مقالات

سیّد حسن عسکری

مرتب

سیّد محمد حسنین

بہار اردو اکادمی پٹنہ
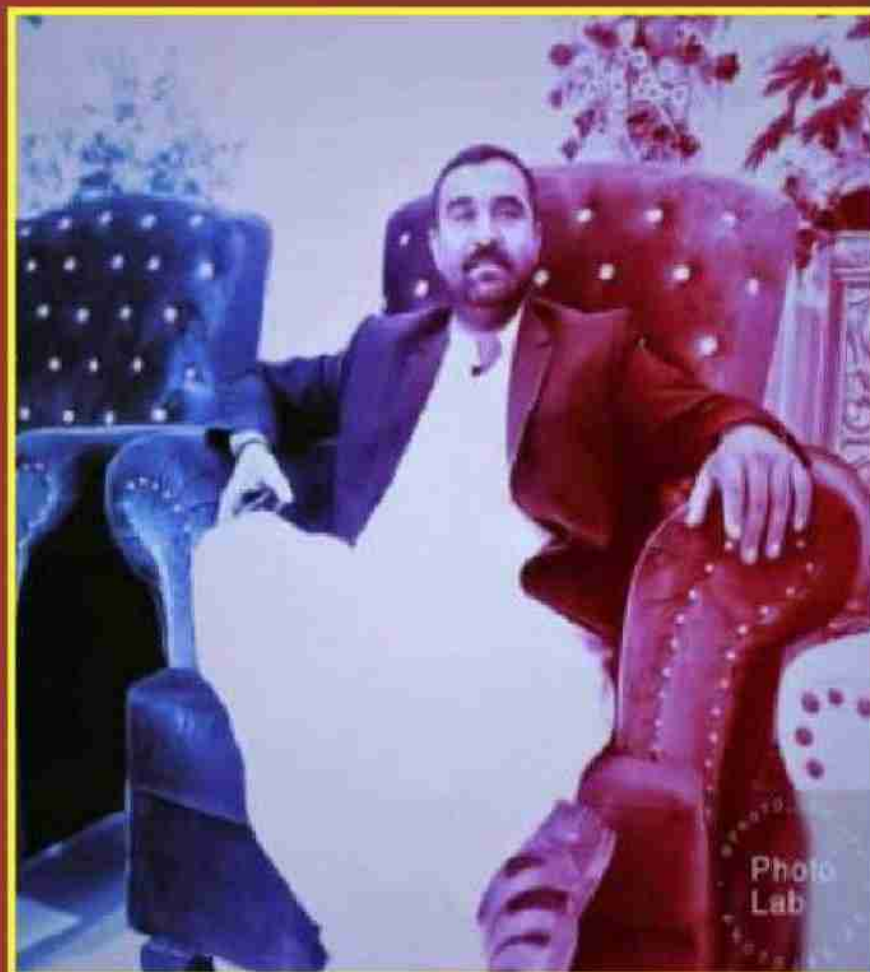
مقالات سیّد حسن عسکری

مرتّب

سیّد محمد حسنین

سنِ اشاعت : ـــــــ ۱۹۹۶ء
تعداد اشاعت : ـــــــ ایک ہزار
کتابت : ـــــــ ابوالکلام عزیزی، قمر رشیدی، یونس یزدانی
طباعت : ـــــــ ایرانین آرٹ پرنٹرس دہلی
قیمت : ـــــــ دو سو روپے

MAQALATE-E-SYED HASAN ASKARI
BY S.M. HASNAIN
PRICE : RS.200/=
EDITION : 1ST. 1996
PUBLISHER : BIHAR URDU ACADEMY, PATNA (BIHAR)

سرورق کی تصویر خدابخش لائبریری پٹنہ کے شکریہ کے ساتھ

ناشر
بہار اردو اکادمی
اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۴

ترتیب

تصنیفی مقالے

شخصیتی مقالے

علمی مقالے

ابتدائیہ

'مقالاتِ عسکری' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کتاب کے مرتب نے بے حد جانفشانی سے پروفیسر سید حسن عسکری کے مقالات جمع کئے اور ترتیب و تدوین کے بعد اکادمی کے حوالے کیا۔ اس کی اشاعت بہت قبل ہونی تھی لیکن قدرے تاخیر اس لئے ہوئی کہ ہم چاہتے تھے کہ اسے خوب سے خوب تر بنائیں چنانچہ ہم نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ کتاب ہر لحاظ سے خوبصورت شائع ہو اور پروفیسر عسکری جیسی عظیم شخصیت کے شایانِ شان ہو۔

اس سلسلے میں اکادمی کے نائب صدر جناب احمد یوسف کا میں ذاتی طور پر بے حد شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کی اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لے کر اسے انجام تک پہنچانے میں میری رہنمائی کی۔

مشتاق احمد نوری

سکریٹری

نذر

"عسکری صاحب کی ذات مغتنم ہے۔ وہ بہت مذہبی ہیں۔ ہر جمعہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ نماز کے پابند ہیں۔ نماز جہاں تک ممکن ہوتی ہے مسجد میں پڑھتے ہیں۔ نماز کے نام سے ایک واقعہ یاد آیا۔

۱۹۴۶ - ۱۹۴۷ کا زمانہ تھا۔ ہندو مسلم فسادات ہو چکے تھے۔ فسادات کے بعد مسلمانوں نے اپنی حفاظت کے لئے مختلف قسم کے اسلحے اور بم وغیرہ بھی جمع کر رکھے تھے۔ جب گورنمنٹ نے حالات پر قابو پالیا تو حکم دیا کہ جس کے پاس بلا لائسنس کے اسلحے وغیرہ ہیں وہ ہٹادیں۔

جس محلے میں عسکری صاحب رہتے تھے وہاں ایک مسجد تھی۔ عسکری صاحب اسی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ لیکن یہ باہر گئے ہوئے تھے کہ کسی نے مسجد کے احاطے میں بم وغیرہ چھپادیا — کوئی بم پھٹ گیا یا

کیا ہوا؟ پولیس کو خبر ہو گئی۔ اس نے تلاشی لی تو اُس احاطے میں بہت سی چیزیں ملیں۔ عسکری صاحب اسی دن باہر سے آئے۔ نماز کا وقت تھا، کسی سے گفتگو نہ ہو سکی۔ اُسی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے، پولیس کو معلوم ہوا تو اُن کے گھر پہونچی، ان سے پوچھ تاچھ کی۔ اُنہیں تھانے لے گئی اور گرفتار کر لیا

ڈی۔ایس۔پی جو اُن کا شاگرد تھا اور تھانے کا انچارج بھی تھا، اُس نے انسپکٹر سے کہا اگر خرگوش ہی پکڑنا تھا تو بے چارے پروفیسر صاحب کو کیوں پکڑا؟"

اپنی تلاش میں۔ جلد ۳، ص۲۴۴؛ کلیم الدین احمد

نذرانۂ عقیدت

خاکساری، انکساری، بُردباری، سادگی
جب ہوئیں یکجا، مجسم تھیں بشکل عسکری

زندگی بھر وہ تلاشِ حق میں سرگرداں رہے
جستجو، تحقیق ان کا مقصدِ اولیٰ رہی

موجزن تھا گرچہ سینے میں سدا ایک بحرِ علم
تشنگیِ علم آخر سانس تک باقی رہی

نازشِ اہلِ وطن کنجِ لحد میں سو گیے
ہر طرف چھائی ہوئی ہے ایک بھیانک تیرگی

ہاں مگر اس مہرِ روشن کی کرن تھی تابناک
ڈوب جانے پر بھی اس کی روشنی باقی رہی

سرزمیں گھوسی کی کہتی ہے عظیم آباد سے
ٹھیک سے رکھنا امانت ہے بڑی یہ قیمتی

پروفیسر موسیٰ رضا

پیش لفظ

پروفیسر سید حسن عسکری صفِ اوّل کے مورّخ اور محقق ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں انہوں نے اپنے شاگردوں کی کئی نسلوں کو علم و تحقیق کی راہ دکھائی ہے۔ ان کے متعلق کچھ لکھنا' آفتاب کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے' لیکن الامر فوق الادب' تعمیل ارشاد میں یہ چند سطریں اپنی علمی بے بضاعتی کے پورے احساس کے ساتھ سپردِ قلم کی جارہی ہیں۔

عسکری صاحب کی ذات بہار ہی کے لئے نہیں' بلکہ پورے برصغیر کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ انہوں نے منصب و منفعت دونوں سے بالاتر ہوکر' برسہا برس صرف تاریخ اور ادب کی خدمت کی ہے۔ وہ عرفی کی زبان میں کہہ سکتے ہیں ؎

ملال عالمیاں دم بدم دگر گوں است
منم کہ مدت عمرم بہ یک ملال گزشت

خدا بخش لائبریری سے کتنے ہی تشنگانِ علم نے استفادہ کیا ہوگا' لیکن اس کے درودیوار نے عسکری صاحب جیسا علم کا شیدائی شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ وہ برسوں "کرم کتابی" کی طرح مخطوطات سے چپکے رہے ہیں بلکہ کتابوں ہی کو اپنا نشیمن بنالیا ہے۔ تحقیق اور تلاش کا جو جذبہ ان کے نحیف و نزار جسم میں' جو بیماریوں سے خستہ جان ہوچکا ہے' کروٹیں لیتا نظر آتا ہے' وہ اُن کے بعد شاید ہی کبھی دیکھنے کو ملے۔

وقت کی کوئی رفتار ہو، حالات مساعد ہوں یا نہ ہوں، اُن کے علمی معمولات میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا۔ مخطوطات کی تلاش میں انہوں نے میلوں سائیکل پر سفر کئے ہیں اور بے پناہ محنت و مشقت سے حاصل کئے ہوئے علمی فوائد کو اپنے شاگردوں پر اس طرح عام کردیا ہے کہ خود فیاضی اور وسیع القلبی کو ان پر رشک آجائے۔ علم اُن کی نظر میں خود ایک قدر ہے جس کو کسی دوسری قدر کے تابع نہیں کیا جاسکتا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وہ تلاش کتب میں صوفیوں کے طرز کی ریاضت کرتے ہیں اور اس محنت کے نتائج قلندرانہ انداز میں صرف کردیتے ہیں۔

پیش نظر کتاب عسکری صاحب کے اردو مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف اوقات میں رسائل وجرائد میں شایع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تاریخی مواد کا بیش بہا سرمایہ اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔

عسکری صاحب کا اندازِ بیان تمام تکلفات اور آرائش ظاہری سے بے نیاز ہے ؎

"تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے"

تزئین وآرائش سے زیادہ ان کا زور مواد کی تاریخی اہمیت واضح کرنے پر ہوتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں وہ کسی تکلف کو روا نہیں رکھتے، جس طرح سوچتے ہیں اسی طرح اپنے خیالات کا اظہار کردیتے ہیں۔

عسکری صاحب کو ایک عرصہ سے تصوف میں خاص دلچسپی ہے۔ انہوں نے مشایخ کے ملفوظات ومکتوبات کی تلاش میں بڑا وقت صرف کیا ہے۔ پیش نظر مجموعہ میں صوفیہ کی ہندی ودکنی اور مسلمان شعراء کے ہندی کلام پر گراں قدر مضامین شامل ہیں حقیقت یہ ہے کہ مشایخ متقدمین کی خانقاہوں نے "ہندوی" زبان کے نشوونما میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ اگر قرون وسطی میں کوئی جگہ ایسی تھی جہاں ہر مذہب، ہر طبقہ اور ہر سماجی پس منظر کے لوگ جمع ہوتے تھے تو وہ خانقاہیں تھیں۔ "ہندوی" کے قدیم ترین

جملے شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے جماعت خانہ میں بولے گئے۔ راجستھان میں خواجہ معین الدین حسن سجزی اجمیریؒ کے خلیفہ شیخ حمیدالدین ناگوریؒ کے گھر میں ساری بول چال "ہندوی" زبان میں ہوتی تھی۔ شیخ صوفی بدھنیؒ، شیخ احمد نہروانیؒ، شیخ علی مولاؒ وغیرہ نے عوام سے رابطہ قایم کرنے کے لیے اسی زبان کو اختیار کیا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ ہندی جکری سن کر وجد میں آجاتے تھے۔ سید محمد گیسودرازؒ سے ایک بار پوچھا گیا کہ صوفیوں کو "ہندوی" میں زیادہ دلچسپی کیوں ہے؟ جواب دیا:

"ہندوی بیشتر نرم و مروق می باشد و سخن کشادہ گفتہ
می شود و آہنگ بر وفق او نرم مروق می باشد کہ
گریہ کناند۔"

"ہندوی" زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر عسکری صاحب نے نہ صرف صوفیۂ متقدمین کی ہندی دوستی کو تفصیل سے بیان کیا ہے، بلکہ جن مسلمان شعراء نے ہندی کلام چھوڑا ہے اس کی دریافت میں بھی کافی جستجو کی ہے۔ یہ معلومات نہ صرف اردو زبان کی ارتقائی منزلوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، بلکہ ہندی قرون وسطیٰ کی تہذیبی زندگی کے بعض اہم پہلو بھی اُجاگر ہوجاتے ہیں۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ملفوظات اور مکتوبات میں تصوف کی بنیادی تعلیم کا عطر کشید ہوکر آگیا ہے۔ ان کے یہاں تصوف کے مسائل کا جو ادراک نظر آتا ہے، اور ان کو اپنے افکار کے اظہار پر جو حیرت انگیز قدرت ہے، اس کے پیش نظر ان کی ہر تحریر سے عہد وسطیٰ کی مذہبی فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ عسکری صاحب کو شیخ منیریؒ سے گہرا تعلق اور عقیدت ہے۔ انہوں نے شیخ کے ملفوظات اور اور مکتوبات پر جس بصیرت افروز انداز میں گفتگو کی ہے وہ لائق ستایش ہے۔

تاریخی موضوعات پر عسکری صاحب کے مضامین (نسخۂ دلکشا جنگ نامہ، تاریخ کشمیر، طبقات بابری) قیمتی تاریخی مواد کی نشاندہی کرتے ہیں اور تاریخ کے

طلباء کے لئے ان کی اہمیت مسلّم ہے۔

عسکری صاحب کے اندازِ زندگی سے کسی قدر واقفیت کی بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان مضامین کے علاوہ اور بھی مطبوعہ مضامین ہوں گے جو اس مجموعہ میں جگہ نہ پا سکے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد ایسے مضامین کی ہوگی جن کو عسکری صاحب نے لکھ کر اپنے "خریطہ جواہر" میں رکھ دیا اور زیورِ طبع سے آراستہ کرانے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ اردو اکاڈمی بہار نے ان مضامین کو شایع کر کے بڑی علمی خدمت انجام دی ہے جس کے لئے وہ یقیناً لائق مبارک باد ہے۔ اگر عسکری صاحب کے غیر مطبوعہ مضامین کا سراغ لگا کر اُن کو بھی شایع کر دیا جائے تو یہ اکاڈمی کا قابلِ قدر کارنامہ ہوگا۔

پروفیسر سید محمد حسنین صاحب نے ان مضامین کے حصول، طباعت اور اشاعت میں جو دلچسپی لی ہے اور جس پُرخلوص انداز میں اس سلسلہ کی ساری صعوبتوں کو برداشت کیا ہے اس کے لئے وہ لائق مبارک باد ہیں۔

نظامی ولا

سرسید روڈ۔ علی گڑھ

۳ را پریل ۱۹۸۹ء

خلیق احمد نظامی

احوالِ واقعی

سید حسن عسکری (پ ۱۹۰۱ - وفات بروز جمعرات ۲۸ نومبر ۱۹۵۰ء) کی جائے پیدائش و تعلیم ابتدائی، ان کا آبائی وطن کجھوہ، ضلع سارن ہے۔ یہ شمالی مغربی بہار میں حسنی سادات (شیعی) کی ایک قدیم بستی[1] ہے۔ ان کے والد، سید رضی حسن اس علاقہ کے خوش حال اور باعزت زمین داروں میں تھے۔

چودہ برس کی عمر میں سر سے والد کا سایہ اُٹھ جانے پر بڑے بھائی، سید سلطان علی نے ان کی سرپرستی کے فرائض بتوجہ انجام دیئے۔ روایتی مشرقی تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۱۸ء میں سید حسن عسکری نے چھپرا ضلع اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہ ملک کی نئی تشکیل کردہ ریاست بہار اُڑیسہ (سابق علاقہ بنگالہ، بہار اور اڑیسہ) کی پہلی قائم کردہ پٹنہ یونی ورسٹی کا وہ پہلا امتحان تھا جو اس دانش گاہ کے تحت ہوا تھا — اس امتحان میں وہ ڈسٹرکٹ جونیر اسکالرشپ سے نوازے گئے۔

---

[1] ... شاہ عالمگیر سے ۱۹۰۵ء میں بطور امداد معاش مسماۃ "بی بی بدی" (بڑی) کو بری ازلگان دو سو بیگہ زمین دی تھی۔ اسی جگہ یہ بستی ۱۷۳۰ میں آباد ہوئی — بحوالہ مقالہ "کجھوہ کی تاریخی اہمیت" مطبوعہ رسالہ 'کجھوہ' مرتبہ ڈاکٹر سمیع عسکری ۱۹۸۷۔
"دیوان ناصر علی انہیں سید کی اولاد ہیں۔" پروفیسر عسکری - بحوالہ مقالے گنج فراہمی صـــــ اور اوراقِ پارینہ ص ۵۳

سید حسن عسکری کی کالجی تعلیم کا آغاز شہر مظفر پور کے جی بی بی کالج سے ہوا جو آج کل لنگٹ سنگھ کالج سے موسوم ہے۔ اس کالج سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کرنے کے بعد وہ مظفر پور سے پٹنہ آ گئے۔ پٹنہ کالج کے شعبۂ تاریخ میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۴ء میں ایم اے کی سند لی۔ یہ یونی ورسٹی میں "تاریخ" کا پہلا امتحان تھا — ایک متعلم تاریخ کی تعلیمی زندگی کے یہ امتحانات اس طرح تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی کالج میں سید حسن عسکری ملک کے مشہور تاریخ داں، سر جادوناتھ سرکار کے شاگرد رہے۔

سید حسن عسکری کا دور ملازمت بہ حیثیت "ماسٹر" پٹنہ کے نیو کالج سے ۱۹۲۶ء میں شروع ہوتا ہے۔ ایک سال بعد ۱۹۲۷ء میں پٹنہ کالج میں وہ "لکچرر" کے عہدہ پر بحال ہوئے۔ اسی کالج میں وہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۵۰ء "اسسٹنٹ پروفیسر" رہے۔ بعد ازاں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۶ء "پروفیسر" کی حیثیت سے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں جب سید حسن عسکری B - E - S (بہار ایجوکیشنل سروس) کی کلاس وَن جگہ سے سبکدوش ہو گئے تو پٹنہ یونی ورسٹی نے ان کی ملازمت کی مزید توسیع کر دی (جس میں تقریباً آٹھ سالہ عرصہ ملازمت ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۴ء کا مختصر خلا تھا)۔ اسی سال یو جی سی کی نئی اسکیم

FINANCIAL ASSISTANCE TO RETIRED TEACHER.

کے تحت ان کا انتخاب ہوا۔ یہ صوبہ بہار میں ایک ریٹائرڈ ٹیچر کا پہلا انتخاب و اعزاز تھا — پروفیسر سید حسن عسکری تقریباً تیس چالیس برس تک (۱۹۲۶ء تا ۱۹۶۴ء) ریاست کی قدیم دانش گاہ پٹنہ یونی ورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ رہے۔

سید حسن عسکری ۱۹۲۱ء میں ازدواجی زندگی میں داخل ہوئے۔ چند ہی برس بعد بیوی قضا کر گئیں۔ دوسرا عقد ۱۹۲۶ء میں اُمّ سلمہ خاتون سے ہوا۔ زوجۂ ثانی سے چار بیٹیاں اور تین بیٹے تولد ہوئے۔ بفضلِ خدا، اس اقبال مند باپ پر سایۂ فگن تھا؛ پروفیسر عسکری نے اپنی کُل اولاد کو آباد و شاد، صاحبِ اولاد اور عزت دار چھوڑا۔

پروفیسر عسکری نے نوّے برس کی طویل عمر پائی۔ اِدھر تعلیمی زندگی ختم کی اور تدریسی نے خیر مقدم کیا، یہ ان کی تعلیم اور شوقِ علم و عمل کی بخت آوری تھی ـــــ ابتدائی پچیس سال کے بعد اور وفات سے چار پانچ سال قبل تک، تمام عمر پڑھتے، پڑھاتے اور لکھتے رہے۔ منصبی مطالبوں اور علمی کاموں میں، جب تک ملازم رہے، بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اپنے عزیز طلبہ میں وہ جس قدر محبوب تھے، علم کے عام پیاسوں میں بھی اسی قدر ہر دل عزیز رہے۔

پروفیسر عسکری ملازمت کے ابتدائی سالوں ہی سے مختلف اداروں سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان میں مقامی و بیرونی اور ریاستی و مرکزی حد بندیاں نہ تھیں۔ ۱۹۳۸ سے وہ کئی برس تک INDIAN HISTORICAL RECORDS کمیشن کے ASSOCIATED ممبر رہے۔ ۱۹۴۶ میں انڈین ہسٹری کانگریس کے MEDIEVAL سکشن کی صدارت کی۔ ۱۹۵۸ میں کلکتہ یونی ورسٹی کے سر عبداللہ سہروردی میموریل لکچرس میں "عہدِ وسطیٰ میں بہار میں تصوف" کے موضوع پر تین خطبے دیے۔ ۱۹۶۰ میں رجسٹرڈ ریکارڈ سروے کمیشن کے اعزازی سکریٹری منتخب ہوئے اور کئی برس تک اس سے وابستہ تھے۔ انڈیا گزیٹیر کی نظرِ ثانی کے موقع پر حکومتِ ہند نے جن دس مورخین کا انتخاب کیا تھا، ان میں ایک اہم نام پروفیسر عسکری کا بھی تھا۔

بہار ریسرچ سوسائٹی، ریاستِ بہار کا سب سے موقر اور پرانا ادارہ ہے۔ اس سے لگاتار پچیس برسوں سے ان کی رکنیت قائم رہی۔

بہار کے مشہور کے۔پی۔ جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے پروفیسر عسکری کا بہت پرانا تعلق رہا۔ ۱۹۶۳ میں وہ اس کے HONORARY JOINT DIRECTOR بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۷ میں مگدھ یونی ورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ آف لٹریچر کی اعزازی سند عطا کی، اور ۱۹۸۴ میں پٹنہ یونی ورسٹی نے بھی اسی اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۷۵ میں انہیں فخر الدین علی احمد غالب اوارڈ پیش کیا گیا۔ ۱۹۸۵ میں حکومتِ ہند کی طرف سے پدم شری کا خطاب ملا ـــ یہ قدر و منزلت اگر ایک طرف پروفیسر عسکری کی ذی علم اور فیض بخش شخصیت کا ثبوت ہے، تو یہ اعزاز و احترام

ان کے منصب و معاش کے فروزاں وجود کی بدیہی علامت ہے۔

کسی فرد میں وسیلۂ معاش اور استطاعتِ طبعی اگر جان اور تن والی بات ہوجائے تو منصب و معاش کا یہ اتحاد، کاروانِ رُو براہ کے لئے ستارۂ سمت ہوجاتا ہے۔ یہ انضباط و انضمام نہ صرف فرد کی پیشہ ورانہ کامیابی ہے، بلکہ اس کے اولوالعزمی کی بامرادی بھی — تدریس و تعلیم اور مطالعہ، پروفیسر عسکری کا محض پیشہ نہ تھا، ایک شوق بے پناہ تھا۔ مطالعہ، بالخصوص نایاب و قدیم مطبوعات اور مخطوطات کا مطالعہ، ان کے معمولات کا فریضہ تھا۔ علم تاریخ سے ان کی بے پایاں دلچسپی عمر کے ساتھ ساتھ اس طرح بڑھتی گئی کہ اس کی رفتار یا روش پر زمانہ اور حالات کے وقتی ناسازگار تقاضے بھی اثر انداز نہ ہوتے — وہ طبعاً ایک صادق معلم تھے، مزاجاً خادمِ علم اور عملاً ایک صوفی۔ حصولِ علم اور علم بخشی ان کا شعار و کردار تھا اور اسی احساس و خمار کے ساتھ وہ تا حیات تیز قدم اور ثابت قدم رہے۔ ان میں حوصلہ تھا، حرص نہ تھی۔ درویشی تھی، جاہ طلبی نہ تھی وہ کام پسند تھے، نام پسند نہ تھے۔ ان میں جاہ اور نباہ کا وہ مساوی رویہ تھا جو ہر کا ظرف نہیں۔

پروفیسر سید حسن عسکری کے سیکڑوں شاگردوں میں ڈاکٹر قیام الدین احمد، پروفیسر شعبۂ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی، قدرت کی سخا و عطا کا ایک نمونہ ہیں۔ شرافت و سعادت کا پیکر اور علم و قلم کے دھنی — اس خوش طالع انسان کی تذکیر، ہمہ خانہ آفتاب نہیں، ہمہ نسل روشن چراغ کی تمثیل ہے — پروفیسر قیام الدین احمد، ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے پوتے اور پروفیسر کلیم الدین احمد کے سگے بھتیجے ہیں: سونے پر سہاگہ، دانش گاہ پٹنہ کے اُبھرتے تاریخ داں، ڈاکٹر امتیاز احمد ان کے اکلوتے بیٹے ہیں۔

ڈاکٹر قیام الدین کا یہ قول "Prof. Askari combines the roles of a scholar and explorer" ہند کے چند باکمال مورخین میں بہار کے اس مایۂ ناز تاریخ داں کی انفرادیت کا نہایت روشن نشان ہے۔ یہ قول مختصر، پروفیسر عسکری کا جامع تعارف ہے اور ان کی خدمات کی تنقید بھی — مرحوم پروفیسر عسکری کی تاریخ سے شیفتگی ایک تاریخی شہادت

ہے اور استاد کی یہ امارت، شاگرد کی امانت ہے۔

"تلاش" پروفیسر عسکری کی سیرت کا جوہر ہے، والہانہ اور بے تابانہ تلاش ــــ ان میں تلاش و تجسس اور دید و دریافت کی یہ خلش یا خواہش، مطبوعات ہوں یا مخطوطات، اشخاص ہوں یا عمارات، ہر جگہ بلا کم و کاست سرگرم عمل رہی ہے ــ تاریخی صداقت کی تحقیق و تفتیش کی خاطر، اس "قیس الادب" نے سرزمین بہار کو روند ڈالا تھا۔ کہاں کہاں اور کس کس جتن سے وہ ایسے دفینے اور دستاویز ڈھونڈ نکال لیتے، جس کی دستیابی کسی دوسرے سے ممکن نہ تھی۔ بہار کا یہ مردِ نحیف و حنیف اپنی تاریخی سرگرمیوں اور قلمی فتوحات کے بموجب اپنے عہد کا کولمبس تھا اور سکندر بھی۔

پروفیسر عسکری کی مطبوعات کی مجموعی تعداد قیاساً ڈھائی تین سو سے کم نہ ہوگی ــــ ڈاکٹر قیام نے ان کی انگریزی اور اردو نگارشات کی، جس میں مقالے، خطبات، تبصرے و تعارف شامل ہیں، ایک سو اٹھائیس موضوعی تقسیم کی ہے۔ یہ ۱۹۶۸ تک کا شمار ہے ــــ مگر درحقیقت وفات سے تقریباً تین چار قبل تک، ان کا مشغلہ، نوشت و خواند برقرار تھا، اول الذکر کم اور ثانی الذکر بہ کثرت ــــ یہ وہ زمانہ تھا، جب بصارت اور انگلیوں کی قوتِ گرفت زوال پذیر تھی۔ بہ فاصلۂ یکشت، ہتھیلی کی اوٹ سے وہ اخبارات پڑھ لیتے۔ نقاہت زیادہ نہ ہوتی تو مرتعش ہاتھ سے تھوڑا بہت لکھ بھی لیتے ــــ ان حالات میں بھی ان کا ذہن بیدار رہتا۔ سماعت میں کمی نہ تھی۔ بہ پہچانی آواز سے مخاطب کی شناخت کر لیتے۔ اُن دنوں بھی کسی ہنگامی مسئلہ یا موضوع پر عسکری نواز اُن سے تبادلۂ خیال یا قلم بند تاثرات کی خاطر بے تامل آجاتے، اور اصرار و التجا پر یہ انہیں املا کرا دیتے۔

مبسوط اور منظم تصنیفی و تالیفی کاموں میں ذہنی تنظیم کاری ابتدائی اور اہم مرحلہ ہے جو

---

[1]۔ پروفیسر سید اختر احمد اورینوی، پروفیسر عسکری کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کا سراپا، ہیئت اور شدتِ جنونِ جستجو کے پیش نظر وہ عسکری مرحوم کو اسی لقب سے یاد کرتے۔

قلم بندی میں صبر و ضبط اور وقت کا طالب ہوتا ہے ـــــ پروفیسر حسن عسکری کی خواندگی میں جیسی استواری تھی، نگارش اس سے محروم تھی۔ ان کے جذبۂ تلاش و تحقیق میں برق روی تھی مگر عمل تسوید میں مادۂ استقامت ناتواں تھا۔ علمی محصولات کے مطالعہ کی طرف وہ جس قدر جلد متوجہ ہو جاتے، اسی سرعت سے قلم بندی میں بھی مستعد ہو جاتے ـــــ تودۂ خاک یا خس و خاشاک سے وہ کوئی نیا، بار کار یا ناتمام جزئی مواد نکال لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ جزو سے تشکیلِ کُل یا موجود ناتمام کی تکمیل کاری کا ان میں سلیقہ یا ہنر نہ تھا ـــــ یہی وجہ ہے کہ کسی منصوبہ بند پروگرام کے ساتھ وہ کوئی تصنیفی یا تالیفی کام انجام نہ دے سکے ـــــ پروفیسر سید حسن عسکری کے مبلغِ علم اور ابلاغِ علم کا یہ سنگین المیہ ہے۔

ایسی ہی دو مثالیں، ڈاکٹر عظیم الدین احمد اور قاضی عبد الودود کی ہیں جن کا گراں قدر سرمایۂ علم کسی مبسوط و منظم اور جامع "تصنیف" کی صورت کو ترستا ہی رہا ــ!

اپنے مقالوں سے پروفیسر عسکری کی عملاً بے پروائی کی وجہ یہ تھی کہ انہیں وہ محض تفتیشی کام (explorative - work) سمجھتے تھے کوئی ایسا (reasearch - based) کارنامہ تصور نہیں کرتے جس میں تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ مزید محنت کر کے انہیں بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

بات ٹھیک تھی۔ لیکن، یہ صبر طلب تنظیمی کام ان کے بس کا نہ تھا ـــــ پروفیسر کلیم الدین کو ان کے اس خیال سے اتفاق نہ تھا۔ وہ کہتے "پہلے ان مضامین کی شیرازہ بندی واجب ہے ورنہ یہ ضائع ہو جائیں گی . . . کوئی کام کبھی آخری نہیں ہوتا۔ وقت آنے کا تو مزید اضافی کام ہو جائے گا۔

پروفیسر سید حسن عسکری کی مطبوعہ نگارشات کے تحفظ کا خیال اولاً پروفیسر کلیم الدین احمد کے ذہن میں آیا تھا۔ یہ ان کی نیازِ عسکری اور نوازشِ ادب کا جذبہ تھا ـــــ بات ان دنوں کی ہے جب وہ خدا بخش پبلک لائبریری کے انتظامیہ سے منسلک تھے اور قاضی عبد الودود اور پروفیسر عسکری بورڈ کے اراکین ـــ ہر دو بزرگ، پروفیسر عسکری کی سیمابی اور استغنائی تضاد سیرت اور نام و نمود یا نمائشی کاموں سے ان کی عملاً عمداً کنارہ کشی کی خصلت سے کماحقہٗ واقف تھے۔

اسی غرض سے ان کی مطبوعات انگریزی اور اُردو کی ایک ایک کاپی لائبریری میں محفوظ کی جانے لگی — یہ سلسلہ چلا، قائم رہا مگر صاحبِ تحریر کی سیرت و خصلت کا بوجھ نہ اٹھا سکا۔

الغرض، پروفیسر عسکری لکھتے اور چھپتے رہے؛ عادتاً اپنے اندوختہ قلم سے بالکل تہی دست، حتیٰ یہ کہ مطبوعات کا کوئی ریکارڈ رکھنا بھی ناگوار خاطر — ان کے بیشتر مضامین زینت معاصر (مجلہ دائرہ ادب، پٹنہ) رہے۔ پر، ایسی تحریریں کم نہ تھیں جو ادبی مواقع پر پیش کی گئیں، مگر نہ یہ شائع ہوئیں اور نہ ان کی نقل رکھی گئی۔

مقالاتِ سید حسن عسکری کی طباعت کی بات بھی پروفیسر کلیم الدین احمد نے ہی اٹھائی تھی، جب وہ بہار اُردو اکادمی، پٹنہ کے نائب چیرمین تھے۔ اور اسے اکادمی کے اشاعتی پروگرام میں شامل کر لیا گیا۔ میری خوش بختی یا بد بختی، یہ کارِ سعید میرے سپرد کر دیا گیا۔ میں، نہ پروفیسر عسکری کا شاگرد اور نہ تاریخ میرا مضمون؛ بس، پاسِ احترام یا الزام اسی قدر کہ میرے ریسرچ میں یہ ہمدم و رفیق تھے اور مجھ سے زیادہ فعال اور فولادی رہے۔

ریاست بہار میں ادبیات اردو میں پہلی پی ایچ۔ ڈی کی سند کا سہرا میرا مقدر رہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ میں ابتدا سے ادب کا طالب علم رہا اور ادب لطیف کا عاشق زار۔ یہ بھی اصلیت ہے کہ تحقیق یا تاریخ سے نسبت میرا جذبۂ ذوق و شوق نہیں، عزمِ حصولِ سند تھا۔

یہ زمین سنگ و خشت، سخت گرم و جاں طلب، لازماً میرے لئے قطعاً انجانی تھی۔ دانش گاہوں میں (بہار میں یہ صرف دو تھیں)، اُن دنوں اُردو میں ریسرچ، ایک خیال دور از کار تھا۔ اس کا ارادہ، ایک کارِ دشوار اور اس کی بات، ایک نا تصور ذہنی عمل — مُلک میں بھولے بھٹکے اِدھر اُدھر کسی نے کچھ کام کر لیے تھے، سو بھی کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو، والی مضحک بات تھی — یہ اس صدی کی اواخر چوتھی دہائی کا ذکر ہے۔

بہرحال، میں نے قدم رکھا تو جوش و ہوش جاتے رہے۔ موضوع ایسا کہ نہ اُدھر جیو رہی پہلی منزل، جہدِ ارضی (FIELD WORK) تھی؛ تلاشِ مخطوطہ، حصولِ مخطوطہ اور دستیابیِ مواد میں میں نے جو پاپڑ بیلے ہیں اور ریاستی اور غیر ریاستی چکر لگائے ہیں، جیسی ذہنی، جسمانی اور مالی صعوبتیں اٹھائی ہیں، یہ میرے "محسنینِ خمسہ" (قاضی عبدالودود، فصیح الدین بلخی، سید حسن عسکری، کلیم الدین احمد، اور شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی) سے چھپی نہ تھیں۔

مرحوم پروفیسر عسکری، خدا غریقِ رحمت کرے! ہر سفر میں ساتھ اور ہر جا سایہ ہو جاتے۔ کارِ تحقیق میں ہر خستگی یا خوابیدگی کو کافور کر دیتے۔ خود تیز قدم ہوتے اور مجھے ہم قدم رکھتے۔

بہار اُردو اکادمی کے اشاعتی پروگرام میں مقالاتِ عسکری کے اندراج کی خبر پر پروفیسر عسکری نے کوئی نوٹس نہ لی — یہ کام میرے سپرد کیا گیا تھا، ناخوش ہوئے نہ خوش — جب بغرضِ تعاون ان سے رجوع کیا، بے نیازی برتی۔ دو ٹوک کہا۔ "پرنٹڈ آرٹیکلس ہیں، جو چاہے ترتیب دے، میرا کیا لینا دینا ..." — میں نے اثر نہ لیا۔ جانتا تھا کہ وہ مجھے نا دیر ٹوٹا نہ دیکھ سکیں گے۔ شفقت و اخلاص میں کمی نہ تھی — پہلا خیال کہنہ پارہ جیسا از خود کھو گیا — کام شروع کر دیا گیا۔

آغازِ کار میں دشوار گذار مرحلہ پروفیسر عسکری کی مطبوعہ نگارشات اردو کا علم اور ان کی تصریحات، بعد ازاں ان کی تلاش و دستیابی تھی۔ معاصر کے ذریعہ مجھے ان کی واقفیت تھی۔ اس کی مکمل جلدیں ذخیرۂ حسینی میں موجود تھیں۔ ابتدا ہی میں ان کی نقل کرالی تھی — مزید چند نگارشات کا علم مصنف سے ہوا، مگر حصول میں کوششوں کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی — دو چار مقالے اِدھر اُدھر سے ملے، جس میں ڈاکٹر قیام کا خاص تعاون تھا۔

بائیس تیئیس مقالوں پر مشتمل بہرحال، مسودہ تیار ہو گیا۔ کتابت کی منزل آئی تو اندازہ ہوا کہ معاصر سے منقول چند مقالوں کی کتابت دشوار ہے، کیونکہ علاوہ بدخطی، نقل میں بڑی بد احتیاطی ملتی ہے — میری ذاتی معاصر کی مکمل جلدیں پروفیسر کلیم الدین احمد کے مکان میں ۱۹۷۵ء کے سیلاب میں

تلف ہوگئی تھیں ۔۔ اب کیا صورت ہو؟ ۔۔ معلوم ہوا کہ خدا بخش لائبریری میں ادھر اُدھر سے داخل کردہ معاصر کے کئی شماروں سے اس کی پوری جلد مکمل کر لی گئی ہے ۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے رجوع کیا ۔۔ وقت وقت کی بات ہے، پروفیسر عسکری کے مقالوں کی اشاعت میں بیدار صاحب کی فکر کچھ مجہول سی تھی ۔ خود مصنف بھی اس سے لاعلم نہ تھے اور غایت مکدر ۔

کتابت کا کام شروع ہو گیا تھا ۔۔ پروفیسر عسکری سے ملنے جاتا تو پوچھ لیتے کہ کام کیسا چل رہا ہے ۔۔ لیکن کام کی رفتار بہت سست تھی ۔ کبھی کبھی کئی ماہ کتابت رُک جاتی ۔ غیر متوقع موانعات سامنے آجاتے ۔

پروفیسر عسکری کی صحت گرتی اور حالت سنبھل سنبھل کر بگڑتی جاتی ۔۔ وفات سے دو تین برس پہلے، جب وہ ضعف اور ضیق النفس سے زیادہ پریشان نہ تھے، اس بات پر راضی تھے کہ کتابت کردہ حصے کو وہ سن لیا کریں گے ۔ یوں تصحیح کا کام ہو جائے گا اور ادھر ادھر غیر واضح متن، عبارات، اغلاط اسمائے کتب اور اسمِ اشخاص پر وہ ضروری نوٹ کی املا خود کرا دیں گے ۔

ان مقالوں کی اشاعت میں بے حد تاخیر ہوئی ۔ الزام سے میں بھی بَری نہیں ۔ بیس عدد مقالات ہم دست تھے ۔ معاصر کے ان مطلوبہ شماروں کی عکسی کاپیاں بیدار صاحب نے از راہ کرم مفت بھیج دی تھیں، لیکن دو چار ایسے مقالے جو میری فہرست میں نہ تھے، ان سے محروم رکھا ۔

مشفقی پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنا "پیش لفظ" ۱۳ اپریل ۱۹۸۹ کو بھیج دیا تھا ۔ پروفیسر عسکری نے اسے بغور سنا ۔ گفتگو سے معذور اور بصارت سے محروم تھے، پر دو بار سنا ۔ سوکھے شکن آلودہ چہرے پر تازگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی ۔۔ بہ دقت کہا "عزیزم اسے جلد شائع کرالو ۔ ۔ میں دیکھ نہ سکوں گا، جی خوش ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ خدا تمہیں خوش رکھے ۔ ۔ ۔" ۔۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ !!

آج، جب سید حسن عسکری، پیوند خاک ہیں، بہ خاکسار بخدمت عسکری نوازاں، یہ تحفہ عزیز

نذر کر رہا ہے۔

مقالے جو علم میں آئے مگر بروقت دستیاب نہ ہو سکے، ان کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ سیرت سیر الاولیا، مقدمہ فیروز شاہی — مطبوعہ جرنل آف انڈین ہسٹری ٹراونکور، مدراس ۱۹۵۲، بحوالہ خود مصنف

۲۔ صوبہ بہار کے آخری ہندوستانی گورنر جنرل امتیاز الملک ممتاز الدولہ مہاراجا کلیان سنگھ بہادر — مطبوعہ رسالہ ندیم بہار نمبر (گیا)۔ ۱۹۴۰ء

۳۔ مثنوی گوہر جوہری — مطبوعہ سہ ماہی اُردو انجمن ترقی اردو، اپریل ۱۹۴۸۔

۴۔ اوّلین مسلمان اور دیسی بھاشائیں۔ — مطبوعہ پٹنہ یونی ورسٹی جرنل ۱۹۵۰ -

۵۔ سندیش رسک، ایک مسلمان کی اپبھرنش ہندی کا مطالعہ — مطبوعہ سہ ماہی اُردو ۔

۶۔ مظفر نامہ

نمبر ۴-۵-۶ بحوالہ انگریزی بک لٹ مرتبہ ڈاکٹر قیام الدین احمد، مطبوعہ جرنل آف بہار ریسرچ سوسائٹی، خاص نمبر ۱۹۶۸

۷۔ پروفیسر محفوظ الحق مرحوم

۸ کے کردہ نیافت

۹۔ افسانہ بادشاہان یا تاریخ افغانی

۱۰۔ ترک سلاطین ہند کے ابتدائی دور میں شکار

۱۱۔ استدراک بر مفید الانشا

۱۲۔ دیوان نانک شاہ

۱۳۔ سندیس واسک اپ بھرنش

۱۴۔ نسخۂ خالصۃ الانساب

مقالات عسکری کا میں مرتب ہوں، پر بڑی محسوس ہوتی ہے — مرحوم پروفیسر سید حسن عسکری زندہ ہوتے، تو اس کا اظہار فخریہ کرتا — ان کی ہدایت، تصحیح اور تحشیہ کے اشتراکِ عمل سے یہ مجموعہ وہ ہوتا جو نہ ہو سکا۔ یہ کیسی محرومی ہے!

عزیزی ڈاکٹر قیام الدین احمد اور برادرم شاہ محمد اسمٰعیل روحی سے ہر منزل پر مدد ملی۔ ان کی ذاتی توجہ کے باوجود، مقامات مشتبہ اور اغلاط تحریر پر قابو نہ پایا جا سکا۔ مزید کوشش سے غالباً یہ کام ہو جاتا، لیکن نہ موقع تھا اور نہ وقت — متون میں ایسے مقامات پر علامت استفہام کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

مذکورہ بالا حضرات کا شکریہ واجب ہے۔ میرے ایک شاگرد، ڈاکٹر سید محفوظ الحق، صدر شعبۂ اُردو نکاری کالج گیا نے بھی وقت ضرورت مدد کی ہے، ان کا شکر گذار ہوں۔

مشفقی پروفیسر خلیق نظامی سے منصبی جہت ہے اور جذباتی تعلق بھی — دوران قیام علی گڑھ میں، جس کا بفضلہ اب زیادہ موقع ملتا ہے کہ بیٹا اور بہو دونوں دانش گاہ میں ملازم ہیں، موصوف سے ہائے دل اور ہائے گُل والی بے تکلفانہ باتیں ہوتی ہیں۔ مقالات عسکری کی اشاعت کی بات سن کر بہت خوش ہوئے۔ پیش لفظ کے لیے یوں آمادہ ہو گئے کہ جیسے یہ کارِ ادب ہو — تہہ دل سے ان کا ممنون ہوں۔

احوال واقعی کا اختتام پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی ان سطور کے ساتھ کرتا ہوں، جن میں جذباتِ حسین بقلمِ رشید کروٹیں لے رہے ہیں:

> "... میرے نزدیک کام کرنے کا بہترین ممکن العمل طریقہ یہ ہے کہ کام تو اولین لمحہ میں شروع کر دیا جائے اور بہترین کام کرنے والے کی تلاش جاری رکھی جائے۔ میں بھلے یا بُرے طریقہ پر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتا ہوں، دوسرے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں۔"

مقدمہ داستان عجم از خیال عظیم آبادی

تاریخ کشمیر کے چند قلمی نسخے

[۱]

(۱) فارسی مخطوطات کے تجسس و تلاش کے دوران میں راقم السطور کی نظر سے تاریخ کشمیر کے چند قلمی نسخے گذرے ایک نسخہ رامنگر راج (بنارس) کی لائبریری میں ملا۔ اس تاریخ کشمیر معروف بہ نوادر الاخبار کا مصنف رفیع الدین احمد بن عبدالصبور بن خواجہ محمد بلخی کشمیری التخلص بہ غافل دیباچہ میں لکھتا ہے۔ "کلہن پنڈت زنار دار در تصنیف دارزہ ترنگ راج ترنگنی یعنی شہنامہ بزبان کشمیری (سنسکرت) نوشتہ موافق معتقدات ارباب کفر و ضلالت دلائل باطل و اقوال خلاف شرع محمدی بیان نمودہ بعضے دانشوران کہ تواریخ جدید تالیف کردند در اخبار قدیم متابعت مصنف مذکور را کار فرما شدہ .... احقر بخاطر گذرانید کہ برا این مبطلہ کفارے اعتبار شمردہ چون وچرائے ملوک کفرہ موقوف داشتہ حسب حال بنائے کشمیر با حقائق بادشاہان اسلامیہ مجملاً بقید کتابت در آرد تا یادگار سوانح جویاں روزگار بماند و از معتقدات اہل اسلام بیرون نباشد بہ ہمیں خیال تصانیف متقدمین و طائفہ متاخرین مورخان کشمیر داشتہ بنظر مطالعہ در آوردہ از ہر نسخہ چیزیکہ قرین صحت و دلنشیں دانشمندان دین مبین دید بنگارش آں پرداختہ صفحات ایں اوراق غریبہ و روایات صحیحہ بہ تسمیہ نوادر الاخبار مسمی گردانید۔" یہ عبارت مصنف کے مبلغ معلومات[۱]

---

* معاصر مئی جون ۱۹۴۲ء۔

[۱] کلہن نے اپنی مشہور منظوم تاریخ کشمیر مسمیٰ راج ترنگنی سنہ ۱۱۴۸-۴۹ء میں لکھنی شروع کی اور سنہ ۱۱۵۰ء میں اس کے آٹھویں باب کو ختم کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد زمانہ قدیم کی تاریخ کو قلمبند کرنا تھا۔ اسلامی عہد اور مسلمان سلاطین اس کے پیش نظر نہ تھے معتقدات اہل اسلام سے اس کو واسطہ ہی کیا تھا۔ ہندو روایات قصص دیومالا کا ذکر ناگزیر تھا۔

اور نظر کی تنگی کی غمازی کرتی ہے افسوس ہے کہ باقاعدہ نوٹ لینے کی اجازت باوجود کوشش کے نہ ملی اور وقت کی کمی اور دوسرے زیادہ جاذب نظر مخطوطات کے سرسری مطالعہ نے موقع نہ دیا کہ اس کتاب کی اوراق گردانی سے چند ضروری باتیں ذہن میں محفوظ کر لیتا۔ اس نسخے کے آخر میں ایک قطعہ تاریخ ملتا ہے جس میں ختم نام سے ۱۱۳۶ ہجری کا سن نکلتا ہے۔ سن کتابت ۲۶ رجب ۱۱۹۹ھ ہجری درج تھا کتاب بمقام شاہجہان آباد (دہلی) میں لکھی گئی اس کے اوراق کی تعداد ۷۷ اور ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں ہیں یہ کتاب یعقوب خاں چک کے حالات پر ختم ہو جاتی ہے۔

(۲۱) تاریخ کشمیر کا ایک دوسرا نسخہ جو تاریخ اعظمی کے نام سے مشہور ہے۔ نوادر الاخبار کی طرح کمیاب نہیں اس کا ایک قلمی نسخہ جو نفیس الطرفین ہے راقم السطور کے پاس ہے۔ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں نہ صرف اس کا مکمل فارسی قلمی نسخہ بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے جسے مطبع العلوم مدرسہ دہلی نے ۱۲۰۲ھ میں چھاپ کر شائع کیا۔ اصل نسخہ کا مصنف ایک راسخ العقیدہ حنفی المذہب مسلمان محمد اعظم ابن خیر الزمان تھا جس نے حیدر ملک کی تاریخ کشمیر کے نقائص اور اس کی بیجا باپ دادے کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف سے متنفر ہو کر اپنی کتاب ۱۱۴۶ھ میں لکھنی شروع کی لیکن ۱۱۶۰ ہجری میں اس کی تکمیل کی "واقعات کشمیر" سے کتاب کے آغاز کی تاریخ نکلتی ہے منشی اشرف علی مدرس مدرسہ دہلی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ مشرقی ترجمہ۔ ایف میجل نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی ۳۳ ویں جلد میں مسلمان فرمانروایان کشمیر کی مختصر تاریخ شائع کرائی تھی جو زیادہ تر محمد اعظم کی تاریخ سے

۱؎ اس کا ایک نایاب نسخہ راقم السطور کو دستیاب ہوا تبصرہ آگے ملاحظہ ہو۔

۲؎ "زیب و زینت کشمیر فزود" سے یہ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

۳؎ محمد اعظم نے اپنے ماخذات کی حسب ذیل فہرست دی ہے۔ تاریخ سید علی۔ تاریخ رشیدی از مرزا حیدر کاشغری۔ منتخب التاریخ از حسن بیگ۔ رتنی نامہ از ملا نجیب۔ درجات السعادت از خواجہ اسحاق اودہی۔ اسرار الاسرار از بابا داؤد مشکوتی۔ تحفۃ الفقرا از شیخ مراد و مرشد۔ مصنف مآثر عالمگیری از مستعد خاں ساقی۔ تاریخ حیدر ملک چادورہ۔

ماخوذ تھی۔ اس تاریخ کو ہم کشمیر کے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کا تذکرہ بھی کہہ سکتے ہیں، خود مصنف ایک جگہ رقم طراز ہے : "اولی این است کہ احوال حضرات عالی درجات کہ از اواخر عہد سلطان زین العابدین تا در فتح شاہ و محمد شاہ زینت بخش مسند ہدایت و تقویٰ بودند طراوت افزائے ایں اوراق گردد کہ علت غائیہ ایں نسخہ تذکار حالات حضرات است بعد آں حالات شاہان بین التفصیل و الاجمال مرقوم عبرت سگال شود۔" یہ کتاب ایک مقدمہ تین قسموں اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں حالات و صفات کشمیر حوالۂ قلم کئے گئے ہیں۔ پہلی قسم میں اسلام کے قبل کشمیر کے راجگان کے حالات ہیں۔ دوسری اور تیسری قسموں میں اولین سلاطین اسلام اور غلبہ چغتائیاں (مغل) کے حالات ہیں۔ خاتمہ میں عجائب و غرائب کشمیر کے متعلق قلم کو جولان کیا گیا ہے۔ درمیان میں مشائخ کبار اور بزرگان دین اور علماء و شعرائے کشمیر کے تذکرے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب عسیر الحصول نہیں اور اس کا مطبوعہ اُردو ترجمہ موجود ہے۔ اس لئے اس کے متعلق یہ چند اشارات کافی ہیں۔

(۳) **تاریخ کشمیر** کا ایک نسبتاً کمیاب نسخہ راقم السطور کو اس کے وطن کچھوچھہ ضلع سارن اور دیوان ناصر علی اعلی اللہ مقامہ کے موقوفہ کتب خانہ میں ملا اس کے صفحہ اول پر **تاریخ کشمیر** اور **تواریخ کشمیر مسمی بہ راج ترنگنی** مرقوم ہے یہ نسخہ قدیم اور تقریباً مکمل لیکن بہت کرم خوردہ ہے۔ آخر کے دو ایک اوراق غائب ہیں اس کے اوراق کی تعداد ۱۷۱ ہے اور ہر صفحے پر ۱۵ سطریں ہیں خط پختہ صاف نستعلیق ہے اور سُرخ روشنائی سے راجگان و سلاطین کے نام اور خاص خاص مباحث کے عنوان لکھے گئے ہیں۔ اس کا مؤلف نرائن کول المتخلص بہ عاجز "پروردہ ..... سرزمین جنت قرین کشمیر" تھا۔ چونکہ "بنا بر کثرت استماع اخبار از روے **تواریخ کشمیر** بر احوال راجہائے ریاست نشان و سلاطین عالی مکان ایں خطہ بیشتر وقوف داشتہ" "اکثر مجالس اکابر رافت مآثر" میں اس سے خواہش کی گئی کہ "واقعات ایں طبقہ ذی رتبہ" کو "مطالعہ کنندگان" کے لئے مرتب کرے اس لئے اس "گرفتار محبس بیکاری نے خدیو زماں ..... ابو النصر سید قطب الدین محمد شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت میں"

ے مؤرخین لکھتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کا دعوائے سیادت ایک کمزور دلیل اور روایت مجہول پر مبنی تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

اور "چہارم سال فرخندہ مال" اعلیٰ حضرت ظل الٰہی مطابق یکہزار و یکصد و بست و دو ہجری" میں "خان ذی شان عارف خاں نائب و دیوان صوبہ" کی ترغیب سے یہ کتاب حوالۂ قلم کی۔ عارف خاں مذکور نے "کتب تواریخ کشمیر" بزبان سنسکرت کہ مورخاں بذکر وجہ تسمیہ و احوال آغاز عمارت و زراعت و مدت و عدت سلاطین کشمیر پرداختند جمع کی تھیں۔ نرائن کول عاجز نے مشہور مورخ و شاعر کلہن پنڈت و مورخان دیگر[1] کہ اعتماد مدار شایاں است کے سنسکرت نسخوں کے فارسی ترجمہ مؤلفہ ملک حیدر کو ڈھونڈھ نکالا اور اصل نسخوں سے اس ترجمہ کا مقابلہ کیا "مبالغاتے را کہ طبیعت ارباب خبرت و اصحاب بصیرت بدان اقبال نمی نمود در ترجمہ مذبور مثبت بود متروک ساختہ" اور واقعات کو بفارسی لیح خانی[2] در غایت اختصار و ایجاز القلم عجز رقم آورد "تا طبع مطالعہ کنندگان ملال نیاورد و زنگ کلفت نپذیرد" کتاب کا نام احوال بایجاز تمام کشمیر تجویز ہوا لیکن اس سے ۱۱۳۰ھ ہجری نکلتا ہے۔

کتاب کا آغاز ایک مقدمہ سے ہوتا ہے "در ذکر وجہ تسمیہ و آغاز عمارت و زراعت کشمیر" اس کے بعد کی سرخی ہے "ذکر آغاز سلطنت و حکومت راجہای کشمیر بتقدیر حافظ الصغیر و الکبیر" "راجہ اور کند یا گونند اول راجہ او دہن دیو برادر زادہ سہدیو اور رانی کوٹہ رین تک ۱۲۵ ہندو فرمانرواؤں کے مختصر حالات اوراق ۶ ب سے ۶۲ ب پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ورق ۶۲ ب میں شاہمیر۔ لنگر چک جد چکاں

(بقیہ حاشیہ) کہا جاتا ہے کہ سید شاہ میر حضرت عبد القادر جیلانیؒ کی نسل کے ایک بزرگ کشمیر میں پہنچے راجہ ان کا مرید ہوا اور اپنی دختر سے ان کی شادی کر دی۔ بہادر شاہ کی ماں نواب بائی انھیں سید اور دختر راجہ کی بیٹی تھیں۔ ان کا اصلی نام ملکۃ النساء تھا انھیں ان کے باپ سید شاہ میر راجہ کے سپرد کر کے مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے۔ راجہ کشمیر نے انھیں پالا اور شاہزادہ اورنگ زیب سے ان کی شادی کر دی (مآثر مغل جلد ا صفحہ ۳۶)

[1] کلہن کے بعد جونار راجہ نے راج ترنگنی کا تتمہ ۱۴۵۹ء میں تصنیف کیا اس کے شاگرد سری ور نے چار حصوں میں ۱۴۵۹ء سے ۱۴۸۶ء کے وقائع کشمیر مرتب کیے تتمہ رابع راجا ولی پتاکا کے نام سے پراج بھٹ اور اس کے شاگرد شُبھ سوکا نے اکبر کی تسخیر کشمیر کے بعد (۱۰۸۶ھ) میں تمام کیا۔ نرائن کول عاجز نے شاید ان کتابوں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے۔

([2] اگلے صفحہ پر)

اور رتن جیو عرف سلطان صدر الدین کے کشمیر میں آنے اور درویش نور شاہ کے کشف و کرامات اور شاہ میر کو سلطنت کشمیر کی بشارت دینے کا ذکر ہے۔ سلطان رتن جیو کے بارہ میں نرائن کول لکھتا ہے کہ " اول کسے کہ از سلاطین کشمیر شرف اسلام یافت او بود "۔ لیکن اس کے اسلام لانے اور بلبل شاہ کا تذکرہ اس نے نہیں کیا شاہ میر الملقب بہ سلطان شمس الدین سے حبیب خاں تک ۲۴ شاہان اسلام کے حالات اوراق ۵۵ ب تا ۱۸۰ الف تک میں مرقوم ہیں۔ سلطان فتح شاہ پسر زادہ سلطان زین العابدین اور سلطان محمد شاہ ابن سلطان حسن بن سلطان حیدر ابن زین العابدین کے چار چار بار سلطنت پر فائز ہونے اور انقلابات کا مختصر بیان ان اوراق میں موجود ہے۔ ورق ۱۸۰ الف سے غازی خاں کا حال شروع ہوتا ہے۔ " اول کسے کہ از طبقہ چکاں بہ مرتبہ ارجمند فرماں فرمائی و تاجداری رسید غازی خاں بود "۔ اس طبقہ کا آخری بادشاہ یعقوب خاں ابن یوسف خاں تھا جو اپنی تمام کوششیں رائگاں جاتی دیکھ کر بالآخر " شعال جال " سے باہر آیا اور حسب الطلب شاہنشاہ اکبر حاضر ہو کر " جبین عبودیت بسجود کریاس فلک اساس روشن گردانید و جرائم او بزلال مکرمت خاقان گردوں مرتبت شست وشو یافت (ورق ۲۴۷ب) ورق ۲۴۷ میں اول مرتبہ مغلوں کا ذکر اس عبارت سے شروع ہوتا ہے " در سال نہصد و سی و ہفت میرزا کامران چغتائی با قریب سی ہزار سوار متوجہ تسخیر کشمیر گردید و بذات خود در شہرہ نزول آوردہ مرکب منصور را بہ سرکردگی محرم بیگ ... و با فتح علی بیگ بہ کشمیر تعین نمود و سرداران مذکور در آمدن نوعے عزم و احتیاط بکار بردند کہ تا وصول بحوالی کشمیر مرا خبردار نہ شدند ... در موضع آنہ چون تلاقی طرفین افتاد لشکر میرزا کامران شکست یافتہ طبل ارتحال کوفتند "۔ پھر کاشغریوں کا ذکر ہے۔ " در سال نہصد و سی و نہ[لہ] والی کاشغر سعید خاں با لشکر گراں بقصد کشمیر آمدہ خود در تبت رفتہ اقامت گشودہ پسر خود سکندر خاں را بہ سرکردگی مرزا حیدر با چہار دہ ہزار سوار جرار و بست و ہفت ہزار اسپ دیگر ... بہ کشمیر تعین نمود ... کاشغریاں کہ غلبہ از جانب کشمیریاں دیدند ... با امرائے کشمیر صلح کردند ... در اواخر ردی بہشت طبل ارتحال کوفتہ معاودت نمودند " (۲۴۷ الف ب) مرزا حیدر دوغلات کے متعلق جس نے تاریخ رشیدی اور کشمیر پر دس سال تک اپنا تسلط قائم

لہ راقم السطور نے کئی لغات کے اوراق الٹ ڈالے مگر فارسی لیچ خالی کا مفہوم عقدہ لاینحل رہا۔

(سہ اگلے صفحہ پر)

رگھا نرائن کول لکھتا ہے " درسال نہصد و چہل و ہفت مرزا حیدر کاشغری را کہ در ہندوستان ملازم خاقان جم جاہ ہمایون بادشاہ بود بادشاہ مزبور درحینیکہ بہ مقتضائے تصاریف ایام از دست شیر خان افغان کہ یکے[1] چاکر او بود آزردہ خاطر گشتہ متوجہ سیر ایران زمین بودند دراں وقت مرزا حیدر را از سعادت استیلائے رکاب دولت حرماں نصیب گردیدہ روبہ کشمیر آوردند . . . . و ملک را در حیطۂ تصرف آوردند . . . خطیب کشمیر مولانا جمال الدین محمد یوسف لفظ فتح مکرر تاریخ یافتہ چہ فتح اول با سکندر خاں کاشغری بودہ فتح ثانی این است (۷۰ الف ب) آگے چل کر رقمطراز ہے " الحاصل مرزا حیدر مدت دہ سال در انتظام ولایت کشمیر سعی بلیغ نمود (۷۰ الف) مرزا حیدر کے قتل - یوسف خاں چک کے دربار میں جانے - راجہ مان سنگھ صوبہ دار لاہور سے ساز باز کرنے - اکبر کے ارادۂ " تسخیر کشمیر " - یوسف خاں کے اپنے بیٹوں حیدر اور یعقوب خاں کو " بدرگاہ جہاں پناہ " بھیجنے - خاقاں ممالک شاہ کے پنجاہ ہزار سوار کو بہ سرکردگی راجہ بھگوان داس کے[2] کچھوا تسخیر کشمیر کے لیے روانہ کرنے کا تذکرہ کرنے کے بعد (۹۱ الف تا ۹۵ الف) یعقوب خاں جلد و ار " ذکر آمدن قاسم خاں میر بحر باقریب سی ہزار سوار از پیش گاہ بادشاہ جہاں " تتمۂ احوال یعقوب خاں " " ذکر آمدن مرزا یوسف خاں رضوی بہ کشمیر و شرح حالات و واقعاتی کہ دراں حسین رو نمود " " ذکر نہضت رایات جاہ و جلال خاقان بے ہمال جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ظل شاہ بہ گلگشت کشمیر جنت نظیر و شرح حالاتیکہ دراں حسین روئے نمود " " ذکر شورش یادگار مرزا و انطفائے نائرہ فتنہ و فساد و نہضت رایات اقبال بار دوم در آوان فصل خزاں بہ صوب کشمیر جنت نظیر یا فتن فتنہ جویاں " کے عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ملتے ہیں ورق ۱۱۰ ب میں " ذکر صوبہ داری کہ از ابتدائے تسخیر تا حالت تحریر بہ جہت محافظت و حراست و نظم و نسق ممالک کشمیر از پیشگاہ خلافت این سلسلہ علیہ سرفراز گردیدند " کی سرخی کے تحت اکبر سے عالمگیر

سے اس ضمن میں ملاحظہ ہو وہ فہرست جو مسٹر پنڈت نے اپنے تازہ ترین انگریزی ترجمہ راج ترنگنی کے آخر میں دی ہے ۔ مسٹر اسٹائن کی جلد اول میں بھی فہرست راجگان کشمیر دی ہے ۔

سے تاریخ فرشتہ میں دو مزید نام ہیں سلطان نازک بن ابراہیم اور سلطان حبیب بن نازک شاہ موخر الذکر کا نرائن کول نے ذکر تو کیا ہے لیکن زمرہ بادشاہان کشمیر میں سرخ روشنائی سے اسے داخل نہیں کیا ۔

سے فرشتہ نے تاریخ رشیدی کے حوالے سے کامران کے اس حملہ کا ذکر تو کیا لیکن سن نہیں دیا ہے فرشتہ کا بیان مختلف ہے شرح کیا گیا ہے ۔

کا مختصر ذکر ملتا ہے۔ قاسم خاں، مرزا یوسف خاں، محمد قلی خاں، قلیچ خاں۔ مرزا تقی اکبر شاہی۔ قاسم خاں۔ صفدر خاں۔ احمد بیگ خاں۔ دلاور خاں۔ ارادت خاں۔ اعتقاد خاں۔ خواجہ ابوالحسن ظفر خاں۔ علی مردان خاں۔ تربیت خاں۔ ظفر خاں (بار دوم) سلطان مراد بخش۔ حسن بیگ۔ علی مردان خاں (بار دوم) لشکر خاں۔ اعتماد خاں۔ ابراہیم خاں۔ اسلام خاں۔ سیف خاں۔ مبارز خاں۔ (لئے حکومت؟) قوام الدین خاں۔ ابراہیم خاں (بار دوم) حفیظ اللہ خاں۔ ابونصر خاں۔ ابراہیم خاں (مرتبہ ثالث) نوازش خاں سلطان محمد معظم۔ ابراہیم خاں بہ مخاطب علی مردان خاں (بار سوم) اس حصہ کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے "تا امروز کہ اوسط شعبان المعظم سنہ یکہزار و یکصد و بست و دو ہست عارف خاں دیوان صوبہ از دربار معلی نائب علی مردان خاں مزبور شدہ بود۔ قریب یک سال است کہ بکار نظم و نسق حفظ و حراست صوبہ می پردازد" خاتمہ کتاب "ذکر تعیین حدود دری و عجائب و غرائب کشمیر" پر مشتمل ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے مضامین کے مندرجہ بالا خلاصہ سے ہو سکتا ہے۔ تقریباً آدھی کتاب عہد عتیق اور راجگان ہنود کے لیے وقف کر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ورق پر تواریخ کشمیر مسمی بہ راج ترنگنی کی عبارت مرقوم ہے لیکن کلہن کی راج ترنگنی اور نرائن کول کی فہرست راجگان کشمیر اور بیانات پر ایک نظر ڈالنے سے چند باتیں دل میں خطور کرتی ہیں، اولاً اس ہندو کشمیری پنڈت سے اُمید کی جا سکتی تھی کہ سنسکرت ناموں کا صحیح تلفظ اس کی

سہ ملاحظہ ہو فرشتہ۔

سہ مغلوں کی جنبہ داری میں عاجز نے شیر شاہ سے انصاف نہیں کیا "آزردہ خاطر" ہو کر سیر ایران زمین کے لیے ہمایوں کا جانا بھی حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا سہ فرشتہ بھی لکھتا ہے کہ مرزا حیدر دوغلات اپنے تسلط کشمیر کے دسویں سال ۹۵۸ھ میں مارا گیا سہ بقول فرشتہ یوسف خاں اپنے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر دہلی پہنچا۔ اکبر کے حکم سے راجہ مان سنگھ اور سید یوسف خاں اسے لے کر فتح پور سے جانب کشمیر ۹۹۴ھ میں روانہ ہوئے۔ سہ فرشتہ لکھتا ہے کہ اکبر کا شروع سے ارادہ تھا کشمیر کی حرکات کو بہانہ قرار دیکر اسنے مرزا شاہرخ شاہ علی اور راجہ بھگوان داس کو اس غرض سے کشمیر کی جانب فوج کے ساتھ روانہ کیا سہ اس فہرست میں مرزا علی اکبر اور نواب افتخار خاں (قبل نواب قوام الدین) نواب فاضل خاں کا ذکر نہیں ہے۔

کتاب میں ملے گا اور بجائے حیدر ملک کے ترجمے کے اس کے بیانات اصل ماخذ سے تمام تر مطابقت رکھیں گے لیکن ادگر کند بجائے گونندا۔ کلیندر بجائے گہگندر ہمگن بجائے وی سی سشن ہیرادن بجائے رادن زیباجید بجائے وجرادیت وغیرہ کی ترکیبیں کھٹکتی ہیں۔ بعینہ یہ ہی تلفظ حیدر ملک کی کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ فارسی کتابت ان مسخ شدہ ناموں کی ذمہ دار ہے تو امر دیگر یعنی کلہن و نرائن کول کی فہرست و بیانات میں اختلاف کی کیا توجیہہ کی جائے گی۔ مثلاً مؤخر الذکر راجہ دمودر ابن راجہ ادگر کند (گونندا) کے بعد لکھتا ہے "سری کرشن حکومت کشمیر بہ رانی جیوتی زن راجہ دمودر کہ حاملہ بود ارزانی داشت رانی جیوتی بعد انقضائے مدت حمل راجہ دیال کند نام پسرے آورد چوں راجہ دیال کند بحد بلوغ رسید بست وکشاد امور مملکت داری متعلق برائے ورووئت او گردید راجہ دیال کند دست نوال بہ بذل نقود اموال برکشاد و اساس رعیت پروری و معدلت گستری بر وفق مدام خاطر نماد درازی حکومتش اندک فرصتے بود"۔ قریب قریب یہی مضمون حیدر ملک کی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ "کرشن مذکور حکومت ملک کشمیر را برائے جیوتی زن دمودر تفویض نمود او حاملہ بود بعد از انقضائے مدت مقرر پسرے آورد۔ راجہ دیال کند نام رعایا باد زیر دستاں سلوک خوب کرد و مدت سلطنت اندک زمانے بود۔ کلہن پنڈت کے متعلقہ اشلوکوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے" تب کرشن جدوبنسی نے بادشاہ کی حاملہ بیوہ جسودتی کو برہمنوں کے ذریعہ تخت نشین کرایا ...... مناسب مہینہ میں رانی کو ایک لڑکا ہوا جس نے اپنے دادا کا نام گونندا پایا ...... راجہ کشمیر کی صغر سنی کے باعث نہ تو کوروؤں نے نہ پانڈوؤں نے اس سے امداد طلب کی" (۱۔ اشلوک ۷۰۔۷۴۔۸۲) علاوہ ناموں کے اختلاف کے اصل راج ترنگنی میں رانی جسودتی کے بیٹے کے عدل وداد و رعیت پروری کا کہیں ذکر نہیں "حد بلوغ کا فقرہ" "معدلت گستری" کی طرح اضافہ ہے۔ اشلوک ۸۳ میں مرقوم ہے "۳۵ راجگان اس کے بعد (گونندا دوم نا دیال کند) آئے لیکن یہ قعر گمنامی میں پڑ گئے۔ ان کے نام اور کارہائے نمایاں دفاتر کی بربادی کے باعث مفقود ہو گئے" ان ۳۵ راجگان کی طرف نہ تو نرائن کول نے کوئی اشارہ کیا ہے نہ حیدر ملک کچھ کہتا ہے۔ مؤخر الذکر لکھتا ہے "بعد از دے (دیال کند) راجہ لو نامی حاکم ایں مملکت شد"

نرائن کول تحریر کرتا ہے "راجہ لو از قبیلہ لو در میدان دولت تنگ و دو نمودہ گوئے دولت بچوگان ہمت ازمیان ربود" اسی طرح عاجز و ملک کی تالیفات میں راجہ بھکن ابن گوپی چند کے بعد راجہ اندرجیت ابن بھکن راجہ ہیراون ابن راجہ اندرجیت راجہ بھکن ابن راجہ ہیراون راجہ اندر ابن راجہ ہیراون راجہ اندر ابن راجہ سنکن راجہ نیر برادر راجہ اندر کی ترتیب ملتی ہے حالانکہ کلہن نے گوپی چند کا نام گونندا سیوم قرار دیا ہے اور اس کے بعد اس کے بیٹے وی بی شن اول پھر اس کے بیٹے راون بعدازاں وی بی شن دوم اور اس کے بیٹے نر کا ذکر کرتا ہے۔ کلہن کی فہرست میں راجہ اندر ابن راجہ راجہ سکن ماوی بہی شن دوم کا وجود نہیں پایا جاتا اس قسم کی اور مثالیں ڈھونڈھنے سے مل سکتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا کہ باوجود ادعائے وقوف نرائن کول نے اکثر بجائے اصل ماخذ کے حیدر ملک کے ترجمے سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ ثالثاً نرائن کول اور حیدر ملک نے بعض ایسے نامور راجاؤں کے حالات پر محض ایک چھچھلتی نظر ڈالی ہے جنکے متعلق اصل سنسکرت تاریخ سے بہت معلومات بہم پہنچتے ہیں۔ مثلاً کلہن کی راج ترنگنی میں جے سنگ ابن شوشل یعنی دوسرے لوہر خاندان کے آخری عظیم المرتبت فرمانروا کے متعلق دو ہزار ستاون اشلوک پائے جاتے ہیں لیکن نرائن کول نے ۱۵" اور حیدر ملک نے ۱۲ سطریں اس راجہ کے لئے کافی سمجھیں۔ رابعاً کلہن کی طرح حیدر ملک نے راجگان ہنود کے مختلف خاندانوں کے نام نہیں گنائے۔ خامساً مدت سلطنت میں بھی کہیں کہیں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ الغرض باوجودیکہ نرائن کول عاجز حیدر ملک کی تاریخ کی منقصت کرتا ہے "اس کی ہرزہ سرائی دیانہ درائی" "عدم سرمایہ دانش" کا مضحکہ اڑاتے ہیں پس و پیش نہیں کرتا لیکن اس کی کتاب بحیثیت مجموعی حیدر ملک کی کتاب کے خلاصہ کا حکم رکھتی ہے۔ کہیں کہیں قابل قدر اختلافات ہیں لیکن حیدر ملک کی طرح بجائے ہندی سنوات کے ہجری سال دیتا ہے جہاں جہاں حیدر ملک نے اختصار سے کام لیا ہے یہ بھی مختصر اشارات پر اکتفا کرتا ہے۔ اگرچہ کہ حیدر ملک کے برعکس یہ اپنے خاندان کا ذکر مطلقاً نہیں کرتا اس کی کتاب بھی بعض دور از قیاس باتوں سے خالی نہیں مگر اس میں اسلامی تاریخ سے قصص و حکایات کی بھرمار نہیں کرتا۔ عہد جہانگیر تک اس کی کتاب اور حیدر ملک کی کتاب میں بہت زیادہ

مطابقت پائی جاتی ہے البتہ بعد کے واقعات کے لیے اس کی کتاب کسی حد تک ماخذ کا حکم رکھتی ہے۔ مگر یہ حصہ جسے زیادہ تفصیلی ہونا چاہیے تھا تشنہ ہے۔ باوجود ان خصوصیات کے نرائن کول کی تاریخ کے چند مابہ الامتیاز محاسن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی اس میں حشو و زوائد نہیں ملتے۔ کول کا بیان شگفتہ صاف، سلجھا ہوا اور مربوط و مسلسل ہے کئی اعتبار سے اس کی کتاب کا تاریخی پایہ حیدر ملک کی کتاب سے زیادہ بلند ہے اکثر مقامات پر اس نے حیدر ملک سے صحیح طور پر اختلاف کیا ہے۔ اس عہد کی دستیاب شدہ فارسی تاریخوں میں فہرست راجگان و سلاطین و صوبیداران اس کے ایسی مکمل اور قابل اعتبار نہیں۔ اس نے تاریخ رشیدی، ظفرنامہ اور ابوالفضل کے اکبرنامہ اور ملا نویدی کی تاریخ سے استفادہ کیا ہے۔ ظفرنامہ کی ایک عبارت نقل کی ہے۔ اہل تسنن و اہل تشیع کے قضیوں سے اسے قطعاً واسطہ نہیں یہ ہندو مورخ مسلمان سلاطین اور صوفیائے کرام کا باحترام تذکرہ کرتا ہے۔ اس نے آج کل کے مورخین کی طرح نہ تو سکندر کی بیجا منقبت کی ہے نہ زین العابدین کی از حد تعریف! اس کی تحریر مذہبی عصبیت کی غمازی نہیں کرتی۔

---

[۲]

(۴) تاریخ کشمیر* مصنفہ حیدر ملک چادرورہ جس کا ذکر کئی جگہ اوپر آچکا ہے بہت کمیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ راقم السطور کو دیوان محلہ شہر پٹنہ میں بابو گیا پرشاد سکسینہ کے کرم خوردہ ذخیرہ مخطوطات میں ملا اور ایک جلد میں تین کتابیں ہیں۔ اولین ۹۲ اوراق اسی نسخے کے ہیں۔ کاتب و مصحح کے نام گنپت رائے وزیر علی ہیں۔ ۳ اپریل ۱۸۳۳ء مطابق ۹ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ ہجری تاریخ کتابت مندرج ہے۔ خط نہایت صاف اور نستعلیق ہے چند مقامات پر کیڑوں نے عبارت غائب کردی ہے۔ نسخہ تو مکمل معلوم ہوتا ہے لیکن برٹش میوزیم لندن کے نسخوں کی تعداد اوراق دو سو سے زیادہ ہے۔ ڈاکٹر ریو کے مختصر تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض چیزیں جو لندن کے نسخوں میں موجود ہیں اُن سے پیش نظر نسخہ خالی ہے مثلاً فتح کشتوار کا مکمل بیان اس میں نہیں پایا جاتا۔ مصنف کے متعلق چند باتیں ڈاکٹر ریو نے لندن کے نسخوں کے حوالہ سے بتلائی ہیں

---

* معاصر، جولائی اگست ۱۹۴۳ء

۵ ایک مشگون نامہ مصنفہ کلیان سنگھ دوسرا حکیم تاجور بہاشکر جارج کا "درحکمت و ریاضی بے نظیر بود" کی علمی حساب و مسافت پر مشہور کتاب لیلاوتی کا ترجمہ ہے۔ جسے بسال نہصد و نود و پنج کہ موجب حکم عالی سلطان عادل و برہان کامل شہنشاہ اکبر علامہ ابو الفیض فیضی نے فارسی جامہ پہنایا۔ دمبر سن کتابت ۱۱۱۵ مندرج ہے۔

ہمیں اس نسخہ میں نہیں ملتیں ۔ ہو سکتا ہے کہ جس نسخے سے اس کی نقل لی گئی مکمل نہ ہو ''صحیح نمودہ داخل کتبخانہ سرکار والاشد'' کی عبارت جو آخری صفحے میں پائی جاتی ہے کہتی ہے کہ پٹنہ میں کوئی دوسرا نسخہ بھی تھا جو اب مفقود ہے ۔ دیباچہ کی عبارت ایک رباعی کے بعد اس فقرے سے شروع ہوتی ہے ''سپاس و ثنائے کرامت اساس مالک الملکے راسزاست'' آگے چل کر مصنف اپنا تعارف کرتا ہے اور تاریخ تصنیف و سبب تصنیف کے متعلق لکھتا ہے'' در ۱۰۲۷ھ مطابق سنہ دوازدہم جلوس خدیو سریر آرائے سلطنت . . . ابو المظفر جہانگیر بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ کمترین خلائق حیدر ملک ابن حسن ملک ابن عالی جناب . . . . عمدۂ ارباب جاہ و جلال . . . . برحمۃ اللہ راجی الملقب بکمال الدین محمد ناجی چادر ورد کہ از اخفاد چند ان است میخواست احوال آباء و اجداد خود را کہ ہمہ وقت اہل شوکت و حشمت بودہ اند معلوم کند کہ در چہ وقت وارد و در عہد کدام راجہ جابر بضا ولیف ایام بہ کشمیر آمدہ اند لہٰذا نسخہ تاریخ کشمیر کہ آں را باصلاح دانایان کشمیر کہ چند تاں اند آنرا راز ترنگ نامند آوردہ بتوالہ فقیر ملا محمد حسین نمودند کہ احوال ایشاں را و سائر سلاطین و ارباب دولت و امرائے ملک کشمیر . . . . بہ سلک تحریر در آوردہ و مشروحاً ترجمہ نماید تا آثار آن از صفحات روزگار محو نگردد و حیدر ملک نے یہ کتاب ۱۰۲۷ھ میں شروع کی مگر دو تین سال میں اسے اتمام کو پہنچایا ورق ۸۵/ب میں لکھتا ہے'' الحال کہ سنہ چہاردہم جلوس مبارک جہانگیری است ۱۰۲۹ھ میں کشتوار کے مفتوح ہونے کی خبر دیتا ہے ترک سے ۱۰۲۹ھ اس فتح کی تاریخ ملتی ہے ۔ اس نسخے میں کسی جگہ ابواب و حصص کتاب کی سرخ یا جلی روشنائی سے تفریق و تعین نہیں کی گئی ہے۔ آخر میں البتہ مصنف نے دو قسموں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ پہلی قسم میں ''سوانح و وقائع خود'' اور قسم دوم میں عجائب و غرائب کشمیر و مشائخ دیار کشمیر اس نے شامل کئے'' اس نے اپنے حالات کسی ایک جگہ مفصل طور پر نہیں لکھے جابجا اشارات کئے ہیں اپنے بزرگوں کے حالات مختلف مقامات پر کافی شرح و بسط سے اس نے تحریر کئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا مقصود اصلی یہی تھا کہ اپنے خاندان کے نمود افراد کو اس کتاب کے ذریعے سے منظر عام پر لائے اور دکھائے کہ انھوں نے تاریخ کشمیر میں نمایاں حیثیت حاصل کی تھی ۔ بعد کے فارسی مورخین نے حیدر ملک کی

کتاب سے حوالے دئے ہیں۔ اس کے تتبع ہیں کتابیں لکھیں نرائن کول نے اس کتاب کا خلاصہ پیش کیا مگر سب نے حیدر کے خاندانی حالات کو درخور اعتنا نہ سمجھا چونکہ حیدر ملک کی تاریخ نہایت کمیاب اور عسیر الحصول ہے۔ کم ازکم ہندوستان کے کتب خانوں کی فہرست میں اس کا نام نہیں ملتا اور دوسری کتابوں سے اس کے بزرگوں کے حالات اور فرمانروایان کشمیر سے ان کے تعلقات پر روشنی نہیں پڑتی نامناسب نہ ہوگا اگر قبل اس کے کہ ہم اس نسخے کی خصوصیات پر ایک اجمالی نظر ڈالیں ان حضرات کے متعلق جو کچھ مصنف نے لکھا ہے اس کا خلاصہ پیش کر کے دوسرے ذرائع کی روشنی میں جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہاں تک اس کا بیان مبالغہ آمیز غلط یا قابل قبول ہے۔

"ملک حیدر[1] زابنائے سلاطین" اپنے اور اپنے بزرگوں کے نام کے آخر میں چاردرہ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس لفظ کی مورخین نے مختلف شکلیں دی ہیں ہم جہانگیر کا اتباع کر کے اسے چاردرہ قرار دیتے ہیں اس نام کا ایک موضع سری نگر کے دس[2] میل جنوب ناگام پرگنہ میں واقع ہے۔ جہانگیر تزک[3] میں حیدر ملک اور اس کے بھائی علی ملک کے نام لیتا ہے اور ان کے وطن چہاردرہ کی جہاں بقصد شکار کبک منزل گزیں ہوا تھا تعریف کرتا ہے۔ حیدر اپنا سلسلہ نسب راجپوت راجگان کانگڑہ نگرکوٹ سے جس کا قدیم نام تریگارت تھا ملاتا ہے یہ لوگ خود کو راجہ رام چندر جی کی نسل

---

[1] مسجد جامع وخانقاہ کرامت دستگاہ حق شناس حقیقت اساس شیخ شمس الدین محمد عراقی کی جسے پسران شمس الدین چک نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا حیدر ملک نے از سر نو تعمیر کی۔ "تاریخ اتمام آن خانقاہ راشاہ چنیں یافتہ۔ ملک حیدر زابنائے سلاطین۔ بہ عہد شاہ نورالدین جہانگیر تاریخش سروش غیب گفتا۔ دوبارہ خانقہ راکرد تعمیر (۱۰۳۶ھ) " تاریخ صحیح نہیں معلوم ہوتی ۱۱۲۵ کا نصف جہانگیر کے زمانے کی خبر نہیں دیتا۔

[2] راج ترنگنی مترجمہ سراوریل اشائین جلد ۲۔

[3] تزک جہانگیری کی مخطوطہ کھجوہ لائبریری ۵۲۳/۱ ۵۳۶/ب علی ملک کشمیری کا ذکر تسخیر کشتوار کے سلسلہ میں آیا ہے۔ شہنشاہ حسب التماس مصنف موضع چہاردرہ "کہ وطن حیدر ملک وسرزمین خوشی وسیرگاہ دلکشے است" نورپور نام رکھا یہ نام اس خصوصیت کی خبر دیتا ہے جو ہمارے مصنف کو نورجہاں سے حاصل تھا۔

بتاتے ہیں اُن کے نام کے آخر بقول اشٹائن چند کا لفظ پایا جاتا ہے۔ حیدر بار بار اپنے بزرگوں کے متعلق "از نسل چنداں است" کی تکرار کرتا ہے۔ اس کے خاندان میں براؤن چند پسر رام چند سپہ سالار راجہ سہدیو پہلا شخص تھا جسے رینچو یعنی سلطان صدر الدین نے زینہ یا ملک کا خطاب دیا تا ایں زمان لقب طائفہ ملک است ہم چنانکہ پیشتر چند بود" ورق ۲۳ ب میں حیدر ملک لکھتا ہے کہ راجہ نگر کوٹ نے اپنے پرتھی چند کو دُت پال خاندان کے فرمانروا شنکر ورما کی خدمت میں بطور یرغمال بھیجا "چوں آثار بزرگی و فرزانگی در ناصیہ احوال آں پسر مشاہدہ نمود در تربیت او کوشید ۔۔۔۔ روز بروز کوکب اقبال او اوج گرفت تا آنکہ راجہ او را بفرزندی قبول نمودہ دختر خود ملتا دیبی را نامزد او گردانید و ایں پرتھی چند جد اعلیٰ راقم ایں نسخہ فقیر حیدر ملک چغتائیست چنانچہ تاحال ہم در القاب فقیر حقیر و راجہائے جمو و کشتوار وغیرہ چند جلوہ گر است وقتے کہ بادشاہ جمجاہ کیواں بارگاہ ۔۔۔ نورالدین جہانگیر بواسطہ شکار در سرکار جموں[1] نزول فرمود ندا ز بندگان استفسار ایں معنی بزبان الہام ترجمان رفت حقیقت واقعی از اقوال اسلاف خود معروض مسامع جاہ و جلال مشروحاً گردانیدہ از راہ کمال نوازش تیغ یک دام از سرکار مذکور در وجہ انعام بندہ مرحمت فرمودند ۔۔۔۔ مدت حکومت راجہ (شنکر) ورما خسرو پرتھی چند ہفدہ سال بود چوں از راجہ وارث دیگر نماند پرتھی چند در سنہ[2] ۳۰۴ ہجری بتدبیر و مشورہ پیر مہا گرزیو وزیر بامر سلطنت پرداخت ۔۔۔ مدت حکومت دو سال بود ۔۔۔ در ۳۰۶ رخت بسرائے دیگر کشید چوں از وی یک پسر تارا چند نام کہ رفیع بود وارث نماند راجہ گوپال برادر راجہ ورما بہ سریر جہانداری مستقر گردید و دو روز (۲) حکومت کرد و گذشت۔ رانی سگندھا مادر راجہ گوپال ورما متکفل امر سلطنت شد"

---

[1] جہانگیر تزوک میں لکھتا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں یہ دربار دیار کشمیر میں وارد ہوا۔ بقول نرائن کول اپنے عہد میں جہانگیر نے چار مرتبہ کشمیر کا سفر کیا اول مرتبہ سال یازدہم جلوس یعنی ۱۰۲۵ھ مرتبہ دوم در سال ہفدہم جلوس مطابق ۱۰۳۱ھ ہجری لیکن جہانگیر تزک میں جلوس سال دوم اور یازدہم جلوس میں اپنا کشمیر جانا بیان کرتا ہے [2] حیدر ملک نے ہندی سنین کو ہجری سنین میں تبدیل کر کے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ یہی غلطی نرائن کول سے بھی سرزد ہوئی ہے۔

جکمنی پنڈت کی راج ترنگنی میں اُت پال خاندان کے فرمانرواؤں کے تفصیلی واقعات موجود ہیں۔ شامکر ورما پسر اونتی ورما نے ۱۸ یا ۱۹ سال حکومت کی اس کا دائرہ فتوحات وسیع تھا جب تریگارت[1] (نگر کوٹ یا کوٹ کانگڑہ) کی طرف بڑھا اس کے حاکم پرتھی چند نے بقول جکمنی اپنے بیٹے بھونا چند کو راجہ کشمیر کے پاس بطور یرغمال بھیجا۔ کس پرتھی چند کے راجہ کشمیر یا داماد و جانشین راجہ ورما ہونے کا ذکر اصل راج ترنگنی میں نہیں ملتا سگندھا شامکر ورما کی رانی تھی پربھاکر دیو وزیر سے اس کے ناجائز تعلقات اور عارضی حکومت کا بیان کلہن کی کتابوں میں موجود ہے' گوپال ورما اسی رانی کے بطن سے تھا اس لئے یہ شامکر ورما کا بھائی نہیں بیٹا تھا۔ خورد سالی میں اس کی جانشینی کا اعلان ہوا دو روز نہیں بلکہ دو سال کے بعد انتقال کر گیا اور اس کا بھائی شانکٹ[2] جس کے شامکر ورما کا بھائی ہونے میں شبہ تھا تخت پر بٹھلایا گیا اور تین چار روز میں مر گیا۔ لہٰذا یہ بھی غلط ہے کہ شامکر ورما کا کوئی وارث نہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حیدر ملک کی روایت کا ماخذ[3] کیا ہے خاندانی روایات کو اہمیت دی جا سکتی ہے بشرطیکہ مسلمہ تاریخی واقعات میں ان کی کھپت ہو سکے مثال میں لگ چندر اور اس کے اخلاف کے متعلق جو کچھ مصنف نے لکھا ہے پیش کیا جا سکتا ہے "لگ چند کہ از نسل پرتھی چند سابق احوال آوردن او از نگر کوٹ مذکور شد بود و حکومت بر دو بست باد مقرر بود۔" لگ چند نے راجہ اچل کے قتل کا انتقام لیا۔ غاصب سلطنت اور (ردا) کو بہ عقوبت تمام قتل کیا بعد ازاں راجہ سلہن برادر خورد (علاقی) راجہ اُچل با ستصواب لگ چند مذکور بر تخت نشست چوں از اصلاح قابلیت سلطنت

---

[1] ملاحظہ ہو راج ترنگنی میں سراورل اسٹائن کا نوٹ جلد اول۔

[2] نرائن کول نے سانکت ورما کے دورِ حکومت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[3] حیدر نے علاوہ کلہن پنڈت کی راجہ ترنگ کے دو ایک اور تاریخ راجہائے کشمیر کا ذکر کیا ہے۔ "کلہن نام دانشورے بزبان ہندی ماثر واقعات راجہا پرداخت" بقول نرائن کول "آغاز تاریخ از ابتدائے سلطنت راجہ اوکند کہ معاصر پانڈواں و انجام بہ سلطنت راجہ جے سنگھ رساند" دوسری کتاب "در عہد زین العابدین ملا احمد... نام برہمنے تاریخ شہنامہ را برائے راجہ تصنیف کردہ"

نداشت اعیان وسرداران گگ چندرا بہ سلطنت برداشتند" لیکن "پیش از آنکہ گگ چند بر سلطنت بر سد [illegible]" بہ راجہ سُسّل (سوسیل) برادر راجل را کہ قلعہ دار لوہر کوٹ بود نامہ بتضمن اشعار تفویض سلطنت نوشت طلب کرد" سلہن مقید اور سُسّل تخت نشیں ہوا "چوں کہ سُسّل از گگ چند امین نہ بود او را اخراج نمود۔ گگ چند نے راجہ اُچل کے ایک گمنام بیٹے کو پنجاب سے بر آمد کیا اس کی حمایت کی راجہ سُسّل کی آتش غضب بھڑک اٹھی لیکن اس نے بہ مصلحت حکمت عملی سے کام لیا گگ چند را بہ بہانہ ضیافت بخانہ بردہ باد و پسر بقتل رسانند۔ گگ چند کلہن راج ترنگنی کا گگر چندر[۵] ہے۔ کلہن نے گگر چندر کی راجہ اُچل کے دشمنوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں سلہن کی حمایت اسے تخت پر بٹھانے لیکن سُسّل سے ساز باز اس کی تخت نشینی کے بعد اس سے بگاڑ، اُچل کے بیٹے کی طرفداری اقدار اور بالآخر راجہ سُسّل کے ہاتھوں مقید ہونے اور بیٹوں کے ساتھ قتل کئے جانے کے واقعات کی تفصیل دی ہے جزوی اختلافات یہی ہیں جنہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کلہن گگر چندر کو بادشاہ گر کی حیثیت دیتا ہے۔ اُس کے ایثار کی تعریف کی ہے کیونکہ باوجود اقتدار اور تاج و تخت کے پیش کئے جانے کے اس نے اپنے لئے راجگی پسند نہیں کی۔ یہاں حیدر ملک نے مبالغہ سے کام لیا ہے اس لیے کہ گگ چند کی مدت سلطنت ایک سال قرار دیتا ہے۔

اب ہم دس ورق میں پھیلے ہوئے بیانات کو سمیٹ کر نذر ناظرین کرتے ہیں تاکہ حیدر ملک کی کتاب کے حسن و قبح اور اس کے بیانات کی حقیقت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو سکے۔ ہمارا مصنف راجہ ین مودیو کے عہد میں اپنے ایک دوسرے بزرگ کا ذکر کرتا ہے "در زمان او ملچند کہ از نسل پرتھی چند راجہ نگر کوٹ بود خدمتے چند تقدیم رسانید کہ بر صفحہ روزگار مرتسم است" ملچند کی شجاعت و جلادت اور تیز ہوشی کی تعریف کی ہے۔ اس کے حملہ اور ترکوں کے لشکر میں بے باکانہ جانے اور اس بلا کو حکمت عملی سے ٹالنے کا ذکر کیا ہے لکھتا ہے۔ "ذی دیو ۲۶ سال حکومت کر کے مر گیا" "چوں پسرش بری مات خورد سال بود، اعیان التماس قبول امر سلطنت بہ ملچند نمودند او ہم بہ مصلحت کہ اگر قبول

---

۵ ملاحظہ ہو راج ترنگنی مترجمہ اسٹائن جلد اول ص ۱۱۹ جلد دوم

نکند اساس مملکت خلل نپذیرد سر رضا جنبانید باین شرط کہ چوں پری مات بر سر حد تیز بر سد سلطنت را باو وا گذارد ... قدرت و شوکت راجہ ملچند دراں وقت بہ مرتبہ ای بود کہ ہیچ کس مملکت را از تصرف او بیروں نتوانست کرد اما برائے اداے حقوق نعمت قدیم سلطنت باد (پری مات) مسلم داشت ... راجہ نے اپنی سفاہت و بے عقلی سے قدر ہمراہی و خدمت ملچند ندانستہ بر خلاف رائے او ظلم و جور و عدوان پیشہ ساخت و در مقام جمع مال بود از وضع او ملچند آزردہ خاطر گشتہ دست از کار و بار او کشید دراں اثنا آفتاب عمر ملچند بغروب رسید"۔ ملچند ۱۱ سال تک بر سر اقتدار رہا پری مات ۹ سال تک حکومت کر کے دنیا سے چل بسا۔ دمتہ دیو اس کا بیٹا ۸ سال ۶ ماہ تخت نشیں رہا اس کے بعد احمق و سفیہ بویہ دیو نے ۹ سال تک کسی صورت سے حکومت کی پھر اس کے بیٹے رتہ دیو کو اعیان سلطنت نے تخت پر بٹھایا ۱۸ سال کے بعد یہ بھی راہی ملک بقا ہوا اس کے بعد" جگدیو کہ یکے بنی اعمال راجہ مذکور بود بامر حکومت پرداخت "۱۴ سال کے بعد اس نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا اور اس کا بیٹا رازہ دیو باراجدیو بر سریر خالی نشست" اس راجہ نے بقول حیدر ملک و نرائن کول "گک چند ابن ملچند را بدستور آبا و اجداد او سپہ سالار عسکر اخلاص" آثار نمود" اس نے طائفہ لون کی قرار واقعی تنبیہ کی گگنہ گیر میں قلعہ بنایا جو حیدر ملک کے زمانہ میں بدستور قائم تھا۔ اس گک چند کے مرنے کے بعد راجہ رازہ دیو نے اس کے بیٹے بلھادچند سے کہ صاحب ثروت و سامان بسیار بود "بے التفاتی برتی امرا بھی اس کی حرکتوں سے ناراض ہو گئے انھوں نے بلادچند کی قیادت میں بغاوت کی اور راجہ اخراج نمودند بقول حیدر ملک بلھادچند بست و سہ سال سلطنت کرد" راجہ رازہ دیو کے بعد اس کا بیٹا سنگرام دیو راجہ ہوا اس کے بھائی سورج نے بغاوت کی سنگرام چند ابن بلادچند اور بلاد شمالی کے ایک حاکم تلک یا تونگ سے اتفاق کیا۔ سورج تو مارا گیا تلک کا ملک بھی غارت کیا گیا لیکن سنگرام چند نے ڈانگر لوں کے ہنگاموں سے فائدہ اٹھایا' راجہ نے اس سے صلح کر لی۔ نوازش فرمودہ رعایتہا کرد راجہ ۱۶ سال حکومت کر کے مر گیا۔ اس کا بیٹا رامدیو راجہ ہوا بقول حیدر ملک ایک سال اور بقول نرائن کول دس برس ایک ماہ سلطنت کی۔ اس کے پسر متبنٰی لچھمن دیو نے جو برہمن زادہ تھا ۱۳ سال تک اس کی جانشینی کی لیکن اس کا دور ظلم و جور پر مبنی تھا رام چند ابن سنگرام چند نے امرا سے اتفاق کر کے اس کا کام تمام کیا اور اس کی جگہ سمہ دیو

کو تخت سلطنت پر بیٹھایا اس کے جانشیں سوہدیو کی نوزدہ سالہ حکومت میں شاہ میر ابن وفورشاہ
کشمیر میں وارد ہوئے۔ زلجو نام ترک نے حملہ کیا لنگر چک مکان اور رینچو بینی کشمیر میں وارد ہوئے
رام چند راہن سنگرام چند جو راجہ کا سپہ سالار تھا۔ قلعہ گگنہ گیر میں آٹھ مہینہ ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن
ترکوں نے کشمیر پر بڑی مصیبت ڈھائی رام چندر نے رینچو بینی پسر تعتین کے ساتھ رعایتیں کیں جاگیر
دلوائی لیکن اس متبنیٰ نے احسان فراموشی کی اپنے محسن کے قلعہ پر حملہ سے متصرف ہو گیا اور رفتہ رفتہ سارے
ملک پر محیط ہو گیا چوں بقائے ملک و پایندگی مملکت بتالیف قلوب دانستہ است بنابراں بار اون چند
پسر رام چند بنائے عہد و سوگند استوار نمود خواہر او کوتہ رانی را در عقد آوردہ و بطریق پدر حکومت مر دو تبت
با و مسلم داشت اس نے راون چند کو ملک یازینہ کا خطاب دیا۔ چند کے بجائے حیدر ملک کے بزرگوں
کا لقب ملک یازینہ پڑ گیا۔ بابا مبل داس کے دست حق پرست پر رینچو اور راون چند ایمان لائے۔
اوار سیکہ بہ عروۃ الوثقیٰ دین حق پرست دست اعتقاد و ارادت زد ملک راون چند بود چوں از رینچو
غیر از یک پسر کہ رضیع بود وارث نماند بس کوتہ رانی (خواہر راون چند) با مر حکومت پرداخت" کوتہ رانی
نے۔ رن چند اور شاہ میر کی مدد سے اوراں نامی ایک ترک حملہ آور کا مقابلہ کیا چوں ایں مہم بیشتر بسعی
و اہتمام شاہ میر مرتب پذیرفت صولت و سطوت از در دلہا متمکن گشت" شاہ میر نے کوتہ رانی پر غلبہ حاصل
اسے قلعہ اندر کوٹ میں کچھ دنوں نظر بند رکھا اور پھر نکاح کا پیغام دیا۔ رانی ازیں معنی نظر بر عار کہ مدت با
شاہ میر نوازش بود امتناع نمود و خود را کشت بتاریخ ہفت صد و چہل و دو مملکت کشمیر بہ شاہ کہ بہ شمس
الدین ملقب شد مقرر گشت" (ورق ۴۲-۴۳)

کلہن پنڈت کی کتاب راجہ جے سنگھ کے عہد پر تمام ہو جاتی ہے۔ جونا راجہ اور اس کے
شاگردوں نے راج ترنگنی کا ضمیمہ اور تتمہ لکھا۔ اس تتمہ کے اقتباسات انگریزی[1] مورخین نے پیش
کئے ہیں۔ ان سے مندرجہ بالا واقعات کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے۔ ضمیمہ راج ترنگنی میں

---

[1] پروفیسر ایچ۔ سی رائے کی کتاب شمالی ھند کے سلاطین کی تاریخ راقم السطور
کے پیش نظر ہے ان کا وہ باب ملاحظہ ہو جو راجگان کشمیر کے متعلق ہے۔

راجہ ذی کمھ دیو کا ذکر جسے حیدر ملک اور اس کا تتبع نرائن کول راجہ جے سنگھ کے بعد لاتے ہیں
مفقود ہے۔ ابوالفضل[1] کی فہرست میں بھی ذی کمھ دیو کا نام نہیں ملتا۔ کشمیر کے متاخرین راجاؤں میں صرف
جے سنگھ کی مدت سلطنت ۲۶ یا ۲۷ سال بتائی گئی ہے۔ ۱۱۵۴ یا ۱۱۵۵ میں یہ مرا۔ آخر زمانہ میں
اس سے اور ترکوں سے جنگ ہوئی۔ حیدر ملک جے سنگھ کے پسر رفیع گلہانہ کا جسے باپ نے اپنے
زمانہ میں ہی تخت نشین کر دیا تھا کوئی ذکر نہیں کرتا جونا راجہ نے گلہانہ کے بعد جے سنگھ کے دوسرے بیٹے
پری مانک کی راجگی کا تذکرہ کیا ہے۔ پری انک اور پری مات دراصل ایک شخص تھا۔ اس کی مدت حکومت
۹ سال ۶ ماہ ۱۰ روز بتائی گئی ہے اور اس کے بعد اس کے بیٹے ونتی دیو کا مورخین کشمیر نے ذکر کیا ہے
جس نے ۷ یا ۸ سال حکومت کی لہٰذا شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ذی کمھ دیو اور جے سنگھ دراصل ایک ہی
شخص کے نام ہیں۔ حیدر ملک اور نرائن کول نے خلط مبحث کر دیا ہے بوبہ دیو ونتی دیو کے بعد راجہ
ہوا ۹ سال تک حکومت کی۔ رسہ دیو دراصل جسہ دیو کا نام ہے اس کے بعد جونا راجہ کی فہرست میں
جگدیو راجدیو سنگرام دیو رامدیو اور لچھمن دیو کے نام ملتے ہیں، ایام حکومت میں کہیں کہیں اختلاف ہے
سمھ دیو بوحدیو ریخچو یار ریخچن تبتی (سلطان صدر الدین) کوٹہ رانی اور شاہ میر کی ترتیب بھی درست
ہے لیکن حیدر ملک نے اودین دیو کا ذکر نہیں کیا جو ریخچن یا ریخچو کے بعد راجہ کشمیر ہوا نرائن کول کی
اس فروگذاشت سے خالی ہے۔ اب رہا ملچند اور اس کے اخلاف کے متعلق حیدر ملک کا بیان
افسوس ہے کہ جونا راجہ کا انگریزی ترجمہ ہمیں نہیں ملا انگریزی مورخین نے محض اشارات سے کام لیا ہے۔
کوئی تفصیلی تاریخ کشمیر نہیں لکھی معلوم نہیں اصل اور مکمل نسخے میں ملچند کا ذکر ملتا ہے یا نہیں نرائن کول ملچند
ملچند بلاد چند سنگرام چند اور راون چند کا ذکر کیا ہے اعظم بھی بلاد چند ملچند و رامچند کے نام لیتا ہے لیکن
ان کی کتاب حیدر ملک کی تاریخ سے ماخوذ ہے، صاحب صبح صادق[2] نے جو جہانگیر و شاہجہان کا ہمعصر
راون چند کا ذکر کیا ہے۔ حیدر ملک کے ان بزرگوں کی شخصیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر حیدر

---

[1] آئین اکبری۔ مترجمہ جیرٹ جلد دوم
[2] مخطوطہ کتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ

کا دعویٰ کہ خدمات ملچند بر صفحہ روزگار مرتسم است درخور اعتنا نہیں بلاوچند حاکم لاہر کا ذکر البتہ جوناراجہ نے کیا ہے لیکن حیدر ملک نے راجہ سنگرام چند کی ۲۲ سالہ حکومت کو بلاوچند کا دور سلطنت قرار دے کر اپنی کتاب کی وقعت گھٹادی ہے۔ سنگرام چند اور سورج چند کی رفاقت ان کے راجہ سنگرام دیو سے تعلقات کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ جونا راجہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بھیمن دیو ایک برہمن زادہ اور پسر متبنی تھا ۱۳ برس ۱۲ دن ۳ ماہ حکومت کی اس کے بعد وہ مارا گیا لیکن ایک ترک حملہ آور اس کی بربادی و تباہی کا باعث ہوا۔ رام چند ابن سنگرام چند کا ذکر ضمیمہ میں نہیں ملتا۔ راجہ سوھدیو کے زمانے کے جن واقعات کو حیدر ملک نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہو ان کی حقیقت میں شبہ نہیں لیکن علاوہ اس کے کہ حیدر ملک راجہ اودین دیو کو بالکل فراموش کر گیا ہو اُس نے کوتہ رانی سے شاہ میر سے عقد کے دھبے کو دھونے کی کوشش کی ہے۔ کل مورخین شاہ میر اور کوتہ رانی کے یک روزہ ازدواجی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن کوتہ رانی حیدر ملک کے بزرگ راون چند کی بہن تھی اس لئے ہمارے مصنف نے اس ناگوار واقعے سے نظر چرانے کی کوشش کی ہے۔ بابا بلبل شاہ کے واقعے کو سب نے حیدر کی کتاب سے لیا ہے لیکن ہندو مورخین اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

حیدر ملک نے اسلامی عہد میں بھی اپنے خاندان کے اکثر افراد کو برسر اقتدار بتایا ہے سلطان شہاب الدین ابن علاء الدین نے ملک اچل کو کہ از نسل چنداں است اپنا سپہ سالار مقرر کیا اور چند قریہ چار دہ را اضافہ بر محال جاگیر نمود کہ تا این وقت آن موضع پشت در پشت بہ اولاد او در وجہ جاگیر مقرر و مفوض است الحال بعرض حضرت بادشاہ کیواں بارگاہ نورالدین جہانگیر خلد اللہ ملکہ ابدا موافق رسانیدہ فرمان قضا دمان نافذ گشت کہ موضع مذکور در وجہ التمغاے بندہ درگاہ بطریق انعام مع اولاد مقرر باشد (۴۴) اچل $\frac{۷۷۵}{۱۳۷۳}$ میں بموجب حکم بادشاہ کابل و بدخشاں سرکشوں کی تنبیہ پر مامور ہوا اور وقت مراجعت انتقال کر گیا۔ دولت چند پسر ملک اچل باپ کے منصب پر سرفراز ہوا۔ جب ولایت مآب حضرت سید علی ہمدانی قدس سرہ العزیز عہد قطب الدین میں کشمیر میں رونق افروز ہوئے اس نے صفہ مرتفع در علاء الدین پورہ برائے ادائے نماز حضرت ترتیب دادہ کمر ہمت بر میان خدمت بستہ دقیقہ ای از دقائق خدمت فرو نگذاشت (۴۵) ملک دولت چند سلطان زین العابدین بڈشاہ کی ایک جنگ میں

مارا گیا و ملک اوتار چند پسر رشید وے بجائے پدر بہ منصب سپہ سالاری مفوض گردید (۴۹) سلطان زین العابدین نے ولایت تبت و کاشغر پر تاخت کیا خان کاشغر نے موضع کرکشی ہزیمت پائی چوں تقدیم این حکومت با ہتمام ملک اوتار چند انصراف یافت جاگیرات اور اضعاف یافت" (۵۰) سلطان حسن ابن حیدر ابن زین العابدین کا سپہ سالار ملک سنجر چند تھا لیکن سب سے زیادہ وقیع ملک موسیٰ رینہ کی تھی اس نے اور ملک نصرت نے کہ از نسل چنداں بودند سلطان فتح شاہ ابن زین العابدین کی حمایت کی شمس الدین ملک کی موافقت میں سیف دار سپہ سالار محمد شاہ ابن سلطان حسن نے جنگ کی ہشتردہ سالہ ملک نصرت تو مارا گیا لیکن سیف دار بھی مقتول ہوا۔ فتح شاہ تخت نشین ہوا۔ شمس الدین کو وزارت ملی لیکن اس سے اور ملک موسیٰ سے نہ بنی ملک موسیٰ کہ در شجاعت و جلادت قریب رستم و اسفندیار بود باتفاق ملک ابراہیم ماگری وحیدی ملک عم زادہ خود جنگ قومی با شمس الدین کرد اور فتح یاب ہوا ..... ہمارا مصنف اسی پر قناعت نہیں کرتا، لکھتا ہے بتاریخ نہصد و ہفت ملک موسیٰ بت شکن سریر آرائے جہانبانی گردید در ایام حکومت خود ہمگی ہمت بر قلع و قمع کفر و ترویج دین مبین حضرت سید المرسلین علیہ اکمل الصلوٰۃ معروف داشت و اکثر بتخانہا را خراب ساخت و در ہر جا کہ بتخانہ ویران کردہ مسجدے تعمیر نمود۔ جمع کثیر را بہ شرف اسلام در آورد ..... ہیچ کس از سلاطین کشمیر بعد از سلطان سکندر مغفور بہ ترویج دین اسلام بقدر ملک موسیٰ ماردرہ سعی و اہتمام نہ نمود ازیں جہت سعادتمند بت شکن لقب یافت" اس کے بعد رقمطراز ہے: "چوں سلطان فتح شاہ را ملک موسیٰ رحمۃ اللہ بنا بر ضعف رائے و قلت عقل کہ یکے جملہ ارادہ ویران کردن مسجد جامع کہ سلطان سکندر ساختہ بود داشت و ازیں قبیل مصر قبائح بسیار شدہ بود اخراج نمود تا مدت نہ سال کہ زمان حکومت ملک موسیٰ بود در جبال ہند سرگرداں می گردید ..... بعد از مدت مذکور سلطان فتح شاہ مکاتیب عجز بخدمت سلک مسطور ارسال داشت چوں آثار عجز و ناصیہ احوال او ظاہر بافت فرمان آمدن سلطان مذکور نافذ ساخت چوں سلطان بنا بر حکم ملک مذکور بہ کشمیر رسید ملک ابراہیم ماگری وغیرہ سرداراں را متفق ساختہ قدم بہ مجادلہ و محاربہ بر داشت و ملک موسیٰ را مغلوب ساخت در ہنگام فرار ملک موسیٰ بدست یکے از لشکر یاں بقتل رسید" (۵۲-۵۳)

شہاب الدین علاء الدین کا بیٹا نہیں بھائی تھا۔ حیدر اور اس کے تتبع میں نرائن کول نے صریحی غلطی کی ہے۔ ملک اچل کا ذکر کسی دوسری تاریخ میں موجود نہیں۔ شہاب الدین ایک فاتح بادشاہ تھا۔ پنجاب سے لے کر ہندوکش تک اس نے تاخت کی مگر کاشغر کا صاف ذکر کہیں نہیں ملتا۔ دولت چند اور اوتار چند ہستیاں نمایاں نہیں معلوم ہوتیں۔ نرائن کول نے جنگ زی شی کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اوتار چند کا نام نہیں لیتا۔ اعظم حیدر ملک کے حوالہ سے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ شنکر دنبہ اور ملک موسیٰ کا ذکر کئی کتابوں میں ملتا ہے۔ صاحب صبحِ صادق ملک موسیٰ کو اکابر امراء میں شمار کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ "در نہصد و ہفتاد فتح شاہ شمس الدین چک را بقتل رسانید و وزارت به ملک موسیٰ زینہ داد بعد اندک زمانے قصد قتل او کرد ملک موسیٰ آگاہ شدہ بگریخت و در راہ از اسپ افتادہ ہلاک شد" اعظم سیر نگ زینہ (لفرت) اور ملک موسیٰ کی ملک سیف دار سے جنگ کا حال لکھتا ہے اور ملک موسیٰ کے دربستر "محاربات عظیم" کا تذکرہ کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ "مجملہ واقعات عجیبہ مشکلہ کہ در زمان فتح شاہ و تسلط ملک موسیٰ زینہ در کشمیر روداد آمدن میر شمس عراقی است کہ پیشتر در عہد حسن شاہ بتقریب سفارت دریں شہر رسیدہ و توطن نمودہ بود ..... رفتہ رفتہ بتدریج حنفیہ مذہب تشیع را جاری نمود بہ سعی بابا علی مرجع اکثر امرائے کشمیر شد و خانقاہ در جدی بل و آستانہ بنا کردہ در آنجا سکونت نمود ...... چون ملک موسیٰ جد ملکان چاڈورہ از راہ تقدیر بیعت شمس عراقی نمود و مذہب او را قبول کرد بازار او از پیشتر گرم شد بامر ملک باجرائے مذہب خود مشغول شد" نرائن کول لکھتا ہے "در سال نہصد و ہفت ملک موسیٰ زینہ مستعدی بمہمات سپاہ و رعیت گردید تا مدت نہ سال در کمال استقلال زمام رتق و فتق کافۂ انام در قبضہ اقتدارش بود۔" مورجرس نے سکون کی مدد اور تاریخ فرشتہ کے حوالہ سے سلاطین کشمیر کے مختلف حالات جرنل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۰ء میں شائع کیے۔ اس نے بھی ملک موسیٰ کے اقتدار کا ذکر کیا ہے۔ غرض کہ ملک موسیٰ کے جلیل القدر ہستی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس کی فرمانروائی کی تصدیق کسی کتاب سے نہیں ہوتی۔

لہ ملاحظہ: طبقات اکبری، فرشتہ، صبح صادق وغیرہ

حیدر ملک نے اس دور طوائف الملوکی تفصیلی تذکرہ کیا ہے جس میں محمد شاہ اور فتح شاہ بار بار تخت سلطنت پر بیٹھے اور اس سے ہٹائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات امرا کے آلہ کار تھے مصنف کے خاندان والوں نے بھی اس انتشار سے فائدہ اٹھایا۔ چکوں کی حکومت قائم ہوئی کچھ دنوں زور رہا۔ پھر کمزور سلاطین کا زمانہ آیا امرا کی باہمی آویزش کے مواقع بہم پہونچے۔ اس ضمن میں حیدر ملک نے ملک علی چاردرہ ملک سرنگ چند ملک نصرت[1] چند ملک حسین چار درہ عیدی ملک چاردرہ وغیرہ کے حالات لکھے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ نام نہاد بادشاہ تخت پر تھا لیکن سلطنت کشمیر مختلف قبائل میں منقسم ہو گئی ایک وقت میں درکشمیر چہار کس بطریق استقلال دم از حکومت زدند ان میں ایک ملک علی چاردرہ تھا۔ ایک جگہ ہمارا مصنف لکھتا ہے۔ "چوں مملکتِ کشمیر از فرمانروائے بالاستحقاق خالی ماند۔ مرزا کامران جغتائی دندانِ طمع تیز نمودہ بعزم کشورستانی با سی ہزار سوار قدم برداشت۔" اس کی فوج کو مراجعت اختیار کرنی پڑی۔ اس کے بعد مرزا حیدر گورگانی صاحب تاریخ رشیدی کا حملہ شروع ہوا۔ حیدر ملک فخریہ لکھتا ہے کہ "اول کسیکہ دست بر مجادلہ کشاد ملک علی چاردرہ کہ از نسل چنداں است بود۔ ملک حسین زینہ اور ہمارے مصنف کا دادا ملک محمد نامی برادر زادہ ملک حسین و علی ملک جس کا سن اس وقت ۱۴ سال تھا اس جنگ میں شریک تھے بالآخر صلح کی ٹھہری لیکن مرزا حیدر نے دوبارہ کشمیر پر حملہ کیا اور بالآخر ملک پر متصرف ہوا "فتح" کمر اس کی تاریخ ہے۔ مرزا حیدر نے دس سال حکومت کی۔ اعظم لکھتا ہے کہ شعار اہل سنت را انہ بر تجدید درین شہر کی ہر کرا خانقاہ جدی بل با آتش کشیدہ استخوانہائے شمس عراقی را برآوردہ بسوخت و مقبرش را مزبلۂ تمام شہر ساخت۔ ... ملک عیدی زینہ احسن زینہ و ملک محمد ناجی وغیرہ در اطاعت او بودند" لیکن مرزا حیدر کی کارروائیاں اور تعصب مذہب نے انھیں برگشتہ خاطر کردیا۔ حیدر ملک نے اپنے جد بزرگوار کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں جب مرزا حیدر نے "شیخ دانیال دار سخت پناہ شیخ شمس الدین عراقی رحمۃ اللہ" کو بلا کر قتل کیا شکل زنگی "صوفی تقانیدار" کا بند بند جدا کیا۔ قاضی میر علی کو خارج از بلد کیا ملا حاجی خطیب کو بھی تہمت تشیع میں جان سے

---

[1] یہ ملک نصرت حیدر ملک کے دادا ملک محمد ناجی کا والد بزرگوار تھا۔

مار ڈالا اور بچھر بابا علی کو کہ سن او از چند سال پیشتر بود بلا کر قتل کرنا چاہا۔ نزدیک بود کہ بابا بر زمین افتد عرق غیرت ملک محمد ناجی بہ حرکت آمد از پہلوئے مرزا برخاست، و پیشش آمدہ دست بابا را گرفت۔ مرزا حیدر نے سمجھا کہ ملک خلل پذیر خواہد شد" اس لئے اپنے ارادہ سے باز آیا لیکن مرزا حیدر کے امرا مخالف ہو گئے تھے۔ ملک عیدی زینہ اور ملک محمد ناجی اور حسین ماگری و خواجہ حاجی نے ۹۵۸ھ میں علم مخالفت دراز کیا۔ مرزا نے اپنی فوجیں اطراف و جوانب میں بھیج رکھی تھیں شورشیں رونما ہوئیں۔ ایک رات ایک قصاب کے تیر نے اس جان اور دَہ سالہ حکومت کا خاتمہ کر دیا "در تاریخ نہصد و پنجاہ و نہ عیدی ملک تموے ملک محمد ناجی تیغ جہانگیری افراختہ در اندک وقتے ایں ولایت را از دشمنان دین و دولت پاک ساخت ونیز اقبالش روز بروز بر مدارج سروری و عزت ارتفاع نمود۔ عیدی ملک نے پسران ناجی چک غازی خاں حسین خاں و علی خاں را کہ بکمال اخلاص و محبت گرفتار بودند و سالہائے دراز در سینہ کینہ دیرینہ ملک مذکور داشتند۔ ۔ ۔ بہ منصب و امامت خانی رسانیدہ دلواخت و برادر زادہ خود ملک محمد ناجی را از پایۂ اعتبار انداخت بمرور ایام کہ غازی خان و برادران او اقتدار و استقلال پیدا کردند حقوق نعم را بر طاق نسیاں گذاشتند۔ ۔ ۔ ملک محمد ناجی را بخود موافق نمودہ حبیب خاں پسر شمس الدین خاں را کہ خواہر زادہ غازی خاں بود بہ سلطنت برداشتند بہ تخریب و عزل عیدی ملک اتفاق کردند و دختر تموے خود را بہ حسن ملک (بد مصنف) ولد ارشد ملک محمد ناجی در سلک ازدواج کشیدند و ابواب منازعہ و مخاصمہ بروئے عیدی ملک کشادند اگرچہ لشکر عیدی ملک بسیار بود از جدا شدن ملک محمد ناجی شکستہ بحال ملک مذکور راہ یافت تاب مقاومت نیاوردہ ناچار بہ ہزیمت رفت چوں ہر اول بود رسید شاخ درخت انگو گلوگیرش گشت از اسپ افتاد و اسپ لگد انداخت جاں بجاں آفرین داد در جوار پدرش مدفون ساختند مدت

لہ یہ فقرہ ہمارے مصنف کے مذہبی خیالات کی غمازی کرتا ہے۔ شمس الدین محمد عراقی جس کے سبب سے کشمیر میں شیعیت نے زور پکڑا مرزا حیدر کاشغری صاحب تاریخ رشیدی اور بعد کے کل مورخین نے جس میں محمد اعظم خاص طور پر شامل ہے۔ نہایت ہی برے الفاظ سے یاد کی ہے۔ حیدر کے تعظیمی الفاظ اس کے متعلق متن اور حاشیہ میں ملاحظہ ہوں۔

سلطنت اویک سال بود۔" مرزا کامران اور مرزا حیدر گورگانی کے حملوں کی تفصیلات صحیح ابن حید ملک کی تحریر سے اس کے مذہبی رجحانات کا پتہ چلتا ہے عیدی ملک کا حال کل مورخین نے قلمبند کیا ہے صاحب صبح صادق لکھتا ہے" عیدی ملک برامور ملک ومال مستولی شدہ۔ نظام الدین صاحب طبقات اکبری کا فرشتہ نے اتباع کرتے ہوئے لکھا ہے۔ اوّل الذکر لکھتا ہے" امرائے کشمیر خصوص عیدی زینہ تسلط تمام گرفتہ نازک شاہ را بحکومت برداشتہ نمونہ میداشتند درحقیقت عیدی زینہ بادشاہ بود۔" رودجرس بھی یہی لکھتا ہے۔ عیدی ملک کی شکست و وفات کے بعد چکوں کی حکومت قائم ہوئی۔ غازی خاں تاج از سر حبیب خاں برداشت اول کسیکہ از قبیلہ چکاں بہ مرتبہ ارجمند فرماندہی رسید غازیخاں بود۔ شمس الدین زینہ ابن عیدی ملک دربار ہمایوں میں پہونچا اور مدد چاہی ہمایوں کا انتقال ہوگیا میر ابوالمعالی اس کی ترغیب سے کشمیر پر حملہ آور ہوا لیکن غازی خاں سے شکست کھائی باوجودے کہ شمس الدین کی دختر غازی خاں کی بی بی تھی اسے قتل کردیا گیا اس کا بھائی ملک محمد ابن عیدی ملک ملک دولت چک اور دوسرے امراسے اتفاق کرکے پھر غازی خاں کا مقابلہ کیا مگر کچھ بھی بنائے نہ بنی۔ ملک محمد ناجی اور اکثر قبیلہ دار پھر ہندوستان پہنچے۔ قرار پایا کہ ہمشیرزادہ مرزا حیدر کاشغری کو غازی خاں کے مقابلہ میں لائے لیکن انھیں بھی ہزیمت اٹھانی پڑی۔ غازی خاں کے مرنے کے بعد اس کا بھائی حسین خاں تخت نشیں ہوا یہ ملک محمد ناجی کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا تمام مہام ملک ومال در قبضہ اختیار ملک محمد ناجی گذاشت وخود بعیش ونشاط و شکار مشغول بود۔ علی خاں برادر خورد ملک محمد ناجی نے سلطان حسین کے باغی بھائی سنکر خاں سے جنگ عظیم کی اور اسے مار بھگایا اس فتح سے ملک محمد ناجی کے مدارج میں مزید ترقی ہوئی لیکن ۹۷۰ میں اپنے بیٹے قاسم خاں کے مرنے سے اتنا متاثر ہوا کہ خود بھی راہی عالم بقا ہوا۔ اس اثنا میں حسین خاں کا بھائی اور جانشیں علی خاں بھی مرچکا تھا۔ یوسف خاں ابن علی خاں کی بساط سلطنت سید مبارک خاں نے الٹ دی لیکن کشمیریوں نے لوہر خاں برادرزادہ سلطان یوسف کی حمایت کی اسے تخت پر بٹھایا یوسف خاں دربار اکبری میں پہونچا ایک سال ہندوستان میں رہا پھر رخصت لے کر لاہور بعد ازاں راجوری پہونچا۔ حسن ملک ولد ملک محمد ناجی اور دوسرے سرداروں نے اس کی موافقت میں لوہر خاں سے جنگ کی سنہ ۹۸۶

میں یوسف خاں بار دوم تخت نشین ہوا حیدر ملک نے مان سنگھ حاکم لاہور سے امداد طلب کی شہنشاہ
اکبر اب تسخیر کشمیر پر متوجہ ہوا سلطان یوسف نے اپنے بیٹے حیدر خاں کو پیشکش کے ساتھ اکبر کے
پاس بھیجا لیکن اکبر نے خود سلطان یوسف کو طلب کیا اُس نے اپنے پسر ولی عہد یعقوب خاں کو دربار
میں بھیجا اکبر نے حکیم علی کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ پسر دیوانہ بخدمت ما فرستادی دماغش مختل است و
بکارے نمی آید اگر ایں مرتبہ در آمدن مختل واقع شود غضب بادشاہی را آمادہ باش ۔ یوسف شاہ ڈرا
امرا نے اسے جانے سے روکا ۔ راجہ بھگوان داس کچھواہ ۵۰ ہزار سوار کے ساتھ اٹک سے تسخیر کشمیر
کے لیے بھیجا گیا لیکن لشکر بادشاہی کو دشواریاں پیش آئیں لیکن یوسف شاہ ڈرا اور بلا اطلاع تنہا بھگوان
کی طرف روانہ ہوا ۔ امرائے یعقوب اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا ۔ راجہ داس کچھواہ نے یوسف شاہ کو
راجہ ٹوڈرمل حاکم لاہور کے سپرد کیا دو سال بناکامی در قید گذرانیدہ آخر راجہ مان سنگھ کہ از کابل معاودت
نمودہ التماس استخلاص سلطان نمود یوسف شاہ رہا کیا گیا ۔ ایک سو روپیہ یابانہ مقرر ہوا اور اُسے بنگالہ بھیجا
گیا ۔ یعقوب خاں کی حرکات سے حسن ملک ولد ملک محمد ناجی شمس الدین چک و عالم شیر خاں وغیرہ
ناراض ہو گئے عازم ملازمت اکبر شاہ شد ۔ اکبر نے قاسم خاں میر بحر کی سرکردگی میں تیس ہزار سوار تسخیر
کشمیر کے لئے بھیجے یعقوب خاں کو بھاگنا پڑا لیکن امرائے کشمیر نے پھر اس کا ساتھ دیا حسن ملک بھی اس
سے مل گیا رفتہ رفتہ یعقوب خاں نے زور پکڑا قاسم خاں نے مزید کمک کی درخواست کی ۔ اکبر نے سید
محمد خاں بخوبی کو ۲۵ ہزار فوج لے کر بھیجا ۔ اب یعقوب خاں کے لئے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا
[illegible] میں اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور کشمیر سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا گیا ۔

یوسف خاں [illegible] ابراہیم خاں اور دوسرے [illegible] آئین کشمیر نے دربار
مغلیہ میں [illegible] ۔ مناصب عالیہ پائے مصنف [illegible] "قرابت قریب" یوسف و ابراہیم کے ساتھ
[illegible] یوسف کو [illegible] پانصدی اور ابراہیم کو ہزاری مناصب ملے اور پرگنہ [illegible]
[illegible] درمیان دو آبہ دھن ساوات بارہہ بجاگیر ایشاں مقرر نمودند ۔ بندہ را خان مذکور جدا نہ کرد بخدمت
فوجداری ایں دو پرگنہ مفوض داشتند زمیندار آنجا راجہ [illegible] کہ بہ تمرد و سرکشی مشہور بود ۔ اس کے ہاتھوں
مقتول ہوا ۔ دوران جنگ [illegible] تیر در بدن احقر جا گرفت و مقدار پانصد کس ازاں کفار کشتہ شدند

ولست نفر از مسلمانان شربت شہادت نوشیدند۔ اکبر ۱۶۰۵ء میں مرگیا . . . . جب جہانگیر شاہ سلطان خسرو کی لڑائی کے لئے روانہ لاہور ہوا یوسف خاں بنا بر آزار ہمراہ لشکر ظفر اثر نہ بود خاطر مبارک ازو رنجیدہ تعینات بنگالہ شد و جاگیر ایشاں در سرکار بردوان از مضافات صوبہ بنگالہ مقرر گشت و بندہ نیز در خدمت ایشاں بداں صوب ہمراہ گردید اسی زمانہ میں فرمان بنام قطب الدین خاں صوبہ دار بنگالہ بمضمون استیصال شیر افگن صدور یافت و خان مذکور بہ سرعت تمام خود را بہ یوسف خاں رسانید و راز سربستہ را با ایشاں اظہار نمود شیر افگن را بدلاسا طلب داشت . . . . چوں بر شیر افگن قصد ایشاں معلوم شد از جا جست و شمشیر از نیام بیروں آوردہ . . . . اول با بندہ در افتاد یک دو زخم رد و بدل واقع شد بندہ را از کار بر آوردہ قطب الدین خاں را بدو زخم از میاں برداشت . . . . ابراہیم خاں حملہ بردے او آوردہ کار او ہم بہ یک ضرب شمشیر تمام ساختند اما یوسف خاں انتقام برادر زادہ اش از وے کشیدہ او را از پا در آورد چوں ایں ہر سہ سردار نامی در میدان کارزار علاقہ گشتہ شدند۔ یوسف خاں متوجہ بردوان شدہ تجسس باقی ماندہائے شیر افگن افتاد اہل محل او کہ مہر النساء بیگم بنت غیاث بیگ بود گریختہ بخانہ بندہ رسید دقیقہ از دقائق تعظیم و خدمتگاری فرو نگذاشت تا چہل روز آں بلقیس الزمانی در خانہ بندہ تشریف داشتند کشور خاں ولد قطب الدین خاں معتمد را از راہ محل بطلب ایشاں فرستاد تاراج محل بندہ با جمیع برادران در رکاب ایشاں ہمراہ بود و آنچہ از خدمت شائستہ ممکن بود بتقدیم رسانیدہ رخصت شد . . . . چوں آں عصمت و طہارت دستگاہ بہ شرف حضور پر نور مشرف گشتند حقیقت جان سپاری بندہ و برادرم علی ملک گردانید بنا برآں فرمان . . . . بطلب بندہ و برادر بخطاب ملک صادر شد مجرد ورود فرمان ہمایوں ہر دو برادر سر از قدم ساختہ بدرگاہ خلائق رسیدہ بود اما از آنجا کہ نیک ذاتی و قدردانی و ادائے حقوق خدمت آں بلقیس دوراں اظہر من الشمس است بندگو خدمتی بندہ در معرض قبول افتاد در سلک بندگان انتظام فرمودہ بشمول شرائف اعطاف از جملہ اقران مفتخر و سپاہی ساختن بہ صاحب عالیہ سرفراز و ممتاز و بخطاب چغتائی مخاطب فرمودند۔"

مقالہ کی غیر متوقع طوالت اجازت نہیں دیتی کہ حیدر ملک کی تاریخ پر تفصیلی تبصرہ کیا جائے کتاب کا بیشتر حصہ مصنف کے خاندانی حالات پر مشتمل ہے لہٰذا تاریخی واقعات کو ضمنی حیثیت حاصل

ہوگئی ہے کسی تناسب و توازن کی توقع فضول ہے جو کچھ عرض کیا گیا اس سے قارئین کو حیدر ملک کے بیانات کی حقیقت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوگئی ہوگی۔ صاحب البیت ادریٰ بما فیہ عربی کا مشہور مقولہ ہے۔ حیدر ملک نے جن حضرات کو اپنے خاندان میں شمار کیا ہے اس میں شبہ کی گنجائش نہیں بعض ہستیاں یقیناً تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن مصنف کا دعوا کہ "ایام استیلائے چنداں اسلاف فقیر حیدر ملک چغتائی در ملک کشمیر چہل و ہفت سال است کہ بہ مرتبہ فرماندھی رسیدند شش نفر اند علی ہذا المنوال پرتی چند دو سال لگ چند یک سال ملچند یازدہ سال بلاد چند ابن ملچند بست و سہ سال ملک موشی بت شکن نہ سال عیدی ملک یک سال" (ورق ۶۲-۶۳) اس لئے قابل قبول نہیں کہ صرف کل مورخین نے انہیں تاج و تخت سے دور رکھا ہے۔ بلکہ کشمیر کے فرمانرواؤں کے سکہ جات بھی ان میں سے کسی ایک کی فرمانروائی کی شہادت نہیں دیتے حقیقت یہ ہے کہ ملک موشی، عیدی ملک اور بلاد چند بادشاہ گر تھے بادشاہ یا راجہ نہ تھے۔ حیدر کا مبالغہ آمیز بیان اپنے بزرگوں کی جا و بے جا ستائش بعض ناگوار واقعات سے چشم پوشی آسانی سے سمجھ میں آجانے والی باتیں ہیں۔ مگر باوجودیکہ اس کا خاندان شیعی تھا اس نے تعصب مذہبی سے مرزا حیدر جیسے متشدد سنیوں کی بھی مذمت کی ہے۔ دین اسلام میں یہ پختہ تھا اس لئے ہنود اس کے طرز بیان سے کچھ خوش نہ ہوں گے۔ اس نے اپنی کتاب میں اسلامی روایات اور تاریخی واقعات سے ہر جگہ تمثیل پیش کر کے کتاب کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی۔ یقیناً تاریخ اسلام پر اس کو عبور تھا اور اس کا اس نے کافی ثبوت دیا ہے۔ اس کی تاریخ کشمیر ایک ماخذ کا حکم رکھتی ہے اس لئے بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

[یہ مقالہ تاریخ کشمیر مصنفہ حیدر ملک چادورہ کے تاریخی تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ عسکری صاحب نے حیدر ملک کی اس تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے اس کی تمام خوبیوں و خرابیوں سے پردہ اٹھایا ہے بقول مقالہ نگار چونکہ حیدر ملک کا مقصد اپنے خاندان کے عہد و ماثر کی تاریخ لکھنا اور ان کی تعریف و تمجید تھا اس لئے ان کی تاریخ سے تاریخی صحت کی توقع ہی فضول ہے پھر بھی بقول مقالہ نگار اس کی یہ تاریخ ایک تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہت سے مقامات پر اس نے صحت و دیانت کا پورا خیال رکھا ہے۔ وہ شیعی مذہب کا پیرو ضرور تھا لیکن اس کی اسلامی تاریخ دانی سے انکار نہیں کیا جا سکتا]

جائسی اور چند مسلمان ہندی شعراء کے کلام کا ایک قدیم مجموعہ

"ہندی ساہتیہ کے مہان کلاکاروں" میں ملک محمد جائسی کو بڑا اونچا استھان دیا گیا ہے۔ ان کی مشہور کتاب پدماوت کی بھاشا کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ تلسی داس کی راماین سے بھی زیادہ خالص اور بے مثل بتاتے ہیں۔ گریرسن اسے آج سے تقریباً چار سو برس پہلے کی اودھ اور اتری ہندوستان کی ٹھیٹ زبان کا عکس یا آئینہ قرار دیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں میں بھی اس کتاب کا بہت چرچا تھا۔ ملا عبدالشکور یا شکراللہ بزمی نے تین ہزار سے زیادہ ابیات پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ جہانگیر کے نام سے معنون کیا اور پدماوت نام دیا۔ حسین غزنوی، میر عسکری، عاقل خاں رازی، حسام الدین، عبدالجلیل بلگرامی، ضیاء الدین عبرت اور ان کے شریک کار غلام علی عشرت وغیرہ نے آج سے بہت قبل جائسی کی پدماوت سے متاثر ہو کر اور اس کے ڈھنگ پر مثنویاں لکھیں اور بھی کتنی ہی کتابیں لکھی گئی ہوں گی جن کا ہمیں علم نہیں۔ مسلمان ہندی، اودھی اور برج بھاشا میں نظمیں کہتے تھے اُن میں سے بیشتر اب معدوم ہو گئیں لیکن اب بھی اتفاقی طور پر جائسی کی کتابیں اور دوسرے مسلمان ہندی شعراءؔ کے کلام کے قدیم ترین نسخے صوفیاء کرام کی خانقاہوں اور پرانے مسلمان گھرانوں میں مل جاتے ہیں۔ منیر شریف کی قدیم خانقاہ میں مجھے بھی خوش قسمتی سے ایک نادر مجموعہ مخطوطات مولانا مراد اللہ اور

ملہ معاصر حصہ ۳

موصوف کے برادر محترم شاہ عنایت اللہ صاحب سجادہ نشیں نے دکھایا جب میں نے پہلے پہل اس مجموعہ کو دیکھا تو اس کے دو اجزا جائسی کے مکمل نسخہ اکھراوٹ اور شیخ بکسن کی نامکمل نظم بھوگ ساگر کے تتمہ میں تاریخ کتابت ۹۱۱ھ پر نظر ٹھٹکی خیال آیا کہ آج سے قریب ۱۵ یا ۲۰ سال قبل مجھے پدماوت کا ایک نامکمل نسخہ ملا تھا جسے بھولا ناتھ عظیم آبادی نے اردو خط میں عہد شاہ عالم میں لکھا تھا اور اس سے "شیر شاہ دہلیں سلطانون" کی مدح سرائی اور سال تصنیف "نوسو سینتالیس ۹۴۷" ہے۔ کتابی ــــ کہنے کا علم ہوا تھا اس لئے پدماوت کا یہ نسخہ جو ناقص الطرفین ہے لیکن جس کی کتابت، کاغذ، روشنائی وغیرہ اکھراوٹ اور بھوگ ساگر اور مجموعہ کے دوسرے اجزا سے اتنی مختلف نہیں کہ بے حد بُعد زماں کی گنجائش ہو سن ۹۱۱ھ کا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اکھراوٹ کے سال تصنیف کی طرف شاعر نے کہیں اشارہ نہیں کیا ہے لیکن ایک تیسری کتاب آخری کلام میں جو ہمارے مجموعہ میں شامل نہیں بابو شاہ چھتر پتی اور نوسو چھتیس ۹۳۶ جو بھئے اس کا سال تصنیف واضح ہے۔ مجموعہ کے سارے اجزا کا خط نستعلیق ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ اس خط میں دسویں صدی کی کئی کتابیں پٹنہ کے مشرقی کتبخانہ میں موجود ہیں نسخہ سبحۃ الاحرار جس کا کاغذ "نجلے دبیز و نفیس" ہے اور سنہ ۹۱۳ھ کی تاریخ ثبت ہے دیوان شاہی کی تاریخ کتابت ۹۱۵ھ مندرج ہے خمسہ نظامی کا ایک نسخہ تو سنہ ۹۱۳ھ کا معلوم ہوتا ہے زیر نظر مجموعہ کا آخری جز ۱۲ جزدوں پر مشتمل ہے ہر ایک میں ۱۳ شعر ہیں اس کتاب کا مکمل نسخہ جس میں بیس گیت جائسی کے پائے جاتے ہیں ماتا پرشاد گپت نے پہلے پہل پارسال ۱۹۵۲ء میں شائع کیا تھا اس کا کاغذ کچھ زیادہ اجلا روشنائی زیادہ ہلکی اور پھیکی ہے پدماوت۔ برآن کی اریل اور بکسن اور بکسن کہاں کی چوپائیاں چھند کونڈلیاں سادھن کے کلام اور بھوگ ساگر کی روشنائی زیادہ واضح اور کاغذ کچھ زیادہ میلا پن لئے ہوئے ہے رسم الخط تحریر اور قلم کی کشش میں بھی قدرے اختلاف کی گنجائش معلوم ہوتی ہے لیکن بعض دوستوں کا خیال ہے کہ سارا مجموعہ ایک ہی شخص کے قلم کا ہے اور سارے اجزا کی کتابت قریب العہد ہے ظاہر ہے کہ

سنہ ۹۱۱ھ میں سارے اجزا نہیں لکھے گئے ہوں گے۔ کاتب نے اپنا نام بھی لکھا ہے لیکن الٰہ آباد کا صوبہ کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔ اکبر کے پہلے پریاگ کو صوبہ کے مستقر کی حیثیت حاصل نہ تھی اس لئے سنہ ۹۱۱ھ جو سکندر لودی کا زمانہ تھا صحیح نہیں ہو سکتا بہت غور کیا جعل و فریب کا شائبہ نظر نہیں آیا لیکن اشکال بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

ضرورت محسوس ہوئی کہ جائسی کے سوانح حیات اور ان کی کتابوں کے سال تصنیفات کے متعلق چھان بین کی جائے بالخصوص اکھراوٹ کے سال تصنیف پر زیادہ دھیان دیا جائے۔ میں نے جائسی کے متعلق شائع شدہ کتابوں اور مقالوں کی کھوج شروع کی گریرسن اور دویدی کی صحیح لیکن ناتمام پارترجمہ پدماوت (۲۸۶ بند) جو ۱۸۹۶ء میں شروع ہو کر سنہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی بشکل جی کی جائسی گرنتھاولی کا سنہ ۱۹۳۴ء کا ایڈیشن جس میں اکھراوٹ اور آخری کلام بھی شامل ہے۔ مسٹر شریف آئی سی ایس کا مکمل انگریزی ترجمہ پدماوت جو سنہ ۱۹۴۴ء میں چھپا۔ ڈاکٹر کمل کلشر یشٹ کی مختصر مگر مفید ہندی کتاب انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ جائسی پر اردو کتاب جس کے مصنف کلب مصطفےٰ جائسی ہیں، لالہ سیتا رام کا انگریزی مضمون جو الٰہ آباد اسٹڈیز میں شائع ہوا اور ناگری پرچارنی پتریکا میں کئی حضرات کے مقالے بالخصوص جلد ۱۲-۱۳-۱۴ میں چندر بلی پانڈے جی کے ہندی مضامین نظر سے گذرے۔ پانڈے جی کے طویل مقالے پدماوت کی لپی (خط) اور رچنا کال (زمانہ تصنیف) اور جائسی کے جیون برت (سوانح حیات) پر خاص طور پر نظر ڈالی۔ بابو شیام سندر داس ڈاکٹر رام کمار ورما وغیرہ کی کتابیں بھی دیکھیں۔ ان سب کے سرسری مطالعے اور خاص کر ماتا پرشاد گپت کی حال میں شائع شدہ جامع ضخیم اور بہت حد تک تشفی بخش جائسی گرنتھاولی سے استفادہ کے بعد اور منیر شریف کے مجموعہ کی روشنی میں میں ان نتیجوں پر پہنچا ہوں کہ (۱) جائسی کے متعلق بہت کچھ چھان بین کی گئی ہے، لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے ہرگز مسکن عطش نہیں۔ سوانح حیات پر جو روشنی ڈالی گئی ہے، ابھی تک مدہم اور دھندلی ہے۔ کب کہاں پیدا ہوئے۔ کیا عمر پائی کب فوت ہوئے۔ متاہل تھے یا مجرد۔ نسلاً ہندو تھے یا مسلمان۔ اس کے علاوہ والدین،

اولاد، ذریعہ معاش، مسلک و مشرب سلسلہ ارشاد و بیعت فہرست تصنیفات سال تصنیفات خط تصنیفات غرض کئی امور ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔ خود جائسی نے جو اشارات کئے ہیں ان کے متعلق کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ ہنوز بحث کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ (۲) ہندی زبان میں قدیم مسلمان صوفی شعرا کے کلام کے تجسس و تلاش میں بہت سعی و کاوش کی ضرورت ہے خود جائسی نے جن کتابوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں دو ایک کے سوا اور اب تک پردۂ خفا میں مستور ہیں (۳) بیوگ ساگر اور برھان۔ کمسن۔ بکسن کہان اور سادھن کے جو نئے اودھی زبان میں کلام اس مجموعہ میں شامل ہیں ان پر ہندی ادیبوں کو خاص کر دھیان دینے کی ضرورت ہے (۴) اکھراوٹ کا قدیم ترین نسخہ یقیناً ۹۰۰ھ میں لکھا گیا تھا اور بیوگ ساگر کا موجودہ نسخہ بھی ۹۱۱ھ کے کسی نسخے سے نقل کیا گیا (۵) زیر نظر مجموعہ کے اجزا بالخصوص پہلا پد ماوت اور آخری (جسے گپت صاحب نے مہری باٹسی نام دے رکھا ہے) دسویں صدی ہجری یعنی عہد شاہجہانی کے اوائل میں لکھے گئے۔ لہذا جتنے نسخے آج تک دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں یہ قدیم ترین ہیں۔ سطور ذیل میں انہیں چند امور کے متعلق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ گپت جی یا پانڈے جی جن کا جائسی پر مطالعہ کافی گہرا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے مقالوں اور نظریات پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس کریں کم از کم دعوتِ فکر کے موقع کو بہم پہنچانے کا مجھے بھی حق حاصل ہے۔

سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکھراوٹ اور بیوگ ساگر کے تتمہ میں سید مے ساد ھے کاتب نے جو کچھ لکھا ہے جوں کا توں یہاں نقل کردیا جائے "تمام شد پوتھی اکھروتی بزبان ملک محمد جائسی (یہاں تک سرخ روشنائی میں) کتاب هندوی کتاب الملک و کاتب حروف فقیر حقیر محمد مقیم ساکن پتہ ندالون خاص عملہ پرگنہ مقام آباد سرکار جونپور الہ آباد بوقت ظہر یوم جمعہ ز کے شہر ذوالقام سنہ ۹۱۱ در موضع خاصدریہ مقام کنورہ عملہ پرگنہ نکوان سرکار مسطور است تحریر یافت زیادہ گفتار نوشتن اظہار نیست" "پوتھی بیوگ ساگر بزبان هندوی العزام شدہ فی التاریخ ذوالقام سنہ ۹۱۱ موضع خاصدیہ مالک بلکا نون

سنہ النون یاری بتاریخ ہستم روز جمعہ ز کے تیار تمام شد" اس خبط ربط عبارت اور غلط سلط املا کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ کاتب صاحب فارسی میں بہت کچے نہ تھے بد حواسی کا یہ عالم تھا کہ جمعہ کو پہلے جمع لکھا پھر ہے کا شوشہ بڑھایا اور ہشتم کے نیچے بجائے ہ کے شوشہ کے ب کا نقطہ دیکر بستم بنا دیا یہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ انہوں نے کسی دوسرے نسخے سے نقل کیا۔ کلینڈر کے مطابق ۹۱۱ھ میں ذو القعدہ کے مہینہ کی آٹھویں تاریخ کا روز جمعرات تھا ایک روز کا فرق رویت کی عام گڑبڑی سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ۹۱۱ھ میں صوبہ الہ آباد کا وجود نہ تھا صوبہ تو اکبر نے بنایا۔ سجان سنگھ مصنف **خلاصۃ التواریخ** نے اور ان کی تاسی میں صاحب **حدیقۃ الاقالیم** نے لکھا ہے کہ اکبر نے گنگا وجمنا کے سنگم پر جب قلعہ بنایا اور قدیم پریاگ کی آبادی بڑھی تو اس کا نام الہاباس تجویز ہوا جو عہد شاہجہانی میں الہ آباد ہو گیا۔ **آئین اکبری** میں صوبہ الہاباس سرکار جونپور اور پرگنات نظام آباد و ینگون کے نام ملتے ہیں صاحب **طبقات اکبری** بھی الہاباس ہی لکھتے ہیں لیکن ابوالفضل کے نسخوں میں کہیں کہیں، مگر کم۔ الہ آباد کی شکل بھی ملتی ہے۔ عہد اکبری کے ایک سکہ اور ایک کتبہ میں الہ آباد صاف طور پر مندرج ہے۔ مولوی مقبول احمد صمدانی نے اپنی **تاریخ الہ آباد** (اردو) میں اس امر پر کافی روشنی ڈالی ہے جیسا اوپر ذکر کیا گیا۔ کاتب نے قصداً کوئی فریب اور جعل نہیں کیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بھولے بھالے محمد مقیم نے اصل نسخہ کی تاریخ کتابت تو درج کر دی اور اپنے وقت اور زمانہ کو بھول گئے اپنا نام اور جائے سکونت کو جتلا دیا کاتب اول کا نام نہ دیا اور اس کے جائے قیام کی وضاحت نہ کی ایک اور امر قابل ذکر ہے **اکھراوٹ** کے ایک شعر" بند سمند سمال یہ اچرج کا سوں کہوں جیہیں ہیرا سو ہیران محمد آپہ آپ منہ" کے مترادف حاشیہ میں کاتب اول نے ایک فارسی شعر لکھا تھا (منقش) "بسے جو یداز راز شان - ندانم کہ چوں کردے آغاز شاں" کم سواد کاتب کے قلم سے ہرگز یہ شعر برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان اجزا کی کتابت کب عمل میں آئی صحیح تاریخ بتانا مشکل

ہے لیکن اکھراوٹ اور مھوری بانسی کے نسخے جس صفحہ سے شروع ہوتے ہیں ان کی
پشت پر کچھ مختلف تحریریں ۔ نسخے ۔ فارسی ۔ ہندی شعر کسی صاحب یا خود کاتب نے لکھ دیئے
ہیں۔ شان قلم اور انداز تحریر اور روشنائی ان دو صفحات کی یکساں ہے اور ان سے ہمیں بہت کچھ
مدد مل سکتی ہے "کبت بیر شاہجہاں بادشاہ غازی"، "ایضاً" "کبت بیر مہابت کہاں بابو"، "ایضاً"
"کبت بیر میر الصاحب بیر خاں جہاں جیو" "کبت میر الصاحب سلطان جہاں" کے عنوانات جو
سرخ روشنائی میں دیئے گئے ہیں عہد جہانگیری کے اواخر اور عہد شاہجہاں کے اوائل کے
امرا کی مدح اور ان سے چند گمنام مسلمان ہندی شعرا کی کچھ مانگ کی خبر دیتے ہیں۔ بعض اشعار
ٹھیک سے پڑھے نہیں جا سکے۔ کاغذ خستہ پھٹا ہوا اور الفاظ اوچٹے ہوئے تھے پھر بھی چند
مصرعے یا شعر کافی جاذب نظر ہیں (۱) شاہجہاں بلونت بلی ...... کنڈلیا دوں اچھی ......
نہاں جہاں پران بچی ۔ جنہہ سمبھل تیر تجوار .... خان جہاں لودی اجت خاں لڑی تہاں
جو ستہ جوگوں آن کچی (۲) اور ان کے مان سمان کرکون سکی کا دلیپ مہابت کہاں در پینہ کو
سنکا ہی بدھت کماں بابوا جت کو تول ۔ کون دیکھی ہیں بھگہا گے چک ایک ان کا ہی (۳)
ساہتہ کے لیبی کون من ہیں کرار بدھت کماں عمر ہیں بائیس برس گے (۴) سلطان جہاں
نشت جان جہاں جنہ سار بہار سو ساتھن پایو بیر کے ہیں تلی تیج دیکھت لون ہو سیام کہنا
بہرایو (۵) جان جہاں ننس ساننگ سروتم اُپم ہاشم کاب سنایو" ان برج بھاشا کے مسلمان
شاعروں کماں اور ہاشم کا حال ہمیں معلوم نہیں دنیا انہیں فراموش کر چکی ہے۔ مگر کاتب کو
جو ان کا معاصر معلوم ہوتا ہے ان کے یہ اشعار اتنے بھائے کہ بطور یادداشت خالی جگہ پا کر انہیں
قلمبند کر لیا۔ پیر خاں ولد دولت خاں شاہو خیل جو پہلے صلابت خان پھر جہاں لودی ہو گیا۔
جہانگیر کا بڑا چہیتا امیر تھا۔ صاحب ماثر الامرا نے لکھا ہے کہ شہنشاہ اسے "اندرون محل
بردند و خواستند کہ یکے از خویشان بادشاہ نسبت کردہ مخاطب بہ سلطان جہاں گردانند"
اسی کتاب میں یہ بھی مرقوم ہے کہ جب خان جہاں لودی معتوب ہوا اور شاہجہاں نے مظفر خاں
بارہہ کو اس کی سرکوبی کے لئے متعین کیا تو دھولپور میں ۱۰۳۹ھ (۱۶۲۹ء) میں ایک جنگ

واقع ہوئی یہ خود تو بچ نکلا لیکن اس کے بیٹے، داماد اور کئی رفقا کام آئے ان بیٹوں میں خلعت خاں بھی تھا جو لڑتا ہوا مارا گیا۔ مہابت خاں بڑا جلیل القدر امیر تھا۔ جہاں گیر کو اس نے ایک دفعہ اپنی حراست میں لے لیا تھا نور جہاں نے حکمت عملی سے اسے چھڑایا۔ عہد شاہجہانی کے ساتویں سال ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں فوت ہوا۔ چونکہ "مہری بالشی" اور اکھراوٹ کی تحریریں ایک ہی شخص کے قلم سے نکلیں، ان نسخوں کو عہد شاہجہانی یا گیارہویں صدی کے اوائل کا قرار دینا غیر مناسب نہیں۔ جتنے نسخے اکھراوٹ کے ہوں یا پدماوت کے جواب تک دریافت ہوئے یہ سب بارہویں صدی سے پیچھے نہیں جاتے۔

اب یہاں ہندی ادیبوں کی مفروضہ تاریخوں سے جو دقت پیدا ہوتی ہے اس پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ آخری کلام میں جس کا ۹۳۶ھ سال تصنیف ہے جائسی نے لکھا ہے "بھا اوتار سو۔ نو صدی۔ تیس برکھو اوپر کبی بدی" اور "آوت اودھت چار بڑھ ٹھانا ہا جو کپ جگت اکولانا" اور "سورج سیوک ہا کے رہے۔ آٹھوں پہر ہیبت تو رہے" ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر "نو صدی" میں پیدا ہوا تیس برس سے اوپر کی عمر میں اچھے شعر کہنے لگا، زلزلہ اور سورج گرہن کے ہولناک مناظر کو دیکھا اور اس کی تصویر کھینچی بداؤنی اور صاحب مخزن افاغنہ نے ۹۱۱ھ میں آگرہ اور نواح میں ایک شدید زلزلے کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر کمل کلسر لیشٹ نے ۹۰۷ھ میں سورج گرہن کا پتہ لگایا ہے۔ لکھتے ہیں "تیس برس کی آیو (عمر) میں انہوں نے یہ رچنا کی اور وے نو صدی میں پیدا ہوئے تھے۔ ۹۳۶ ہجری میں سے تیس برس نکال دینے پر ۹۰۶ ہجری میں پڑا تھا۔ جائسی ... کہہ سکتے تھے کہ وے ان کے جنم کے سمے ہی ہوئے تھے۔ نو صدی کا ارتھ یا تو کبھی کو ٹھیک ٹھیک نہ معلوم تھا یا نئی صدی سے ہی اس کا تات پریہ تھا... کبھی کہہ سکتا تھا کہ ان کا جنم ایک نئی صدی میں ہوا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کبھی نو صدی کا ارتھ ۹۰۰ کے بعد کا سمے سمجھتا ہو... یہ ۹۰۶ھ ہجری جنم سن اتنا سپشٹ نکلتا ہے کہ سہسا اس پر بنا کسی اتی ہر بل پرمان کے اوشواش نہیں کیا جا سکتا ہے۔" یہ غنیمت ہے کہ کسی اور نے ۹۰۶ھ کی تاریخ کلسر لیشٹ جی کی طرح ایسی قطعی نہیں سمجھی ہاں شکل جی دبے لفظوں میں لکھے

ہیں " نوصدی پاٹ مانیں تو جنم کال سنہ ۹۰۰ھ ہجری نکلتا ہے۔" مسٹر شریف بھی آخری کلام کے اشاروں کی بنا پر لکھتے ہیں کہ جائسی سنہ ۹۰۰ھ م ۱۴۹۴ میں زلزلے کے زمانے میں پیدا ہوئے اور شاعر کی حیثیت سے تیس برس بعد ظاہر ہوئے گریرسن اور دوویدی نے اس امر پر کچھ روشنی نہیں ڈالی۔ کلب مصطفےٰ صاحب نے بھی لکھ دیا ہے کہ جائسی بابر شاہ کے عہد میں سنہ ۹۰۰ھ میں جائس میں پیدا ہوئے۔ صدی کا صحیح مفہوم سمجھنے میں شری چندر بلی پانڈے اور ڈاکٹر سورج کانت شاستری کا نام لیا جا سکتا ہے مگر نہ جانے کس دلیل کی بنا پر انہوں نے مان لیا ہے کہ جائسی سنہ ۹۳۰ھ میں پیدا ہوئے تھے حقیقت یہ ہے کہ جائسی کو خود اصل سال پیدائش کا حال معلوم نہ تھا بنظر احتیاط کہہ دیا کہ سنہ ۹۰۰ھ اور سنہ ۹۰۰ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔ آغاز کلام کے بارے میں بھی احتیاط کا دامن نہیں چھوٹا پدماوت میں شیر شاہ اور سنہ ۹۴۰ھ (جسے کچھ لوگ غلطی سے سنہ ۹۲۰ھ سمجھ بیٹھے ہیں) کے ذکر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر اس کتاب کے آخری بند پر لوگوں نے دھیان نہیں دیا اس میں " اوستھا " اور " بل " کے جانے (صحت و قوت) کے زائل ہونے) " سریر کے کہن " (جسم کے ضعیف) ہونے بصارت کی کمی دانتوں کے جانے سے رخسار کی بے رونقی (دسن گیو کے تو جا کپولا) آواز کے جانے سے بول کی خرابی عقل کے زوال سے لوگوں کا خبطی پکارنا (بورائی) بہراپن۔ بالوں کا سفید بھورا ہو جانا سر کے ڈولنے حس و حرکت کی کمی غرض کہ ایک ستر بہتر برس کے ضعیف پیر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ پانڈے جی نے عہد شجاع الدولہ کے اودھ کے قاضی نادل حسین جائسی کی یادداشت میں ۵ رجب سنہ ۹۴۹ھ کی تاریخ وفات کو معتبر مان کر تسلیم کر لیا ہے۔ ان کے حساب سے تو جائسی ۱۱۹ برس کی عمر میں مرے اس لئے ضعیف و پیری کی تصویر صحیح ہے لیکن جنھوں نے سنہ ۹۰۰ھ سال پیدائش قرار دیا ہے وہ سنہ ۹۴۹ھ کو نہیں مان سکتے ان کے نزدیک اکھراوٹ کی تاریخ کتابت کسی طرح صحیح نہیں سمجھی جا سکتی۔ اکھراوٹ تو مسلمہ طور پر پدماوت کے پہلے کی تصنیف ہے اور یہ حال آخری کلام کا ہے موخر الذکر کے نام کی کچھ مناسبت تو ہونی چاہئے میرا خیال ہے کہ آخری کلام آخری کڑی ہے ان مختصر نظموں کی جن میں صوفی شاعر نے

قصہ کہانی سے قطع نظر گیان اور جوگ معرفت و تصوف پر زیادہ دھیان دیا ہے یا کوئی واقعہ
یا دلچسپ بات ازراہ تفنن نظم کردی ۹۴۷ھ میں بڑھاپے کی تصویر ۹۴۹ھ میں وفات کی تاریخ
اور منیر کے مجموعہ میں اکھراوٹ کے اصل کتاب کا سال کتابت ۹۱۱ھ ایک دوسرے سے
چولی دامن کا تعلق رکھتے ہیں کوئی تضاد یا تردد پیدا نہیں ہوتا۔

کچھ لوگ جائسی کا عہد اکبری میں موجود ہونا بتاتے ہیں۔ کلب مصطفےٰ صاحب
خزینۃ الاصفیا اور رسالہ عبدالقادر جائسی کے متحد القول ہونے پر ملک صاحب
کا سنہ وفات ۱۰۴۹ھ تھا زور دے کر انہیں عہد شاہجہانی میں پہنچا دیتے ہیں۔ غلام سرور
لاہوری مصنف خزینۃ الاصفیا نے شجرہ چشتیہ اور معارج الولایت
کا حوالہ دے کر جو لکھا ہے اس پر غور کرنے سے کئی کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں" الشیخ جائسی
نیز گویند و لقب او محقق ہندی است۔ مرید و خلیفہ شیخ اللہ داد و خلیفہ محمد مہدی است آنچہ
از کلام وے مفہوم می گردد ہمیں است و در کتب خود مدح او بسیار کردہ ..... او را در
زبان ہندی کتب و رسائل چنانچہ پدماوت و لہتات و آکھروٹی و پوستی نامہ
وھولی نامہ و مانند آں بسیار است سوائے آں اشعار بسیار است کہ بطرز سورٹھہ بنظم
درآمدہ صاحب شجرہ چشتیہ می گوید کہ وے باآخر عمر ارادت بخدمت الہ داد آورد و
در اندک زماں از کاملین وقت شدہ در سال یک ہزار و چہل و نہ وفات یافت و صاحب معراج
الولایت فرمودہ کہ وے تا آخر خلافت اکبر بادشاہ در قید حیات بود اما حال وفاتش درج نفرمودہ"
۱۰۴۹ھ میں بجائے اکبر شاہجہاں برسر حکومت تھا۔ آل محمد مہر جائسی فرماتے ہیں کہ ۹۹۹ھ کو کاتب
نے ۹۴۹ھ لکھ دیا۔ میرا خیال ہے کہ چہل و نہ تو صحیح لکھا گیا لیکن کسی وجہ سے نہصد کو یک ہزار
میں تبدیل کردیا گیا۔ بہرکیف ہمارے پاس اودھ کے ماضی کی یادداشت کے علاوہ کوئی قطعی
شہادت جائسی کی وفات کے متعلق نہیں ملتی اور پانڈے جی ۹۴۹ھ کی روایت کو صحیح ماننے
میں حق بجانب ہیں۔ منیر کے نسخے سے اس امر پر تو کچھ روشنی نہیں پڑتی لیکن غلام سرور مرحوم
کی اس روایت کی کہ" مرید و خلیفہ شیخ اللہ داد و خلیفہ محمد مہدی است" کی تائید ہوتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ صاحب **خزینۃ الاصفیا** کو بھی کوئی قدیم اور معتبر نسخہ ملا تھا اس لئے
جتنے نسخوں کا چاہے وہ **پدماوت** کے ہوں یا **اکھراوٹ** کے دورِ جدید کے فضلاء نے ذکر
کیا ہے ان میں جائسی کے پیر و مرشد "موحدی ۔ موحدی ۔ موہدی" نظر آتے ہیں جسے محی
الدین کی بگڑی ہوئی شکل بتائی گئی ہے تعجب ہے کہ جائسی جیسا قادر الکلام شاعر اپنے پیر کا صحیح
نام کسی طرح اور کسی جگہ نہ لا سکا یہی حال حاجی عبدالرزاق نورالعین متوفی ۹۰۵ھ کا ہے جو جائسی
کے پیرِ طریقت سید اشرف جہانگیر سمنانی کے متبنی خلیفہ مرید و جانشین تھے اور جنہیں جائسی
"حاجی شیخ" لکھتے ہیں۔ انہیں حاجی شیخ کے پانچ بیٹوں میں ایک کے بارے میں صاحب
مراۃ الاسرار نے لکھا ہے کہ "نسل پسری او از شیخ محی الدین شد" قطب
مصطفیٰ صاحب ان کا ذکر نہیں کرتے لیکن حاجی عبدالرزاق کے خلف امام شاہ احمد کی تیسری
پشت میں دو بھائیوں شاہ مبارک اور شاہ کمال کا نام لیا ہے جن کی طرف جائسی نے بھی اشارہ
کیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ **لطائف اشرفی** میں مبارک اور کمال دو مریدان حضرت
اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ کے نام آئے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ محی الدین کون تھے لیکن انہیں
علائی سلسلے کی دوسری کڑی کا بزرگ اور شیخ برہان کالپوری کا مرید بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے
کہ لوگوں نے مہدی کو زبردستی محی الدین بنا ڈالا ہے۔ شکل صاحب نے تو نہ معلوم کس بنا پر شیخ
مبارک و شیخ کمال کو "حاجی شیخ" کا پوتا قرار دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جائسی نے مبارک
شاہ بودلہ متوفی ۹۰۱ھ کی ایک عادت کا **پوستی نامہ** لکھ کر مذاق اڑایا تھا۔ پیر نے بد دعا
کی مرید کی ساری جسمانی اولاد ضائع ہو گئی پھر دعا کی برکت سے معنوی اولاد لاتعداد ثابت ہوئی۔
جنہیں پیر و مرید کے رشتہ کا علم ہے وہ اس روایت کو صحیح نہیں مان سکتے۔ شیخ برہان ۹۷۵ھ
میں فوت ہوئے لہٰذا مہدی یا محی الدین کو ان کا مرید و خلیفہ ماننے کے لئے جائسی کو کم از کم
اکبر کا ہم عصر تسلیم کرنا ہی پڑے گا لیکن نہیں تو اس کھینچا تانی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی
اس لئے کہ امین شریف کے نسخہ **اکھراوٹ** کا ستائیسواں بند اور بند ۲۸ کا تیسرا شعر ایک
ایسے سلسلے کی خبر دیتا ہے جس کی بجز ایک کے ہر کڑی دوسرے سے مربوط اور منسلک ہے

اشعار یہ ہیں (۱) پاپایوں مہدی گرمیتھا۔ ملا پنتہ منہ درسن دیتھا (۲) نانوں پیار سیکھو برہانوں۔ کلپی نگر گینہ استھانوں (۳) اونہ تین درسن کو سائیں کا پاوا۔ اللہ داد گرپنتہ لکھاوا (۴) اللہ داد جگ سدھ نویلا۔ سید محمد کے وے چیلا (۵) سید محمد مہدی سانچا۔ دانیال دینہی سدھ باچا (۶) جگ جگ امر سو ہجرت خواجی۔ ہجرت نبی رسول نیواجی (۷) دانیال تو پرکٹ کینہاں۔ ہجرت خواجہ کھدر کینہہ چینہاں" تسکل اور گپت کی گرنتھا ولیوں میں مہدی کو موہ دی لکھا ہے اور پانچویں شعر کے پہلے مصرعہ کو یوں مسخ کیا ہے" سید محمد دینہی سانچا" بند ۳۸ کے تیسرے شعر کے دوسرے مصرع" چلی او تا مل مہدی کہیوا" میں کچھ تصرف کیا ہے" ایسن چلنے موحمدی کہیوا" لیکن گپت صاحب کو اکھراوٹ کا ایک اور نسخہ ملا تھا جسے وہ زیادہ معتبر اور تشفی بخش سمجھتے ہیں اس میں 'مہدی' کا لفظ صاف طور پر موجود ہے یہ مہدی" سید محمد مہدی سانچا" تھے جنہیں مہدویت کا مقتدا مانا گیا ہے۔

تاریخ محمدی کے حوالے سے صاحب مراۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ سید احمد اور سید محمد دو بھائی جونپور میں رہتے تھے۔ بعد تحصیل علوم دونوں شیخ دانیال خضری کے مرید ہوئے جب وہ سلطان حسین شرقی کے زمانے میں جونپور تشریف لے گئے تھے شیخ دانیال کو خواجہ خضر کی صحبت نصیب ہوئی تھی۔ سید احمد تو جونپور میں رہ گئے مگر سید محمد جنہوں نے مہدی آخرالزماں ہونے کا دعویٰ کیا تھا گجرات چلے گئے۔ مرآۃ احمدی اور مرآۃ سکندری میں مرقوم ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ کے آخری ایام حکومت میں یہ جونپور پہنچے تھے اور سلطان کا ان کی طرف رجحان تھا۔ عبدالصمد مؤلف اخبار الاصفیا لکھتے ہیں کہ" سلطان محمد زبان گجرات در سلسلہ اعتقاد او در آمد" اکبری دور کا یہ تذکرہ نگار اور علامی ابوالفضل کا خواہرزادہ لکھتا ہے" میر سید محمد جونپوری ...... از مستی بادہ کشف دعوۂ مہدویہ نمود" جب علمائے روزگار بر سر پرخاش ہوئے تو" بہ گجرات رفت چوں در آنجا نیز مطعون علما شد عزم ایران زمین نمود و در فرح (بلوچستان) کوس رحلت زدہ" بدایونی صاحب منتخب التواریخ سنہ ۹۱۰ھ کے واقعات کے تحت لکھتے ہیں" دریں سال میر سید محمد جونپوری قدس اللہ سرہ از اعاظم اولیا

کبار کہ دعویٰ مہدویہ از برزدہ بود ہنگام مراجعت از مکہ معظمہ بجانب دیار ہند در بلدہ فرح داعی حق را لبیک فرمود" عبدالرحمان امیٹھوی بھی سنہ ۹۱۰ھ تاریخ وفات یا شہادت بتاتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آوف اسلام میں ۹۴۷ھ سید محمد مہدی کا سال تولد بتا دیا گیا ہے وفات کے کچھ ہی قبل جونپور اور شمالی ہند چھوڑا تھا کیا تعجب ہے اگر جائسی کہتے ہیں کہ سید محمد مہدی نے راستہ دکھایا یعنی ان کی زیارت کی اور اس امر میں" اگوا بھیئے سیکھ برہانوں" (پدماوت) دی جن کا پیارا نام شیخ برہان ہے اور جو کالپی نگر کے رہنے والے ہیں اور جنھیں اللہ داد نے راستہ دکھایا۔ اللہ داد سید محمد مہدی سچے رہنما کے معتقد تھے اور سید محمد کی تعلیم باطنی شیخ دانیال سے ملی اور دانیال حضرت خواجہ خضر کی صحبت و زیارت سے حضرت خواجہ اجمیری کی بدولت شرفیاب ہوئے۔ اخبار الاخیار۔ اخبار الاصفیاء۔ گلزار ابرار عہد اکبری کے مستند تذکرے ہیں جنھیں شیخ برہان الدین بن تاج الدین انصاری کالپوری متوفی ۱۸ جمادی الثانی سنہ ۹۷۵ھ کا دلچسپ حال مندرج ہے۔ سب نے لکھا ہے کہ یہ زاہد مرتاض تھے۔ ہندی کے شاعر تھے اور ان کا ہندی کلام بہت مقبول تھا اور کیفیت سے خالی نہ تھا ان پر مہدویت کا شبہ تھا۔ جس احترام سے مداونی ایسے کٹر مسلمان نے سید محمد کی کا ذکر کیا ہے اس سے بھی راسخ العقیدہ ملک محمد جائسی اور شیخ برہان کی بانی مہدویت سے گرویدگی میں کسی اشکال اور شبہ کی گنجائش نہیں نکلی۔ معراج الولایت کے حوالہ سے صاحب خزینۃ الاصفیا نے جو کچھ شیخ دانیال کے متعلق لکھا ہے وہ بہت اہم ہے۔ "مرید و خلیفہ راجے حامد شاہ است و صحبت با خضر علیہ السلام بود و فیض باطنی از روح خواجہ بزرگ معین الدین چشتی و حسن سجزی حاصل کرد۔ ایں شعر ہندی کہ درج کتاب معارج الولایت و شرح حروف العالیات برایں معنی دال است سہ جگ جگ عمر تو حضرت خواجی حضرت نبی رسول نیواجی۔ دانیال تو پرکٹ کنیاں۔ حضرت خواجہ خضر منہ دنیا۔ یعنی حضرت خواجہ بزرگ کہ عمر دائمی باطنی دارند خواستند کہ دانیال را ظاہر کنند و از جملہ اولیا راللہ گردانند۔ در واقعہ دانیال را خواجہ خضر علیہ السلام کردند وفات شیخ دانیال در نہ صد و نود و چہار و عمر شریفش یک صد و یازدہ

سال است" ان دو شعروں کا اکھراوٹ میں پایا جانا کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جتنے بزرگوں کا بجز حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانی اور ان کے متبنّی اور مرید و خلیفہ حاجی نور العین عبد الرزاق کے جن کا جائسی نے نام لیا ہے سب کے سب ان کے ہم عصر تھے اور انھیں سے بہتوں کے ہندی سے شغف کا ثبوت تذکروں اور ملفوظات سے ملتا ہے۔ سید راجے حامد شہ کا پدماوت میں ذکر آتا ہے "بھئے پرسن اوہی ہجرت کھاجے۔ لیئی میری جنہ سید راجے" یعنی حضرت خواجہ خضر (دانیال سے) خوش ہوئے اور جہاں سید راجے (حامد شے) تھے وہاں لے جاکر (ان سے) ملایا۔ سید راجے حامد شہ اور ان کے بیٹے سید نور الدین متوفی ۹۲۱ھ دونوں کو سید راجے کہتے تھے اوّل الذکر کے مرید مشہور فاضل شیخ اللہ داد جونپوری شارح کافیہ و بزودی تھے اور موخر الذکر کے مریدوں میں بھی ایک اللہ داد جونپوری کا نام ملتا ہے جن کا اصل نام شیخ دتین بن احمد رضی شریف تھا اور جو ۱۱ ربیع الثانی ۹۴۴ھ میں فوت ہوئے۔ سید راجے اول اور ان کے پیر و مرشد حضرت حسام الدین مانک پوری جو حضرت سید جہانگیر سمنانی کے پیر حضرت علاء الدین پنڈوی کے بیٹے اور خلیفہ نور قطب عالم پنڈوی کے مرید خاص تھے۔ ہندی میں برجستہ اشعار منظوم فرماتے تھے۔ انیس العاشقین، رفیق العارفین وغیرہ اور گنج ارشدی میں مانک پوری بزرگ اور ان کے مرید سید راجے حامد شہ کے ہندی فقرات اور ہندی اشعار موجود ہیں۔ حضرت نور قطب عالم کے مکتوبات میں بھی دوہے ملتے ہیں۔

کسی کتاب کی قدر و قیمت اصلیت و قدامت کے لئے اس کی داخلی شہادت سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے مختلف نسخوں کی جانچ پڑتال تجزیہ و تقابل سے خاطر خواہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ ماتا پرشاد گپت کی ضخیم کتاب جائسی گرنتھاولی بہت محنت، تجسس و تلاش غور و فکر ہندوستان اور غیر ہندوستان کے بہت سے نسخوں کے مطالعہ اور ناقدانہ جائزہ کے بعد مرتب کی گئی اور حال ہی میں پارسال الٰہ آباد سے شائع ہوئی پدماوت کے الحاقات و موضوعات پر کافی دھیان دیا گیا ہے بہت کچھ قطع و برید سے کام لیا گیا ہے جو کچھ

متن اصلی اور معتبر سمجھا گیا اصل کتاب میں اسے جگہ دی گئی۔ موضوعات کو ضمیمہ میں ڈال دیا گیا۔ ۱۱۰ صفحات
پر پھیلے ہوئے 'بھومیکا' میں گپت جی نے مختلف نسخوں اور مستند کتابوں پر نظر ڈالی ہے۔ لسانی
خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا۔ لیکن پدماوت ہی پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ اکھراوٹ
اور آخری کلام جوں کی توں شکل جی کے گرنتھاولی سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ گری یرسن
اور دوویدی اور ان کے تتبع میں شریف نے بھی کہیں کہیں موضوعات و الحاقات کی طرف اشارہ
کیا ہے۔ منیر شریف کے نسخوں کا ان تمام مطبوعہ کتابوں سے مقابلہ کرنے پر ہمیں اس کی اہمیت
و قدامت کا اندازہ ہوتا ہے صرف چند باتیں خاص طور پر ہم قارئین معاصر کے ذریعے ہندی
ادیبوں تک پہنچانا چاہتے ہیں (۱) اکھراوٹ کا نسخہ مکمل ہے لیکن پہلی بیت اور آخر کا بند
اس میں موجود نہیں پدماوت ناقص الطرفین ہے۔ شروع کے ۸ اوراق جن میں ۳۰ چھند یا
بند ہونے چاہئیں ضائع ہو گئے۔ آخر کا بھی دو تین چھند موجود نہیں بیچ میں بھی دو تین جگہ کچھ
اوراق غائب ہیں۔ ضائع شدہ اجزا سے قطع نظر جتنے بند شکل اور شریف نے اپنی کتابوں میں
شامل کئے ہیں ان کی مجموعی تعداد منیر کے نسخے سے جس میں صرف ۵۲۸ بند ہیں کہیں زیادہ ہے۔
گپت جی نے کاٹ چھانٹ کر ۶۵۳ رکھے ہیں ان میں وہ بھی شامل ہیں جو منیر کے نسخے سے
ضائع ہو چکے۔ کیا یہ کافی اہم امر نہیں کہ گپت جی نے جن بندوں کو الحاقی سمجھ کر چھانٹ دیا ہے
وہ کُل کے کُل منیر کے نسخے سے غائب ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں فصل ۳
کا بند ہے اور گپت جی کا نمبر ۵۵ (ملاحظہ ہو) ہے۔ سے "ایک دیوس پدماوتی رانی۔ ہیرامن تہہ
کہا سیانی۔ سے سنہو ہیرامن کہوں بوجھائی۔ دن دن مدن ستاوئی آئی۔ سے پتا ہمار نہ
چالئی باتا۔ تم ہی بولی سکتی نہیں ماتا۔ سے دیس دیس کے بر موہنی آویں۔ پتا ہمار نہ
آنکھ لگاویں۔ سے جوبن مور بھیو جس گنگا۔ دیہہ دیہہ ہم لاگ انگا۔ سے ہیرامن تب
کہا بوجھائی۔ بدھ تی کر لیکھا میٹ نہ جائی۔ سے اگیاں دیو دیکھئے بیہ سے ولیا۔ تبھی جوگ
بر ملیہ نریسا۔ سے جو لاگی میں پہری آؤں۔ من جیت گھر ہوں جیتا۔ سنت ہا کوئی ذر جس
بھی کہا بیچارہ۔" آخری شعر کے معنی یہ ہیں کہ سنگھل دیپ کے زنانہ محل میں کوئی بدمعاش گھس پڑا تھا

اس نے طوطے کی بات سنی اور راجا سے چغلی کھائی۔ ایسی اور دوسری گندی باتیں پدماوت کے کسی حصہ میں شاید نہیں ملتیں۔ کیا اس زمانہ کی تہذیب اس کی مقتضی تھی کہ ایک کنواری شہزادی جوانی سے بھرپور ایسے الفاظ زبان پر جاری کرے جس سے بے حیائی اور بے شرمی کا ترشح ہوتا ہے جوبن پھٹا پڑتا ہے ہر عضو میں کام دیوتا براجمان ہیں۔ باپ سنتے نہیں، ماں ڈر سے کہتی نہیں عشاق دیس دیس سے میرے لئے آتے ہیں لیکن پتاجی کسی کو منہ نہیں لگاتے۔ پھر یہ بھی غور فرمائیے کہ ہیرامن طوطا تو عقل مجسم اور حلّ مشکلات تھا پدماوت اسے کیا سمجھائے گی بجھائے گی۔ "سنو ہیرامن کہوں بوجھائی"۔ "مسٹر شریف اور گری یرسن کہتے ہیں" یہ ابیات یقیناً الحاقی ہیں اور ان کا اضافہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ آئندہ بند کا پہلا شعر واضح ہو جائے (" راجبین سناں دِشٹ بھئی اناں" یعنی راجا نے سنا نگاہ قہر آلود ہو گئی) یہ الحاق نہایت بھدا اور بھونڈا ہے زبان ملک محمد جائسی کی نہیں ہو سکتی۔ اور شریر مرد کی زنانہ حصہ میں موجودگی کا سبب نہیں ظاہر ہوتا" اور بھی بند ہیں جو بقول مسٹر شریف "بلاشبہ اصلی نہیں"، بعد کو کسی "نا اہل مقلد" کی دماغی اُپج کی خبر دیتے ہیں ان میں کوئی بھی منیر کے نسخے میں موجود نہیں۔ جن بندوں کو گپت جی یا گری یرسن نے اصلی نہیں مانا ہے اور جو منیر کے نسخے میں بھی نہیں پائے جاتے اُن کی فہرست خالی از دلچسپی نہیں (۱) بند ۷ فصل ۳ (۲) بند ۳ فصل ۴ (۳) بند ۸ فصل ۱۱ (۴) بند ۶ فصل ۲۳ گپت نے اسے دیا ہے (۵) بند ۴ - ۵ - ۶ - ۱۳ - ۱۴ - ۱۵ - ۱۷ - ۱۹ - ۲۴ فصل ۲۵ اس فصل میں منیر کے نسخہ میں وہی ۱۵ بند ہیں جنہیں گپت جی نے دیا ہے گری یرسن اور شکل نے ۲۴ بند رکھے ہیں (۶) بند ۱۱ - ۱۳ - ۱۳ - ۱۸ - ۱۹ فصل ۲۶۔ شکل نے ۱۹ بند دیئے ہیں، گپت نے ۱۶ دیئے ہیں لیکن منیر کے نسخے میں صرف ۱۴ ہیں (۷) بند ۲۷ - ۲۹ - ۳۱ فصل ۲۷ (۸) بند ۲ فصل ۲۹ (۹) بند ۱۲ - ۱۳ - ۱۴ فصل ۳۲ (۱۰) بند ۱۴ فصل ۳۶ اس بند میں گپت جی اور منیر کے نسخے کی ترتیب یکساں اور شکل سے مختلف ہے۔ فصل ۲۵ میں بھی یہی حال ہے (۱۱) بند ۲ فصل ۴۲ (۱۲) بند ۲ فصل ۴۷ (۱۳) فصل ۴۸ میں شکل نے ۶ بند دیئے ہیں گپت نے صرف ۳ اور یہی صرف ۳ منیر کے نسخے میں ہیں۔

(۱۴) بند ۱۱ فصل ۴۹ شکل نے ۱۷ گپت نے ۱۶ دیئے ہیں لیکن منیر کے نسخے میں صرف ۱۲ ہیں
شکل کا بند ۱۱ نہ گپت نے دیا ہے نہ منیر کے نسخہ میں ہے (۱۵) بند ۵ فصل ۵۰ (۱۶) فصل
۵۱ میں شکل کا بند ۳ گپت کا ۶۰۸ ہے لیکن یہ بند منیر کے نسخے میں نہیں ہے بند ۴ ۔ ۵ گپت
کے ۶۰۹ ۔ ۶۱۰ بھی اس نسخے میں نہیں ملتے۔ گپت نے بند ۶ کو خارج کر دیا ہے اور منیر کے
نسخے میں بھی یہ موجود نہیں (۱۷) خاتمہ میں پہلا بند شکل کا گپت نے نہیں دیا اور منیر کے نسخے
میں بھی یہ نہیں ملتا گپت کے دیئے ہوئے آخری بند شاید منیر کے نسخے میں کبھی رہے ہوں
اس لئے کہ "محمد کبی" کا ترک اسے بتاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان بندوں پر جنہیں گپت صاحب
نے بھی باقی رکھا اور جو منیر کے نسخے میں نہیں ہیں خاص کر دھیان دیا جائے مثلاً (۱) گپت کا ۲۲۲
اس نسخے میں نہیں ہے حاشیہ میں گپت جی نے ایک نسخے کا ذکر کیا ہے جس میں بھی یہ بند نہیں
پایا جاتا (۲) فصل ۲۶ کے آخری دو بند گپت کے ۲۸۹ ۔ ۲۹۰ منیر کے نسخے سے زائد ہیں۔
(۳) فصل ۴۹ کے گپت کے بند ۵۶۴ ۔ ۵۶۵ ۔ ۵۶۶ ۔ ۵۶۷ منیر کے نسخے میں نہیں ہیں۔
(۴) فصل ۵۱ میں گپت کا بند ۶۰۸ اور ۶۰۹ بھی اس نسخے میں نہیں ملتا۔

(۲) دوسری اہم بات یہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں میں بہت سے "شبد" کو 'شدھ' یا جدید
شکل میں پیش کیا گیا ہے مگر منیر کے نسخوں میں ان کی صورت غالباً وہی ہے جو دسویں صدی میں
رائج تھی جائسی نہ تو سنسکرت کے رسیا تھے نہ کھڑی بولی کے تت سم کی جگہ زیادہ تر اُن کی
زبان پر تدبھو نے لے لی تھی مگر عربی فارسی لفظ ہندی شکل میں بولتے اور لکھتے تھے کہیں کہیں
دو چار لفظ کو دو تین طرح استعمال کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شکلیں بدل رہی تھیں بہرکیف منیر کے
نسخے میں ہم بجائے امرت کے انبرت۔ پُرش کے پُرکھ۔ پرکچھ کے برکھ۔ پلش کے بجھ۔
اوشدھ کے اوکھد۔ بکھیا کے وِکھا۔ انگور کے انجور۔ سانس کے سوانس۔ سورج کے سوریا
سرج گیہوں کے گوہوں۔ توتا کے توٹل۔ آنچل کے آنچر۔ مدد کے مدت۔ سلطان کے سرطان۔
بادشاہ کے باتشاہ۔ پُل صراط کے پُرصراط۔ ذکر کے جکر۔ پرلئے کے کیامت۔ میور یا مجور کے
منجور۔ سکھی کے سنکھی۔ سنگترا کے سنگدرا۔ چوم کے جونب۔ کیلاس کے کبلاس نادوں

کے ناؤں - پہلے کے پہلیں - آنسو کے آنس - چھوڑ کے چھاؤ - کہاں کے کہتوں - دوسرے کے دوجیں وغیرہ ہم پاتے ہیں -

(۳) ایک اور امر قابل غور یہ ہے کہ سارے مجموعہ میں کسی جگہ ھے ہائے ہوز کے بعد یائے مجہول یا لمبی 'ے' کے ساتھ نہیں ملتی - اکھراوٹ ایک چھوٹی سی کتاب ہے اس میں شکل اور گپت نے ۱۶ جگہ 'ھے' کا استعمال کیا ہے لیکن پیش نظر نسخوں میں یہ لفظ یا تو سرے سے غائب ہے یا کوئی اور لفظ اس کی جگہ مستعمل ہوا ہے "سو بڈھ بنتہ محمد کبیرا - ات نرمل کبلاس بسیرا" (۲۵ - ۵) مطبوعہ کتابوں میں ات کی جگہ ہے اور کبلاس کی جگہ کیلاس ہے "تون سیوک ہیں مورنتارا" (۶ - ۴) مطبوعہ میں ہیں کی جگہ ہے ہے - اسی طرح "دکھ ہوئی نرک جوا یچی روکو" (۹ - ۵) کہا کھیلا رجس ھوی دوئی کرا" (۸ - ۱) میں ھوئی کی جگہ ہے ہے "سن پہلین ستی اوتپائی - سن عتیں اُوپجی بہو بہا بنتی" (۳۰ - ۲) مطبوعہ میں پہلا مصرع اس طرح ہے "جہوان کچھو نہیں ہے - ست کرا" کچھو تہ سبہ کرا - جہو ھیں - جہوجہ تہاں سبہ بہرا" (۲۹ - ۶) مطبوعہ میں پہلا مصرع اس طرح ہے "جہواں کچھو نہیں ہے ست کرا" اردہ اردہ دوئی مکہ ہی ہیں - پرکٹ کپت کھا جس وٹیس (۳۳ - ۲) یہ شعر اس طرح چھاپا گیا ہے "اردہ اردہ اس سے دوئی ھتیا - پرکٹ گپت بریں جس دیا" اسی بند کا پانچواں شعر منیر کے نسخہ میں یوں ہے "تاکہنہ ایک منتر میں ساجا - جیں وہ سکہا جائی سو بہاجا" مطبوعہ اس طرح ہے "تاکہنہ منتر ایک ہے سانچا جو وہ پڑھے جائے سو بانچا" بند ۳ کے دوہے میں مطبوعہ "جو کچھو ہے سو ہے سب اوہی بنو نا نہیں کوئی" منیر کے نسخہ میں اس طرح "جو کچھ سو ہو نہیں سب موہ بن نانہیں کوئی" بند ۱۵ کا پہلا شعر منیر کے نسخے میں اس طرح ہے "سن چیلا جس جگ ہوی اونان - سبہ بہتر او باہر یونان اور مطبوعہ میں یوں "سنو چیلا ایہی جگ کرا ونا - سب باہر بہتر ہے یونا" دو جگہ البتہ ھی سے ھے کا مفہوم مترشح ہوتا ہے "دودھ مانجھہ جیون گھیو ہی سمند مانجھہ جس مونت - نین میچ جو دیکھیو چمکی اٹھیے تس جوت" خفیف اختلاف سے مطبوعہ شعر یوں ہے "دودھ مانجھہ جس گھیو ہے سمند مانہہ جس موتی - نین میچ جو دیکھیو چمکی اوٹھیے تس جوتی" (۲۵ - د) اور بند ۱۹ کے

تیسرے شعر میں شاید کاتب محمد مقیم نے کچھ غلطی کی ہے اور اس طرح لکھا ہے " جو پی جگ چھاوت ہی مزمان۔ تیہی کنہ مور تور کا کرنا۔" ہے کی مثالیں مطبوعہ پدماوت میں جو ایک ضخیم کتاب ہے خال خال ہی پائی جاتی ہیں منیر کے نسخے میں ہر جگہ یائے معروف یا گول ی کا استعمال پایا جاتا ہے " ہی آگیں پربت کی باتی۔ بگھم پہار اگم ستہ کہا نتی " (ف ۱۲۔ ب ۸) " گرب پربت گھتی ہی کا جا " (۱۱۔ ۵) لیکن ایسی بھی مثال ملتی ہے جس میں 'ہے' غائب ہے۔ گپت جی کے چھند ۲۲۰ کے سورٹھ کا پہلا شعر یوں ہے " وہ رانی جو ہی جوگ ہے تیہی ک راج او پاٹ " منیر کے نسخے میں اس طرح ہے " وہ رانی جو جوگت تیہی راج اوپات " (۲۳۔ ۴) صرف ایک جگہ منیر کے نسخہ پدماوت میں ہے یائے مجہول کے ساتھ مرقوم ہے " جہاں نہ رات دیوس ہے نہ پون پچھاں (۵۔ ۳) کھڑی بولی میں سنسکرت اور فارسی ہست یا است کی یہ شکل بہت پہلے سے ملتی ہے ایک بہاری بزرگ حضرت قاضن شطاری جنہوں نے ۸۸۱ھ میں مانڈو میں خرقہ خلافت حضرت عبداللہ شطاری سے پایا میرے مورث اعلیٰ اور سہروردیہ سلسلے کے مشہور صوفی بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت متوفی ۷۸۵ھ کا فقرہ کھندا ہے پھندا کہاں " اپنی کتاب معدن الاسرار میں جس کے قدیم نسخے پھلواری اور منیر میں موجود ہیں نقل کیا ہے لیکن ہے کی موجودہ شکل قدیم بھاشاؤں میں نہیں کے برابر ہے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنی قابل قدر کتاب اودھی کا ارتقا میں البتہ جائسی کے تھو۔ اَتھو۔ اَھد او۔ اھے۔ اھی۔ آہی۔ ہاہی کے ساتھ ہے کو بھی شامل کیا ہے۔

(۴) الفاظ و عبارت کے ہیر پھیر اور متن کے اختلافات سے صحت اصلیت قدامت یا تصرفات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ہم پہلے چند مثالیں اکھراوٹ سے پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں (۱) سے " کھون شریعت چشتی پیرو۔ سید اشرف جہانگیر و سے چہ کریں اس کھیوک جہلا۔ جائی طریقت منہ سوچیلا شے راہ حقیقت پری نہ چوکی۔ پنتہ محبت لینہ بڑکی " (بند ۲۶) اس کے مقابلے میں ہم دو مطبوعہ مصرعوں پر خاص کر نظر ڈالتے ہیں " اوو ھرت اشرف او جہانگیر و " اور " جائی اوتاری نہ بینے سو چیلا " کیا جائسی اپنے نہایت ممدوح ہادی طریقت

کے نام کے ایک اہم جزو 'سید' کی جگہ اودھرت' کا استعمال ضروری سمجھے ہوں گے پھر او' کا جوڑ بھی محل نظر ہے ۔ جب جائسی جیسے صوفی شریعت معرفت اور حقیقت کے اصطلاحی الفاظ لاتے ہیں' تو پھر چوتھے لفظ طریقت کو کیوں نظر انداز کر گئے اور اس کی جگہ "اونار ی تر بھے" کو قابل ترجیح سمجھا ہے (۲) ؎ " سات برس جو پکاری بیٹھو ۔ کہن یک کہے جات مل جیو ؎ جانہہ دولوں برابر سیوا ۔ چلی اونائل مہدی اکھیوا " (بند ۳۸) گپت اور شکل کے یہاں یہ شعر یوں ہیں " ساہی برس جو لیئی جھپئی جہن ایک گپت جاپ جو جپئی جانہ ہو ۔ دوؤ برابر سیوا ۔ ایس چلے موحمدی کہیوا " سات ساٹھ ہو سکتا ہے اس لئے کہ فارسی میں ٹ نہیں ہے لیکن اور تبدیلی کیسے واقع ہوئی کیا مہدی کو محی الدین کے قریب لانا ضروری تھا ؟ (۳) ؎ ایمان دسی دی لتیں من کا نتھا ۔ پورہی راجہ بھیم سون ساتھا ؎ وہ ندیکہی رات براتی ۔ کرکہہ بینۃ کر ست سون بنائی ؎ کرکہہ لائی کرنبا ایبسو ۔ نری نہوی دھنی نہ سیسو ؎ لا الہ کی ناری مینچے الا اللہ کہہ رہا تھا کھینچے ؎ سدہ مارگ وہ پہنچا جائی جو یہ بہانت کری ست پائی ؎ بہلا شریعت مارگ کا ہو کہ کچھ نہ لبسائی ۔ دھرے باؤ وہ سیدھی ترت پہونچی جائی ؎ من استھر کے نیک دوسر کنہاں چھاؤ ۔ دی ۔ آؤ انت ہن ایک محمد کہہ دوسر کہاں " (بند ۴۴) مطبوعہ اشعار کا مقابلہ کرنے سے اختلافات واضح ہو جائیں گے ۔ تیسرا شعر تو بالکل مختلف ہے اور پانچویں کا بدل " لائی لائی کے نری چڑھائی ۔ ایلا للہ کے ڈوری چلائی " تو کافی مضحکہ خیز ہے ۔ من اور ایمان کا فرق ظاہر ہے ۔ دوہے کا پہلا مصرعہ " چلنے سانس تیہی مارگ جو ہی سے تارن ہوئی " بیج بالکل بدلا ہوا ہے اور باتوں سے ہم قطع نظر کرتے ہیں (۴) ؎ " احد جھنیں بہا احمد دوجا ۔ آپن لاگ کری سب پوجا " ؎ " انہد سبد ہ رہی تس لاگی ۔ کہن نسبھاری سو وت جاگی " مطبوعہ میں یہ یوں ہے ۔ انہد تے بہا آدم دوجا ۔ آپ نگر کروائیں پوجا " اور " انہد سوتن رھے سن لاگے ۔ کبھوں نہ لبسرے سوئے جاگے (بند ۵) بہادی چار یو مرسل کنہوں ۔ (۵) بہادی چار کتابیں بھنوں " مطبوعہ میں " مرشد " اور " پڑھنوں ہے ۔ حالانکہ چار جلیل القدر صاحب کتاب انبیائے مرسلین کا درجہ مسلمانوں کے نزدیک ظاہر ہے (۶) " ذکر پاس الفاس کہت رہی

تسبیح جیوں۔ بکت رہی ہر سو سواس محمد نرمل ہوئی تب"۔ (بند ۳۹) گپت اور شکل اسے اس طرح لکھتے ہیں "جیکر پاس الفانس کہوھی سے فیکر سنہار کے۔ کہت رہے ہر سانس محمد نرمل ہوئی تب"۔ یہاں ذکر تسبیح سواس بکت پر خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ادبی حیثیت سے غالباً پہلے بند کا یہ دوہا "کہا کیا ان کیگہر اسب آکھر ہیں لیکھ۔ پنڈت پدھی اکھروئی جو رہ توتی دیکھ" بہتر قرأت مہیا کرتا ہے بہ نسبت مطبوعہ کے "کہوں سوگیاں گگہر سب آکر منہ لیکھ۔ پنڈت پڑھے اکھراوتی توٹا جو رہتو دیکھ"۔

الغرض اختلافات بے شمار ہیں اور تصرفات کا کافی احتمال ہے یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ گپت جی نے جو ایک دوسرا قدیم نسخہ اکھراوٹ کا چھپائی شروع ہو جانے کے بعد شری گوپال چندر سنگھ سے حاصل کیا اور جس کے اختلافات کی طرف ضمیمہ میں اشارات کر دیئے اور جسے وہ زیادہ معتبر اور تشفی بخش سمجھتے ہیں بہت حد تک منیر کے نسخے سے ملتا جلتا ہے (۱) پہلی بیت دونوں میں غائب ہے (۲) کہیں کہیں ترتیب میں مطابقت ہے علاوہ اور بیتوں کی ترتیب کے ان دونوں میں چھ بند یا بند ۶ کا سورٹھہ ۴ میں دیا ہوا ہے اور بند ۵ کا سورٹھہ بند ۶ میں ملتا ہے بند ۴۴ میں سورٹھہ ۴۵ کا ہے اور ۴۵ میں ۴۴ کا۔ کون کس جگہ زیادہ دلچسپ ہے ہندی ادیب ہی اس کا فیصلہ کریں (۳) الفاظ و عبارت میں شائع شدہ کتاب کی بہ نسبت ان دونوں میں کافی یکسانیت ہے گو گپت جی کا یہ نیا نسخہ مجموعی طور پر متن کے اعتبار سے مطبوعہ نسخہ کے قریب تر ہے۔ جن مقامات پر نئے نسخے اور منیر کے نسخے بہت حد تک ملتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: بند ۱۲ بیت ۶-۷، بند ۱۴ بیت ۲-۵-۷، بند ۲۹ بیت ۵-۶، بند ۳۱ بیت ۳، بند ۳۵ بیت ۲-۶، بند ۳۶ بیت ۵، بند ۳۷ بیت ۷ بند ۴۰ بیت ۱، بند ۴۱ بیت ۲-۵، بند ۴۲ بیت ۳، بند ۴۴ بیت ۵-۶-۸، بند ۴۶ بیت ۳، بند ۴۷ بیت ۳-۵-۷ بند ۴۹ بیت ۲، بند ۵۰ بیت ۷، بند ۵۱ بیت ۲-۴

(۵) پد مادتے کے اختلافات بھی قابل غور ہیں مجموعی حیثیت سے منیر شریف کے نسخہ کا متن گریرسن اور گپت کے پاٹھ (قرأت) کے بہ نسبت شکل جی کے پاٹھ کے

قریب تر ہے۔ گپت جی کا مانا ہوا پاٹھ منیری نسخے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے گو اختلافات ان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ گپت جی کا بند ۲۳۳ گریرسن کا ۲۲۸ شکل اور شریف کا کینٹو ۲۲ بند ۱۷ جو منیری نسخہ کا بند ۱۶ ہے ملاحظہ ہو۔ اس میں جائسی نے اپنے سے پہلے کے مسلمان شاعروں کی ہندی منظوم کتابوں کی طرف شاید اشارہ کیا ہے [۱] " اب جو سور گگن چڑھ آدس۔ راہ ہوں تو سس کنہ پادس [۲] بہنہ آیس سہ جیو پر کھیلا۔ تون جوگی کہ مانہ اکیلا [۳] بکرم دھنسا ہیم کے باراں۔ چھنپاوتی کنہ گو تپاراں [۴] سدی بچہ مگہداوت لاگی۔ کنکن پور ہوئیگا بیراگی [۵] راج کنور کنچن پور گئو۔ مرگاوت کنہ جوگی بھؤ [۶] سادہ کنوار کندباوت جوگو۔ مدھومالت کنہ کینہ بیوگو [۷] پیماوت کنہ سرسُر سا ندھا۔ اوکھالاک انیرودھ بر باندھا [۸] ہوں رانی پدماوت سات سرگ پر باس۔ ہاتھ چڑھوں ھوں تیھکی پرتھمہ کری اپ ناس "
یعنی اب جو آفتاب آسمان پر بلند ہوا اور ستاروں کی راہ ماہتاب نے مجھے پالیا۔ جنہوں نے اس طرح میرے لئے جان پر کھیلا تو جوگی کیسا ہے کہ اکیلا دکھائی دیتا ہے۔ بکرم جو فضائے عشق میں داخل ہوا تو چھنپاوٹ تحت الثریٰ میں پہنچ گئی۔ راجہ بھوج بھی مگہ داوت کے عشق میں کنکن پور بیراگی ہو کر پہنچا۔ راج کنور بھی کنچن پور مرگاوت کے عشق میں جوگی بن کر گیا۔ کنور نے بھی کھنداوٹ کے عشق میں جوگ سادھا۔ مدھومالتی نے بھی کسی کے واسطے بیوگ سہا۔ پیماوت کے لئے راجہ سر نے چتا لگائی ـــــ اور اوکھا (اوشا) کی لاگ میں انیرودھ .... باندھا گیا۔ میں رانی ہوں اور میری جگہ ساتویں آسمان پر ہے۔ جو شخص خود کو فنا کر دے وہی مجھے پا سکے گا۔ طوالت کے خوف سے ہم مطبوعہ متنوں کو نہیں دے سکتے۔ علاوہ ازیں یہ کتابیں عسیر الحصول بھی نہیں ہیں۔ معمولی اختلافات کے علاوہ چنتاوتی کی جگہ سپناوتی (شکل) مدھو باج کی جگہ سوئی بچہ کو گریرسن اور گپت نے بھی صحیح سمجھا ہے کندباوت گندباوت میں فرق نہیں چندر بلی پانڈے نے ان اشعار میں جائسی سے پہلے کی نظموں کی طرف دھیان دلایا ہے۔ کلب مصطفٰے صاحب لکھتے ہیں " وکرم دت اور اُشا (اُکھا) انی رودھ کی مشہور کہانیوں کے علاوہ چند اور چار عشق کی داستانیں ملک محمد جائسی کے پہلے لکھی گئی ہیں ان میں سے مرگاوتی اور

مدھومالتی تو مل گئی ہیں لیکن پریمادت اور مگدھاوتی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ملک محمد نے
پدماوت انہیں نظموں کے طرز پر لکھی ہے۔

"ص ۱۶۔ شری گنیش پرشاد دویدی نے ناگری پرچارنی پتریکا جلد ۱۴ میں لکھا ہے
کہ ایسی کہانیاں لکھنے والوں میں سب سے پہلے جن کا کلام ملا ہے شیخ قطبن ہیں یہ چشتی سلسلے کے
شیخ برہان کے تربیت یافتہ تھے اور ان کی کتاب مرگاوتی جس کا سال تصنیف ۹۰۹ھ ہجری
ہے پہلی مشہور کتاب ہے۔" شیخ منجھن مدھومالتی کے مصنف تھے۔

اب ہم چند ٹکڑوں کو منیر کے نسخے سے نقل کرتے ہیں جو شکل ای کے متن سے مختلف
اور گری یرسن اور گپت کے متن سے قریب تر ہیں (۱) فصل (کینٹو ۲) کے بند ۹۔ ۱۰۔ ۱۲۔ ۱۵۔
۱۷۔ ۱۸۔ ۲۲ فصل ۲ کے بند ۳۔ ۶۔ ۷۔ فصل ۴ کے بند ۳۔ ۵ فصل ۶ کے بند ۱ فصل ۷ کے
بند ۲۔ ۵۔ ۷۔ ۹ فصل ۸ کے بند ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۷۔ فصل ۸ کے بند ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ فصل ۹ کے
بند ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴ فصل ۱۰ کے ۴۔ ۷۔ ۱۰ فصل ۱۱ کے بند ۴ فصل ۱۲ کے بند ۶۔ ۷ فصل ۱۳ کے
بند ۱۔ ۵ فصل ۱۸ کے بند ۶ فصل ۲۲ کے بند ۶۔ ۷ فصل ۲۳ کے بند ۵۔ ۹۔ ۱۹ فصل ۲۴ کے
بند ۵۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۲۱ وغیرہ کے بہت سے ابیات یا مصرعے اس کی مثال ہیں۔ کہیں کہیں منیر کی
متن شکل سے زیادہ ملتا ہے مگر بہت کم جیسے فصل ۷ کے بند ۹ کے سورٹھہ کا آخری مصرعہ اور فصل
۱۰ کے بند ۴ کا دوسرا شعر اور فصل ۲۳ کے بند ۵ کا تیسرا شعر۔ کہیں کہیں منیر کی متن سارے مطبوعہ
مصرعوں یا شعر سے مختلف ہے مثلاً فصل ۲۳ کے بند ۱۹ (شکل ۲۰) کے ابیات منیر کے نسخے میں
اس طرح مرقوم ہیں (۱) "موجہ آس پاس موپاوا۔ بہری سانس پیت جیو آوا ؎ دیکھس جاگ
سو وا تپی تہاوا۔ کرو کہ پچن دیکھہ کہ کاوہا ؎ سبد بول کی تروان آکھیلا۔ گرد بولا بیک چل چیلا۔
؎ بول سوانس تو سون من لائیں جوڑی مارک دشت لگائیں ؎ اداس کہ مون نین لپارے۔
درسن چاہیوں روپ تمہارے" اس کا ساتواں شعر کسی مطبوعہ کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ اس کی جگہ
شکل اور گری یرسن نے منیر ہی نسخہ کا چھٹاں شعر دیا ہے اور گپت نے ایک نئی بیت پیش کی ہے
"اڈھبا جیولی بروسے ذسماا۔ کنتھا مکٹ بھرزا۔" اس بند میں کل مطبوعہ نسخوں کی چوتھی بیت

"تہہیں آل گیتہ آپو بسے گیوا - بھول مٹوا کے . پچ پر یوا" منیر کے نسخہ سے غائب ہے مگر بند مکمل ہے دیگر اختلافات کو ہم نظر انداز کرتے ہیں اسی طرح فصل ۱۵ کے بند ۷ (گپت ۱۰۶ - گری پرسن ۱۰۸) کا ساتواں شعر منیر کے نسخہ میں یہ ہے " دھی پنتھہ سب کا ہو جاناں ۔ ہوئی دوجیر بسواس نیاناں" یعنی اسی راہ میں سب کو جانا ہے جس میں دوئی ہے قابلِ اعتبار نہیں ۔ اس کی جگہ گری پرسن نے یہ بیت دی ہے " ایہہ ری ٹھاون کنہ گرو سنگ . بھجئی . گرو سنگ ہوئی پار نہ ادا کیجئے ۔" لیکن گپت کے یہاں یہ بیت دوسری ہے اور شکل کے یہاں ساتویں منیر کے نسخہ کی چھٹویں لیکن جہاں تک ترتیب ابیات کا تعلق ہے ہمارا نسخہ زیادہ تر گری پرسن اور دو ویدی اور گپت کی شائع کردہ کتابوں سے ملتا جلتا ہے ۔

یہ مثالیں بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کی گئیں ۔ مقالہ بہت طویل ہو گیا اور ابھی ہمیں مجموعہ کے دوسرے اجزا پر بھی ایک جھلتی نظر ڈالنی ہے پد ماوت اور اکھراوٹ کے درمیان ۱۶ صفحات پر برہان بکس اور نکسن یا بکس کہاں کے اودھی زبان میں متعدد اشعار پائے جاتے ہیں جن سے ہندی داں طبقہ بالکل ناواقف ہے پہلے دو صفحات میں ہندوستان کے مختلف مہینوں کے نام پر چار چار مصرعوں کے گیارہ 'اریل' ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا ورق اس کا غائب ہو گیا صفحہ کا نمبر ۳ موجود ہے ان دو شعروں سے دفعتاً اس جزو کا آغاز ہوتا ہے ۔

" سے سنکھر مانس میں بیت جمی جگ جانیھے ۔ میں سیت نہ نا ریو نبلھم مانھئے سے مندر مندہ ہیر اس ہلاسس کو آدھے ۔ برہان موکنہ کنت لبسار دنہ کا کنہ راد ھئے ۔" یعنی میرے من میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے . یعنی جوش و اُمنگ جاتا رہا یہ دنیا جانتی ہے اور میرے من کو نہ عورتیں لبھا سکتی ہیں نہ گیت نہ نو ٹلیاں بھی یہ مانتی ہیں لیکن دل کے مندر میں اٹھکھیلیاں کرتی ہیں اے برہان میرا محبوب کہاں ہے جس طرح کرشن اور رادھا ایک دوسرے سے دور ہیں یہ بھی مجھ سے جدا ہے ۔ اریل پوس کے تحت یہ اشعار ملتے ہیں " سے پوس کہوں کہ بیر بیُن کر جانگی ۔ کون سکھی ہم بیہہ ملا دے آنگی ۔" یعنی پوس کے مہینہ کی بات میں کیا کہوں اس سے تو بیر ہوں (افتراق) کی جانکاری ہوتی ہے کون ہمارا ساتھی ایسا ہے جو ہمارے محبوب کو ہم سے ملا دے " ہے تا کی ہوں بلہار جو باؤ کہ مبنتہ ۔

برہان جا پرشاد پیاری کہہ بہنتہ۔" یعنی میں اس پر قربان جاؤں (بلہار) جو اس دکھ کو مٹا دے اور جس کی مہربانی سے برہان کو اس کی پیاری مل جائے۔ 'اریل' ماگھ کے عنوان سے یہ شعر ہیں۔ "ماگھو مانس بن کنت سیج نہ پائی۔ برہ دسو ھوئی ناک کہوں کٹ جائی۔" یعنی ماگھ کے مہینہ میں محبوب کے بغیر میں بستر پر قدم نہیں رکھ سکتی۔ جدائی کی حالت میں ایسا کرنا شرم کی بات ہے "کاڑھوں کہہ دلیس بھیس کنہ کیجئی۔ برہان بکس بیہہ کو نیہ سمجھ سکئی" یعنی تم کیوں دیس اور بھیس گوراری چڑیا (ٹھٹھری) کا اختیار نہیں کرتے۔ برہان بکس کہتے ہیں کہ تم عشق محبوب کو اسی طرح سمجھ سکتے ہو۔ اس کے بعد ہر مہینوں کنوار تک کے تحت اور اشعار ہیں محض برہان ۶ جگہ اور برہان بکس چار جگہ آیا ہے بکس کی وجہ سے وقت پیدا ہو گئی۔ ورنہ ان اشعار کو شیخ برہان الدین کالپوری یا جائسی کے نالوں پیار سیکھو برہانون یعنی قطبن مصنف مرگاوتی کے پیر سے منسوب کیا جاتا۔

اریل کے بعد ہی تقریباً ۱۱۲ اشعار بارہ ماسہ کے طرز پر ملتے ہیں۔ سرخ روشنائی سے کہیں پر 'چھند' کہیں 'سورٹھ' کہیں 'کوندلیاں' کہیں چوپائی بند کے عنوانات درج ہیں کئی جگہ محض بکسن اور بعض چھندوں میں "بکس کہاں پہ ہو" کی تکرار آخری مصرعوں میں پائی جاتی ہے۔ جس سے شاعر کے تخلص کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ بکسن کون تھے اور بخش خاں یہی تھے۔ یا کوئی دوسرے "بکس کہاں پر ہو چوک کون دھوں ہر لبسار جو موہ دیو" "بکس کہاں پیہ درسن کارن اس لاگو ھی دھیا" "بکس کہاں پہ ہو بیہ تن موہ برہ بہر سدا چور" "پیم سمندر آمو کھ بکسن تیر کو کیوں لائیے" "کوندلیوں میں ہر جگہ بکسن ہی آیا ہے کہیں بکس کہاں نہیں پایا جاتا (۱) "بکسن داداں برہ کو دکھ دیت موہ کام" (۲) بکسن دشت میار کی بیک لیہو سدہ تنی" (۳) کاتک کرت انند جگ رحس معلاس انیک بکسن پر تم کی چلی کل نہوت پل ایک (۴) ماور برہ بیوگ سو بکسن بن من بھاؤن نیر بانک بن کنت جی وا ایک بہو ساون۔" اس کے بعد "چوپائی بند" کے تحت کئی بند ملتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو "چڑھا اساڑھ گگن گہرا ناں۔ تڑپی ندب تر اس جی ماناں" یعنی اساڑھ کا مہینہ آیا بادل گرجنے لگے تڑپتے ہوئے دل کی پیاس بجھنے لگی ہے۔

پنچھن گرہ کی لینہ لبیرا۔ کنت کٹھن بہو، کینہ نہ پھیرا"۔ یعنی چڑیوں نے اپنے اپنے گھروں (گھونسلوں) میں لبیرا لیا لیکن ابھی ہمارا محبوب واپس نہیں لوٹا ؎ ایہی مانس چہاجن جس چھادی۔ پردیسی سدہ کی گہر آدی" یعنی اس مہینہ میں جب آسمان پر بادل چھاجاتے ہیں تو پردیسی کو اپنے گھر کی سدھ بدھ ہوتی رہے ؎ "تم پیہ بیلنب بدلیسنہ رہے۔ ہم تن دکھہ دہ جات نہ سہے" "تم میرے محبوب بدیس ہی ٹھہرے رہے ہمارے تن میں جو دکھ ہو رہا ہے اسے سہا نہیں جاتا ؎ "بیلہ لتا رو کہن لپٹانی۔ تنہ دیکھ پیہ بیر بجانی" یعنی درخت میں لتوں نے گھیرا ڈال دیا اس کو دیکھ کر جو دکھ عاشق کو ہوتا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ؎ "مور سور سُنگی مردں ھیا نباندھے دھیر۔ لاکت مند سمیر ہوئی نکس جات جم تیر"۔ یعنی مور کا شور سن کر اور سردوں کے کلور کو دیکھ کر دل سے صبر و قرار جاتا رہا۔ سمیر کی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور اس طرح بدن میں چبھ رہی ہے جیسے جم (ملک الموت) کا تیر۔ پہلا بندیوں ہے ؎۱ کاتک مانس چہاد یہہ کہی۔ سیس سیتل ہم کنہ پرب بھئی ؎۲ کی کہر سال بان کنہ دینی۔ چاہت ہیں پین سرکینی ؎۳ مارن کو من منہ سنوارے۔ آسی بجائی لیہو پیہ پیارے ؎۴ جی ادھرن آدی بہر جائے۔ ادھ ادھار رہی تہھرا مٹھے ؎۵ ابھوں آئے پیا گھر میرے۔ ہا ہا پران راکھو ہیہ ہیرے ؎۶ پران گیان تن من سکل سکھ سجم نہ اس۔ راکھو اودھ ادھار دی نت ہوئی جات تراس" ان بندوں میں کسی جگہ تخلص کا پتہ نہیں چلتا لیکن بعض مقامات پر موجود ہے۔ سورٹھ ...... " اب سکہ مانہ سیج جیدہ پوجی من کی آس۔ بکمن ہرکہ انند ھیں نت آنتہ کرہ بیر اس" ؎ "جیست چا۔ ایکو نہیں یہ بسنت گہر نار۔ تا پر برہ بیوگ یہ بکمن واہت آنہ" ؎ "ساون میکہ ابور جل تم نس تہنکی جو نیج۔ تا پر جو جہر لالے رہی کہوں بکمن کم سیج" آخری شعر اس سارے جزو کا جس کا نام بیوگ ساگر ہے اس طرح پڑھا جا سکا ہے "کشن کنوار پرسن بھئی اودا یابہ کینہہ۔ بکمن ملی آنند سو سورہ نوندہ دینہ" یعنی کرشن کمار خوش ہوئے اور ان کی دیا حاصل ہوئی اور بکمن کے دل کو مسرت پہونچی۔ سولہ قسم کی خوشیاں نصیب ہوئیں۔

بیوگ ساگر کے بعد کا نسخہ اکھراوٹ ہے جس صفحہ میں اکھراوٹ کا تمہ ہے اسی سے ایک لامعلوم الاسم کتاب شروع ہو جاتی ہے جس کی "تاریخ کتابت

سہ ہے ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے بعد اس بند سے آغاز ہوتا ہے سلہ جنہ کل
بیلسوا یہ اسیل گجیدل دُلملیو ۔ سادھن ہمُ نی کھیہ پرتھمیں چنبہاں 'ان ہو۔" یعنی ہمارے دل
نے جس کل (خاندان) میں بیلاس (کھیل) کیا اس نے اس دل کو مل دل دیا (میرے عشق کو
ٹھکرادیا) اس لئے سادھن کہتے ہیں کہ میرے دل میں تیز چبھن پیدا ہوئی کیونکہ پہلے کی جان پہچان
نہ رہی سلہ جاتا دیکھوں اپہ سنسار و۔ کالو کاتہ دہرہ پیارو" یعنی اس دنیا کو میں آنی جانی دیکھی
زمانہ (کال) کے ہاتھوں پہ ٹھہرنے والی نہیں سلہ پانی ایس ببلا ہوئے۔ جو آدا سو رہا نکوئے"
زندگی پانی کے بلبلہ کی طرح ہے جو پیدا ہوا رہنے والا نہیں سلہ پہلیں جن جو دیئے ابانی آوت
دیکھیے جات نہ جانی" "جنھیں دنیا میں آنے دیا گیا ان سب کو آتے ہوئے تو دیکھا جاتے نہیں
دیکھا سلہ یک جیت نرندان کیہناں ۔ پرتھیں رہانہ تھکر چنہاں" ایسے راجا جو چھتر پتی
تھے ان کا بھی نام ونشان مٹ گیا سلہ ہم بن دن یک چل چل اکھیں۔ نکہ اکھر سمجھو تا کہیں"
ہیں اور دن دونوں چنچل ہیں (عارضی) میں جو سمجھتا ہوں حروف کی شکل میں پیش کرتا ہوں سلہ
دھواں کیر دھورا ہر پرتھمیں کوئی نہ ہاندان ۔ سادھن روئی دتہاری جیوں جیوں منہ تنواں"
دنیا گیا ہے دھواں کا ڈھیر اس میں جو بھی آیا ہمیشہ نہیں رہا سادھن کہتا ہے جوں جوں میں اپنی
بےبسی محسوس کرتا ہوں رو رو کر قریب المرگ ہوتا جاتا ہوں سلہ کوڑی کوڑی جوڑ موٹی چن کر
بن پاپری لگی کہ نت کرور من پچھتاوا پایہ" یعنی کوڑی کوڑی جوڑ کر دھن دولت اکٹھا کیا۔
اور بن دان کیا لیکن یہ فیاضی بیجا کی (فضول ثابت ہوئی)۔ اچھلے کودتے کروڑوں من جمع کیا
لیکن آخر میں پاپ کو پچھتانا ہی پڑا۔ شاعر سادھن نے اس نظم میں دنیائے ناپائیدار اور عالم بے بقا
کی طرف اشارہ کرکے لوگوں کو عبرت دلائی ہے اور متنبہ کیا ہے کہ جو زراندوزی اور دنیا طلبی
میں سرشار رہتے ہیں خائب وخاسر ہوکر ہمیشہ کے لئے عمر فانی کو خیرباد کہتے ہیں۔ اس قسم کے
اور بھی اشعار پائے جاتے ہیں نظم ایک کہانی کی صورت میں پیش کی گئی ہے جیسے مینا مالن
کی کہانی اگر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا سلہ مالن جانی مندر منہ پیٹھے ۔ میناں جہاں سنگھاسن بیٹھے"
اس نظم میں بھی مہینوں کا التزام ملحوظ رکھا گیا ہے سلہ ساون میناں آئی تلاں اں ۔ گہر گمر سنگھن

ہنڈولا تاناں" سے ہر پیر بھئی گسنبھی رتناری نانہ سر کھے کھیلہ دھماری سے کنت سہاگن جھولہ بارا۔ گاونہ گیت اُنہی جھنکارا سے اونہ دکھہ تنہ سکھ رین دو تھیلے۔ جہر جہر مرھون سیج اکیلے سے ساون گنگ بھئی مورنیاں۔ تو دکھ دکھیو مروں میں نیناں سے جوبن جات نجانب کئی بار پچھتاب۔ ان بھنور توہ مرّدوں بی نہ جگت کچھ جاپ سے یہ جک جیس سپنہ سو جانی چہ دوئی رچا۔ گپت روپ سبھہ کہیہ سا۔ دھن دوس نرلاگی"۔ ایک جگہ ہے سے بھادوں گہر گہنر نین گنگ کو سنہ بھرے کیونکر بادوں نیر سادھن کھیول ہارین"۔ آگے چل کر ایک بند یوں شروع ہوتا ہے سے سن میناں اب چدہا کنوارو۔ جیتی تاک سب کو ندنہ ہارو۔ ایک دوسرے بند کا مطلع ہے سے" اوتم کاتک پر بہ دیواری۔ سب کو ڈ کھیلی پرم دھماری"۔ سب کے آخر یعنی اٹھارھویں بند میں پھاگن کی رُت دکھائی گئی ہے۔ ہر بند میں سادھن کی تکرار شاعر کے تخلص کا پتہ دیتی ہے ہمیں معلوم نہیں سادھن کون تھے۔ ایک ہندی ادیب نے سادھن پنجابی مسلمان صوفی بزرگ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس نظم میں پنجابیت کا عنصر بہت کم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہوں اس لئے کہ ان کے حسب ذیل اشعار شاید ہندو کے قلم سے نہیں نکل سکتے تھے سے" ساتن کنوار نکسیر کے دوتا۔ گپت روپ نارد کے پوتا"۔ نارد منی جھل کپٹ جوڑ توڑ کے لئے مشہور ہیں لیکن برہمچاری رشی تھے جائسی پدماوت اور اکھراوٹ میں ان کا نام اکثر لائے ہیں اور شیطان قرار دیتے ہیں سے" سنت شاستر نارد بھاگی۔ چھوتی پاپ دھرم سنگ لاگی"۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ نارد نے ایک جولاہا (کبیر داس) سے ہار مان لی سے نانا رو سنگ پکارا۔ ایک جولاہا تین میں ہارا سے پرم تت تانا تنیکی۔ جب تپ پور سانس سے گنئیں"۔ بہر طور یہ نظم میرے خیال میں ہندی ادب میں ایک اضافہ ہے اور خاص توجہ کی مستحق ہے۔

اس مجموعہ کا آخری جزو اب بالکل نیا نہیں رہا اس لئے کہ گپت جی نے اسے پہلے پہل کھوج نکالا اور اپنی گرنتھاولی کے آخر میں اسے جگہ دے دی۔ اپنے "بھومیکا" میں صفحہ ۱۰۴ میں لکھتے ہیں "مجھے جائسی کا ایک نسخہ ملا ہے جسے اس مجموعہ

میں پہلے پہل شائع کیا جا رہا ہے یہ ہے **مہری باشی** لیکن یہ نام میرا دیا ہوا ہے کوئی واضح نام نسخہ میں نہیں ہے لیکن مہری گانے کا ذکر جہاں تہاں ہوا ہے اور اس نسخہ میں کل بائیس گیت ہیں اس لئے یہ نام دے دیا گیا ہے۔ اغلب ہی نہیں امید بھی ہے کہ آگے کی کھوجوں میں اس نسخہ کا ٹھیک نام معلوم ہو جائے گا۔ افسوس یہ ہے کہ منیر کا نسخہ ناقص ہے صرف ۱۲ گیت ہیں اور ان میں بھی چند اشعار غائب ہیں۔ بیچ کے اوراق ضائع ہو گئے لیکن تعداد کی کمی کا کافی معاوضہ متن کی بہتری میں مل جاتا ہے ہم پہلا بند پیش کر کے قدامت و اصلیت کا فیصلہ نبدی ادیبوں پر چھوڑتے ہیں [۱] "سنہہ میت ہوں کرت بکھانوں۔ مہرا جس مہرائی رے" یعنی اے دوست سنو میں بیان کرتا ہوں مہرائی اور مہرا یعنی معشوق و عاشق میں کوئی فرق نہیں [۲] "کہہ کیوت کیو ناچڑ ہادی۔ کیولا کا کھنیرائی رے" ملاح کہاں ہے کون کشتی چلا دے گا اور پانی کی تھاہ لے گا [۳] "کیوگن لائی پنتہ سر ڈھیلا۔ چلو دو گن کہانجین رے" کوئی گن (رسی) لیکر (کنارہ) پر کھینچتا ہوا چلا ہے اور مشکل میں پڑا ہے [۴] "تیر نیر اتھلیں بہا سو پنتہ۔ گہریں بُت بہل بانچہ رے" کنارہ (دریا کا) اور چھچھلا پانی راستہ بن جاتا ہے۔ جو گہرائی میں پہنچ جاتا ہے وہی ٹھیک ہے [۵] "کوئی تردار سوت اس کینہاں۔ بہاد ہیم من مانیوں رے" کوئی اس سوت کو تلوار کی مثال دیتا ہے میں بھی ایسے ملاح کا قائل ہوں [۶] "کا ہوں پھاند تر کہنہ دکھیا۔ پڑا جال ارجھانیوں رے" کسی نے اس کو (دنیا کو) پھندا قرار دیا ہے کسی نے خواہشات نفسانی۔ جو اس جال میں پڑا اُلجھ کر رہ گیا [۷] "کوئی آدکھات ہار کا نپورت۔ رہا بیچ ہوئی سادہا رے" کسی کا گھاٹ ہی پر جی چھوٹ جاتا ہے کوئی تیر جاتا ہے جو بیچ میں رہا سادھو ہوا [۸] "کوئی اوکاہ پڑا گہریں منہ۔ سو بہل آہ جو کادہا رے" کوئی غسل کرتے وقت گہرائی میں پڑ گیا۔ وہی بہتر ہے جو نکل گیا [۹] "کوئی دھیر سمند ما بنجہ بدکا وا۔ ڈھونڈہ سیپ سے آنیوں رے" کوئی سمندر کی گہرائی میں ڈوبکی لگا کر سیپ کو ڈھونڈ نکالتا ہے [۱۰] "کوئی کنور چھچھ بہورا۔ ہاتھ جیہاد یکھتہا نیون رے" کوئی ٹٹولتا رہتا ہے لیکن خالی ہاتھ واپس آتا ہے اور پچھتاتا ہے کہ بیکار ردی چیز (مٹی) ہی ہاتھ آئی۔

۱۱ "کوئی تی تہاہ اٹھا پاؤ نہ سوں - نپور تیر دہ لاگا رے۔" "کوئی پانی کی تھاہ لے کر اٹھا اور تیر کر کنارے پہنچ گیا ۱۲ "کوئی ست جہاد سواوکا ھیں - کا بہر دس جہ کہا نکارے" "کوئی سچائی چھوڑ کر عمق میں پڑجاتا ہے اور اس کے چاروں طرف گڑھا ہی گڑھا نظر آتا ہے ۱۳ "کہے محمد جیلیو سبنہاریں - پاؤ پانی منہ کہا لین رے" "توی توی نہیں پاداوتار ھو - نہیں تو پڑھیو کہا لیں رے"۔ محمد کہتے ہیں کہ سنبھل کر پانی میں پاؤں رکھو نہیں تو تباہی میں پڑجاؤ گے۔ ٹٹول کر زمین قدم رکھو نہیں تو خندق میں پڑجاؤ گے۔ ممکن ہے کہ اصلی مفہوم ان اشعار کا وہ نہ ہو جو اوپر دیا گیا مگر گپت جی کے نسخے سے اُن کے متن کا مقابلہ کرنے سے چند باتیں صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ بسنتی کی جگہ میت - کو کی جگہ کیو دُھنو کی جگہ ڈُھیلا - سوی کی جگہ تینہ - تو کی جگہ ہُت - بہل بانجھو کی جگہ بہل نجھو - بہادسر کی جگہ بہادھیر - ترشنا کی جگہ ترکہنا - بھورت کی جگہ نپورت - تہاڈو کی جگہ سادہا - سمند ماہنہ کی جگہ دھیر سمندہ مانجہ - ششت کی جگہ سیپ - تیر تیر کی جگہ بنوڑ تیر - چھوڑ کی جگہ چھاڑ - دیسیو گہرے کی جگہ آؤ گاہیں - کہائیں کی جگہ کہانکا - اوتھا کی جگہ اوتار ہو زیادہ معنی خیز جیاں اور قدامت کا ثبوت ہیں - اور مقامات پر بھی منیر کے نسخے کا متن بہتر اور زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے مثلاً سترھویں بند کے چھٹے شعر کا پہلا مصرعہ۔ "سنگ سہیلی رہی اکیلی"، گپت کے پاٹھ "سنگ سہیلی رہیں اکیلی"۔ اس بند کے باقی اشعار سے بھی اختلافات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۷ کی سونہاں لی بسنت کرھی جو سونتہہ نہ تہائیں رے ۸ جیت مغادہ ایر جادہ - اوجر ہاری بہائیں رے ۹ اودھو کا نہتر پودہ سانتہر - جوک ہوئی بہنسارارے ۱۰ پُن ہم آوب آئی جیکاوب - لئی جائب کہر بارارے ۱۱ آس کی کرھی رات درونی - دی کی بجر کیوارارے ۱۲ مندپ ماہنیں جیو اُبیا ھیں - سانگر سبہ اندھیارارے ۱۳ کہے محمد منواں وہ بدجو اس بہارہ کہا بچی رے - مرن نہ تولہ مرکی جولہ مرکی جیو سو بانچی رے"۔

اس میں شک نہیں کہ کاف کے مرکز کی قدیم فارسی کتابت میں کمی اور ٹ، ڈ وغیرہ کی غیر موجودگی ہائے مخلوط جو خالص ہندی ہے اور یائے معروف مجہول کی گڑبڑ اور اضافت

کے نہ ہونے سے ہندی بھاشا کی زبانوں کی فارسی رسم الخط میں صحیح قرأت مشکل سے ہوتی ہے
الفاظ کچھ کے کچھ ہو جا سکتے ہیں۔ بابو شیام سندر داس اوجھا جی شکل جی وغیرہ نے ۲۷، ۹۲ اور ۹۳
وغیرہ کی بحث کرتے ہوئے پدماوت کے اصلی رسم الخط کو فارسی مانا ہے۔ گری یرسن صاحب بھی
اُن کے ہم خیال ہیں۔ لیکن چندر بلی پانڈے جی نے ہندی لیپی کا سمجھہ کرتے ہوئے ناگری
پرچارنی پتریکا جلد ۱۲ میں بڑا زور قلم صرف کیا ہے۔ گپت جی بھی باوجود اپنے اس
استعجاب کے قدیم ترین نسخے فارسی ہی میں ہیں فرماتے ہیں "چاہے ناگری کی ہوں چاہے فارسی
عربی لیپی کی سب کا مول آدرش کبی کی پرتی ناگری لیپی میں تھی"۔ لیکن اس کے ثبوت میں انہوں
نے جو متعدد مثالیں الفاظ کی دی ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسا لفظ ہو جو فارسی خط میں نہ لکھے
گیا جبھی۔ تبھی۔ کبھوں۔ پچھیے۔ کوھوں۔ کرنبہہ وغیرہ فارسی میں نہیں لکھے جا سکتے۔ پانڈے
جی سوال کرتے ہیں کہ "اس زمانہ میں فارسی میں کتنے حروف تھے اور وہ کہاں تک ہندی کو اپنا سکتے
تھے"۔ ان کا کہنا صحیح ہے کہ اس زمانہ میں موجودہ اردو خط کا نام و نشان نہ تھا۔ ہم ان کی یہ بات
بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جائسی اپنی کتابوں میں حتی الوسع فارسی پن پسند نہیں کرتے تھے۔ سنسکار
کے کارن وہ بہس پڑا رہے "وہ ہندو کی ہندوی ہندی کی بحث میں بے کار اُلجھتے ہیں۔
خسرو کبیر اور رحیم کو کبھی درمیان میں لاتے ہیں لیکن کوئی دلیل ایسی پیش نہیں کرتے جو لگتی ہوئی ہو۔ بار ثبوت تو ان لوگوں پر
ہے جو کوئی قدیم نسخہ کیتھی یا ناگری کا پیش نہیں کر سکتے حالانکہ تلسی داس کی رامائن یا گرداس جن کی گرنتھ صاحب
کے قدیم نسخے موجود ہیں وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ چودھویں پندرہویں صدی کے فارسی مکتوبات و ملفوظات میں
ہندی دوہے ہندی اور کھڑی بولی کے فقرے موجود ہیں۔ وہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ فارسی کا دفاتر میں رواج تھا اور
سکندر لودی کے زمانے سے کائستھوں نے دفتری زبان میں باقاعدہ لکھنا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ جائسی
وسیع المشرب رواداری مسلمان اور صوفی تھے ان کی چیزیں ہندو مسلمان سب کے لئے تھیں مگر ہندو ان کے پاس
کب پھٹکتے اور وہ خاص ان کا خیال کیوں کرتے۔ آخر میں اکھراوٹ، بیوگ ساگر اور سادھن کے کلام کے
اصل نسخے کی کتابت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ بھی تو درخور اعتنا ہے۔

نوٹ: پروفیسر جگن ناتھ شرما پٹنہ یونیورسٹی نے جو میری امداد فرمائی ہے اس کے لئے ان کا تہ دل سے شکر گذار ہوں
سید حسن عسکری

جنگ نامہ
ایک کمیاب ہندی منظوم تاریخ

اورنگ زیب عالمگیر کے پرپوتے اور شاہزادہ عظیم الشان ابن شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے دوسرے بیٹے فرخ سیر کو صوبہ بہار سے ایک خاص تعلق ہے۔ صوبہ کا صدر مقام پٹنہ اس کے باپ کے نام پر آج بھی عظیم آباد مشہور ہے۔ تاریخ کے صفحات عمارتوں کے کتبے اور چند فرامین و اسناد کی شہادت ان ایام کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جب شاہزادہ فرخ سیر باپ کا حکم نامہ پاکر اوائل[۲] ۱۱۲۳ھ میں بنگال سے جانب بہار عازم سفر ہوا۔ راستے میں شہنشاہ کی خبر وفات سُنی، عظیم آباد کے مشہور باغ جعفر خاں میں خیمہ زن ہوکر خاطر خواہ مواقع کا انتظار کرنے لگا یہاں تک کہ اب اہمام کی جنگ عظیم الشان کی شکست اور دریائے راوی میں غرقیابی سب سے بڑے اور نا اہل چچا معز الدین جہاندار کے ہاتھوں بقیہ دو چچاؤں کی شکست قتل بڑے بھائی عبدالکریم کی گرفتاری اور موت کے حسرت ناک واقعات سنے پھر خود اس کی گرفتاری کے احکام کے صدور کی وحشت خیز خبریں پہنچیں باپ کے متوسلین کی احسان ناشناسی اپنی بے بسی تنگدستی اور لاچاری کے احساس نے سارے حوصلے پست کردیے، خودکشی پر آمادہ ہوگیا۔ ہائے اس کی شیر دل کشمیری مادر محترمہ صاحبہ بیگم کے ہمت آفریں الفاظ اور پُر اثر کوششیں رنگ لائیں، ایک سیدہ محترمہ کی سفارش اور فرخ سیر کی ننھی بچی کی معصوم نگاہیں اور توتلی زبان میں التجائیں بہار کے زبردست اور ہر دلعزیز ناظم سید حسین علی خاں بارہہ کے جذبہ استکراہ و کنارہ کشی پر غالب آئیں۔ اپنے مفلس و مجبور محسن زادہ کی

کی امانت پر کمر بستہ ہو گیا۔ فرخ سیر نے باغ افضل خاں میں جلوس کیا تخت پر بیٹھا خطبہ وسکہ اپنے نام کا جاری کیا فوجیں جمع کی جانے لگیں مہاجنوں اور متمول حضرات کے کیسے خالی ہونے لگے۔ سید عبداللہ خاں ناظم الہ آباد نے پہلے تو اپنے چھوٹے بھائی حسین علی خاں کو اس امر اہم سے روکنے کی کوشش کی لیکن جب موخر الذکر کا ارادہ اٹل اور غیر متزلزل پایا اور جہاندار شاہ کی غیر مدبرانہ کاروائیاں اس کے عزل سید راجی خاں مانکپوری کے صوبیدار الہ آباد پر تقرر اور سید عبدالغفار خاں کی اس کے خلاف مہم کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ بھی فرخ سیر کے لئے سر فروشی پر آمادہ ہو گیا عبدالغفار خاں کو مار بھگایا۔ شاہزادہ اعزالدین کا راستہ روکا بنگال کے مرسلہ خزانہ کو اپنے قبضہ میں کیا اور فرخ سیر اور حسین علی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ۷ شعبان ۱۱۲۴ھ کو فرخ سیر کا پیش خیمہ پٹنہ سے روانہ ہوا اور چار روز بعد اس نے خود بھی تقریباً ۲۵ ہزار فوج کے ساتھ شہر کو چھوڑا۔ دانا پور سہسرام مغل سرائے ہوتا ہوا بنارس کے نزدیک دریائے گنگا کے اس پار نماز عیداد کی۔ پھر آگے بڑھا ۹ شوال ۱۱۲۴ھ کو جھوسی میں عبداللہ خاں نے شرف قدمبوسی حاصل کیا اس اثنا میں جہاندار شاہ کا بیٹا اعزالدین خواجہ حسین خاں دوراں اور لطف اللہ خاں صادق کے ساتھ بڑھکر کھجوہ میں خیمہ زن ہو گیا تھا۔ اکثر امراء اور عمائدین اس سے ٹوٹ کر فرخ سیر کی فوج میں شامل ہونے لگے جمعیت بڑھتی گئی معزالدین نے خوف زدہ ہو کر معمولی جھڑپ کے بعد اکبر آباد کی طرف مراجعت کی بالآخر خود جہاندار شاہ ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوا ۱۳ ذی حجہ ۱۱۲۴ھ کو آگرہ کے نزدیک فرخ سیر اور جہاندار شاہ کے درمیان جنگ عظیم واقع ہوئی موخر الذکر نے شکست کھائی اور فرخ سیر شہنشاہ ہندوستان ہوا۔ بہار کے وسائل کی بدولت ایک کمزور شاہزادہ تخت دہلی کا مالک ہوا۔

فرخ سیر و جہاندار شاہ کی اس جنگ کا اجمالی حال مورخین بالخصوص غلام حسین خاں صاحب سیر المتاخرین خفی خاں صاحب منتخب اللباب کامواد خاں صاحب تذکرہ سلاطین چغتائیہ مبارک اللہ واضح معتمد خاں صاحب عبرت نامہ نے حوالہ قلم کیا ہے شیو داس لکھنوی مصنف اقبالنامہ فرخ سیر یا منور الکلام نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ محمد حسن ایجاد کی ہفت سالہ منظوم تاریخ راقم السطور کی نظر سے نہیں گذری۔ ناظم خاں فارغ اور ملا دانائی کشمیری کی منظوم تاریخ ۔۔۔ بقول

بندرابن داس خوشگو خود فرخ سیر کے ایماء پر تصنیف ہوئی مفقود ہے۔ البتہ آنجہانی مسٹر ولیم ارون نے اپنی قابل قدر مشہور "تاریخ متاخرین مغل" جلد اول میں متعدد فارسی تاریخوں کا نچوڑ" ان مبحث پر جمع کر دیا ہے۔ جس وقت یہ کتاب جرنل ایشیاٹک سوسائٹی میں بالاقساط شائع ہو رہی تھی۔ مسٹر موصوف کے منشی مولوی عبدالعزیز متوطن بھیتری نے بابو ہریش چندر ساکن محلہ چوکھمبہ شہر بنارس کی مملوکہ نایاب ہندی منظوم کتاب "جنگ نامہ" مصنفہ مرلی دھر عرف سری دھر کا نسخہ اپنے ہموطن بابو رادھا کرشن داس کی وساطت سے حاصل کیا۔ مسٹر اردن نے اس کتاب کا جس کے صفحات کی تعداد ۶۶ اور اشعار تقریباً سوا سو تھے تقریباً نصف حصہ انتخاب کر کے انگریزی ترجمہ اور چند ضروری اشارات کے ساتھ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۰۰ء میں شائع کر دیا چار سال بعد ۱۹۰۴ء میں سری رادھا کرشن داس اور بابو کشوری لال گوسوامی نے اس کتاب کا مکمل نسخہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے طبع کرایا۔ شاید ہندی داں طبقہ میں یہ کتاب مقبول نہیں ہوئی اس لئے کہ کوشش سے بھی اب اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ کسی کتب خانہ میں نہیں ملتا۔ راقم السطور پروفیسر ڈاکٹر ایشور دت صدر شعبہ ہندی پٹنہ کالج کا نہایت شکر گذار ہے کہ موصوف کی کوشش سے اس کتاب کا تنہا نسخہ ناگری پرچارنی سبھا سے چند روز کے لئے مستعار ملا۔ ناچیز کو اپنے عزیز شاگرد بابو جوگندر مصر بی۔ اے کی مدد سے اس کتاب کے مطالعہ کا موقع ملا مصر جی ایک ہونہار اور نہایت لائق شخص ہیں بغیر ان کی اعانت کے یہ ناچیز مقالہ جس میں "جنگ نامہ" کے مصنف اور کتاب کی خصوصیات پر تاریخی حقائق کے متعلق ناظرین رسالہ معاصر کی خدمت میں چند امور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معرض ظہور میں نہیں آسکتا تھا۔ مسٹر جوگندر مصر کا ناچیز نہایت ممنون ہے۔

مشہور مستشرق اور ماہر السنہ مسٹر گریرسن اور ان سے ۱۲ سال قبل (۱۸۷۷) ہندی تذکرہ نگار صاحب "شیو سنگھ سروج" مرلی دھر اور سری دھر کی تصنیف کسی نبود کا ذکر کرتے ہیں اور اول الذکر ان کو دو مختلف شاعر قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان دونوں کی متفقہ کوشش "جنگنامہ" کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ مسٹر گریرسن نے شاعر کا زمانہ ۱۶۸۳ء یعنی "جنگنامہ" کے صحیح سن تصنیف ۱۷۱۳ء سے ۳۰ برس پہلے بتا کر ایک اور زبردست ٹھوکر کھائی ہے اس کا خارجی ثبوت مسٹر ولیم ارون کے محولہ بالا اشارات

اور بابو کرشن داس کے دیباچہ میں موجود ہے داخلی شہادت آئندہ پیش کی جائے گی مصرا برادران نے جنہوں نے ہندی شعرا اور مصنفین کا ضخیم تذکرہ "مصر بندھو بنود" چار جلدوں میں لکھا ہے اس میں اندھی تقلید اور انتشار کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے چودہ عدد شاعروں کا جن کا نام سری دھر تھا تذکرہ کیا ہے۔ جلد دوم صفحہ ۲۷۵ میں مرلی دھر اُپنام (عرف) مرلی کی تاریخ پیدائش سمبت ۱۸۲۷ اردو شاعری ۱۷۷۰ء اور کتابوں کے نام جس میں ایک ۱۸۰۴ء میں تمام ہوئی بتائے ہیں یہ بھی لکھا ہے کہ اس مرلی دھر نے سری دھر کے ساتھ "رس نبود" نامی کتاب تصنیف کی۔ صفحہ ۴۷۵ میں سری دھر مرلی دھر نام کا حال رادھا کرشن داس کے مطبوعہ ہندی نسخہ "جنگ نامہ" کے حوالے سے لکھا ہے فرماتے ہیں کہ اس کتاب کے "بھومیکا" (دیباچہ) سے جان پڑتا ہے کہ بابو رادھا کرشن داس نے ان کا جنم کال (سن پیدائش) سمبت ۱۷۳۷ کے لگ بھگ مانا ہے۔" ساری کتاب اور اس کے دیباچہ کو دیکھ جائیے ایک جگہ بھی تاریخ پیدائش اور ۱۷۳۷ کی طرف اشارہ بھی نہیں ملتا۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۱۵ میں مصرا برادران گوہر افشاں ہیں کہ ایک کبی (شاعر) سری دھر نے مرلی دھر کے ساتھ "کبی نبود" سنہ ۱۷۶۱ء میں تصنیف کی۔ "ہندی تنقید پر ایک نظر" اس مقالہ کا موضوع نہیں ورنہ کلیم الدین احمد صاحب کے سخت مگر جائز اعتراضات جو اردو تذکرہ نگاروں اور نقاد پر کئے گئے ہندی نواز حضرات کی خدمت میں بھی پیش کئے جاتے۔ یہاں بھی ایسی ہی "پراگندگی" اور "لغو ولایعنی بکواس" کی اکثر مثالیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی نقاد اور "تذکرہ نگار" مصنفین اور شعرا کا حال قلمبند کرنے اور ان کے کلام کا جائزہ لینے کے لئے ان کی کتابوں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ لکیر کے فقیر ہیں۔ متقدمین نے جو کچھ لکھ دیا اس پر آمنا صدقنا کہنے کے لئے مجبور ہیں۔

بہرکیف اب ہم ایک موجودہ دور کے مستند ادیب رام چندر شکل جی کی مشہور اور ہر دلعزیز تصنیف "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" کے بیان پر نظر کرتے ہیں۔ شکل جی اس کتاب کے صفحات ۲۰۳-۲۰۴ میں رقمطراز ہیں "سری دھر پریاگ (الہ آباد) کے رہنے والے برہمن تھے (سمبت ۱۷۳۷ کے لگ بھگ ورتمان (پیدا) ہوئے تھے (گرچہ) ابھی تک ان کا "جنگ نامہ" ہی پرکاشت (شائع) ہوا ہے جس میں فرخ سیر اور جہاندار کے جودھ (جنگ) کا ورنن (بیان) ہے۔ پر سنوگ گی (اتفاقی) بابو رادھا

کرشن داس نے ان کے بنائے کئی ریتی گرنتھوں (کتابوں) کا اولیکھ کیا ہے جیسے نائکا بھید۔ چتر کاویہ آدی (وغیرہ) ان کا کبیتا کال (دور شاعری) سمبت ۱۷۶۰ کے آگے مانا جاسکتا ہے۔" آگے چل کر صفحہ ۹۸، ۲۹۷ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "سری دھر یا مرلی دھر پریاگ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے کئی پستکیں (کتابیں) لکھیں اور بہت سی پھوٹکل (متفرق) کبتا بنائی۔ سنگیت کی پستک۔ نائکا بھید جین منیوں کے چرتر کرشن لیلا کے پھوٹکل پد (متفرق اشعار) چتر کاویہ (کے علاوہ) انھوں نے "جنگنامہ" نامک (نامی) ایک اتیہاسک پربندھ کاویہ (تاریخی بیانیہ نظم) جس میں فرخ سیر اور جہاندار شاہ کے جودھ کا ورنن ہے (لکھی) اس چھوٹی سی پستک میں سینا (فوج) کی چڑھائی۔ ساج (ساز) سامان آدی (وغیرہ) کا اچھا ورنن ہے۔ اس کا کبیتا کال سمبت ۱۷۶۷ کے آس پاس مانا جاسکتا ہے

یہ ساری عبارت بابو رادھا کرشن کے دیباچے سے ماخوذ ہے۔ بجز اس کے کہ سن پیدائش اور دور شاعری کا تذکرہ اس میں نہیں ملتا۔ سمبت ۱۷۶۰ سے آگے اور سمبت ۱۷۶۷ کے لگ بھگ کا فقرہ بھی قابل غور ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ شکل جی کی بتائی ہوئی تاریخوں کا(۴) ماخذ کیا ہے۔ انہوں نے بابو رادھا کرشن داس کی ایک اہم عبارت پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی شاید انھوں نے اسے غیر متعلق اور بے ربط سمجھا حالانکہ اس استفادہ سے مصنف "جنگنامہ" کی شخصیت اس کے خاندان، اس کے ماحول اور اس کی زندگی کے مختلف ادوار کو متعین کرنے میں بہت کچھ آسانی ہو جاتی۔ البتہ شکل جی کے عدم توجہ کی توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ بابو کرشن داس خود اس نتیجہ پر نہیں پہونچے جو ان کے بیان اور صاحب شیو سنگھ سروج کی بتائی ہوئی تاریخ پیدائش کو ملانے سے پیدا ہوتا ہے۔ مطبوعہ ہندی کتاب کے دیباچے میں علاوہ اُن باتوں کے جن کا اقتباس شکل جی کی کتاب سے اوپر نقل ہوا مندرجہ ذیل عبارت قابل توجہ ہے "یہ کبی (شری مرلی دھر عرف مرلی دھر) سوکبی (اچھا شاعر) تھا ...... یہ گرنتھ (کتاب) فرخ سیر کا جنگنامہ اور اس سمے کے امیر راج کرمچاریوں (عمال سلطنت) اور راجاؤں کی کبتا ہے۔ ان کی کبتا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بڑا منگھن اور خوشامدی تھا اور لوگوں کی بڑائی گا گا کر کبتا کہتے پھرنے کا اس کا (روزگار) تھا۔ نواب مصلح خاں کی تعریف کی بہت سی کبتا اس نے کہی ہے۔ ان کی ہولی کا (بیان) اور ان کی رسکتا (تعشق) اور ولاسیتا (تعیش) کی بڑی تعریف کی ہے۔ لوگوں کے ہاں لڑکا ہونے پر

بیاہ میں پہونچنا اور کبتا سنانا اس کا کام تھا۔ ۔ ۔ ۔ بابو شیو سنگھ اور ڈاکٹر گریرسن نے ان کے بنائے ' کبی بنود ' کا (ذکر) کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ اور کبی مرلی دھر مل کر کبتا کہتے تھے لیکن ایسا نہیں ہے " جنگنامہ " سے یہ صاف ہوگیا کہ شری دھر ہی کا نام مرلی دھر تھا اور وہ پریاگ میں رہتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پریاگ (الٰہ آباد) میں ایک کبی مرلی دھر مصر بھی ہوئے ہیں ان کا بھی ٹھیک انہیں کا سا سوبھاؤ اور بیوہ سایہ (پیشہ) تھا ان کی بنائی " رام چرتر ناٹک " کتاب لکھت (قلمی) پریاگ کے بھارتی بھون میں رکھی ہوئی ہے میں نے اس کی نقل کر لی تھی اور اسے پرکاشت (شائع) کرتا ہوں یہ گرنتھ سمبت ۱۸۱۸ میں بنا تھا۔ کبی نے لکھا ہے کہ سب جنم سوارتھ (خود غرض) میں بِتا کر اب یہ بھی نشچے (طے) کر کے کہ انت (آخر) میں رام کے گن گا کر پرمارتھ سدھ (عاقبت درست) کرنا چاہیے اس گرنتھ کو بنایا۔ یہ دلی کے بادشاہ محمد شاہ کے دربار میں تھا۔ جب نادر شاہ نے لوٹ مار کر دلی کو تہس نہس کر دیا تب یہ کبی اوداس ہو کر رام چرتر ورنن " (رام چرتر کی تصنیف) میں پروِرت (مشغول) ہوا۔ اس نے اپنی بنساولی (شجرۂ خاندان) کا ورنن اس بھانت سے کیا ہے کہ جمنا گنگا کے بیچ (پریاگ) ایک گاؤں میں جو پرمانند نامی بڑے پنڈت تھے اُنہیں اکبر نے اپنے دربار میں جگہ دی تھی اور خوش ہو کر شاودہائی (ہمہ داں) کی پدوی (خطاب) دی تھی۔ ان کے بیٹے کپور چند۔ ان کے بیٹے پرشوتم (یہ بڑے کبی تھے اور شاہجہاں کے سمئے میں راج میں ان کی قدر تھی) اُن کے بیٹے پریم راج ان کے بیٹے پرتھی راج (یہ بڑے کبی تھے) ان کے بیٹے وِن منی (یہ بڑے مشہور جوتشی تھے) ان کے کئی بیٹوں میں یہ مرلی دھر تھے۔ اس کے بعد بابو کرشن داس نے مسٹر اروِن نے شاعر کی جو دو ایک تاریخی غلطیاں بتائی ہیں ان کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس کی طرف آئندہ اشارہ کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں کئی باتیں جاذب نظر ہیں لیکن مقالہ کی طوالت اور معاصر کی محدود گنجائش مجبور کرتی ہے کہ ہم صرف چند امور کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کریں۔ مسٹر اروِن کو " جنگنامہ " کے علاوہ شاعر کی ایک دوسری نظم بھی دستیاب ہوئی تھی جو موصوف کے خیال میں تتمہ جنگنامہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کے اوراق کی تعداد ۱۳۳ اور اشعار کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے کچھ زیادہ تھی۔ مسٹر اروِن نے اس کے مختلف اجزا کی تعداد اشعار اور شاعر کے ممدوحین کی محض فہرست دیدی ہے۔

پانچ نظموں کی سرخیاں مسٹر موصوف کو نہیں ملیں۔ فہرست میں رتن چند ر راوٌ رس[۴] بہادر جی (؟) مہاراجہ چھبیلے رام۔ میر مشرف۔ راجہ جسونت[۵] (؟)۔ شیر محمد ؟ قطب الملک حسن علی خاں۔ حسین علی خاں۔ مصلح خاں کے نام آئے ہیں۔ موخرالذکر فدائی خاں کا بیٹا تھا صاحب" ماثرالامرا" نے ان کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس فہرست میں ایک طویل کبیتا سو اشعار پر مشتمل ہے جسے سری رام چندر جی کی شان میں شاعر نے نظم کی تھی۔ ہندی مطبوعہ کتاب ان اجزا سے خالی ہے لیکن اُس میں بھی شاعر نے سید برادران راجہ چھبیلے رام' میر مشرف' مصلح خاں اور متعدد دوسرے حضرات کی مبالغہ آمیز تعریفیں کی ہیں جس سے بابو کرشن داس کے ریمارک کی تصدیق ہوتی ہے۔ دوسرا اور سب سے اہم امر جو بابو صاحب کے بیان اور شکل جی اور مصرا برادران کی بتائی ہوئی تاریخوں سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے۔ سری دھر عرف مرلی دھر مصر ولد پرتھی راج دراصل ایک ہی شخص تھے "جنگنامہ" کے مصنف کی تاریخ وفات کسی نے نہیں بتائی۔ اگر سمبت ۱۷۳۷ھ کے قرب میں سری دھر کا جنم کال (بقول شیو سنگھ و مصرا برادران) اور آوت پن (بقول شکل جی) تسلیم کرلیا جائے اور مرلی دھر مصر کے اواخر ایام زندگی میں (بقول بابو کرشن داس) شاید اس کی آخری تصنیف "رام چرتر" کا سمبت سال ملحوظ رکھا جائے اور دونوں شاعروں کو حقیقت میں ایک ہی سمجھا جائے تو اس کی عمر اسی برس سے کچھ سوا ہوتی ہے جس سے کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ نام (مرلی دھر) ذات (برہمن) اور توطن (الہ آباد) کی مطابقت، مشاغل طرز زندگی اور خیالات کی مشابہت' بادشاہی دربار سے تعلقات دور شاعری اور اولین اور آخری تصنیفات کے درمیان ناقابل تسلیم عدم بعدیت ہمیں ایک ہی نتیجہ پر پہونچاتی ہے جسے تعجب ہے کہ بابو کرشن داس جیسے بزرگ نے بھی جن کے پاس شاعر کی متعدد تصنیفات قلمی صورت میں موجود تھیں نظر انداز کر دیا۔ بظاہر ایک دقت پیدا ہوتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ "جنگنامہ" کے ابتدائی شمارہ (۱-۴) سے ثابت ہوتا ہے کہ سری دھر شیومت کا پوجاری تھا' حالانکہ مرلی دھر مصر کا رامایت مت کا ہونا اس کی آخری تصنیف سے متحقق ہے۔ زیر نظر کتاب کے اولین اشعار یہ ہیں:۔

سومونہہ (اچھا منہ والا) گیل ایک دہ (دانت) دگٹ (بھیانک) بہال چندر (جس کے سر پر ماہتاب ہے) گن ناتھ (گنیش جی)۔

لمبود (دراز شکم) شنکر (شیوجی) تنئے (لڑکا) آٹھ سدھی پد (قدم) ساتھ

لمبودر شنکر شیوا (پاربتی زوجہ شیوجی) بھوک (شاگرد) ہیرمبر (ہیر بمعنی شیوجی کے ملازم) پائے

کوی شری دھر کی ہنہیں (کیا) کہتا (قصہ) گورو سارو (سرسوتی جی) پد دھیائے (دھیان کرے)

حقیقت یہ ہے کہ ہنود بالخصوص بسمارت وشنوؤں کا طبقہ برہما۔ وشنو۔ شیو (مہادیو) یعنی ترموتی کے علاوہ گنیش اور شکتی کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ رامایت مت کے جلیل القدر شاعر تلسی داس جی نے اپنی مشہور عالم رام چرتر مانس شاید گنیش جی یعنی مہادیوجی کے لڑکے کے نام سے شروع کی ہے۔ علاوہ اس کے جیسا اوپر عرض کیا گیا "جنگنامہ" کے تتمہ میں شاعر نے شری رام چندر جی کی شان میں سو اشعار نظم کر کے رامایت مت سے اپنی والہانہ شیفتگی کا ثبوت بہم پہونچا دیا ہے۔ المختصر ہمیں تو مرلی دھر اور سری دھر عرف مرلی دھر کو شخص واحد تسلیم کر لینے میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی۔

اب رہا یہ امر کہ شری دھر ہی کا نام مرلی دھر تھا اور "جنگنامہ" ان ناموں کے دو شاعروں کی متفقہ کوشش کا نتیجہ نہیں۔ اس کا داخلی ثبوت اس کتاب کے پانچویں اور چھٹے مصرعوں میں موجود ہے:

سری دھر عرف مرلی دھر۔ دوجبور۔ بہ ست پریاگ
روچر۔ کتھا۔ یہ۔ شاہ کی۔ برنھی او۔ کتھن انوراگ

یعنی سری دھر عرف مرلی دھر دوجبور (برہمن) پریاگ (الٰہ آباد میں) بہ ست (بستا ہے) (اور) یہ شاہ (فرخ سیر) کی روچر (اچھی) کتھا کتھن (کہہ کر) انوراگ (پریم۔ محبت) برنھیو (برتا ہے)۔

ساری کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اسی شعر میں شاعر نے اپنا نام مرلی دھر اپنی ذات برہمن اور وطن الٰہ آباد بتلایا ہے کہیں کہیں سوکبی (اچھا شاعر)، سری دھر اور سری دھر نبیک کدم (قدم) کے فقرے ملتے ہیں بعض مصرعوں میں (جیسے ۱۳۵۱ - ۱۳۱۶) میں سوکبی سری دھر نبیک کدم کا فقرہ ایک ساتھ نظم ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر نے اپنے متعلق کسی بات پر روشنی نہیں ڈالی البتہ ایک شعر جو نہ ارون صاحب کے نزدیک درخور اعتنا ہوا "تاکہ وہ اپنے انتخاب میں اسے شامل کرتے۔ نہ بابو کرشن داس کی اس پر خاص نظر پڑی لیکن جو ایک نہایت اہم مسئلہ پر (آیا یہ نظم چشم دید حالات پر مشتمل ہے یا نہیں) قول فیصل کا حکم رکھتا ہے۔ ہم ناظرین معاصر کی خدمت میں اسے پیش کرتے ہیں

اس شعر کا نمبر ۸۰ - ۱۵۷۹ ہے ۔

شری دھر ۔ بیلویو ۔ دوری ۔ بیرن ۔ کی ۔ بھیڑ رونڈ کا
منڈن ۔ کو ۔ میرو ۔ شرون شلیتا ۔ گمبھیر ۔ کی

بیلویو विलोयो دراصل بیلوکیو विलोकयो ہے جس کے معنی ہیں دیکھنا دوسرے مشکل الفاظ رونڈ (دھڑ) منڈن (سر) میرو (پہاڑ) شرون شلیتا (سنکرت سریتا یعنی ندی) ہیں اس شعر کی نثر یوں ہوگی (شری دھر نے) دوری (دوڑ کر) بیرن (بہادروں) کی بھیڑ رونڈ (دھڑ) منڈن (سر) کا میرو (پہاڑ) (اور) گمبھیر شرون (خون) کی سلیتا (ندی) بلویو یا بلوکیو (دیکھی) یعنی شری دھر نے دوڑ کر بہادروں کی بھیڑ اور دھڑ اور سر کا پہاڑ اور گاڑھے لہو کی ندی دیکھی ۔ کیا اس شعر کے بعد کسی شبہ کی گنجائش ہے کہ شاعر نے آنکھوں دیکھی باتیں نظم کی ہیں ۔

اشارات :- (۱) راقم الحروف کے محلہ گولکھپور پٹنہ کی ایک مسجد (مسجد ملا شادمانی کہ در دور فرخ سیر نماز ادا) کی مثال کافی ہے ۔ ملا شادمانی کی قبر اس مسجد کے نزدیک انجینئرنگ کالج کے احاطہ میں موجود ہے (۲) جس قدیم کرم خوردہ بیاض سے ایک مضمون " اردو کا پہلا واسوخت " صفحات معاصر پر شائع ہو چکا ہے ۔ اس میں کچھ تاریخی قطعات ہیں ۔ حاجی ہادی کا ایک قطعہ " تاریخ برآمدن (خسرو عالی نسب فرخ سیر) از راجمحل " ..... " می آرد تا سکۂ شاہی زند ۱۱۲۳ " یہاں قابل ذکر ہے ۔ (۳) ۱۶۸۳ء سمبت سن ۱۷۳۹ء کے مطابق اور شاعر کے سن پیدائش سے قریب ہے ۔ (۴) غالباً شیو سنگھ تذکرہ سے ہو ۔ پہلی مرتبہ ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا ۔ شاعر کا جنم سمبت (۱۷۳۷ء کے لگ بھگ) لیا گیا ہے ۔ (۵) اس راجہ کا جنگنامہ میں کہیں نام نہیں آیا ۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب ۔ کے عہدہ دار ۔ مہاراجہ جسونت سنگھ سے اس راجہ کو مناسبت نہیں ۔

[۲]

”جنگنامہ“ کی لسانی خصوصیات بھی ہمارے لئے کچھ کم قابلِ توجہ نہیں۔ اس کا مصنف الٰہ آباد کا رہنے والا تھا لیکن بجائے اودھی کے جو اس علاقہ کی سب سے مشہور ادبی زبان ہے برج بھاشا کا رنگ اس کی نظم پر غالب ہے اس لئے ہم اسے برج بھاشا کی نظم قرار دے سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندی کی رزمیہ شاعری کی جس کا ایک قابل قدر نمونہ جنگنامہ میں ہمیں ملتا ہے زبان برج بھاشا ہی ہے لیکن سری دھر نے کسی ایک زبان میں شاعری نہیں کی اسماء و افعال و ضمائر میں برج بھاشا کے ساتھ کھڑی بولی اور اودھی اس کی نظم میں مخلوط نظر آتی ہیں۔ اگر مستقل زبان سے قطع نظر کی جائے تو ہندی کی کتابیں زیادہ تر تین زبانوں، برج بھاشا، اودھی اور کھڑی بولی میں مانی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور بڑی حد تک صحیح نمائندہ قدیم شورسینی زبان کی برج بھاشا ہے۔ برج بھاشا کے بعد مشرقی ہندی کی سب سے مشہور شاخ اور اس کی بیٹیوں میں سب سے زیادہ اہم بولی اودھی ادبی حیثیت سے ممتاز ہے۔ قدیم برج بھاشا اور شورسینی میں جو آگے چل کر مگدھی اور ان تمام بولیوں کی سرچشمہ ثابت ہوئی جسے مشہور ماہر السنہ سر جورج گریرسن نے مغربی ہندی کے تحت میں شمار کیا ہے بہت کم فرق ہے شورسینی دیس متھورا کے آس پاس کے خطوں کو کہتے تھے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان اطراف میں بولی جانے والی پراکرت سورسینی پراکرت اور اس سے جو اپابھرنش یعنی بگڑی شکل یا عام بول چال کی زبان نکلی سورسینی اپابھرنش کے نام سے موسوم ہوئیں۔ موجودہ دور کے ایک ہندی نقاد پروفیسر جگرناتھ رائے اور بنگالی ماہر السنہ ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ سب زبانوں کی طرح اپابھرنش کا بھی دو روپ تھا۔ ادبی اور بول چال کی زبان اور ایک وقت سارے آرین انڈیا یعنی گجرات اور مغربی پنجاب سے بنگال تک ایک ہمہ گیر ادبی زبان رائج تھی جسے شورسی اپابھرنش کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی متعدد شکلیں تھیں جو قصباتی حضرات کی بولیوں میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ ظہور پذیر ہوئیں یہ ہی ادبی شورسی اپابھرنش ایک زمانہ میں لنگوا فرانکا کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کی جگہ موجودہ کھڑی بولی نے لے لی ہے۔ کھڑی بولی

یا ہندوستانی کی دو شکلیں ہیں ہندی اور اردو ۔ ریورنڈ روڈ الیف ہرنلے نے ۱۸۷۲ء کے جنرل ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں برج بھاشا کو ہندی اور اردو کا ماخذ بتایا تھا۔ شاید ان کے تتبع میں گارسن دتاسی اور شمس العلما محمد حسین آزاد مرحوم نے اردو کو برج بھاشا کی بیٹی بتلایا لیکن یہ صحیح نہیں۔ علامہ محمود شیرانی کا خیال صحیح ہے کہ برج بھاشا اور اردو (کھڑی بولی) میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں بہنوں کا۔ دونوں نے شورسینی اپابھرنش کی گود میں جنم لیا گو ان کے "خد و خال" "خصائص" اور صرف و نحو میں فرق نمایاں ہوتا گیا لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اردو یا کھڑی بولی کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر آپ قدیم ہندی ادب کا جائزہ لیں تو نہ صرف ان دو بلکہ اودھی کا بھی ان سے اشتراک پایا جائے گا۔ حتیٰ کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی ہندی شاعر کی زبان خالص اودھی ہے یا برج بھاشا یا یہ کہ کھڑی بولی کا عنصر اس کے کلام میں قطعی طور پر مفقود ہے۔

امیر خسرو کو سب بالاتفاق کھڑی بولی یا موجودہ ہندوستانی کا باوا آدم قرار دیتے ہیں لیکن ان کے کلام میں بھی برج بھاشا کا عنصر نمایاں ہے ہم چند مثالیں رام چندر جی شکل کی ہندی ادب کی تاریخ سے پیش کرتے ہیں جو خالی از دلچسپی نہیں (۱) چوک بھئی کچھ دالوں ایسی + دیش چھوڑ بھیو پردیسی (۲) ایک نار پیا کو بھائی + تن واکو۔ سگرا جیوں پائی (۳) چام مانس واکے نہیں نیک (کچھ) ہاڑ ہاڑ تن واکے چھید + موہنی۔ اچنبھو۔ آوت اسے + وا میں۔ جیو بست ہیں کیسے (۴) اوجل وبرن۔ ادھین (ماتحت) تن۔ ایک چت دودھیاں + دیکھت میں تو سادھو ہے۔ نرپٹ پاپ کی کہاں (۵) کھسرو رین سہاگ کی جاگے پیو کے سنگ + تن میرو۔ من۔ پیو کے۔ دواؤ بھئے ایک رنگ (۶) گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس + چل کھسرو گھر آپنے۔ رین بھئے چہوں دیس۔ اس میں واسوں۔ بھیو۔ واکو۔ واکے۔ نیک۔ موہنی۔ اچنبھو۔ وا میں۔ بست۔ دیکھت۔ میرو۔ پیو کو (کا) دواو۔ بھئے۔ سووے۔ ڈارے۔ آپنے۔ چہوں خالص برج بھاشا کے الفاظ ہیں۔ بھئی۔ بھائی۔ سگرا۔ جاگی برج بھاشا اور اودھی دونوں میں آتے ہیں بقیہ کھڑی بولی کے الفاظ ہیں۔ سیج پر اور مکھ پر کی مثال میں اگر بجائے پر کے "پے" آتا تو برج بھاشا ہو جاتا۔ اس طرح ملک محمد جائسی۔ کبیر داس اور تلسی داس جی اودھی کے مسلم الثبوت شعرا تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مگر ان کے یہاں بھی کھڑی بولی اودھی اور برج بھاشا ایک دوسرے سے بغل گیر نظر آتی ہیں۔ کبیر داس کا مشہور شعر ہے ؎

دیا کون پر کیجئے کا پئے مردئے (بیرحم) ہوئے + سائیں کے سب جیو ہیں کیری (کیڑہ) کو بجر (ہاتھی) دوئے -
یہاں کون کا پئے - ہوئے - دوئے برج بھاشا اور پر - کیجئے کے کھڑی بولی کے الفاظ ہیں - سائیں کے
سب جیو ہیں نہایت صاف کھڑی بولی کی ترکیب ہے یہی حال دیا کس پر کیجئے کا ہے کا پئے مردے ہوئے
صاف برج بھاشا کی مثال ہے - ملک محمد جائسی مصنف پدماوت کی زبان خالص اودھی کہی جاتی ہے لیکن
اس میں بھی کھڑی بولی اور برج بھاشا کا میل پایا جاتا ہے فرماتے ہیں سے بھیو - بی بان (صبح) اٹھا - ربی
(سورج) سائیں + چہوں (چاروں طرف) دیسی تن نکھت (سیارے) ترائیں (تازہ) + لودھین (خوبصورت عورت)
یان - جون (جونا) بھئی جولی - رنگ رنگیلی نیر نگ جئی - ڈولی - ان مصرعوں میں بھئو - چہوں - بھئی تو برج بھاشا اور باقی
کھڑی بولی یا اودھی ہیں - جون (اودھی) اگر جو نو ہوتا تو برج کا لفظ قرار دیا جاتا - تسی داس ایک ہی جگہ بھیو (برج اور
بھئی (اودھی) کا استعمال کرتے ہیں - ان کے یہاں بھئو جیوری بھی کسی حد تک کارفرما ہے سے جاگت رہی بھیو بھنسارا +
بھئی بے بھبھار (بے سہارا) سوت بھکرارا (بیقرار) اس ضمن میں جنگنامہ پر جب ہم نظر دوڑاتے ہیں تو یہی آمیزش بدرجہ اتم
موجود پاتے ہیں کہا کہا سے مثال دی جائے سے زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ٭ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست
بہرکیف یہاں دو ایک شعر مثالاً پیش کئے جاتے ہیں بیلاس جھنڈ کا ایک شعر ہے سے حکم شاہی کو پے گل گجے او
+ کتب الملک دا بھنے بجے او - یہاں گجے اور بجے او خالص اودھی ہیں - ہر گیتا جھنڈ کا شعر ہے سے دو بول
اور دطرف چھوجین ساجی یو + گل گاج دگر جگن بھت (صادر) تھارے یہاں ساجی یو صاف برج بھاشا
دو بول اور گل گاجہ بھی برج کے الفاظ ہیں - چھوجین کھڑی بولی کی ترکیب ہے اگر چھو جن ہوتا تو برج بھاشا ہے
کہتے - بنے بھی برج بھاشا ہے - ایک جگہ شاعر لکھتا ہے سے مر اب سر برگید ھ کیے گئی (جھنڈ) بول
جھوا وت پات (آفت) ہیں - یہاں گدھ کے گئی کے وغیرہ کھڑی بولی کی خبر دیتے ہیں - اوت پات برج بولی
ہیں برج بھاشا کی مثال ہے - دو ایک اور اشعار لیجئے سے پھر ک سیر (فرخ سیر) ہمت (مفتخر) ان شاد
شاہان دل سجیو (۲) یہ کام چوک کی بو - دی یو - کہری جیو کرا سردار ہے (۳) جلنقہ لرکہاں - بجوری سب
بیوج دگا - گی یہ - بھنگ - ان مصرعوں میں سجیو - کی یو - دی یو - برج بھاشا ہیں اودھی میں بھی او - دی -
گی او - دی او ہوئے اور کھڑی بولی کی شکلیں ساجا اور کیا - دیا ہوتیں - بجوری برج بھاشا ہے اور اودھی
بھی کھڑی بولی میں یہ لفظ بھوڑ کر ہوتا - چھوکرا کھڑی بولی ہے - برج بھاشا میں چھوہرا ہوتا - یہ اور ہے کے

الفاظ بھی قابلِ غور ہیں واضح رہے کہ ہے اور "تھا" پرتھی راج راسو" مصنفہ چاند بردائی کے ان حصوں میں جو متفقہ طور پر اصلی اور قدیم تسلیم کئے گئے ہیں مفقود ہیں تھا کی جگہ ہو نتو چاند نے ہر جگہ استعمال کیا ہے جیسا کہ آنجہانی مسٹر بیمس اپنی ایک کتاب میں فرماتے ہیں۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ قدما کے کلام میں مختلف بولیوں کا کافی اشتراک پایا جاتا ہے۔ برج بھاشا اودھی اور کھڑی بولی کی آمیزش زمانہ قدیم سے شروع ہو چکی تھی جس زمانہ میں برج اودھی وغیرہ کا ادب معراج کمال پر پہونچا ہوا تھا۔ کھڑی بولی یا ہندوستانی آہستہ آہستہ اپنا رنگ جما رہی تھی۔ امتداد زمانہ سے۔ برج بھاشا اور اودھی کا رنگ تو پھیکا پڑتا گیا، موجودہ دور میں تو کھڑی بولی کا ہی بول بالا ہے۔ برج بھاشا میں شاعری اب بہت کم کی جاتی ہے اور اودھی میں تو قریب قریب ناپید ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اودھی نے بتدریج برج بھاشا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس میں ضم ہو کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ برج بھاشا اور اودھی میں فی زمانہ فرق کرنا بہت مشکل ہے اور سوا ماہرین السنہ کے سب کے بس کی بات نہیں۔ سری دھر عرف مرلی دھر مصنف "جنگنامہ" نے قدیم روش پر چلنے کی کوشش کی اس کے زمانہ میں اودھی برج بھاشا اور کھڑی بولی تینوں کا رواج تھا۔ لیکن برج پیش پیش تھی اودھی مائل بہ تنزل تھی۔ کھڑی بولی اٹھان پر تھی لیکن سنسکرت زبان کا ماہر الہ آباد کا برہمن رزمیہ نظم کا مصنف اور چاند بردائی جیسے شاعروں کا مقلد برج بھاشا کے بغیر کیوں کر قدم اٹھا سکتا تھا۔ دربار اور گرد و پیش کی چلتی ہوئی زبان کھڑی بولی تھی وہ اس سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کھڑی بولی میں اس نے نظم لکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن جیسا ہم آیندہ عرض کریں گے اس کا رنگ اس کی زبان پر چڑھ گیا۔ فارسی و عربی کے الفاظ اس نے بکثرت استعمال کئے ہیں ماحول کا اثر زبردست ہوتا ہے اور پھر جنگنامہ کا موضوع بھی ایسا تھا کہ مسلمانوں کے لائے ہوئے الفاظ کے استعمال کے بغیر اسے چارہ نہ تھا الفاظ کے ذخیرے کے علاوہ اس کے لب و لہجے اور قواعد میں بھی کسی حد تک وہ عناصر پائے جاتے ہیں جو موجودہ ہندوستانی کے جزو لاینفک ہیں اس کی زبان پر غالب رنگ تو برج بھاشا ہی کا ہے لیکن کھڑی بولی اور اودھی کے عناصر بھی دوش بدوش نظر آتے ہیں قبل اس کے کہ ہم اس کے کلام کا کچھ نمونہ نذر ناظرین کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سر جورج گریرسن کی مشہور اور ضخیم مجلدات جائزۂ السنہ ہندوستان ہندی بیاکرن مصنفہ بابو کاملتا پرشاد گرو اور علامہ محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو کی مدد سے کچھ باتیں ان

تین زبانوں کی جو زیر بحث ہیں بعض امتیازی خصوصیات کے متعلق پیش کردیں تاکہ "جنگ نامہ" کی زبان کے خصائص کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہوجائے۔

برج بھاشا اودھی اور کھڑی بولی کی شناخت الفاظ کے آخری حروف سے کی جاتی ہے۔ کھڑی بولی کے آخر میں ا۔ آ۔ یا۔ برج بھاشا میں یو۔ اَو اور اودھی میں اے یو یا او' آتے ہیں مثلاً بَجی او۔ کری او۔ دیا او۔ اودھی۔ ساج یو۔ سجیو۔ کی یو۔ دی یو' برج بھاشا اور سا جا۔ کیا۔ دیا کھڑی بولی ہیں۔ برج بھاشا کے بھی کئی روپ ہیں۔ اس کی اسٹینڈرڈ شکل متھرا آگرہ علی گڈھ وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ آگرہ کے مشرق یعنی دھولپور قنوج اور گوالیار کے اطراف میں لب ولہجہ اسٹینڈرڈ برج کا سا ہے۔ علی گڈھ کے شمال میں بلند شہر ہے جہاں ہندوستانی یا کھڑی بولی اور برج کے لہجے میں بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔ کہیں کہیں آو۔ یو اور اوسب مستعمل ہیں کہیں تو اسمار کے آخر میں بجائے اَو کے آہی آتا ہے مثلاً گھوڑا۔ نہ گھوڑا اَو لیکن بالعموم جہاں کھڑی بولی اپنے اسمار و افعال و اسمائے صفات کے آخر میں الف لاتی ہے برج بھاشا کے آخر میں ایک واو مجہول کا اضافہ کردیا جاتا ہے جیسے اپنا سے اپنو چلا سے چلیو کہیں واو معروف کا بھی استعمال ملتا ہے جیسے بستا سے بستو۔ جن ضمائر میں 3آ یا आ3 یعنی ا یا آ آتا ہے اس کا برج میں او ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی 'د جیسے میرا میرو۔ میرَو ا/ واو معروف و مجہول / جیسا کا جیسو۔ جتنا کا جتنو اسما صفات اور افعال کا بھی یہی حال ہے اور اکثر اسمائے صفات میں لام کی جگہ رے لاتے ہیں جیسے کالا کے بجائے کارو۔ جلنا کے بجائے جرنا۔ پرایا کا پرائیو۔ پیلا کا پیرو۔ ترچھا کا ترچھو۔ اونچا کا اونچو۔ نیا کا نیّو وغیرہ جہاں تک افعال کا تعلق ہے گیا کی جگہ تم گیو۔ دیکھنا کی جگہ دیکھیو۔ پاتے ہیں۔ لاحقہ گا کی جگہ گو ملتا ہے جیسے ماروں گا سے مارونگو۔ جاونگا سے جاونگو۔ برج میں کرتا کی جگہ میں کرتو بولتے تھے اور جانا کی جگہ جائیو۔ مارتا کی جگہ ماریو۔ مارت۔ مارتو لاتے تھے۔ مارہوں۔ مارے ہوں۔ ماری ہوں کا استعمال بھی برج میں بکثرت پایا جاتا۔ کھڑی بولی ہے کی جگہ ہوں یا واو مجہول اور ہوں یا واو معروف بہت لاتے تھے۔ برج میں بعض مصادر یو' یا نو آخر میں لگانے سے بنتے تھے جیسے ہونا کی جگہ ہوئیو۔ پوچھنا کی جگہ پوچھیو۔ چلنا کی جگہ چلیو واحد وجمع تذکیر و تانیث کے اعتبار سے کھڑی بولی اور برج میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جب کسی اسم کو جو واحد مذکر ہو جمع میں لانا چاہیں تو برج میں ای۔ اِن اور انی آخر میں استعمال کریں گے جیسے دو جی

دولہن - دولہنی ۔ ٹھکرائن کی ٹھکرائنی شکل ہوگئی ۔ کھڑی بولی میں یوں اوریاں لاتے ہیں جیسے گلیاں، ٹھکرانیاں ٹھکرانیوں ۔ برج بھاشا کی ان اور انی کی جگہ ہم ن استعمال کرتے ہیں جیسے جالن (برج بھاشا) جالون (کھڑی بولی) نریں (برج بھاشا) نروں (کھڑی بولی) لیکن جمع کے لئے برج میں اسم کے آخر میں اکثر نون کا اضافہ کردیا جاتا ہے جیسے موتی کی جگہ موتن دن کی جگہ دنن پھول کی جگہ پھولن ۔ علامات جارہ میں کا کی جگہ 'کو' کا استعمال ملتا ہے ۔ مثلاً "گلے میں پھولوں کا ہار" برج میں "گل پھولن کو ہار" ہوجائے گا ۔ اسم فاعل کے لئے کھڑی بولی اور برج دونوں میں 'نے' کا استعمال پایا جاتا ہے ۔ لیکن کھڑی بولی کے برخلاف اکثر لاحقہ 'نے' افعال لازمی کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے اور یہ بات کھڑی بولی میں پائی نہیں جاتی جیسے بٹیا چلا کی شکل برج بھاشا میں بٹیا چلیو ہوگی ۔ اضافی حرف جارہ برج بھاشا میں کئی ہیں جیسے کو ۔ کر ۔ کیرا ان کی شکل کھڑی بولی میں کا اور کی ہے ۔ مثلاً راون کیرا موت یعنی راون کی موت رام کو باتیں نے ہی کر باتیں یعنی اس کی باتیں ۔ کھڑی بولی 'سے' کی جگہ برج میں 'تیں' اور 'سوں' ملتے ہیں کے لئے کی جگہ برج میں کہاں ۔ کون ۔ ہیں کو حاصل ہے ۔ کھڑی بولی کا 'کو' برج بھاشا میں 'کون' 'کہاں' کی شکل میں ہمیں ملتی ہے جیسے من مانجھیر یعنی من میں برج میں واو اکثر اوقات میم سے بدل جاتی ہے جیسے دہاں کا مہمان ۔ جاویں کا جامیں ایک اور فرق کھڑی بولی اور برج میں یہ ہے کہ اکثر الفاظ میں حرف علت کو جب کہ حرف ثانی ہو اول الذکر میں حذف کردیتے ہیں لیکن برج میں الف لاتے ہیں جیسے مٹی کی جگہ ماٹی ۔ کنکر کی جگہ کانکر ۔ پتھر کی جگہ پاتھر وغیرہ لیکن جنگنامہ میں ہم لاکھ کی جگہ لکھ ہی پاتے ہیں ۔

---

[۳]

گذشتہ اشاعت میں مصنف "جنگنامہ" کے متعلق بالخصوص تین امور کی جانب قارئین رسالہ معاصر کی توجہ مبذول کی گئی تھی (۱) سری دھر کا عرفی نام مرلی دھر تھا اور اس کے نتائج فکر "جنگنامہ" کی شکل میں ظہور پذیر ہوئے (۲) مرلی دھر مصنف رام چرتر (سال تصنیف سمبت ۱۸۱۸) اور سری دھر عرف مرلی دھر (سال پیدائش سمبت ۱۷۴۳) دو مختلف ہستیاں نہیں معلوم ہوتیں نام ذات۔ وطن دور شاعری۔ درباری تعلقات شعار زندگی کی یکسانیت ہر دو مصنفین کو ایک ہی شخص قرار دیتی ہے (۳) بیت نمبر ۸۰۔ ۱۵۰۹ کے الفاظ "بلوبو" (دراصل بلوکیو = دیکھا) اور دوری (دوڑ کر) بتاتے ہیں کہ شاعر نے چشم دید حالات منظوم کئے۔ پہلی بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ امر دوئم کے متعلق البتہ معترض کہہ سکتا ہے کہ جو نتیجہ چند مشترک صفات کے اتصاف سے نکالا گیا ہے قرین قیاس تو ہے لیکن قطعی ثبوت پر مبنی نہیں۔ ضرورت ہے کہ رام چرتر اور "جنگنامہ" اور دوسرے مختلف تصانیف کا جو اس شاعر سے منسوب کی جاتی ہیں باستیعاب مطالعہ کیا جائے خیالات کے اشتراک الفاظ کی نشست۔ نقرات و تشبیہات کے اتحاد و تکرار عبارت و مضامین کی یکسانیت سے خاطر خواہ ثبوت بہم پہونچایا جائے۔ افسوس ہے کہ ہم اس امر کا تفصال ان ہندی نقاد کے ذمہ چھوڑنے کے لئے مجبور ہیں جنھیں خوش قسمتی سے شاعر کی دوسری تصنیفات پر دسترس ہو۔ اب رہا آخری امر تو اسے بھی محل نظر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ "بلوبو" (معہا) اگر صحیح سمجھا جائے تو بھی کوئی قباحت نہیں ہوتی "بلوبو۔ میرو۔ شرتیا" میں علاوہ رعایت لفظی کے ہندوؤں کی "پورانی" روایات کی طرف

جس میں دیوؤں کا سمندر میں پہاڑ کو متھنے کا ذکر ہے اشارہ موجود ہے۔ لہٰذا شعر کی اردو نثر یہ ہوگی "سری دھر (کہتے ہیں) کہ (فرخ سیر کی فوج نے) دوڑ کر بیروں (سورماؤں) کے جھنڈ کو متھ ڈالا اور سر اور دھڑ کے پہاڑ سے خون کی ندی بہادی۔ ہمیں تو یہ تشریح جو ایک ہندی داں بزرگ سے عطا ہوئی ہے کچھ زیادہ جچتی نہیں بلوکیوں کہ کوئی سقم شاعری میں نہیں ہوتا کسی لفظ کے اضافہ کی ضرورت نہیں ہوتی شعر کسی مزید وضاحت کا محتاج نہیں رہتا۔ علاوہ اس کے جنگنامہ کے مضامین۔ طرفین کے بہادروں کی طویل فہرست۔ منازل سفر۔ مناظر جنگ اور واقعات کی تفصیل اور مستند تاریخی کتابوں سے بیشتر واقعات کا تطابق ثابت کرتا ہے کہ شاعر نے آنکھوں دیکھی اور ہم عصروں سے سنی ہوئی باتیں اپنے خاص انداز میں حوالۂ قلم کی ہیں۔ ہم سطور ذیل میں مکمل ہندی نسخے مسٹر اروِن کے انگریزی ترجمے اور بابو رادھا کرشنن اور بابو جگن ناتھ داس کے "سنگرہ" (تلخیص) سے جنگنامہ کا خلاصہ مع حواشی کے پیش کرتے ہیں تاکہ اس کی تاریخی خصوصیت پر روشنی پڑ سکے۔

کتاب کا اصل مضمون اس بیت سے شروع ہوتا ہے ؎ چھٹی چلی مہاجنی بھئی یکایک چاہ چھانڑ[1] دیہہ سرلوک کو گئے بہادر شاہ۔ یعنی فرخ سیر کو مہاجنوں کے خطوط سے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ کی روح نے جسم سے مفارقت کی اور بہشت کو سدھاری۔ اس نے اپنے بخشی اعظم خاں[2] کو حکم دیا کہ فوجیں جمع کی جائیں کم و بیش دس دن بعد

---

[1] مسٹر اروِن نے چھانڑ (چھوڑ کر) دیہہ (بدن) کا ترجمہ "قے کر کے مرگیا" کیا ہے جو صحیح نہیں چھانڑنا کے معنی چھوڑنا اور قے کرنا دونوں ہیں لیکن شاعر کا مطلب صاف ہے جو متن میں عرض کیا گیا۔

[2] اروِن نے یحییٰ خاں کے حوالے سے لکھا ہے کہ احمد خاں (غالب جنگ) نے شخصے فضل نامی کو فرخ سیر کے سامنے پیش کیا اسے اعظم خاں کا خطاب اور بخشی کا عہدہ عطا کیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ۵ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ کو بخشی کا عہدہ اس سے لے لیا گیا۔

معتبر ذرائع سے خبریں پہونچیں کہ ذوالفقار خاں اور دیگر امرا نے معزالدین کی اطاعت قبول کر لی اور ذوالفقار خاں نے فوجوں کو دھوکہ دے کر بلا لیا۔ معزالدین کی تخت نشینی کا اعلان ہوا۔ خطبہ جاری ہوا اور چاروں طرف احکام صادر کر دیئے گئے اور یہ خود دہلی[1] کی جانب روانہ ہوا۔ اس خبر کو پا کر فرخ سیر نے امرا کو جمع کیا فوج کی بھرتی کا حکم دیا تخت[2] پر بیٹھا چتر شاہی بلند کیا۔ عبداللہ[3] خاں نے حکم کی تعمیل کی الہ آباد پہونچا۔ سارے سرکار اور صوبہ پر متصرف ہوا اور فوجی دستے جا بجا متعین کر دیئے۔ اُدھر میر جملہ[4] جہاندار شاہ کی مخالفت پر تلا بیٹھا تھا لیکن قدم پھونک پھونک کر اٹھاتا تھا۔ اس نے ایک طویل خط میں فرخ سیر کو اطلاع دی کہ سید راجی خاں (مانکپوری) کو صوبہ داری الہ آباد تفویض ہوئی اس نے سید عبدالغفار خاں کو ہراول مقرر کر کے آگے روانہ کر دیا ہے اور عنقریب سے ایک بڑی فوج (شاہزادہ اعزالدین کی سرکردگی میں کوچ کرنے والی ہے۔ فرخ سیر کو یہ خط پا کر گونہ تشویش

۱؎ بہادر شاہ کی وفات ۲۰ محرم ۱۱۲۴ھ۔ جہاندار کی لاہور سے روانگی ۲۵ ربیع الثانی دہلی میں ورود مورخہ ۱۸ جمادی الاول (اروِن)

۲؎ فرخ سیر نے ۳ صفر ۱۱۲۴ھ کو دادا کے مرنے کی خبر سنی اور عظیم الشان کی جانشینی کا اعلان کر دیا۔ ۲۹ صفر کو باپ کی وفات کا حال سنا اور باغ افضل خاں میں اپنی جانشینی کا اعلان کیا (اروِن)

۳؎ یہاں شاعر نے صریحی تاریخی غلطی کی ہے ۱ ذی قعدہ ۱۱۲۲ھ کو عبداللہ خاں الہ آباد کا نائب ناظم مقرر ہوا۔ بہادر شاہ کے مرنے کے تین مہینہ قبل یہ جونپور میں وہاں کے نظم و نسق کے لئے گیا۔ پٹنہ میں اس کا بھائی حسین علی ۱۱۲۰ھ سے نائب ناظم تھا اور پٹنہ اور الہ آباد میں کچھ زیادہ فاصلہ بھی نہیں لیکن عبداللہ کے پٹنہ آنے کی شہادت کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بابو کرشن داس کہتے ہیں کہ شاید عبداللہ خاں دو ایک دن کے لئے پٹنہ آئے ہوئے ہوں لیکن ہم اس مفروضہ کو کوئی وقعت نہیں دے سکتے۔

۴؎ عبداللہ ملائے توران (مآثر الامرا) ڈھاکہ اور پٹنہ میں قاضی رہ چکا تھا عظیم الشان کی وفات کے بعد لاہور سے جانب مشرق روانہ ہوا لیکن روک لیا گیا اسی کی کارستانی تھی کہ "سرداران عمدۂ مغلیہ عظیم بہ بادشاہ زادہ فرخ سیر ساختہ بودند" (عبرت نامہ اروِن)

لاحق ہوئی لیکن حسین علی خاں (بارہہ) نے اس کا غم وغصہ فرو کیا عرض کی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تنہا عبداللہ خاں ان سب کے لئے کافی ہے اسے حکم نامہ بھیج دیا جائے۔ عبداللہ خاں نے فرمان پاکر سر وقد تعظیم کی پھر اپنا خیمہ سرا عالم چند کی طرف روانہ کیا دشمن کا راستہ روک دیا اور اپنے بھائیوں نجم الدین علی خاں، سیف الدین علی خاں، سراج الدین علی خاں کو پیش قدمی کی اجازت دی۔ راجہ رتن چند، میر محسن خاں، انور خاں، سمندر خاں، یادگار بیگ، مرزا ولی، بہرام بیگ، برقنداز خاں اور درویش علی بھی آگے بڑھے یہ سب امراء اس طرف سرائے عالم چند میں ٹھہرے۔ فوج مخالف کو ٹھن میں خیمہ زن تھی۔ طرفین کے درمیان جوش وخروش پیدا ہوا۔ دوسرے روز جنگ واقع ہوئی جو چھ گھنٹہ تک جاری رہی، سیدوں نے بڑی جانفشانی دکھلائی سید سراج الدین علی خاں مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا۔ عبدالغفار خاں[لے] بھی زخموں سے چور ہوکر بے بس ہوگیا اور اس کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ سیدوں کی فوج کو لوٹ کا کافی مال ہاتھ آیا جن کے پیر میں جوتے تک نہ تھے مالک الرقاب ہوئے۔

مرزا منظور نے اس جنگ کی روداد عبداللہ خاں کے گوش گذار کی ـــــ موخرالذکر نے قسم کھائی کہ بھائی کے خون کا میں ضرور انتقام لوں گا۔ اس کے بعد نجم الدین علی خاں الہ آباد میں واپس آئے بھائی سے ملے۔ عبداللہ خاں نے اپنی فتح مند فوج میں انعامات تقسیم کئے پھر صاحب رائے ماتھر کو حکم دیا کہ جنگ کی ساری کیفیت سید حسین علی خاں کو لکھ بھیجے موالذکر کو یہ خط شہر پٹنہ میں موصول ہوا اس کا حسب ذیل

لے "راجی محمد خاں ذکر بخشی آوردہ معظم خاں بہادر شاہی بود) کا صوبیدار الہ آباد مقرر کیا جانا۔ عبدالغفار خاں گروہزی کا بھیجا جانا سرائے عالم چند میں عبداللہ خاں کی بھیجی ہوئی فوج سے مقابلہ تاریخوں سے ثابت ہے لیکن جنگنامہ میں ابوالحسن خاں بخشی عبداللہ خاں کا نام ملتا ہے نہ عبدالغفار خاں کے بھائی کی موت کا ذکر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عبدالغفار خاں بھاگ نکلا اور معزالدین کے ساتھ فرخ سیر سے لڑا (اردن۔ سیر۔ عبرت نامہ وغیرہ)

مضمون اس نے اپنے آقا فرخ سیر کو پڑھ کر سنایا۔ ساری فوج کے ساتھ جلد آ جائیے۔ اعزالدین نے کوڑہ میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ راجہ چھبیلہ[۵۱] رام چھل کر کے اس کے ساتھ ہو لیا ہے علی اصغر خاں بھی اس کے شامل ہے لیکن ان دونوں کے دل ہمارے ساتھ ہیں۔ زین الدین خاں ولی جانباز خاں مظفر علی خاں فقیر اللہ خاں مہ یار خاں ہم سے مل گئے ہیں اور پٹنہ کا قصد رکھتے ہیں تاکہ بادشاہ (فرخ سیر) کی قدم بوسی کا شرف حاصل کریں۔ ابراہیم حسین خاں زبانی حال عرض کریں گے۔

حسین علی خاں کو سراج الدین علی خاں کی موت کا بہت صدمہ ہوا اسی پیچ و تاب میں فرخ سیر سے روانگی کی اجازت چاہی حکم ہوا دو ایک دن اور ٹھہرو امرا کو جمع کرو — اعزالدین کی فکر کیا اب تو معزالدین کی ساری فوج سے مقابلہ کرنا ہے۔ دوسرے دن دیوان خاص میں دربار ہوا۔ مرتضیٰ خاں نے بادشاہ (فرخ سیر) کے حکم کے مطابق مغرب کی جانب اپنے دستے کے ساتھ کوچ کیا۔ اور بہادر پور میں منزل گزیں ہوا۔ میر اعظم خاں بخشی کو بھی آگے بڑھنے کا حکم ملا اس کے چاروں بھائی محمد صالح خاں۔ محمد شجاع محمد حسین گلاب (غلام؟) مہدی خاں اس کے ساتھ تھے۔ ان کے علاوہ میر عزیز خاں جیما (؟) خاں سلطان قلی خاں۔ محمد حیات۔ نیک نام خاں۔ خیر الدین خاں۔ دلاور خاں۔ محمد امان بیگ۔ میر جملہ (؟) میر مکرم شجاعت اللہ خاں۔ شیخ رحمت اللہ خاں۔ تیمور خاں اور سادات خاں مازندرانی اور اس کے تینوں بیٹے فرزند خاں۔ صلابت خاں۔ سیف خاں بھی روانہ کئے گئے۔ انہیں حکم تھا کہ آگے بڑھ کر دشمنوں کو چاروں طرف سے گھیر لینے کی کوشش کریں۔

دوسرے دن فرخ سیر کے دربار میں اشرف[۵۲] خاں (خواجہ عاصم) حاضر ہوا

---

۵۱ راجہ چھبیلہ رام اور علی اصغر خاں کے واقعات بھی صحیح ہیں۔ اعزالدین سے غداری کا سبب صاحب عبرت نامہ نے بتایا ہے "در چنیں وقت نازک زہر دو فوجدار طلب محاسبہ کردند"

۵۲ اس واقعہ کی بھی تاریخیں تصدیق کرتی ہیں (عبرت نامہ۔ سیرۃ المتاخرین خافی خاں۔ اروِن وغیرہ)

یہ معز الدین کا ساتھ چھوڑ کر اور اعز الدین کی نظر بچا کر پٹنہ پہونچا تھا اس کے آنے سے فرخ سیر کو نہایت مسرت ہوئی اسے خان دوراں کا خطاب دیا۔ اب کسی نیک ساعت میں پٹنہ سے کوچ کی تیاری ہونے لگی کہ اس اثنا میں فقیر اللہ خاں غازی الدین خاں (") جانباز خاں اور ابراہیم حسین خاں بھی آ پہونچے انہیں بھی خطابات و انعامات سے سرفراز کیا گیا۔ ابراہیم حسین خاں کو بھاگل پور جانے کا حکم ملا۔ سید[ے] غیرت خاں کو پٹنہ کی (نائب) صوبیداری تفویض ہوئی۔ دیگر امرا اور سرداران فوج کے اجتماع کا حکم دیا۔ یہ سب سلاح بکتر ساز و سامان سے آراستہ ہو کر کوچ کے لئے تیار رہے (یہاں پر ایک طویل فہرست شاعر نے فرخ سیر کے عمائدین و رفقا کی پیش کی ہے مسٹر ارون نے یہ حصہ ترک کر دیا ہے۔ مگر چونکہ ہندی کتاب عسیر الحصول اور بالخصوص اردو داں حضرات کی دسترس سے باہر ہے اس لئے ہم ان کے اسمار کو ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ علاوہ ان کے جس کا نام اوپر آ گیا ہے حسب ذیل امرا فرخ سیر کے ساتھ تھے۔ حسین علی خاں۔ علی نقی خاں۔ عنایت اللہ خاں (اس کا بیٹا) شجاعت اللہ خاں۔ میر مشرف[ے]۔ اسد علی خاں۔ آتش خاں۔ منظفر خاں۔ نور اللہ خاں (اس کا بیٹا) عنایت خاں۔ دوست علی خاں۔ ولی محمد۔ سادات خاں۔ خانہ زاد خاں (خطاب شایستہ خاں) رستم خاں۔ داؤد خاں۔ دویٹہ باز۔ نصرت خاں۔ امیر خاں۔ سیف اللہ خاں۔ مرزا قاسم بیگ سلطان بیگ۔ فتح اللہ خاں۔ افراسیاب خاں۔ محمد واسع خاں۔ فتح علی خاں (میر آتش) راجہ گند هرپ سنگھ (بلندیلہ) صف شکن خاں۔ گلاب (غلام) علی خاں (ذوالفقار خاں

لے

ے یہ لکھنؤ کا رہنے والا تھا اور حسین علی خاں کے مشہور رفقا میں تھا۔ اس کا ذکر تاریخوں میں متعدد مقامات پر آتا ہے۔

ے یہ سید برادران کا عزیز تھا۔ ارون کا نوٹ اس کے متعلق ملاحظہ ہو۔

ے حسن بیگ نائب ناظم اڑیسہ (سیر المتاخرین۔ خافی خاں ارون وغیرہ

خطاب ، میر ممتاز خاں[1] ۔ امتیاز خاں ۔ دربار خاں ۔ مظفر علی خاں (طرہ باز) اکبر علی خاں ۔ سیّد انور خاں ۔ جبار خاں ۔ بیرم خاں ۔ رشید خاں ۔ الانچی بیگ (خطاب بہادر دل خاں) اختیار خاں مخلص خاں ۔ خواجہ عبداللہ (اس کا بیٹا) خواجہ رحمت اللہ ۔

جب کل سردار مجتمع ہوئے فرخ سیر نے ارسلان خاں کو پیش قدمی کی اجازت دی ، یہ نقارہ بجاتا ہوا پیش خیمہ لے کر آگے روانہ ہوا اور پانچ کوس پر منزل گزیں ہوا ۔ دوسرے روز علی الصباح فرخ سیر کی سواری بڑے طمطراق سے نیک شگون میں روانہ ہوئی اطراف و جوانب سے جانباز آتے اور اس کی فوج سے ملحق ہوتے گئے ۔ مختلف مقامات پر منزل کرتا ہوا فرخ سیر کھجوراں پہونچا ۔ یہاں اعظم خاں اس کی فوج کے ساتھ آکر ملحق ہوا ۔ بہادر پور میں مرتضیٰ خاں ملا بہار اس کے نزدیک[2] نمازِ عید ادا کی گئی ۔ پھر بھیری کی راہ سے فوج مہوسی پہونچی وہاں سید عبداللہ خاں نے شرف ملازمت حاصل کیا قطب الملک کا خطاب پایا اس کے رفقا کو بھی حسب مراتب مناصب وسروپا و انعامات عطا کئے گئے ۔ دریائے گنگا پر پل قائم کیا گیا ۔ فوج پار اوتری چار دن الہ آباد میں جانبِ مغرب قیام رہا ۔ یہاں فرزند خاں ، صلابت خاں اور سیف خاں حاضر ہوئے ۔ راجہ چھبیلہ رام اپنی فوج کے ساتھ پہونچا اس کا استقبال کیا گیا ۔ راجہ کا خطاب اور چار ہزاری منصب ملا اس کے بعد علی اصغر خاں ہانسی گرام میں آکر ملحق ہوا ، اسے بھی چار ہزاری منصب اور خان زمان کا خطاب عطا کیا فوج آگے بڑھی اور کمواز پور کے پورب او بندو[3] کی گاؤں کے پچھم ایک درمیانی مقام پر خیمہ زن ہوئی (شاہزادہ) اعز الدین نے

---

[1] میر ممتاز خاں اور امتیاز خاں کا ذکر عبرت نامہ میں موجود ہے ۔

[2] اس کی تصدیق کامدار خاں صاحب تذکرہ سلاطین چغتائیہ نے کی ہے ۔

[3] تذکرہ سلاطین چغتائیہ ۔

فتح آباد سے آگے جانب مشرق اور بندو کی کے مغرب میں ایک جگہ چھاؤنی ڈالی تھی۔[1]
خندق کھود رکھی تھی اور اپنی فوج کے ہر چہار جانب مضبوط مورچہ قائم کیا تھا دونوں
فوجوں کے درمیان قریب تین کوس کا فاصلہ تھا۔ فرخ سیر کی فوج میں جوش پیدا ہوا
عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے پیش قدمی کی عنایت خاں شجاعت خاں وغیرہ
نے بھی بڑھ کر حملہ کر دیا (یہاں شاعر نے متعدد۔ قریب اسّی جاں بازوں کی فہرست دی
ہے اور کئی اشخاص کو کسی نہ کسی اضافی صفت سے یاد کیا ہے مثلاً دھنگ دھر (تیر باز)
"یودھ یودہا" (جنگ آزما) سولچھن (نیک سیرت) شیلتا حد (اخلاق مجسّم) وشال
بھوج بل (مضبوط بازوؤں والا) وغیرہ۔ یہاں کئی نئے نام ملتے ہیں جس میں حسن خاں
دیوان الہ آباد، یادگار بیگ۔ میاں منظور۔ امین الدین خاں۔ حلیم خاں۔ افتخار خاں۔ رستم
خاں وغیرہ قابلِ الذکر ہیں۔ فرخ سیر نے اپنی فوج کی صف آرائی کی اور خود گھاٹیں (؟)
روک کر کھڑا ہو گیا ؎

شہنشاہ سو بھوج بانٹی   رھیو آپن روکی گھا نٹی

فوج مخالف جہاں کی تہاں تھم کر رہ گئی اور دشمنوں کے دل میں کھلبلی سی مچ گئی ؎

بنٹی یہو جیں دلّی جہاں تہاں
پریو کھر بر شتہرو (دشمن) دل مہاں (میں)

آخر اعزالدین کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی خوب لوٹ مچی۔ امتیاز خاں نے بڑھ کر فرخ سیر کو
تہنیت نامہ پیش کیا اور اطلاع دی کہ معزالدین نے اپنے نہایت معتمد امرا یعنی خاں دوراں
(حسین خاں) توشیری خاں (ابن کوکلتاش خاں) عبدالصمد خاں، لطف اللہ خاں

---

[1] بقول صاحب عبرت نامہ جنگ کھجوہ میں درعشرہ اولی شوال واقع ہوئی۔ کامدار لکھتا ہے کہ
دو شبانہ روز جنگ توپخانہ بہ میان آمد" لیکن ۲۹ رشوال کی شب کو" پیش ازانکہ جنگ صفوف بمیان آمد" خاں
دوراں نا تجربہ کار اعزالدین کو لے کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔

صادق راجی خاں، دل دلیر خاںؒ کو حضور کے خلاف جنگ کے لئے بھیجا لیکن اعزالدین کی نالائقی نے اس کا کام بگاڑ دیا امرا اسے لے کر میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ بار برداری مویشی محانے توپ نقار خیمہ جات سب چھوڑ گئے۔ ممتاز خاں کو حکم ہوا کہ ہاتھی گھوڑے، توپ اور نقارہ کو لے کر باقی مال غنیمت لوٹنے والوں کے قبضہ میں چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے دن دربار ہوا مظفر خاں اور مرحمت خاں۔ مستحق عنایت سمجھے گئے اول الذکر کو خان جہاں بہادر اور موالذکر کو مشہور خاں کے خطابات عطا ہوئے

اس فتح کے بعد فوج نے اسی جگہ چار دن قیام کر کے آرام کیا پھر فرخ سیر آگے بڑھا اور قصبۂ شاہ مدار میں پہونچ کر مزار مبارک کی زیارت کی دس دن تک اس جگہ قیام رہا انعامات تقسیم کئے گئے اس اثنا میں میر جملہ کی عرضی پہونچی جسے ممتاز خاں نے دربار میں پیش کیا اور تقرب خاں نے پڑھ کر سُنایا۔ عبد اللہ خاں کے عقل مند کایست عملہ شیرومنؒ اس متوطن سانڈی نے جس نے معزالدین کے دربار میں آمد و رفت کر کے حالات کا نظر غائر سے مطالعہ کیا تھا اپنے آقا کے پاس ایک طویل خط (... مصرعہ) بھیجا جس میں دربار کا نقشہ کھینچا تھا۔ مضمون خطایہ تھا" معزالدین مغرور اور نشہ سے چور رہتا ہے مراد کی جگہ گویوں اور ڈھاڑیوں نے لے رکھی ہے اور ماہی و مراتب علم پنجہ نوبت پاکر پھولے نہیں سماتے رات دن ڈھول مردنگ شراب افیم اور بھنگ کا مشغلہ ہے دربار میں ہر طرف خوش گلو رقاصائیں زیبا صورت کمسن لڑکے بازی گروں کے چھوکرے نازک تن خواجہ سرا نظر آتے ہیں۔ تماشی کا بازار گرم ہے معزالدین کو امور سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں

لے یہ لطف اللہ خاں صادق پانی پتی کا بھائی تھا، اس کا ذکر بھی تاریخوں میں آتا ہے

لے در اصل اس قصبہ کا نام مکھن پور ہے کہ مرکار خاں لکھتا ہے" بعد فتح سترگ شاہ جواں بخت (فرخ سیر) بعزم زیارت مزار شریف حضرت شاہ بدیع الدین قدس سرہٗ عرف شاہ مدار متوجہ مکھن پور گشت بعد سعادت زیارت بصوب مستقر الخلافت اکبر آباد (آگرہ) رو گذاشت۔"

سارا اقتدار کو کلتاش خاں اور ذوالفقار خاں نے غصب کر رکھا ہے مگر ان دونوں میں کبھی کسی آن نہیں بنتی غازی الدّین خاں (چین قلیج خاں) محمد امین خاں عبدالصمد خاں قمرالدین خاں زکریا خاں رحیم خاں غرض کل تورانی امرا کو میر جملہ نے ورغلا کر اپنی طرف ملا لیا ہے اور یہ سب اس کے اشارہ پر چلنے کے لئے تیار ہیں۔ ایک روز معزالدّین دربار میں بیٹھا تھا شراب کا دور چل رہا تھا کہ فرخ سیر کی فوج کے قنوج میں پہونچنے اور اعزالدّین کی شکست کی خبریں پہونچیں رنگ میں بھنگ پڑ گیا سب کے ہاتھ پیر پھول گئے معزالدّین بڑبڑانے لگا کہ مجھی سے چوک ہوئی کہ ایک (ناتجربہ کار) کو سردار فوج بنایا اور نا اہل امرا کے ہاتھ میں زمام اختیار دے دیا خواجہ حسین کو جنگ کی واقفیت ہی کیا لطف اللہ خاں صادق پانی پتی کو کبھی لڑائی سے کیا سروکار۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو سیدوں کو زیر کرتا اب میں خود ہی کل کوچ کروں گا بارہا کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا میں نے تلوار کی زور سے تین شاہزادوں پر فتح پائی تخت و تاج حاصل کیا ان دشمنوں کا بھی قلع قمع کر دوں گا۔ اس کے بعد اعزالدّین کو حکمنامہ بھیجا گیا کہ آگرے میں پناہ قدم جمائے رکھے گھاٹ اور پایاب مقامات کی حفاظت کرے اور نہایت جلد بالم پور سے نیچے تین مضبوط پل باندھ رکھے اس کے بعد بخشی کو حکم دیا گیا کہ سواروں کو مجتمع کرے فوجیوں کو دو مہینہ کی پیشگی تنخواہ ادا کر دی جائے اور سارا انتظام کرکے رات ہی کو کوچ کی تیاری کرے اور میر منزل کو آگے روانہ کر دے۔ امرا کو حکم ہوا کہ علی الصباح

ل؎ جہاندار شاہ کے دربار کا یہ صحیح مرقع ہے کوکلتاش خاں اور ذوالفقار خاں کی منافقت و عناد کی شہادت بھی تاریخوں میں ملتی ہے

۲؎ عبرت نامہ۔ تاریخ ارادت خاں۔ اروِن وغیرہ

۳؎ مبارک اللہ واضح لکھتا ہے کہ خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ جواہرات الات و جنس حتیٰ کہ چھت کے طلائی حصہ کو بھی گلانے کی نوبت آئی لیکن زیادہ فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔

بہ عجلت آگرہ کی طرف قدم بڑھائیں اٹاوہ پر قبضہ کرلیں۔ دوسرے دن جب ساری فوج تیار ہوگئی معز الدین سوار ہوا لیکن چاروں طرف سے بدشگونیوں[1] کا سامنا ہوا (اس پر آیندہ روشنی ڈالی جائے گی) باوجود اس کے فوج نے کوچ کیا آگرہ پہونچی ساموگڈھ[2] میں چھاؤنی پڑی اعز الدین نے یہاں آکر باپ سے ملاقات کی اور اس کی بھاگی ہوئی فوج بھی سمٹ آئی ان کے سامنے معز الدین پھر اپنی بڑائی ہانکنے لگا کہتا تھا کہ سارا فساد ان "بارہا" کے سیدوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ میں انہیں زیر کروں گا سادات خاں نے کینہ کو راہ دی اپنے رشتہ مند کا حکم مانا اور اس کے بیٹے فرزند خاں نے بھی جولانی دکھائی جیسے صمصام الدولہ کہتے ہیں میں اس کی تلوار ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا کون ہے جو میدان جنگ میں میرے سامنے ٹھہرنے کی جرات کرسکے مقہور چھبیلہ رام نے اعز الدین کے دربار میں حاضری دی پھر جُل دے کر دشمنوں سے مل گیا اور یہی حال علی اصغر خاں کا ہوا انہوں نے میری طاقت کا اندازہ نہیں کیا۔ غرض ان سب پر بخار اتار کر معز الدین نے اپنی فوج کا جائزہ لیا پانچ لاکھ سوار[3] اور کئی ہزار ہاتھی شمار میں نکلے۔ توپ داغی گئی"۔

قاصد نے دیوان عام میں یہ خط فرخ سیر کے سامنے پیش کیا۔ صاحب رائے ناتھ نے پڑھ کر سنایا۔ میر جملہ کے مکتوب کا ماحصل بھی یہی تھا۔ عبداللہ خاں نے مونچھوں پر تاؤ دیا اور ہنس کر کہا کہ اگر اجازت ہو ابھی بڑھ کر حملہ کردوں اور

---

[1] ۱۱ر یا ۱۲ر ذی حجہ کو آگرہ کی طرف روانگی (عبرت نامہ) علامات ادبار از روزے کہ جہاندار شاہی متوجہ اکبر آباد شد" کامور خاں۔ اردن۔

[2] یہ مقام مبارک سمجھا گیا کیونکہ دارا کو اورنگ زیب نے اسی جگہ شکست دی تھی۔ اردن

[3] یہاں کچھ شاعرانہ مبالغہ ہے لیکن تعداد کے متعلق تاریخوں میں اختلاف ہے۔ اردن کی کتاب متاخرین مغل جلد اول ملاحظہ ہو۔

معزالدین کی قوت کو توڑ دوں فرخ سیر کو ڈھارس ہوئی ۔ بارہائے سردار سید عبداللہ کی اس پُرجوش تقریر کے بعد محمد خاں بنگش نے بیس ہزار مسلح فوج کے ساتھ آکر حاضری دی اسے پنج ہزاری منصب عطا ہوا اور اس کے رفقا کو بھی مناصب سے سرفراز کیا گیا انہیں ہراول لشکر میں جگہ دی گئی اب فوج نے کوچ کیا آگرہ پہونچی بالم پور کے نیچے دریائے جمن پایاب ہے فرخ سیر کو اس خبر سے نہایت مسرت ہوئی ۔ اس نے ایک چال سوچی خبر مشتہر کی گئی کہ دشمنوں نے دریا کو عبور کر لیا ہے ۔ کچھ فوج تو روکنے کے لئے وہیں چھوڑ دی گئی ۔ فرخ سیر بقیہ فوج کے ساتھ تیار رہا ۔ سید (عبداللہ خاں) رات ہی کو ایک دستہ کے ساتھ دریا کے پار اتر گیا اور شب بھر کٹ کٹاتے جاڑے میں کھڑا رہا یہاں تک کہ وہ فوج جو دشمنوں کو روکنے کے لئے متعین تھی واپس بلالی گئی اور قریب چار کوس آگے بڑھ کر تین چار گھنٹہ میں صبح ہوتے ہوتے دریا کے پار تھی سکندرہ سے دو ایک کوس پورب فرخ سیر کا خیمہ پڑ گیا ۔ اس خبر کو سُنّا تھا کہ معزالدین کی فوج میں ابتری پھیل گئی مارے غصّہ کے یہ اٹر بڑ بولنے لگا اور آنکھیں لال پیلی کرکے تلوار کو گھمانے اور مونچھوں پر تاؤ پھیرنے لگا کہتا تھا کہ میں کسی باغی کو زندہ جانے نہ دوں گا اور سب کو عذاب کے شکنجے میں کس دوں گا ۔ پھر یہ اپنے جنگی ہاتھی پر سوار ہوا اور پانچ لاکھ

لہ محمد خاں بنگش کا آنا اور کارنمایاں انجام دینا متحقق ہے لیکن ہمراہیوں کی تعداد اتنی نہیں تھی ۔

لہ یہ باتیں تاریخوں میں موجود ہیں صاحب ماثرالامرا لکھتے ہیں "معزالدین در فکر عبور کردن دریا جمن بود کہ حسن علی خاں پیش قدمی نمودہ از متصل سرائے روز بہائی جبار کردھے از اکبرآباد دریائے جمن را عبور کرد و در عقب او فرخ سیر نیز از دریا عبور کرد" کامور خاں بھی لکھتا ہے کہ ۱۲ ر ذی حجہ شب شنبہ کو عین تقاطر باراں وکثرت بخار میں قطب الملک نے ہراول فوج کو قریب سرائے روز سانی متصل سکندرہ " دریائے جمنا سے پار اتار دیا ۔ خفی خاں (منتخب اللباب)

ٹڈی دل فوج حرکت میں آئی آگرہ کے جنوب میں سکندرہ کے نزدیک بروز چہارشنبہ[1] بتاریخ ۱۵ ار ۱۵ اردیبہشت سمبت ۱۷۶۹ء مطابق ۱۱۲۳ھ ہجری ۴ ار محرم ۲۳ ماہ الٰہی آذر دونوں فوجیں۔ چھ گھنٹے موسلا دھار[2] پانی برسنے کے بعد جب مطلع صاف ہوا ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں سید عبد اللہ خاں نے سبقت کی پھر تو ہر چہار جانب سے سورما دوڑ پڑے گھمسان کا رن پڑا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے ادھر ہزار تو ادھر لاکھوں تھے مگر قلیل نے کثیر کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے۔

(شاعر نے اپنی کتاب کے آخر میں، اور یہ نصف سے کچھ ہی کم ہے، اس جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ مختلف مناظر پیش کئے ہیں۔ متعدد جانبازوں کے کارنامے اور دست بدست لڑائی کی کیفیت اپنے خاص انداز میں نظم کی ہے۔ یہاں اس نے پورا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ لیکن عام سی باتیں بہت کم بتائی ہیں ہم محض چند اہم واقعات پر اکتفا کرتے ہیں)۔ قطب الملک عبد اللہ خاں، بادشاہ (فرخ سیر) کا حکم پاکر نعرہ بلند کرتا ہوا دائیں طرف حملہ آور ہوا اور طبلِ جنگ بجنے لگے " بزن بزن " کا شور ہوا محمد خاں بنگش عبد اللہ خاں کے ساتھ آگے بڑھا اور اس کے پیچھے افغانوں کے مختلف قبائل (ان کا ذکر آئندہ ہوگا) لوٹنے میں غرق اور جان کی بازی کھیلنے پر آمادہ رواں دواں تھے۔ رحیلوں کا دستہ زین الدین خاں[3] داؤدزئی کی سرکردگی میں شریکِ جنگ تھا نامی سورماؤں کی چھبیلہ رام جھبری کر رہا تھا خان دوران سادات خان امیر خاں اور بہادر ممتاز خاں مع اپنے رفقاء رشتہ مندوں کے

---

[1] روز چہارشنبہ سیزدہم (۱۳) ذی حجہ ۲ ماہ الٰہی سنہ ۱۱۲۳ (کامگار خاں) دن اور سمبت سال صحیح ہیں مگر لکھا (۳۳) کو کتابت کی غلطی اور لکھا (۲۴) بھی سمجھا جائے تب بھی غلطی باقی رہتی ہے۔ اگرچہ چند تاریخی کتابیں بھی "ثلث و عشرین و مائۃ و الف ۱۱۲۳" تا باقی ہیں۔ ماثر الامرا۔ (بحر الامواج)

[2] کامگار لکھتا ہے " در نصف النہار اندکے درباران تخفیف شد"

[3] ماثر الامرا۔ اردو

کارنمایاں انجام دینے لگے ۔ اس طرح معز الدین (جہاندار شاہ) نے اپنے جنگی دستوں کے صفوف کو آراستہ کر رکھا تھا ہراول فوج کی کمان کوکلتاش خاں کے ہاتھ میں تھی نوشیری خاں (اس کا بیٹا) اور اعظم خاں[۱] (اس کا بھائی)، راجی خاں۔ عبدالصمد علی خاں، سید عبدالغفار خاں اپنے آقا کے لئے لڑنے مرنے کے لئے تیار تھے۔ طرفین کے بہادر بحر جنگ میں غوطہ زن ہو گئے۔ عبداللہ خاں نے جنوب کی جانب رخ کیا زین چند معظم خاں، برقنداز خاں، شمس خاں، انور خاں، سمندر خاں۔ یادگار بیگ، منظور میاں اس کے ساتھ تھے۔ دوسری طرف حسین علی خاں بخشی نے حملہ کیا عنایت اللہ خاں زین الدین خاں داود زئی گلاب علی خاں شیخ شجاعت اللہ خاں۔ اسد علی خاں گلاب (غلام مہدی خاں بخشی کی کمک میں دوڑے فتح علی خاں نے اپنی توپیں ساجیں اعظم پیر محمد پوریہ افغان (امیر الدین) خاں۔ سلطان قلی خاں، فتح خاں، محمد امان، محمد باقر عبدالرسول اور چھبیلہ رام نے اوزبے حملہ کیا موخرالذکر کا خویش گلاب رائے اس کا ابن عم گردھر بہادر اور بھائی دیا بہادر اس کے ساتھ تھے بھگوتی داس اس کے لڑکے نے سورماؤں کو للکارا۔ راجہ گندھرپ سنگھ کے ہمراہیوں میں بندیلے چوہان خندیل گور رگھو بنسی چندر بنسی۔ کچھواہہ تھے بنسی پر تہار غرض مختلف راجپوت قبائل کے افراد جنگ آزما تھے۔

غازی الدین خاں داؤد خاں سیف اللہ خاں[۲] کاظم بیگ سلطان بیگ خانہ زاد شائستہ خاں، افراسیاب خاں[۳] افضل خاں صدر الصدور سید انور خاں محمد علی عزیز خاں دربار خاں اختیار خاں مخلص خاں الانچی بیگ ارسلاں خاں۔ رشید خاں فتح اللہ خاں تقرب خاں بیرم خاں جانباز خاں فقر اللہ۔ سید مرتضیٰ خاں بارہہ ٹیکا رام بھیر بہلیہ میاں نہال خاں اعتماد خاں بھی۔ کارنمایاں انجام دے رہے تھے۔ میر اشرف ذوالفقار خاں کی طرف بڑھا اور جنگ کرتا ہوا مارا گیا اس کا بھائی میر مشرف غصے سے بیتاب ہو کر شیر کے مانند دشمنوں پر جا پڑا۔ فتح علی خاں صف شکن خاں[۴]

---

[۱] محمد خاں، اعظم خاں بہادر، منصور جنگ رستم جنگ" ۔ عبرت نامہ

[۲] تذکرہ سلاطین چغتائیہ

[۳] ایضاً [۴] ایضاً اردو

اور زین الدین خاں بھی کھیت رہے۔ ادھر کے بھی کئی نامور مارے گئے سید حسین علی خاں[1] اور ذوالفقار خاں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے آخرالذکر کی اعانت کے لئے مختار خاں جاں نثار خاں لطف اللہ خاں، دل دلیر خاں بڑھے انہیں راجہ چھبیلہ رام عظیم خاں سلطان علی خاں۔ شیخ اسوجت خاں نے روکا۔ راجہ چھبیلہ رام کا مہاوت مارا گیا راجہ نے ہاتھی سنبھالا اتنے میں اس کے داماد رائے گلاب رائے نزدیک پہونچ گئے مختار خاں اپنے ہاتھی کے ساتھ کام آیا۔ اس پر راجہ گردھر بہادر دیوان بھگونت رائے کایستھ کا بیٹا سوبنس رائے بینی رام ناگر۔ سید امام شیخ احمد خاں پیر محمد افغان جھٹولیہ۔ سید شاکر غلام محی الدین خاں نے پورے جوش سے دشمنوں پر حملہ کیا نواب اعظم خاں کا مقابلہ جانی خاں نے کیا۔ موخرالذکر مارا گیا جنگ اسی حال پر جاری تھی کہ یکایک عبداللہ خاں بنگش[2] شادی خاں، رتن چند، نجم الدین خاں ان کے دیوان کرشن داس سید انور خاں سمندر خاں منظور طیب عرب یادگار بیگ کے ساتھ دشمنوں پر ٹوٹ پڑے کوکلتاش خاں۔ سید راجی خاں عبدالصمد خاں نوشیری خاں عبدالغفار نے روکنے کی بے فائدہ کوشش کی۔ کوکلتاش خاں اور قطب الملک محمد خاں بنگش اور اعظم خاں اور نوشیری خاں سے دو بدو مقابلہ ہوا سید راجی خاں عبدالصمد خاں اور راجہ رتن چند اور انور خاں نے بھی ایک دوسرے کا مقابلہ کیا قطب الملک (عبداللہ خاں) کی جرأت دیکھ کر فرخ سیر کی فوج کی ہمت بڑھی، ہوئی ندی بہہ گئی جیسے پہاڑ سے چشمہ پھوٹ نکلتا ہے بالآخر معز الدین نے فرخ سیر سے آگرہ کے میدان میں شکست کھائی اور خوش قسمت فرخ سیر اقلیم ہند کا فرماں روا ہوا۔ ●●

---

[1] حسین علی خاں بہادر با میر الامرا (ذوالفقار خاں) شدہ بعد رزم نمایاں زخمی شدہ برخاک میدان افتاد۔ عبرت نامہ از [illegible] کامگار خاں۔

[2] عبداللہ خاں کے اچانک حملہ کا جس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تب تاریخوں میں ذکر ہے لیکن بیانات میں اختلاف ہے "ہنوز جہاندار ساھیاں حرکت نہ بوتی میکردند کہ سید عبداللہ از پشت حیدر دل فوج رسیدہ شروع بہ تیر اندازی کردہ (کامگار خاں) درین اثنا سید عبداللہ خاں نزدیک سیادہ میر الامرا گذشتہ تعاقب فوج جہاندار شاہی در آمد۔

[۴]

جنگنامہ کی تاریخی حیثیت کا کچھ اندازہ اس کے خلاصے سے جو اشاعت ماسبق میں مع ضروری اشارات کے پیش کیا گیا ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسی تاریخی کتاب خواہ انگریزی ہو یا فارسی دستیاب نہیں ہوتی جسمیں فرخ سیر و جہاندار شاہ کی جنگ میں حصہ لینے والوں کی اتنی کثیر تعداد درج ہو۔ محض فرخ سیر کے رفقا و جاں نثاروں کی تعداد سو سے زیادہ ہے اور ان میں علاوہ سید برادران کے ایک درجن سے زیادہ ایسے حضرات کے نام آئے ہیں جن کے کارناموں کا تذکرہ مستند تاریخی کتابوں میں موجود ہے جہاندار شاہ کے رفقا کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے لیکن اس میں وہ سب مشہور ہستیاں شامل ہیں جن کے اس جنگ میں شمول کی شہادت تاریخی اوراق میں پائی جاتی ہے۔ البتہ طرفین کے بہادروں میں دو ایک نام ایسے بھی ہیں، جن کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے لیکن **جنگنامہ** میں مفقود ہے۔ ابوالحسن خاں بخشی عبداللہ خاں جس نے عبدالغفار خاں کی جنگ میں شرکت کی اور رضا قلی خاں داروغہ توپخانہ جس نے اپنے آقا معزالدین جہاندار شاہ پر اس جنگ میں اپنی جان نثار کی، خلاف توقع ہمارے شاعر کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے برعکس **جنگنامہ** میں کئی باتیں ایسی ہیں جن سے

ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ سری دھر عرف مرلی دھر نے اکثر حضرات کے ذاتی و خاندانی تعلقات اور فرخ سیر کے عطا کردہ خطابات سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ اس ضمن میں اس کے بیانات کی صحت میں شک و شبہ کی بہت کم گنجائش ہے اس لئے کہ ان میں چند ایسے بھی ہیں جن کے باہمی تعلقات اور خطابات کا پتہ تاریخی اوراق میں بھی ملتا ہے۔ شاعر نے طرہ باز۔ دوپٹہ باز۔ شوکد (خوش قد) ساڑھے تین ہاتھ قد (قد) وغیرہ تعبیرات سے بعض حضرات کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ اعظم خاں بخشی اس کے بھائیوں اور ہمراہیوں کے آگے بھیجے جانے اور ارسلان خاں کی پیش قدمی کا تذکرہ ہمیں کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ سید عزت خاں کی نیابت بہار کا ذکر تو اکثر مورخین نے کیا ہے لیکن ابراہیم حسین کا تذکرہ اور اس کے حکومت بھاگلپور پر تقرر کا حال ہمیں سری دھر کے سوا کوئی دوسرا ہم عصر مصنف نہیں بتلاتا۔ فرخ سیر کی پٹنہ سے روانگی اور منزل بہ منزل کوچ کا تفصیلی بیان مسٹر اروِن نے اپنی مشہور کتاب متاخرین مغل جلد اول میں جمع کر دیا ہے لیکن چند ایسے مقامات بھی ہیں جن کے متعلق اکثر تفصیلات جنگنامہ میں ہی ملتی ہیں۔ میر جملہ کے خطوط اور شیر دمن داس متوطن ساندی کی طویل عرض جنگنامہ کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ راجہ گندھرپ سین بندیلہ اور راجہ چتر سال کی اس جنگ میں شرکت جنگنامہ کا ایک تاریخی انکشاف ہے۔ شاعر نے اکثر راجپوت قبائل کے نام گنائے ہیں۔ ہاڈا۔ گوڑ۔ سوبنسی۔ چوہان۔ چندیل۔ باگھیلے۔ گھروار۔ رگھو بنسی۔ کچھواہا۔ سولانکی۔ بے بنسی۔ پیر نیت۔ پریہر بنسی۔ سورج بنسی۔ سولانکی وغیرہ۔ ہم موجودہ معلومات کی بنا پر قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ واقعی یہ سب قبائل شریک جنگ تھے۔ لیکن افغانوں کے جن قبائل کا ذکر ابیات ۹۰۵ تا ۹۱۵ میں آیا ہے اغلب ہے کہ ان میں اکثر اس جنگ میں شامل تھے اس فہرست میں حسب ذیل نام ملتے ہیں۔ گکھی (غلزئی)۔ گبی۔ گوترانی۔ ترین۔ تیراہی۔ تورہ۔ کاسی۔ کاسب۔ کاکر۔ داؤدزئی۔ دزاک۔ آگر۔ ہشانی۔ سور۔ روشانی۔ روہیلہ۔ لودی۔ لوہانی۔ نیازی۔ لنفر۔ شروانی۔ بنیچی۔ خویشگی۔ مہمند۔ بختاری وغیرہ۔ عبد الغفار خاں، اعز الدین جہاندار شاہ سے فرخ سیر کی معرکہ جنگ کا تذکرہ جنگنامہ میں موجود ہے اور اگر چند امور سے قطع نظر کی جائے تو ان مختلف جنگوں کی تفصیل کی تاریخی حیثیت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ کہیں کہیں

سری دھر نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مثلاً محمد خاں بنگش کے دستہ کو بیس ہزار اور جہاندار شاہ کی فوج کو تقریباً پانچ لاکھ بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصنف **جنگنامہ** شاعر تھا مورخ نہ تھا۔ بسا اوقات مورخین نے بھی تعداد افواج بتانے میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ جن حضرات نے کرنل ٹوڈ کی مشہور تاریخ راجستھان ملاحظہ کی ہے جانتے ہیں کہ بھاٹ شاعروں کے بیانات جو ٹوڈ کے ماخذ ہیں کس قدر مبالغہ آمیز واقعات پر مبنی اور رطب و یابس سے پُر ہیں' سری دھر کا احسان ہے کہ اس نے جنگ فرخ سیر و جہاندار کا ایسا خاکہ کھینچا ہے جس میں سیاہ و سفید کی قابل اعتنا آمیزش نہیں جس سے ہمیں کئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور جسے اس مبحث پر ہم ایک ماخذ کا رتبہ دے سکتے ہیں۔

مسٹر اروِن نے اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ تاریخی حضرات کے نام کی ہجنات اور بعض مقامات کی تفصیلات سے جو ہمیں **جنگنامہ** میں ملتی ہیں نہ صرف ہماری موجودہ معلومات میں کسی حد تک اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ مصنف **جنگنامہ** خود اس جنگ میں شریک تھا یا فوراً بعد اس نے جنگ کے حالات حوالہ قلم کئے۔ اس نظم کی طوالت اور امرا و عہدہ داروں کی بے حد تعریف و توصیف اور بیجا تکرار کی طرف اشارہ کیا ہے اور چند غلطیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ بعض بیانات" اور یہ بہت کم ہیں " غیر تاریخی ہیں۔ انھوں نے تین غلطیاں پیش کی ہیں (۱) عبداللہ خاں کو پٹنہ میں بتایا گیا ہے حالانکہ وہ الہ آباد میں تھا (۲) میر جملہ کی جہاندار سے مخالفت افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی (۳) جنگ آگرہ کی تاریخیں بالکل غلط ہیں۔ امر اول کے متعلق گو پہلے کسی جگہ حاشیہ میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عبداللہ خاں کا بہادر شاہ کے مرنے کے بعد جونپور جانا ثابت ہے لیکن پٹنہ آنے کی روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی لیکن اصل ہندی کتاب کے تومار چھند کے ۲۱ مصرعوں میں جہاں سے یہ مفہوم متخرج ہوتا ہے کسی جگہ پٹنہ کا نام تک نہیں آیا ہے متعلقہ اشعار یہ ہیں: ۔

یہ حکم کری شہ وکھت (وقت) دھری چھتر بیٹھے تکھت (تخت) سب شاہ کے دلوج (دلور جانثار) تب لگے راکھن ہوج (فوج)۔ سجی عبداللہ کہاں رکئے۔ پرتھم (پہلے) کوپ (غصہ) پابان (کوچ) ہوبہ (ہوا) شاہ کو ارشاد۔ پہونچا الہ آباد۔ صوبہ دبیئے۔ سرکار۔ سب کیا عمل ادوار (مضبوط) اچھے

وقت میں (فرخ سیر نے) یہ حکم دے کر۔ چتر بلند کیا، تخت پر بیٹھا۔ بادشاہ کے سب جاں نثار اب فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ عبداللہ خاں نے بھی تیاری کی۔ غیظ میں آکر کوچ کیا۔ بادشاہ (کا) ارشاد ہوا۔ یہ الٰہ آباد پہونچا صوبہ و سرکار سب پر دخل جمایا۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت فرخ سیر پٹنہ میں تھا لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے کل ہوا خواہ بھی پٹنہ میں موجود ہوں اور عبداللہ خاں نے پٹنہ سے ہی الٰہ آباد کا رُخ کیا ہو۔ دوسرا اعتراض بھی تمام تر صحیح نہیں۔ دوہرہ چھند کے اول دو مصرعے جس میں اس کا ذکر ہے یہ ہیں ؎

میر جملہ۔ بیر۔ بدھی (عقلمند) گمبھیر۔ باہو (بازو) بی سال (بڑا)۔ موڑی رھیو۔ موج دین کی۔ کٹک (فوج) گدھی (پکڑ کر)۔ کرپال (تلوار) موڑی رھیو موج دین کی کٹک کا ترجمہ مسٹر اروِن نے غلط کیا ہے۔ MIRJUMLA....FOUGHT MOIZUDDIN ARMY

موڑی رھیو کے معنی دراصل مل رھیو یعنی مل کرکے رہا ہیں۔ سنسکرت میں س مندل ہو جاتا ہے اور معنی میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔ بابو کرشن داس نے بھی لکھا ہے کہ موڑی رھیو کا مطلب یہ ہے کہ "میر جملہ چھل کرکے معز الدین سے مل گیا تھا اور وہاں سے سماچار فرخ سیر کو لکھتا تھا۔" اب رہا میر جملہ کی جہاندار سے مخالفت کا واقعہ تو حاشیہ میں عبرت نامہ کی عبارت نقل کی جا چکی ہے۔ خود مسٹر اروِن "متاخرین مغل" جلد اول ۱۳ میں لکھتے ہیں کہ شریعت اللہ عرف میر جملہ عظیم الشان کے ساتھ لاہور میں تھا اس کے مرنے پر بنگال جانے اور آقازادہ (فرخ سیر) سے ملحق ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ جہاندار شاہ کے حکام سدِ راہ ہوئے اور اکبر آباد آگرہ میں اسے روک رکھا ..... اس وقت اس نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر خفیہ طور پر سرداران مغلیہ سے سلسلہ جنبانی شروع کی چین قلیچ خاں اور محمد امین خاں نے اس کی ترغیب سے متاثر ہو کر آمادگی ظاہر کی کہ طرفین میں جب جنگ واقع ہو گی تو یہ شریک نہ ہوں گے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان مغل سرداران نے اس جنگ میں "تن نداوند" جس کے صلے میں چین قلیچ خاں کو نظام الملک کا خطاب ملا اور صوبیداری دکن عطا ہوئی اور محمد امین خاں اور اس کا بیٹا قمر الدین خاں بخشی دوم و سوم مقرر ہوئے البتہ عبدالصمد خاں تورانی اس سازش میں شاید شریک نہ تھا۔ تیسرا اعتراض نہایت اہم اور بظاہر ناقابلِ تاویل معلوم ہوتا ہے۔

حاشیہ میں عرض کیا جا چکا ہے کہ سری دھر کا بتایا ہوا دن۔ بدھ۔ بالکل صحیح ہے تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے۔ سمبت سال ۱۷۶۹ کی صحت میں بھی مطلق شبہہ کی گنجائش نہیں۔ پروفیسر جیکوبی کی تقویم جو ایپی گرافیکا انڈیکا جلد اول میں شایع ہوئی بتاتی ہے کہ سمبت ۱۷۶۹ پورسیا پوس بدھ ۱۱ جنوری ۱۷۱۳ء کے مطابق ہے اور یہی انگریزی تاریخ مسٹر اروِن نے بھی بتائی ہے لہٰذا ہمارے شاعر نے سمبت سال ہندی مہینے اور تاریخ و دن میں بالکل غلطی نہیں کی البتہ عربی ماہ و سال و تاریخ یقیناً غلط ہیں۔ اگر کتابت کی غلطی کی بنا پر ۳۳ کو ۲۳ سمجھا جائے تب بھی ایک سال کی کمی رہ جاتی ہے۔ اور محرم کا مہینہ تو کسی صورت سے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خفی خاں، شاہنواز خاں اور محمد علی انصاری جیسے مورخین نے بھی ۱۱۲۳ ہجری بتا کر ٹھوکر کھائی ہے۔ ۲۳ ماہ الٰہی آذر بھی صحیح نہیں۔ خفی خاں ۱۹ اور مسٹر اروِن ۲۲ ماہ الٰہی قرار دیتے ہیں۔ الغرض ہمارے ہندو شاعر سے اسلامی تاریخوں کے بتانے میں یقیناً چوک ہوگئی ہے لیکن ہندی تاریخیں صحیح ہیں لہٰذا محض اس فروگذاشت کی بنا پر ہم جنگنامہ کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

ضرورت ہے کہ اس کتاب کی ادبی اور لسانی خصوصیات سے بھی ناظرین معاصر کو روشناس کرایا جائے۔ ہندی نقادوں نے تیرھویں سے اٹھارہویں عیسوی تک کے شاعروں کو تین طبقوں میں منقسم کیا ہے۔ چارن۔ بھگتی۔ ریتی۔ پہلے طبقے میں بھاٹ شاعروں کے گروہ داخل ہیں بھاٹوں کی رزمیہ شاعری نے ہندی ادب میں چار چاند لگائے ہیں۔ اس میں بیر رس (بہادرانہ جذبات) کی فراوانی ہوتی ہے۔ اس کی زبان میں اوج یعنی زور و شور تزک بھڑک ہوتی ہے۔ ادب میں اس کو ڈنگل بھاشا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری قسم بھگتی شاعروں کی ہے۔ ان کے دو گروہ ہیں ایک بزرگوں دوسرے نگون اول الذکر اوتار کے قائل نہیں ہوتے اور تمام عقیدے کے خلاف خدا کو تشبیہ و تجسم سے منزہ قرار دیتے ہیں جیسے کبیر جانسی وغیرہ اور آخر الذکر مورتی پوجا اور پرانی روایات کو عقیدتاً تسلیم کرتے ہیں۔ جیسے تلسی داس سورداس وغیرہ۔ بھگتی شاعری کو پنگل بھاشا کہتے ہیں کیونکہ اس کا طرز ادا نہایت نرم، پاکیزہ، دل آویز اور دلگداز ہوا کرتا ہے۔ اخلاق معرفت و تصوف بھگتی شاعری کے خاص موضوع ہوتے ہیں۔ ریتی شاعری میں عشقیہ مضامین کا عنصر غالب ہوتا ہے اور قواعد عروض، شاعرانہ نکات، ندرت

ترکیب، دقت مضامین پر خاص توجہ رہتی ہے۔ خیالات سے زیادہ زبان کی نفاست پر زور دیا جاتا ہے۔ رحیم بہاری وغیرہ اس زمرہ میں شامل ہیں۔ سری دھر عرف مرلی دھر کا تعلق پہلے طبقے سے ہے۔ ہندی کے مشاہیر شعرا میں اس کا شمار نہیں کیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس کی تصنیفات منظر عام پر نہ آئیں اس کی شاعرانہ خصوصیات کا کما حقہٗ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ محض جنگنامہ شائع ہوا لیکن جیسا پہلے عرض کیا گیا شاید نامطبوع موضوع کی وجہ سے اس کی ایسی ناقدری ہوئی کہ سوا ایک نسخے کے دوسرے کا پتہ تک نہیں ملتا اور جن ہندی نقاد اور تذکرہ نگاروں نے اس کے مصنف پر توجہ کی ضرورت سمجھی انہوں نے بھی شاید اصل کتاب کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی حقیقت یہ ہے کہ سری دھر عرف مرلی دھر چارن طبقے کے شاعروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اس سلسلہ کی کڑی ہے جس میں چند بردائی۔ وشال دیو۔ نرہری۔ سارنگ دھر۔ کیسو داس۔ بھوشن۔ دیو۔ گوندر سورتی مم گنجن وغیرہ نے رزمیہ شاعری کے انمول موتی پروئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سری دھر چند بردائی کے کلام سے بہت متاثر ہوا۔ پرتھوی راج راسو کی اکثر مقامات پر تقلید کی ہے۔ کلام میں وہی زور و شور ہے اور وہی انداز بیان۔ تشبیہات و تمثیلات۔ بحور و اوزان اکثر مشترک ہیں۔ بالخصوص جنگنامہ کے بہو جنگ پریات چھند اور چھپّے چھند کے ابیات سے معلوم ہوتا ہے کہ چند بردائی ہی لغم سرا ہے گھوڑوں کی تعریف میں سری دھر نے کئی اشعار نظم کئے ہیں ایک مصرعہ یہاں قابل ذکر ہے۔ عرّبی گرّبی۔ کہو ریلے۔ کندھاری دکھنہ معاری، یہاں عربی اور غربی پر زور دینے کے لئے تشدید دی گئی ہے اور اس کی مثالیں پرتھوی راج راسو میں بکثرت ملتی ہیں۔ بھوشن کی شاعری میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ چند بردائی کے کلام میں اکثر ایسی ترکیبیں موجود ہیں جنہیں آج متروکات میں شمار کیا جاتا ہے اور جس میں جو لفظ آگے آنے والا ہوتا ہے اس کا پہلا ٹکڑا دہرا دیتے ہیں۔ جنگنامہ کے ۴۴۔ ۱۴۲۳۔ ۱۵۶۳ اور ۱۵۶۹ میں بھی ایسے ہی فقرات آتے ہیں مثلاً ونگ گگ گمنی۔ مشنگ لگ گمنی اور نو نگلک گربوز۔ رنگ گگ گنی وغیرہ۔ لیکن سری دھر کی زبان قدیم و فرسودہ نہیں۔ ہم آگے عرض کریں گے کہ اس کی شاعری میں کھڑی بولی کا عنصر بہت زیادہ ہے اگر الہار ودل اور جنگنامہ کا مقابلہ کیا جائے تو فرق صاف نظر آجائے گا۔ چو سرو شکسپیر۔ ولی و غالب کی زبان میں کتنا بُعد ہے۔

[۵]

گو اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب سری دھر نے اپنے نتائج فکر "جنگنامہ" اور دیگر متعدد تصانیف کی شکل میں پیش کئے سیاسی اعتبار سے کچھ سراہنے کے قابل نہیں اس لئے کہ آثار نمایاں ہونے لگے تھے جو اس بات کی خبر دے رہے تھے کہ 'مغل اعظم' کی ہندوستان گیر سلطنت کا شیرازہ بہت جلد بکھرنے والا ہے۔ لیکن ہندو مسلمان کے باہمی تعلقات کی وہ خوشگوار فضا جس سے ایک ایسی زبان کی تخلیق ہوئی جو دونوں قوموں کی مشترکہ تمدن کی مایہ ناز یادگار ہے ابھی ناپید نہیں ہوئی تھی مبارک تھا وہ دور جب ہندی اور ایرانی تمدن کا سنگھم ایک متحدہ قومیت کا بیج بو رہا تھا۔ جب مسلمان اپنی زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے اسے شوق و محبت سے بولتے تھے۔ اس میں رسالے اور کتابیں لکھتے تھے جب ہندوؤں کے طبائع کا عام رجحان اس حد تک تغیر پذیر نہیں ہوا تھا کہ ان کا جذبۂ تنفر کل اسلامی اثرات کے بائیکاٹ کی شکل اختیار کرے۔ جب فارسی و عربی الفاظ خالص ہندوستانی زبانوں 'مرہٹی' 'بنگالی' اودھی' برج بھاشا وغیرہ کی تصانیف میں بکثرت دانستہ و نادانستہ طور پر داخل کئے جا رہے تھے۔ جب زبان کے معاملہ میں تفریق رونما نہ ہوئی تھی جب ادبیات کا ایک ایسا سلسلہ جاری تھا جس میں ہندو مسلمانوں کی مدح سرائی کو عار نہیں سمجھتے تھے اور اسلامی موضوع پر کتابیں لکھتے تھے اور مسلمان خالص ہندوانہ مباحث پر اپنے قلم کو جولاں کرتے تھے اور جس میں ہندی اور اسلامی الفاظ محاورات خیالات کے بالقصد ازالہ و اخراج کی مذموم تحریک جاری نہیں ہوئی تھی۔ جب ہندو مسلمان لسانی حیثیت سے ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے تھے۔ تلسی داس جی کو تو جانے دیجئے کیونکہ یہ اکبر اعظم کے ہم عصر تھے اس لئے اگر نہ صرف ان کی مشہور مقدس کتاب رام چرتر مانس بلکہ "بنئے پتر یکا" میں بھی جس میں انہوں نے

اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر اپنے مالک سے دعائیں مانگی تھیں اور دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ خالص عربی و فارسی الفاظ مثل وسیلہ واو وغیرہ بلا تکلف استعمال کیا ہے لیکن بھوشن یعنی شیواجی مرہٹہ کا مداح اور ہندو جاتی کو اپنی ولولہ خیز نظموں کے ذریعہ بیدار کرنے والا بھی ان الفاظ کا جنہیں اسلامی کہا جاتا ہے ترک کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ مولانا عبدالحق نے مرہٹی زبان پر فارسی کے اثرات کے عنوان سے تو ایک مستقل رسالہ ہی پیش کر دیا ہے۔ حالانکہ مرہٹوں کا مذہبی غلو اور اسلامی حکومتوں کی ان کے ہاتھوں تباہی و بربادی سب کو معلوم ہے جہاں تک سری دھر کے ہم عصروں کا تعلق ہے۔ اگر ہم ایک طرف علی محب خاں کی ہندی نوازی اور قابل قدر ہندی نظموں کے تسلسل پالیسی پر نظر کرتے ہیں تو دوسری جانب متعدد اہل قلم اور شاعروں سے دوچار ہوتے ہیں جو اپنے کلام میں مسلمانوں کی تعریفیں کرتے اور فارسی و عربی الفاظ بکثرت اور بلا تامل لاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک شاعر گنجن نامی کا ذکر ہمارے خیال کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ ذات کا برہمن گجراتی نسل اور کاشی بنارس کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایک کتاب "کمرالدین کہاں ہولاس" کے نام سے سمبت ۱۷۸۶ یعنی ۱۷۲۹ء میں تصنیف کی جس میں قمرالدین خاں اعتمادالدولہ اول یعنی محمد شاہ رنگیلے کے تورانی وزیر اعظم کی مدح سرائی کی ہے ایک جگہ شاعر اپنے ممدوح کے محل بھوشنوں روشنی مسند و قالین کے متعلق کہتا ہے ؎ مینا کے محل جر (زر) باف در پردہ ہیں حلبی پھنوس (فانوس) ہیں روشنی چراغ کی + گل گلی گلیم گرگ (غرق) آب پگ (یعنی پیر) ہوت + جہاں تجھی مسند لالن (لعل) کے دام کی، کتی (دکھتی) مہتاب ہو کبھی۔ گجیت (آراستہ) جواہرن + گنجن سو (اچھا) کبھی کہیں پوری (بیگلی) انوراگ پریم کی۔ اعتمادالدولہ کمرالدین کھاں کی مجلس رس سر (جاترا) میں گریشم (گرمی) بنائی بڑہ بھاگ کی (بڑی خوش قسمتی) ان اشعار میں جتنے الفاظ اشودھ بولیوں کے مستعمل ہوئے ہیں ان کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ اب نہ ایسے مداح ہیں اور نہ ایسے ممدوح۔ اس مختصر اقتباس میں علاوہ فارسی و عربی الفاظ کے کھڑی بولی کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ حالانکہ کتاب کی زبان برج بھاشا ہے۔ کھڑی بولی برج بھاشا پر غالب نظر آرہی ہے۔

تقریباً یہی حال جنگنامہ کی زبان کا بھی ہے جیسا کہ ہم کسی جگہ پیشتر عرض کر چکے ہیں، سری دھر نے خاص عربی و فارسی الفاظ بکثرت اپنی کتاب میں استعمال کئے ہیں۔ یہ الفاظ مفرد بھی ہیں اور مرکب

بھی اپنی اصلی صورت میں بھی منظوم ہوئے ہیں اور خفیف سی تبدیلی کے ساتھ بھی علاوہ ان الفاظ کے جن سے دنیائے اردو کافی روشناس ہے لیکن جو ہندوستان کی قدیم زبانوں کی صدائے بازگشت ہیں۔ سری دھر اپنی نظم میں تقریباً ہر جگہ اور بلا تکلف ایسے الفاظ بھی لاتا ہے جنہیں موجودہ ہندی دنیا کے ایک خاص لیکن روز افزوں گروہ کے نزدیک درجہ قبولیت شاید حاصل نہیں حالانکہ ہمارے شاعر کے لئے یہ روزمرہ کا حکم رکھتے تھے۔ اتمام ۔ ماہرو ۔ شہادت ۔ حریف ۔ گریباں ۔ اعتبار ۔ حضرت ۔ شاہنشاہ ۔ سیاہ رو ۔ گمراہ ۔ دلسوز ۔ جانباز ۔ زیب ۔ صدر الصدور ۔ بخشی ۔ سرکش ۔ عظیم ۔ سمند ۔ الست ۔ مغرور ۔ منصوبہ ۔ منصب ۔ غضب ۔ رفیق ۔ عماری ۔ تفنگ ۔ بختر ۔ ترکش ۔ شمشیر ۔ نقارہ ۔ فتح ۔ خویش (داماد) قاصد ۔ تجویز ۔ مخالف ۔ ولی عہد ۔ طوفاں ۔ سرخرو ۔ بے شمار ۔ آبرو ۔ غنیم ۔ سرد پا ۔ مقام ۔ مجلس ۔ اقبال ۔ کرم ۔ رستم دست ۔ ہمراہ ۔ وطن ۔ جنگساز ۔ شامل ۔ فاضل ۔ یلغار ۔ غدر ۔ مغرور ۔ بندگی ۔ خطاب ۔ صف جنگ ۔ تعنات ۔ نیک نام ۔ ملازمت ۔ بشتاب ۔ آتش ۔ غلبہ ۔ نیک قدم ۔ قائم ۔ پائدار وغیرہ ۔ ان الفاظ سے سری دھر کی نظم بھری پڑی ہے ۔ اب آئیے اور اس سرزمین کے رہنے والے برہمن راسخ العقیدہ ہندو سنسکرت کے عالم اور بھاشا کے مسلم الثبوت شاعر کی عام فہم زبان پر ہم نظر کریں گے (۱) ہنسی کہیو عبداللہ کہاں گلبہ بھیو اوت (ادھر) شاہ کا + پاؤں جواب میں نیک (کچھ) ہوں کری حکم شاہنشاہ کا + اکنال بھرک سیر کو (سے) ارو (اور) کرم اک اللہ کا رن دوری توڑدوں اجو ہیں (آج ہی) بل موج دین کی بانہہ کا ۔ یعنی عبداللہ نے ہنس کر کہا کہ ادھر کے بادشاہ نے غلبہ حاصل کرلیا ہے (تو کیا) اگر میں شاہنشاہ کا ذرا بھی حکم پاؤں تو فرخ سیر کے اقبال اور اللہ کے کرم سے آج ہی میدان جنگ میں دوڑ کر معزالدین کے بازوؤں کی قوت توڑ دوں ۔ اس میں اوت ۔ نیک ۔ ہوں کے علاوہ کل الفاظ آسان ہیں ۔

(۲) سرکھرو آپ بھیو ۔ آبرو ۔ دیس پائیو + ماہرو رہیک (رفیق) جیو مکھالف (مخالف) سیاہ رو ۔ اس میں صرف دلیس کا لفظ محتاج تشریح ہے یہ مرکب ہے ولی اور سنسکرت "ایش" یعنی مالک سے ۔

(۳) دن اورے (دوسرے دن) کتب الملک بولے بولائی صاحب رائے سو (کو) + لکھ عرج شاہنشاہ کو سب بھیدبات بتائی سو + بھائی حسین علیہ کہاں لکھو سب سمجھائی سو + جے ہیا ۔ آئے ۔ ایہاں

ایلگار پہونچے ساج بھوج اوپائی سو۔

(۴) پھر سَپِہد الدین (سیف الدین) علی کھاں بھیج (فتح) کئے آئے جگبے + آئے بیٹے سردار نجم الدین علی کھاں سنگ تبے (تب)

(۵) کہوں لرت سپہ بارہا بچی (مالک ارتن چند کھوں بریں + کھوں لرت برکنداج (برقنداز) کہاں کہوں میر محسن کہاں اڑیں۔

(۶) صبح عنایت اللہ کھاں جہاں + شجاع شجاعت اللہ کھاں تھاں

(۷) بھوں سُنی تجویج کرلی کری + بھری (پھر) اپنے کر (ہاتھ) لیؤ یہاں صرف کر سنسکرت کا ایک لفظ ہے جس سے ہم آشنا نہیں۔

(۸) موج دین کے ایسے ہوتے اعتباری امرائی + ججرتی کے اکبال سوں سکے سنزن ٹھرائی۔

ممکن ہے کہ یہ چند اشعار جو مختلف مقامات سے لیے گئے ہیں مستثنیات میں شمار کئے جائیں لہٰذا ہم ہندی نسخے کے گیتا چھند سے چند مسلسل ابیات کو نذر ناظرین کر کے لفظوں کے اعتبار سے ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو نا محل جہاندار شاہ کی محفل کا ایک ایسا مرقع جس کی حقیقت تاریخی اوراق سے بھی واضح ہوتی ہے۔ اور جسے شاعر نے قطب الملک کے کالستھ گماشتہ شیرو من داس متوطن سانڈی کی زبان میں پیش کیا ہے سے

ات (یہاں) موج دین مگر دست لست عملیں کھائی گئے + سگرے (سارے) کلاونت بنتے امیر بھرے رہے چیت (من) چائی گئے + آوے نر آوے تُمنی من بھولے رہیں اک بھائی گئے + ماہی مراتب علم پنجہ توگ (تیغ) نوبت پائی گئے + دارد سو دارو بھرت گولی عمل گولی رنگ کی مرونگ ڈھولک توپ اور سرنائی ریت (طریقہ) تو بھنگ (تفنگ) کی + پیالہ بلیہ (نعمتہ) سو بھری کے تہاں جیتی موجیں بھنگ کی + دن رات یہی جرچار ہے تت پیر ادر نہ جنگ کی سب کمل لوچن (آنکھ) ڈگو موچن (مٹانے والی) کام روپ اگوہرا (بیش بیش) + اتی (بہت) چتور۔ نیرت (رقصاں) کناں میں گھوان (اندر) مجلس نوجرا خوبصورت + انوراگ (پریم) اوپ جست (پیدا ہوتا ہے) راگ سنی سنی گیت اس کے دوجرا سنو (مانو) ڈھرے ساپچے ونول (مینا) ناچے نانٹ کے چوہرا (چھوکرا) کہوں سبھا مت کلاوتی کہوں یا توران (پتوریا کبی، کی گاتکی (رگاوٹ یا قدردانی + کہوں بخت ہر کبے (تھرک کیا)

ہیجڑا اہتری لگے اوھی رو آہ کی + کہوں چھوکرے باگے (بھس) بنے دربار کنجزن راہ کی + موج دیں کی فوج بے کتی (ڈھنگ) اور تاھی نباہ کی (اس کے بعد چند مصرعے ہیں جس میں شاعر نے میر جملہ کی تورانی امیروں سے سازش کی تاریخی حقیقت بیان کی ہے اور ان کا نام دیا ہے۔ پھر شاعر کہتا ہے۔

ایک روج بیٹھے موج دیں مدیرا (شراب) بڑھایو موج کو + اوت شاہ (جوش میں آکر) سوں چت دی چاہ بھری کری حکم نوروج (نوروز) کو اتے ہی نیج آئی کہری آئے پھرک سیر کنوج کو ارو (اور) ایجودین بھاگے لئے ہمراہ سیگری (ساری) اپھوج کو + یہ سونت (سنکر) بھاگ گیو پھوج سنگ بیتے بھگی + یہاں سکل (کل) مجلس فوج میں اکبارگی ڈکھ سوں پگی (ڈوب گئی) + تب لگی لکھ بیش (زہر، بیتری (بیڑہ پان) اردگیت گاری سی لگی + انگ (عضو) امل (صاف) کی لالی گئی تت بیزار۔ ڈر۔ رس رغصہ، جنگی کہاں سو لکھئے کہتا سب ریت دیکھی نڑی نئی + دھ دھرے کلاونت گر گئے مہران (عورت) کو مورچھا (بے ہوشی) آگئی + کہوں پڑی ڈھینگت (باجے کی آواز) ڈھول کی سو دو تال گھو گھرو کی گئی + سو دگیو مدھ چھوٹی چھاک (نشہ) سوں رٹ آدمی آدھی دی دئی۔

اس عبارت کا مفہوم چنداں مشکل نہیں لیکن مزید وضاحت کے لئے ہم ان کا آسان اردو لفظی ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہاں معز الدین غرور میں چور اور نشہ آور چیزیں استعمال کر کے مخمور ہو رہا ہے۔ سارے مغنیاں امیر کبیر بن بیٹھے ہیں اور اُمنگ سے بھرپور ہیں ہر وقت من ہی من میں پھولے نہیں سماتے۔ ماہی مراتب علم پنجہ تیغ نوبت پاکر جامے میں نہیں سماتے۔ شراب ناب اور رنگ میں لانے والی (نشہ آور) افیون کی گولیاں وہ اپنے بندوق جسم میں بھرتے ہیں۔ مردنگ اور ڈھولک ان کے توپ ہیں اور تفنگ کی جگہ سرنائی نے لے لی ہے۔ فلیتہ کی جگہ پیالہ لبریز ہو رہا ہے اور بھنگ کی موج پر غلبہ حاصل کیا جا رہا ہے۔ دن رات یہ ہی چرچا ہے۔ نہ کوئی تدبیر سوچی جا رہی ہے نہ جنگ کی کسی کو فکر۔ سب کنول جیسی آنکھوں والیاں رنج و غم کو زائل کرنے والے اور کام دیوتا کے ایسا روپ رکھنے والے پیش پیش ہیں۔ متعدد چالاک و چست فن رقص کی ماہر (عورتیں) راجہ اندر کی مجلس کی خوبرو رقاصاؤں کو بھی شرمندہ کر رہی ہیں ان کے گیت اور دوہرے کے راگ سے عشق کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ نٹوں (خواجہ سرا) ناچ رہا ہے اور واہ واہ کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ کہیں اس دربار میں چھوکرے راہ میں

چلنے والی کنجریوں کا بھیس دھارے ہوئے ہیں یہ ہے معزالدین کی دیوانگی اور موج کوئی صورت پناہ کی نظر نہیں آتی ... ایک روز معزالدین بیٹھا ہوا شراب کی موجیں اوڑا رہا تھا اور نہایت خوش تھا اور پھول کر حکم دے رہا تھا کہ نوروز کی تیاریاں کی جائیں کہ اس اثنا میں خبر پہونچی کہ فرخ سیر قنوج تک پہونچ گیا اور اعزالدین مع ساری فوج کے بھاگ نکلا - اعزالدین کے (جنگ سکندرہ سے) فرار اور کل فوج کی پس پائی کو سنتے ہی معزالدین کی مجلس پر رنج واندوہ طاری ہوگیا - جن کے منہ میں پان کے بیڑے تھے وہ زہر معلوم ہونے لگے اور گیت گالیاں ہوگئیں نازک اداؤں کے صاف و شفاف جسموں کی لالی زائل ہوگئی تدبیریں سوچی جانے لگیں غم وغصہ کی لہر اٹھی کہاں تک قصہ کو طول دیا جائے - ساری باتیں اور طریقے نئے نئے تھے ہہ ہہ رے کرتے ہوئے گلا ونت گر پڑے عورتوں پر بے ہوشی طاری ہوگئی ڈھول کی آواز اور گھونگر کے تال کی کسی کو سدھ بدھ نہ رہی شراب کا سب نشہ ہرن ہوگیا اور ادھی آھی وئی وئی کی رٹ لگ گئی -

مندرجہ بالا اشعار سے سری دھر کا شاعرانہ کمال قوت بیانیہ دلآویز طرز اور حقیقت شناسی کا کسی حد تک اظہار ہوتا ہے ہندی کی رزمیہ شاعری کے متعلق ایک کتاب "بیر کاویہ سنگرہ" نامی الہ آباد سے تقریباً دو سال ہوئے شائع ہوئی - ناچیز اپنے فاضل دوست پروفیسر جگر ناتھ رائے کا شکر گذار ہے کہ موصوف نے نہ صرف اس کتاب کی طرف توجہ مبذول کی بلکہ اپنے مفید مشوروں سے اس مقالے کی آخری قسطوں کے لئے کچھ مواد فراہم کرنے میں امداد کی، بہرکیف اس نئی ہندی کتاب کے مصنفین بابو بھاگیرت پرشاد دکشت اور بابو اودے نرائن تواری نے جنگنامہ پر بھی نظر کی ہے اس میں سے کچھ انتخاب اپنی کتاب میں درج کیا ہے - مندرجہ بالا اقتباس کے سات مصرعوں کو خاص جگہ دی ہے اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "بنے کا اتنا سجیو چترن کرنے میں بہت کم کبی سپھل ہوئے ہیں" یعنی خوف کا ایسا عمدہ نقشہ کھینچنے میں بہت کم شاعر اس طرح کامیاب ہوئے ہیں ان اشعار میں کئی باتیں جاذب نظر ہیں لیکن ہمیں تو ان سے شاعر کی لسانی خصوصیات کو واضح کرنا مقصود ہے - اس اقتباس میں خالص سنسکرت کے الفاظ نسبتاً کم ہیں - چیت - سوریت - کمل لوچن - ڈکوموتین - گھمواں - چتور - آتی - گتی - نول - انوراگ - نکھو - ادت ساہ - مدیہ - سودھ اہل سکل - یہی تعداد تقریباً فارسی وعربی الفاظ کی بھی ہے -

جنھیں گننا ضروری نہیں۔ برج بھاشا کے تحت حسب ذیل الفاظ لائے جا سکتے ہیں۔ سیگرے۔ کلاونت۔ بھئے چالی کئے۔ آوے نہ آوے۔ بنتی من۔ اک بھائی کئے۔ پائی کئے۔ بھرت۔ ایہاں۔ ہوجئے۔ اگوھرا۔ تبرت لوہرا اوپ جت۔ سنی سنی۔ سنو۔ دوھرے۔ سُانٹ۔ چوہرا۔ کبھوں (۳ بار) کلاونتی۔ کلاونت۔ پاگوائی۔ گاھکی۔ بخت۔ ہرکہے۔ ارو۔ اور۔ باگے۔ بنے۔ بڑھایو مول (۳ بار) لائی۔ کھری۔ کو (کا) تے تھی۔ کھیری۔ سیگری۔ سونت۔ گیو۔ بسے۔ ٹھان۔ بیری۔ سدھ ئے۔ پڑی۔ ڈھینگت۔ گیو۔ جھوٹی۔ چاک سو۔ رٹ۔ ادھی آھی وئی دی۔ یہ کل الفاظ یا ترکیبیں کھڑی بولی کی ہیں اور ان کی تعداد برج بھاشا سے تقریباً سوائی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں چند اور مقامات سے اشعار لے کر ان کا تجزیہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ تومار چھنڈ کے ۱۰ مصرعوں میں جو اس مقالہ کی تیسری قسط (معاصر جون ۴۲ء ص ۴۶) میں درج کئے جا چکے ہیں۔ ہن کری۔ کری۔ وھری۔ بیٹھو۔ راکھن۔ لو۔ بھونچو۔ ہوپ (۷) برج بھاشا یا اودھی اور پرنظم کوپ۔ بایاں۔ اددار۔ رن۔ بانکورا۔ طبواں (۷) سنسکرت اور وقت۔ حکم۔ تخت شاہ۔ دلسوز۔ فوج۔ ارشاد۔ عل۔ سرکار۔ قائم (۱۰) فارسی و عربی کے الفاظ ملتے ہیں۔ اسی طرح برگیتا چھنڈ کے ۲۷ مصرعوں (۹۴ - ۱۲۲) میں ہیں کھڑی بولی کے ۲۲ سنسکرت تت سم و تدبھو کے ۳۰۔ برج بھاشا کے ۳۴ اور اسمار کی تعداد ۲۵ ملتی ہے۔ بیلاس چھنڈ کے چند مصرعوں میں (۲۱ - ۹۱۸) سنسکرت تت سم و تدبھو کے ۸ اور کھڑی بولی اور فارسی کے ۱۱ اور برج بھاشا کے ۷ الفاظ آئے ہیں۔ اشعار طوالت کے خیال سے نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ اس تجزیے سے جنگنامہ کی لسانی حیثیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

برج بھاشا اور کھڑی بولی دونوں ہی میں بندسے دئے گئے ہیں۔ ایک۔ اک۔ دو۔ دواد۔ دوئے۔ تین۔ تیہوں۔ تینی۔ چو۔ چہوں۔ چاری۔ چارے۔ پانچ۔ آٹھ۔ دس۔ دسہوں۔ دسک مختلف مقامات پر مستعمل ہوئے ہیں۔ ایک جگہ فارسی "نہ" سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ مثلاً وہ دے لاکھ یہ نہ ہزار پورے ٹھرائی کے۔ ایک جگہ ساتوں کا استعمال کیا ہے۔ ۹ سری دھر ٹھٹھا ہی بھوک سیر ساتوں دیپ سرحد ہند کی ملایو تھے۔

شاعر نے اکثر شعر کا وزن درست کرنے کے لئے الفاظ ملفوظ کو بگاڑ ڈالا ہے اور ان کی صورت بدل دی ہے۔ مثلاً کھوج (خواجہ) سید (سید) موج دین (معزالدین) اجودین (اعزالدین) شجاعی

(شجاعت) حسین علیہ کہاں۔ بعض نام تو اس قدر مسخ شدہ صورت میں پیش کئے ہیں کہ ان کی صحیح شکل ذہن میں نہیں آتی۔ جیواج۔ کہاں۔ عبد الغفار کو ابو الگفار اور غازی الدین جین فیح خاں (بانی ریاست حیدرآباد) کو چلیکچ کہاں لکھا ہے۔ بھر بہا جل۔ بھیتوج کر۔ بھیتج داں۔ بھتوجنی۔ حریہین۔ تب بیر بات شاھتی کی۔ انوکھی ترکیبیں اکثر جگہ پائی جاتی ہیں۔ سری کا تعظیمی لفظ اکثر مسلمانوں کے نام کے شروع میں آیا ہے۔

بعض اوقات خالص سنسکرت کے مختصر الفاظ نہایت خوبی سے منظوم ہوئے ہیں۔ مثلاً ۲۵۹ میں

اث پتر۔ راجت۔ اندرا۔ سی۔ پر بھونا براجت۔ کبھی کبھی متروک سنسکرت الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے جیسے ۱۱۱۵ میں دوڈھر (بھیانک) جو دراصل دوردھرش ہے کہیں کہیں بے معنی الفاظ بھی آئے ہیں لیکن اس کی جو مثال مصنفین ویر کا دیہ سنگرہ نے دی ہے صحیح نہیں کتاسنی کی کراکری تراتری تیر کی۔ کنارگی کرکراہٹ اور تیروں کی تر تراہٹ سے ایک مضمون پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر ہندی شعرا کی طرح۔ مصنف جنگنامہ صنائع بدائع کا اکثر استعمال کرتا ہے۔ ایک خاص صنعت جسے ہندی میں انوکرن واچک اور انگریزی میں ONOMATOPOCA کہتے ہیں اور صوتی تکرار کی متعدد مثالیں جنگنامہ میں ملتی ہیں۔ راقم السطور نے مولانا نجم غنی کی بحر الفصاحت کے اوراق اولٹ ڈالے لیکن فارسی و اردو کے اشعار سے اس خاص صنعت کی مثالیں نہیں ملیں۔ حالانکہ فردوسی و نظامی کے کلام میں ایسے الفاظ جنگی ساخت اور صوت سے ان کے معنی اور صفات کا اظہار ہوتا ہو۔ مفقود نہیں۔ جنگنامہ میں ایسے الفاظ اور صوتی تکرار کی بہتات ہے۔ ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں (۱) دھونسا کی دھوکارنی۔ دھمکی اچی دھرتی (۲)۔ دھمک سوں دھمکیں دھر (۳) دھینگت دھول کی لاگا جھر جھر ما توگٹ پٹ اھرکی سیتا (خون)۔ بعض تکرار اصوات کی تو جنگنامہ میں بہتات ہے۔ جھپٹی چھا (ایات (۴۲) میں سنجوگت اکچھر (انصال حروف) کی مثالیں بے شمار نظر آتی ہیں (۵) سر سرت۔ شرونت (خون) دھار۔ منہ سوں پہاڑ پاڑ لیا جھرنا جھرے (۴۰۷) یعنی سر سے خون کی دھار بہہ رہی ہے۔ جیسے پہاڑ سے جھرنا جھڑ رہے۔ (۱) لچھ مہ مرکی۔ برچھو۔ جھبی در۔ سو وجیھ۔ جیھ لت۔ کوپ پہ ٹپ۔ پکری۔ پیاپک، پہ بہ ہی کہن دھوندہ دھملگت (۷) تے ہاں رنگ رنتے ہیں درتے رن میں بجتے بجے جا ہیں + ہاتھی مد بھتے۔ گجر گھیتے۔ مدہ پر کھتے پر وا ہیں یعنی ذو بہادری کے جنگ میں مست رنگ گئے ہیں اور جو رن میں فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں

جوش میں بھرے ہوئے ہیں اور گھاؤ کھا کر مد (لار) چولاتے (برساتے) ہوئے بھاگے جا رہے ہیں۔ یہاں رنگ اتتے۔ تتے پہتے کے الفاظ غور ہیں (۳) گبھی - جبتر منتر کرے - تہتر یرے ویرتھ وتہہ دتے + اوبھی ستہہ باد - تمہتہ ہے ایک متھو گئے بن مہت دھے یعنی قوی ہیکل ہاتھیوں کو لے کر جو جنگ کر رہے تھے وہ بغیر تہہ کے ہو گئے اور حالت دگرگوں ہو گئی اودھر جو زبردست ہاتھیوں کے سہارے قوی بن کر گئے تھے بغیر سر کے ہو گئے۔ صنعت ذو معنیین کی مثالیں ہم اس کتاب میں اکثر جگہ پاتے ہیں (۱) اوت (اودھر) ہی ادنکو کہاں دورا + ایتہ (ادھر) ہی یجی ہہ کہاں دورا رخاند دراں + سنگ کہتک کہاں دورا + منہ ہوا مانو / اُن کو کہاں دورا ۲۷۔ ۴۷۳ (۲) تب جلفکار (ذوالفقار) گرہیو (پکڑا) مہابل جلفکار امیرے۔ جھکی دو دھارتی - سار سار دو دہار دھیر یں دھیر مے - یعنی تب بہادر امیر ذوالفقار نے ذوالفقار پکڑا اور اس کو چلایا۔

شری دھر کو زبان پر بڑا قابو ہے۔ تشبیہات و استعارات، صنائع بدائع سے اس کی کتاب مملو ہے گو نازک خیالی اور بلند پردازی کی مثالوں سے جنگنامہ خالی نہیں لیکن سری دھر خیالات سے زیادہ زبان کی نفاست اور صنائع بدائع پر زیادہ متوجہ ہے۔ اس کے بیان میں تسلسل، شگفتگی و تعینت اور تکمیل پائی جاتی ہے۔ یہ جس چیز کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے متعلق بہت معلومات پیش کر دیتا ہے۔ اس کی زبان قواعد سے انحراف نہیں کرتی۔ گو "لگی نکمہ یہش سی" اور "گیت گاری سی لگی" میں نکمہ اور گیت کو موجودہ قواعد کے خلاف اُس نے تانیث قرار دیا ہے۔ ہم چند نمونے اس کے کلام کے پیش کرتے ہیں جس سے اُس کے شاعرانہ کمال کے متعلق رائے قائم کرنے میں آسانی ہو گی نیز اُس زمانہ کے آداب طرز معاشرت توہمات وغیرہ پر روشنی پڑے گی۔

لڑائی کا نقشہ ملاحظہ ہو (۱) چلے چاری ہوں (چار طرف) اور صوبے گردری + جنہیں وار کئے (روک کر) شتر وادشمنی، بھوج چوری + کہاں سوں کہوں بھوج میں سورا چے (سورما چمک رہے تھے) + کتے گو ملی بندو کے دکے گراجے + یئے سورما بیر بانکے بنئے تنے + بجے ساج باجی (گھوڑے) چڑھے ہانک دیتے + کرمین بھوج لوں ڈانکی ساچل کر گھوڑے تھیار سے سکتے کوہ (۱۵) کئے کئے سو بھانے پھر ادیے (۲) یہ شور ہیو (ہوا) چہون اور (چاروں طرف) اٹھے دوڑے سردار ہیں + تت (وہاں) ڈاری ڈھالیں

ماری کوٹیں ۔ بھاری جرہ (زرہ) اگار ہیں ۔ ارو چھوٹری بکتر توڑی ۔ میان گر ہیو (پکڑ کر) گرنی کٹار ہے +
چگے چھوں نیجہ (نیزہ) ہونئے جھکئے گھنی کردار (تلوار) ہیں + ایی (اس طرح) دوڑ کے چھوں اوتے پھر
بھوج گھیری جارے کے + تھاں بیر بر جھابان گولی رنگ رنگ لگائی کے شمشیر وار جھرا جھری کر کر کٹاری
گھائی کے + جھوکی جھپٹی جھرمٹ کھیلی اریدل (دشمن کا دل) و بیورے ھی بی (زمین ، تھرائی کے +
لوٹے کیتئے بھومئے (زمین) پیرئے کو او گھائی مو گھومئے گیرے + کو او جئے مرجھا دتت (مرجھا گئے)
ڈر ہولے بنا مارے مرے ۔ سردار ابوالکفار کے انگ رنگ گھن (گہرا) گھاری (گھاؤ) پھرے + رن
بھوم میں پاؤ نہیں جاتے کہاں کے لئے دھرپے (سربنی گیت چھند)

بھگدڑ کی تصویر : جو جنگ پیریات چھند کے مندرجہ ذیل ابیات میں کیا خوب کھینچی ہے ؎
سہارے نہ گھوڑے رتھی ۔ ھیم (سونا) ہاتھی + سنہارے نہ کو او کچھو سنگ ساتھی کے ہوں چھاڑی گھور
ہی ڈاڑیو ہتھیاری + کے مول بھاگی سوں (قیمت کے ساتھ) آگے ہی پتہ ۔ (راستہ) ڈھاری +
کرے کو او ۔ ہاہا ۔ پڑے کو او بیاں + چلے رام رنگا ذ چھپے بھاوکے بھاو کسطرح چھپ کر + گھسے
باہر و بھاگ گئے مکا ھی + کیتے کو تہرے بندی ناھینی نای + کیتے کو گمانی گہر دریٔ چھائے + بڑے
حوصلے کے تیا (عورت) سنگ ملا ہے + نہین تیوڑی بھاگے چھٹی چال بانگی + گئے پیولی ۔ تالے چھٹی ہو سناکی
سو روے اصیلے پھیلے ہیلی + پکاریں گھنوا اُپدا (آفت) کوں میلی (ڈال دیا) + گر رو ڈھا ر د جھاکی چھپے
لو روئے + سبئے موج دیں کو بھریں ہیں کو ئے ۔ یعنی گھوڑا رتھ ہاتھی سونا کوئی نہیں سنبھالتا یہاں تک کہ کوئی
اپنے سنگ ساتھی کو بھی سہارا دینے والا نہیں ۔ کہیں کوئی گھوڑے کو چھوڑ کر ہتھیار ڈال دیتا ہے کسی نے
خوش قسمتی سے آگے ہی کا راستہ پکڑ لیا کوئی ہاہا کرتا ہے ۔ کوئی کسی کا پیر پکڑتا ہے ۔ کچھ لوگ رینگ رینگ
کر چلنے کی کوشش کر رہے تھے کوئی چیختا تھا کوئی چھپ چھپا کر نکل بھاگنے کی فکر میں تھا کتنے نکلے بھاگ
نکلے کتنے باہر کی طرف دوڑ پڑے ۔ کئی نامور اور مشہور اشخاص کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور گرفتار ہو کر
قید میں آ گئے ۔ کتنے گمانی اور گھمنڈی اشخاص جو بڑے حوصلے سے اپنی عورتوں کو ساتھ لائے تھے انھیں
چھوڑ کر بھاگ نکلے اور انکی بانکی چال چھوٹ گئی ان کے تلوے زخمی ہو گئے ۔ ہوش غائب ہو گئے ۔
اصیل فصیل عورتیں اور سہیلیاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ۔ پکاریں کہ اے خدا تو نے ہمیں کس آفت

میں ڈال دیا ان کا گلا بھر آیا ۔ گاہ جھانکتی ہیں گاہ جھجکتی ہیں ۔ غصہ میں آپے سے باہر ہو رہی ہیں اور سب کی سب معزالدین کو آنکھوں میں آنسو بھر کر کوس رہی ہیں ۔

لوٹ اور آتش زنی کی کیفیت ۶۱۷ ۔ ۷۴ میں بیان کی ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎
جہ ہوں سینغ لونجانی (لے) آگی لائی + مہا بھیم (بتہاک) بھیلی دھوان کی اندھیاری + کہوں بانس کی گانٹھی بھوئیں تپک کیں + چٹاچٹ پاکھاں بھاری ٹپک کیں ۔ ۔ ۔ کھوں ہوت موتی درنن (اچھا) چھار چونا ۔ ۔ ۔ جریں اور لوٹیں چیر (کپٹر) چیرا (پگڑی) جری (زر) کے + بڑے موٹ کے موٹ لوٹیں پری گئے + کیتی تیجریں (تجارتی) ہائے ہائے رٹ لاگی + کتنی کامنی دامنی روپ بھاگی (کئی ایک برق وش عورتوں کی شکل بدل گئی)۔

گھوڑوں کے متعلق شاعر کہتا ہے ۵۴۵ ۔ ۶۰ کبھی بیٹھہ پوٹھوں ۔ پلے نیز (پانی) راوی + سجے صندلی او سمند و سرنگے + کبوتو تبے پھولواری سو دنگے + بجے اوج سنجاف نیلے ہریلے + موسو کی ۔ پنج ۔ پنج کلیاں پیلے + پکھروں بہکروں لکھ گھوڑے ۔ سنو بھانوجی (لورج) کے رتھی جوڑ جوڑے + چلے چیالی سون ۔ چنچلے چال بانکی + دریائی تو روکی ۔ تجیلے عراقی + کریں پون (ہوا) سی پون کی پائمداری + گرتی ۔ گہریلے ۔ کہباری + بڑے ڈیل کے کان چھوٹے نوکیلے + سو چوری کھوری چاکری چالو بینے + بڑے چنچلے ۔ بین کے مو کہ سانچے کہوریں ۔ بال جھومیں گھنے دوش بانچے ۔

توہمات (۱) معزالدین کی دہلی سے روانگی اور بدشگونیاں ۔" جب سوار ہو کہود گہٹا گھومری (چھاگئی) پڑے پانبنی (پتھر) گہور ہو + بدشگون لکھی (دیکھ کر) سب کہیں ؟ ہیہ کالی کاکوپ (غصہ) ہو ۔ داھنے گہر (گدہا) جیلہ سن موکہہ (سامنے) بائیں بولیو کاگ ہے ۔ ارو گہی گاتی گلی نیلی (بلی) تہت (کہڑی) رانڈ (بیوہ) رو دت لاگ ہے + ات (پتر) نشاں کہنڈت (خراب) ڈنڈ (ابھار) بھر بریم (بہت) اہماگ ہے + جب سودار موج دین ہو بدشگوں لاگا لاگ ہے + دن کٹک (فوج) مانجہہ (میں) اولوک (الو) بولت لوک (ستارے) ٹوٹت رات ہے ۔ کھوں سوداں (کتا) رو دت موربی (مور لنگاک) سوں کہوں سیار (لومڑی) گن (جھنڈ) پھکرات ہے + سر رات سر پہ گیدھ کے گن یوں بڑھوا دت پات (خلفشار) ہے + دھڑ دھڑ رے سپاہی سوپن (نیند) میں سب بھاگ گیو بڑ رات ہے

(۲) شہنشاہ (فرخ سیر) تب سورن (اچھاوِن) سو وچھ (خوب) دھری + بسے اور تھل (جگہ) بچے پڑاو کرے (۳) ہو ہو ہو کرنائی باجت + شہنشاہ شگون ساجت وغیرہ ۔

آداب شاہی تب سید عبداللہ کہاں لینہو سو ادب بجائے + وہ حکم سر دھریے ۔ سو میری (خیال کرتے) پر بھو کو پارے یعنی فرخ سیر کا فرمان پا کر عبداللہ خاں نے اسے تعظیماً سر پر رکھا اور بادشاہ کا دل میں تصور کر کے نقارہ بجانے کا حکم دیا (۲) آجم کہاں تجا کیجئے سوں پرے (تھورا) پر بھو کے پائے ۔ یعنی اعظم خاں نے اپنے آقا (فرخ سیر) کا قدم چھوا ۔ یہ ایک ہندوانہ رسم ہے ۔ اگر پرے کو درسے یعنی درشن پڑھا جائے تو قباحت نہیں رہتی ۔

سری دھر نے ہندوؤں کی پرانی روایات اور دیومالا کی طرف اکثر جگہ نہایت خوبی سے اشارہ کیا ہے ۔ ۵۵۵ ۔ ۵۶۵ ۔ ۹۱۱ ۔ ۹۱۲ ۔ ۱۱۲۷ وغیرہ میں شیش ناگ ، کورم (کچھوا) اور دگپال کا ذکر جو زمین کا لنگر سنبھالے ہوئے ہیں پایا جاتا ہے ۔ ایک مثال کافی ہے سے آتی (زیادہ) بھور (سورج) جھنپت (چھپ گیا) کورم گنپت شیش کی بلتا (قوت) گھٹی ۔ اس ضمن میں ۵۶ ۔ ۱۱۵۵ کے اشعار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا سے تب گر بور (پہاڑ) کو (ہاتھ) دھری گر بور (سری کرشن جی) دھر شری دھر بھنت (کہتا ہے) درج منڈل کی تپانہ (ساتھ) ہو + اب گر دھر لال بہادر یہ شمشیر گہی (پکڑ کر) کر بات شاہی کے پناہ ہو ۔ ان مصرعوں میں دیومالا تشبیہہ و استعارہ ترنم تکرار صوت سب کچھ موجود ہے ۔ تاریخی اشارہ بھی قابلِ توجہ ہے ۔ شاعر کہتا ہے کہ زمانہ قدیم میں سری کرشن جی نے پہاڑ کو ہاتھ پر سنبھال کر برج منڈل کو بچا لیا اور اس زمانہ میں گردھر لال (ناگر) بہادر شمشیر ہاتھ میں لے کر بادشاہ (فرخ سیر) کے پشت و پناہ ثابت ہوئے ۔ روایت ہے کہ ایک بار سری کرشن جی اور اندر دیوتا کے درمیان نزاع واقع ہوئی اندر نے غصہ میں آ کر پانی برسانا شروع کیا تا کہ برج منڈل غرقِ آب ہو جائے ۔ کرشن جی نے سارے باشندوں کو پہاڑ پر جانے کا حکم دیا اور جب تک پانی برستا رہا اس پہاڑ کو ایک انگلی پر اٹھائے رہے آخر میں اندر نے ہار مان لی اور اس وجہ سے کرشن جی کا نام گردھاری یا گر بور پڑا ۔

چنداین از ملّا داؤد اور میناست از میاں سادھن
قدیم ہندی پریم کتھائیں

چند سال پہلے چودھویں صدی کے مولانا داود کی چنداین اور میاں سادھن کی میناست جو اودھی بھاشا کی پریم کتھائیں یا عشقیہ کہانیاں ہیں علمی دنیا کے لئے تقریباً مفقود تھیں۔ ان کے نامکمل لیکن قدیم نسخے جب منیر شریف (پٹنہ) کی خانقاہ میں ملے اور ان پر کرنٹ اسٹڈیز پٹنہ اور بہار ریسرچ جرنل میں دو طویل انگریزی مقالے شائع ہوئے تو ہندی داں طبقہ کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی اور کافی دلچسپی لی گئی۔ چنداین کے ۳۴ پریشاں اوراق کی متعدد عکسی کاپیاں افراد اور اداروں نے منگوائیں۔ سادھن کی کتاب کے بھی فوٹو لئے گئے۔ میناست کے علاوہ ملک محمد جائسی کی پدماوت، اکھراوٹ مہری نامہ اور برہان اور بکسن کی ہیوگ ساگر کا یہ ضخیم مجموعہ کافی اہم سمجھا گیا۔ پاکستان سے چند باتصویر قدیم اجزا چنداین کے دستیاب ہوئے جو شملہ میں ڈاکٹر سوری ڈائریکٹر ارکائیز لاہور سے تقسیم کراکے ساتھ لائے۔ راجستھان اور یوپی میں بھی دو نسخوں کا پتہ چلا جو ہندی لیپی یا رسم الخط میں ہیں میناست کا فارسی رسم الخط میں کوئی دوسرا نسخہ اب تک نہیں ملا لیکن شری اودے شنکر شاستری نے کیتھی لیپی میں اس کے کئی نسخے ڈھونڈھ نکالے جن میں راجستھانی بھاشا میں کھیم داس کی تضمین بھی ہے۔ مشرقی پاکستان میں اس وقت ایک صاحب جواب ڈاکٹر گھوشال صدر شعبہ بنگالی پٹنہ کالج میں پی ایچ۔ ڈی کے لئے ایک کتاب مرتب کر رہے تھے سترھویں صدی کے قاضی دولت نے میناست

مصنف سادھن کو جو بنگالی روپ دیا تھا وہ اُن کے دائرہ تحقیقات کے اندر تھی ایک آدھ بند جو منیر شریف کے نسخے سے انگریزی مقالے میں بطور نمونہ دیئے گئے تھے اُسے دیکھ کر مزید تفصیلات کی موصوف کو تلاش تھی جو یہاں سے بہم پہنچائی گئی۔ اس مقالے میں محض سرسری طور پر اس نادر ہندی نظم کا جائزہ لیا گیا تھا لیکن ساری کتاب کا مطالعہ صاحب ذوق حضرات کے لئے ضروری تھا۔ الغرض منیر شریف کے ان دو نامکمل نسخوں کی دریافت سے قدیم مسلمان ہندی شاعروں کی تصنیفات کے تجسس و تلاش میں پہلے سے زیادہ تگ و دو شروع ہو گئی۔ "چنداین" کے جو کچھ اجزا اب تک حاصل ہو سکے ہیں ان میں علاوہ منیر شریف کے ۴۸ صفحات لاہور کے تقریباً ۲۷ اوراق کالا بھون بنارس کے چند باتصویر اجزا کے بھوپال کا قدیم باتصویر اور زیادہ اوراق پر مشتمل نسخہ قابل ذکر ہے۔ بھوپال کا نسخہ اب بمبئی میوزیم کی ملک ہے۔ ان سارے اجزا کو کتابی صورت میں آگرہ ہندی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔ سادھن کی "میناست" حال ہی میں گوالیار سے شائع ہوئی ہے اور اس پر الٰہ آباد کے پروفیسر ڈاکٹر ماتا پرشاد گپت نے ایک تحریر شائع کی ہے اردو داں طبقہ مولانا داؤد کی "چنداین" اور سادھن کی "میناست" کے متعلق شاید ہی کچھ واقفیت رکھتا ہو۔ میناست ایک مختصر نظم ہے جو زبان، موضوع، پند و نصیحت اور اخلاقی نکات کے لئے کافی جاذب نظر ہے۔ چونکہ ان دونوں کتابوں کے قدیم نسخے فارسی رسم الخط میں ہیں اور نادر الوجود و عسیر الحصول ہیں۔ اس لئے اردو دنیا کے لئے انھیں منظر عام پر لانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ "چنداین" پر تو ایک مقالہ حوالۂ قلم کیا جا چکا ہے لیکن ضرورت ہے کہ "میناست" کے جو اجزا ملے ہیں بالخصوص منیر شریف کا نسخہ جوں کا توں شائع کر دیا جائے۔ منیر کے نسخے اور جودھپور بیکانیر کے ہندی رسم الخط والے نسخوں میں بہت جگہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہندی داں طبقہ بھی شاید اسے پسند کرے کہ منیر کے نسخے کے بند پورے کے پورے شائع کر دئے جائیں تاکہ مقابلہ اور تصحیح میں آسانی پیدا ہو۔ سادھن کی زبان اور دیگر خصوصیات لسانی، ادبی، اخلاقی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن یہ بات انھیں کو زیب دیتی ہے جو قدیم ہندی کے بدوان یا عالم لیکھک یا اہل قلم اور انشا پرداز ہیں۔ راقم السطور کا اس مقالہ سے محض یہ مقصد ہے کہ اردو دنیا بھی ان چیزوں سے روشناس ہو جائے۔

"چنداین" اور "میناست" کے درمیان بڑا گہرا رابطہ ہے۔ اس لئے سب سے پہلے مختصر طور پر اول الذکر کے متعلق ان حضرات کے لئے جن کی نظر سے راقم السطور کا انگریزی مقالہ نہیں گذرا چند ضروری باتیں بتا دینا شاید برمحل سمجھا جائے۔ یہ ایک طویل منظوم پریم کتھا ہے جسے مولانا داؤد نے جو شاید یوپی کے دالمئو کے رہنے والے تھے وہاں کی مقامی بولی اودھی میں ایک قدیم لوک گیت کو ماخذ قرار دے کر ۷۸۹ھ میں تصنیف کیا اور اسے فیروز شاہ تغلق سلطان دہلی کے وزیر جہاں شہ پسر خانجہاں مقبول کے سامنے پیش کیا۔ منیر شریف کے نسخے کے اوراق پر قدیم انداز میں نمبر دیئے ہوئے ہیں۔ ایک صفحہ پر ۱۴۴ مرقوم ہے۔ اُس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ بیچ میں ایک جگہ ٹوٹتا ہے۔ پھر آخر کے اوراق بھی غائب ہیں۔ کتنے یہ نہیں معلوم۔ بارہ ماسہ کے اجزا جو اس کتاب کے اہم حصے تھے جیسا کہ کالا بھون بنارس اور بھوپال کے نسخوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں نہیں ملتے۔ کل ۴۸ صفحات چھوٹی تقطیع کے ہیں۔ ہر ایک صفحہ میں دو بند ہیں جن کی لکھاوٹ کا انداز آڑا ترچھا ہے لیکن دوہے سیدھی لکیر میں ہیں۔ بیچ کا دوہا سرخ روشنائی میں لکھا ہوا ہے۔ یہی انداز تقریباً سب دستیاب شدہ قدیم نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ ہر صفحہ کے اوپر فارسی میں عنوان دیا گیا ہے جو غالباً مصنف کا نہیں ہے اس لئے اکثر جگہ عنوان اور دوہوں' چوپائیوں میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔

ایک قابل ذکر امر منیر کے نسخے کی یہ ہے کہ حاشیہ پر ہر صفحہ میں ۱۵ ویں صدی کے شیخ قطبن کی مشہور پریم کتھا مرگاوت کا وہ حصہ درج ہے جس میں بارہ ماسہ شامل ہے۔ اس کا خط قدرے مختلف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرگاوت جیسے ہی شائع ہوئی کسی صاحب نے اسے چنداین کے اس نسخے کی خالی جگہ میں لکھنا شروع کر دیا۔ اس سے ان اوراق کی قدامت پر بھی کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔ شیخ قطبن نے حسین شاہ شرقی کے آخری ایام میں یہ کتاب منظوم کی اور اس بادشاہ کی مدح میں انھوں نے کئی شعر اپنی کتاب میں شامل کئے ہیں اور تاریخ تصنیف بھی دی ہے:

"شاہ حسین آہ' بڈہ راجا   چھات سنگھاسن اِنہ لی چھاجا ....
اِنہ کے راج یہ رہم کہے   نوسئے نو جو سمبت اہے"

سمبت سے مراد ہجری سنہ ہے۔ کتاب کے آخر میں سمبت سن بھی موجود ہے:

"جھیا پندرہ ہی بُت ساٹھی   تبیا یہ چوپانیہ کا بھی"

معلوم ہوا کہ ۹۰۹ھ یا ۱۵۰۳ء میں یہ نظم پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

جائسی نے تقریباً آدھ درجن مسلمان شاعروں کی ہندی نظموں کی جو فہرست "پدماوت" میں گنائی ہے اس میں "مرگاوت" بھی شامل ہے لیکن تعجب معلوم ہوتا ہے کہ جائسی نے مولانا داؤد کی "چنداین" اور سادھن کی "میناست" کی طرف قطعی اشارہ کہیں نہیں کیا۔ حالانکہ شیخ قطبن نے چنداین سے یقیناً استفادہ کیا تھا جیسا کہ ان کے ایک ٹیپ کے مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کسی قدر اختلاف کے ساتھ یہ مصرع منیر کے نسخے میں موجود ہے:

" اک اک بول موتی جس پروا بکتا چت من لائی "

چنداین میں یہ مصرع اس طرح ہے:

" اک اک بول موتی جس پروا کہوں جو ہیرا توڑ "

"مرگاوت" کے مکمل نسخہ پر جو راقم السطور کو دہلی سے ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی کی وساطت سے ملا اور جو فارسی رسم الخط میں ہے ایک طویل مقالہ بہار ریسرچ جرنل میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک اور مقالے میں جو پندرھویں صدی کے مشہور چشتی سلسلے کے صوفی بزرگ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے متعلق تھا۔ موصوف نے جو "چنداین" کا ایک شعر اپنے خط میں دیا ہے اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

چنداین بڑی مقبول تھی۔ مسلمان بھی اسے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ عہد اکبری کے مشہور مورخ مولانا عبد القادر بدایونی "منتخب التواریخ" میں لکھتے ہیں کہ ملا تقی الدین واعظ ربانی نے جب بعد نماز اپنے خطبے میں چند دوہے "چنداین" کے سنائے اور کچھ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوتے دیکھیں تو فرمایا کہ معرفت کی باتیں جو ان اشعار میں مضمر ہیں دھیان دینے کے قابل ہیں نہ کہ اس کی زبان۔ غرض کہ ہمایوں و اکبر کے عہد تک ملا داود کی "چنداین" کا بہت چرچا تھا۔

مولانا داود نے سلطان وقت، اس کے وزیر، تاریخ تصنیف اور اپنے جائے قیام یا وطن کا ان اشعار میں تذکرہ کیا ہے:

برس سات سے ہوئے اُناسی ۔۔۔ تہیا یہ کبی سر سے بھاسی
ساہ پھیروج دلی سرطانا ۔۔۔ جوناشاہ اوجیر بکھانا
دلمؤ نگر بسے نورنگا ۔۔۔ اوپر کوٹ تھے بہے گنگا

یعنی ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں شاعر نے یہ قصہ منظوم کیا۔ فیروز شاہ (تغلق) دہلی کا سلطان تھا اور اس کا وزیر ملقب بہ جوناشاہ تھا۔ دلمؤ نگر ایک خوبصورت شہر اس طرح بسا ہوا تھا کہ اوپر اس کے قلعہ تھا۔ نیچے دریائے گنگا موجزن تھا۔ جوناشاہ یا جہاں شہ اپنے نامور باپ خان جہاں مقبول وزیر فیروز شاہ کی وفات کے بعد ۷۷۰ھ (۱۳۶۸ء) میں اس کا جانشین ہوا اور خان جہاں کا خطاب بھی پایا۔ ستمبر ۱۳۸۹ء تک جب کہ فیروز شاہ کی وفات ہوئی یہ عہدۂ وزارت پر فائز رہا۔ بھوپال کے نسخے میں ایک جگہ خانجہاں کے عدل وانصاف کی مدح سرائی بھی کی گئی ہے:

ہندو ترک دوھو سم راکھیں ۔۔۔ ست جو ہوئے ڈھونڈھ کھنہ بھاکیں
گئو سنگھ ایک پنتھی رینگاویں ۔۔۔ ایک گھاٹ دو مہرل پانی پیاویں
ایک دیٹھ دیکھیں سنسارو ۔۔۔ کہاں جہاں سوں کون بڈ ہارو کہہ جوہار

ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔ جہاں کہیں سچی بات ہوتی ہے اسے ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور بے لاگ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ گائے اور شیر ببر کو ایک ہی راستہ پر چلاتے ہیں۔ دونوں ساتھ ایک گھاٹ پر ان کے عہد میں اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ یکساں طور پر سب پر نظر رکھتے ہیں۔ غرور اور گھمنڈ سے معرا ہیں۔ سب کے ساتھ بیوہار ان کا سادھارن طور کا ہے۔ پہاڑ اور زمین کی طرح جنگ کے میدان میں یہ اٹل رہتے ہیں۔ خانجہاں سے کون بڑا امیر ہے۔ ان کے سامنے کیوں تعظیم سے سر جھک رہا ہے۔

جن دوہوں میں مولانا داؤد اپنا تعارف اور تعلی کا اظہار کرتے ہیں وہ یہ ہیں:

داود کب جو چاندا گائی ۔۔۔ جیہن رے سنا سو کامر جھائی
دھن تی بول دھن لیکھن ہارا ۔۔۔ دھن تی آکھر دھن ارتھ بچارا
ہر دین جات سو چاندا رانی ۔۔۔ سانپ ڈسے ہوں سوئی بکھانی
تو رکھا ہیں یہ کھنڈ کا نوں ۔۔۔ کمتا کاب کی لوک سنانوں

ملک نتھن سن بول ہماری　　　سنتھے کان دیی ہے کنہیاری

اور گیت میں کردں منی سیں ناٹی کر جوڑ　　　ایک ایک بول موتی جس پرداکھوں جو ہیرا توڑ

مطلب یہ ہے کہ داؤد کہتے ہیں کہ جو چاندا کی کہانی نظم کی تو جس نے سنا اس غم انگیز کہانی کو اس کا دل مرجھایا۔ قابل مبارک ہے یہ کہانی اور اس کا لکھنے والا۔ اس کے الفاظ، اس کے معنی و مطلب۔ چاندا رانی کی کہانی سن کر صدمہ ہوتا ہے۔ خاص کر چاندا رانی کو سانپ کا ڈس لینا نہایت غم فزا ہے۔ داؤد ملک نتھن کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ میں نے یہ حصہ منظوم کیا۔ شاعر کی کہی ہوئی کہانی لوگوں کو سنائی۔ تم بھی اسے سنو۔ میں سر جھکا کر ہاتھوں کو جوڑ کر یہ گیت بناتا اور سناتا ہوں۔ ایک ایک بات میری موتی کی طرح درخشاں بلکہ ہیرا توڑ ہے۔

بھوپال کے نسخے میں مولانا داؤد کا دو تین جگہ نام آیا ہے اور ملک نتھن کے علاوہ خانجہاں میر مسعود مؤخر الذکر کی دو بیبیوں اور سراج الدین کے نام بھی آئے ہیں۔ خانجہاں مقبول کی مدح میں جو اشعار ہیں وہ اوپر دیئے گئے۔ دوسرے متعلقہ اشعار یہ ہیں:

میر مسعود کا دوؤ ناریں　　　بھیمبرا (؟) بھوریں جوبن باریں

لئے کھنڈ واتی دوؤ بناویں　　　کو ہی بر جریں چھوک بجھاویں

باسن کورین پان کھنواویں　　　ایک کھنڈ چھاپ آنی پہراویں

یہ گیان تمھ چاند نہ بوجھی　　　مینان سیون کو تبو تیہ نہ جوجھی

او جے بات سنی چاند نہ کیجئی　　　اوتر دیئی اون اوتر نہ کیجئی

سراج دین سو کھنڈ (؟) داؤد کہے سنوار　　　میر مسعود کا دو رناریں لائی دھر می اُتار

یعنی میر مسعود کی دو بیبیاں تھیں بھیمبرا اور بھوریں۔ دونوں خوبصورت نوجوان عورتیں تھیں۔ دونوں نے الگ الگ گھر بنوا لئے تھے۔ ایک کا کوہبر جلتا تھا دوسری آگ بجھاتی تھی۔ کوئی کورے برتن میں پان لا کر کھلاتی تھی۔ دوسری اپنے خاوند کو چھاپا ہوا کپڑا پہناتی تھی۔ تجھے اے چاندا ان باتوں کا گیان نہیں ہوا اور تو فضول میناں سے لڑ بیٹھی۔ اوچھی بات سنکر اے چاندا کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔ جواب سوال نہیں کرنا چاہیئے۔ سراج الدین سے یہ باتیں داؤد سنوار کر کہتے ہیں کہ میر مسعود کی دونوں عورتیں آپس میں بغل گیر کیوں کر

ہوگئیں ۔

سراج الدین اور ملک بختن کون تھے یہ تو نہیں معلوم لیکن شاہی خاندان کے ایک فرد امیر مسعود بک کا ذکر صوفیوں کے تذکرہ میں ضرور ملتا ہے جو نہایت اچھے فارسی کے شاعر تھے ۔ وحدت الوجود کے نظریہ کو اپنے دیوان میں اس شدومد وغلو کے ساتھ نظم کیا کہ علمائے ظاہر نے ان کی شطحیات پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور منصور وشہاب الدین مقتول وغیرہ کی طرح ان کو بھی سزائے موت دی گئی لیکن ان کے اشعار پھر بھی صوفیوں میں بہت مقبول تھے ۔ ہوسکتا ہے کہ امیر مسعود سے مسعود بک ہی مراد ہوں ۔

جن دوہوں میں مولانا داؤد لورک اور چندا کا اول الذکر کی زبان سے تعارف کراتے ہیں وہ منیر کے نسخے میں اس طرح مرقوم ہیں :

جات اہیر ہم لورک ناؤں کنور نگر ہمار پور ٹھاؤں
سہدیو مہر کی چاندا دھیا مہر بیاہ باون سوں کیا
باون کیر نار لے آیوں چاندا تری مہر دی پایوں
ہوں جو آہ جیہں بانٹھا مارا اجور اور روپچند ہارا وغیرہ

قصہ کا ہیرو لورک ایک بہادر گوالا تھا جس کی بچپنے میں میناں سے شادی کردی گئی تھی قصے کے دوران میں ایک اور بیاہتا بی بی منجری کا بھی نام ملتا ہے ۔ لیکن چنداین کی اصلی ہیروئن چاندا یا چندا ہے جو کنور راج سہدیو کی دھیا یا دختر تھی ۔ اس سے لورک کو عشق ہوگیا اور وہ بھی اس پر جی جان سے فریفتہ تھی ۔ دونوں بھاگ نکلے ۔ لورک کا بھائی مویشیوں کے ساتھ راستے میں ملا ۔ بہت سمجھایا ۔ کوئی اثر نہیں ہوا ، لڑا اور مارا گیا ۔ ایک چمار بانٹھا بھی مخل ہوا لیکن اس نے بھی منہ کی کھائی ۔ راؤ روپچند اور اجور سب کو شکست ہوئی ۔ لورک سب پر غالب آیا ۔ ایک درخت کے نیچے دونوں نے آرام کیا لیکن چاندا کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ مرگئی ۔ اوجھا آیا اور بہت سی دوسری تفصیلات ہیں ۔

بھوپال کے نسخے میں ایک جگہ غمزدہ لورک اپنی غربت ولاچاری وبے بسی کا رونا روتا ہے :۔

ماتا پتا بندھو نہیں دہائی سنگ نہ ساتھی میت نہ بھائی
اور نہ سنکھنڈ کوئی پاس نہ آوا کوئی مرت کمھ نیر چو آوا

کورے اٹھائے جیا سنبھاری　　آن کتھا کو کھے ہنکاری

دیئی پیت جیو گھر سنچارا　　باندھسی میں جہادی کے بارا

سپنے بہوتک میں کچھو دیکھا　　چیت نہ سنبھار مرن بسیکھا

لیہو پوچھہ نیں جو اچھوں کس گا سنبھار　　کیا سیوک کہو جیئے دھرو ریں جی کچھو نہ سنبھار

نہ میری ماں ہے نہ باپ نہ رشتہ دار نہ دودھ پلائی دائی نہ کوئی سنگھی ساتھی ہے نہ کوئی دوست ۔ اس جنگل میں کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا ۔ کوئی مرتے وقت آنسو بہانے والا یا پانی پلانے والا بھی نہیں ۔ کسے یاد کروں ۔ کوئی سنبھالا دینے والا نہیں ۔ کوئی میری داستان اور پکار کو سننے والا نہیں جس کو پریم دیا ۔ جس کے لئے گھر سے تکلیف کر کے نکلا ۔ سر کو باندھ کر اپنی عورت کو جس کے لئے چھوڑا (وہ بھی چلی گئی) ۔ خواب میں میں نے بہت کچھ دیکھا ۔ جس کے لئے میرا جی نہیں سنبھلتا اور موت ہی کی بات سوچتا ہوں ۔

اس نسخے میں ایک جگہ دوران گفتگو میں لورک اپنا اور چاندا کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر کرتا ہے :-

سُن لورک آس اوتر کہا　　سب پریوار کنور مورا اہا

گریھیں سنتاپ آن گھر آو جیھیں　　کھا بندن دبندھ پردیس دیکھاویں

بیری ہوئے کورت پیاسا　　لین نہ دیئی سو کہی سون سانسا

لوگ جائی ایھی ٹھائیں کری جیھیں　　مکھ دیکھت پڑیں کان نہ دھری لیں

جات گووارا ہوں بدھی واری　　لور کنور کر ہی ناؤں ہماری

کنور راج سہدیو چپرو دھی کئے دھی دولاری

تیہی کارن لیں دیستر مے موہی چاندا رانی

یعنی لورک نے یہ سُن کر جواب دیا ۔ میرے خاندان کے سب لوگ راجکمار ہیں ۔ اس خاندان کے لوگ اپنے مقام پر نہیں رہتے پردیس چلے جاتے ہیں ۔ دشمن خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں ۔ سکھ سے سانس بھی لینے نہیں دیتے ۔ لوگ یہاں اپنا گھر نہیں بناتے ۔ مونہہ دیکھتے ہیں ، کان نہیں

دیتے۔ جات کا تو میں گوالا ہوں لیکن عقل رکھتا ہوں۔ میرا نام کنور لورک ہے۔ کنور راج سہدیو کی وہی دولاری بیٹی ہے جس کی وجہ سے میں نے جلا وطنی اختیار کی ہے اور وہ چاندا رانی ہے۔

آخر بار بیاہی عصمت مآب فراق زدہ میناں کی وفا رنگ لائی جب اس کی دشواریوں اور دُکھ کا حال لورک کو معلوم ہوا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور پھر ملاپ کا خواہاں ہوا۔ جب کہا گیا کہ "برہ سنتائی میناں" ماہی بے آب کی طرح اس کے فراق میں بسمل ہے "جس مچھ کی بن نیر مرجھائی" تو وہ اس کے پاس مندر میں پہنچا۔

سن سنتاب میناں کر روا	لورک ہئی گسمر دھووا
اب میناں بن رہئے نہ جائی	دیہی پنکھ بدھی جاؤں اوڈائی
مندر جائی میناں مکھ دیکھوں	بن تکھ جیوں (؟) مرن کئے لیکھوں

میناں کے درد و کرب کا حال سن کر لورک رووا۔ اس کے دل میں دُکھ ہوا جی میں کہا کہ اب میناں کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اگر ایشور مجھے پنکھ دے دے تو میں اُڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاؤں۔ مندر جا کر اس کا چہرہ دیکھوں۔ بغیر اس کے درشن کے شاید میں مر جاؤں۔

سادھن کی "میناست" کے اہم افراد بھی "بار بیاہی"، "برہ سنتائی" "میناں" لورک اور چندا ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دوتی یعنی دلالہ کٹنی رتنا نام کی مالن ہے جسے ساتن نگر کا شیطان سیرت کنور لالچ دے کر بھیجتا ہے کہ وہ میناں کو اس کے 'ست' سے ڈگمگا کر اس سے ملنے پر آمادہ کرے۔ کٹنی میناں کی بے بس اور بے وفا شوہر کی جدائی سے جو اسے دُکھ پہنچا ہے اس کا فائدہ اٹھا کر طرح طرح سے اس کے جذبات کو اُبھارتی ہے۔ لورک کی یاد کو بھلا کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے اور کنور سے ملنے پر اُس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتی۔ وفا کی پتلی اُس کے دام میں نہیں آتی اور آخر کٹنی ذلیل ہو کر نکال دی جاتی ہے۔ چونکہ چندائن کا مکمل نسخہ ہنوز گوشۂ گمنامی میں مستور ہے اس لئے کہا نہیں جا سکتا کہ "میناست" کس حد تک اس سے ماخوذ ہے۔ لسانی خصوصیات کی بنا پر جن کے متعلق آخری فیصلہ تو قدیم ہندی کے عالم ہی دے سکتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ چونکہ "چندائن" کی بہ نسبت "میناست" کی زبان زیادہ صاف اور سریع الفہم

ہے اس لئے موخر الذکر بعد کی تصنیف اور اول الذکر کی مقبولیت اس کی محرک ہوئی ۔ دونوں میں بارہ ماسہ کا جزو شامل ہے ۔شاید چنداین کے بارہ ماسہ میں جس کے صرف چند ہی بند مل سکے ہیں ولاولہ رتنا اور اس کے شیطان سیرت مربی کنور کا کچھ ذکر نہیں ہے ۔ سرجن ایک بھاٹ ہے جس کے ذریعہ میناں لورک (اور چاندا کو بھی) اپنا پیغام بھجواتی ہے ۔بھوپال کے نسخے اور کالا بھون بنارس کے ایک باتصویر ورق میں کاتک کے مہینے کا حال درج ہے :۔

موہی نکھیں سب جگ اندھیارا ۔۔۔ لے گئی چاند مور اُجیارا
پائیں لاگ کے سرجن موں بن جائے مناوے ۔۔۔ سوریہ دیوا ٹھان پیئے پوجے منس آوے

بھادوں میں میناں کہتی ہے :۔

بھادوں برس جھمکے اندھیاری ۔۔۔ رین ڈراؤنی ہوں دھن باری
چنچل چمک مورھیو بھاگے ۔۔۔ مندر رنا نہ بنددھی دھی لاگے
سنگ نہ ساتھ نہ سکھی سہیلی ۔۔۔ دیکھ بھاٹ میں مندر اکیلی
ایہہ دُکھ بھوٹ نین تس بھنے ۔۔۔ دھرت بھوڑ سائر بھری رہتے
نکری جاؤں پگ چلے نہ جائی ۔۔۔ بھومینھی بھوڑی رہا جل چھائی

دُرجن بچن سنو کے لور پردیسنہی چھاؤ
لائی نین دو دھوں برکھا سُرجن روئی بھاؤ

ایک جگہ ہے :۔

سرگ چندر منہی میلا دھرم میگھ بھنے کار
سرجن پہنچ تمہارے اوپرے بوڑھ نہ مار

غرض کہ ہر موقع پر سرجن ہی پیغامبر ہے ۔

سادھن کون تھے ۔کہاں کے رہنے والے تھے ۔ ہندو تھے یا مسلمان ۔ مولانا داؤد سے پہلے تھے یا بعد ۔ان سے متاثر تھے یا نہیں ۔ان کے قصہ کا ماخذ چنداین ہے یا لوریکا کی قدیم روایتی کہانی ۔ ان امور کے متعلق قطعی طور پر تو کچھ کہا نہیں جاسکتا، قیاس آرائی کی جاسکتی ہے ۔ راقم السطور کے دست

شری اودے شنکر شاستری نے کیتھی لپی میں "میناست" کے کئی نسخے دیکھے جن میں ایک پر بطور عنوان "میاں سادھن لکھا ہوا ہے۔ بنبر کے نسخے کے پہلے شعر۔

"ساتن کنور بگر کے دوتا   کپت روپ نارد کے پوتا"

میں برہما کے پُتر ہندوؤں کے رِشی ناردجی کی ایک شیطان سیرت کنور سے جو نسبت دی گئی ہے اسے شاید راسخ العقیدہ ہندو گوارا نہ کریں۔ یہ ضرور ہے کہ ناردجی کو ادھر کی بات اُدھر لگانے اور رشیوں کے درمیان اختلافات اور غلط فہمیوں کو ہوا دینے میں خاص طور پر ملکہ حاصل تھا لیکن ان کی نیت ہمیشہ نیک ہوا کرتی تھی۔ مسلمان شاعر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ ایسی باتیں بھی ان کے قلم سے نکل جاتی ہیں جو ناردجی کی شان اور عظمت کے خلاف پڑ جاتی ہیں۔ لیکن ہندو اہلِ قلم بہر حال احتیاط اور احترام کا پہلو قائم رکھتے ہیں۔ جائسی نے "اکھراوٹ" میں متعدد بار ناردجی کا نام لیا ہے:

"سنت شاشتر نارد بھاگے"

ایک جگہ کبیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

نارد روئی سنگ پکارا   ایک جلاہے تیں میں ہارا

سادھن کے الفاظ میں بھی ذم کا پہلو موجود ہے۔ گو ان کا منشا ہرگز یہ نہ ہوگا کہ کسی کو کچھ بھی ان کے اندازِ بیان سے ٹھیس پہنچے۔ سادھن نے اپنی شخصیت پر ایک موٹا پردہ قصداً ڈال رکھا ہے۔ دبستانِ مذاہب کے مصنف کی طرح شاید ان کی بھی یہی کوشش تھی کہ ان کے مذہب و ملت کی جانکاری خوانندوں کو نہ ہو سکے۔ پھر بھی کچھ ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو اُن کے اسلامی خیالات کی غمازی کرتی ہیں۔ ان کی مختصر نظم بھی مثنوی کی طرز پر ہے۔ عموماً مسلمانوں کی ہندی نظمیں مثنوی نما ہوتی ہیں۔ خدا و رسول، پیر طریقت اور شاہ وقت کے ذکر سے یہ اپنی کتاب کا آغاز کرتے ہیں لیکن سادھن یہ سب کچھ نہیں کرتے۔ وہ براہ راست قصہ پر آجاتے ہیں۔ ان کے اخلاقی پند و نصائح دنیا کی بے ثباتی، حق گوئی، وفا شعاری، حفظ ناموس، عفت و عصمت پر جو زیادہ زور ان کے ٹیپ کے مصرعوں یا سورٹھوں میں پایا جاتا ہے عمومی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کا اطلاق ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے مذاہب پر یکساں طور سے ہو سکتا ہے خالص اسلامی عقیدہ یا نظریہ کی کہیں بھی جھلک تک نہیں پائی جاتی لیکن اس کی اس ہندی نظم میں گنجائش

بھی نہ تھی۔ میناں ایک ہندو عورت ہے، چوڑی، سیندور، کاجل اور دوسری سہاگ کی باتیں، تیوہار، کھیل کود، کھانے پینے کا ذکر جو تمام تر ہندوانہ ہیں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ دیوتاؤں، رشیوں، راکھشسوں، پانچوں اندریوں کی طرف جو اشارات ہیں وہ بھی برمحل ہیں۔ پھر بھی ایک دو باتیں ایسی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ ہندو اہل قلم کے لئے جہاں موقع آجاتا ہے اپنے بنیادی مسئلہ آواگون یا تناسخ کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن سادھن کی ساری نظم میں کوئی بھی اشارہ ایسا نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ ایسے مواقع آتے ہیں جب سادھن میناں کی زبان سے کہلوا سکتے تھے کہ اس دنیا میں نہ سہی دوسرے جنم میں تو میں اپنے خاوند لورک کو پالوں گی۔ وہ پُر امید ہے کہ اسی دنیا میں اس کا بچھڑا ہوا شوہر اس کے پاس لوٹ آئے گا۔ اور بالفرض ایسا نہ ہوا تو وہ اس کی یاد میں اپنی زندگی ختم کر ڈالے گی۔ ایک جگہ کہتی ہے:

"تا نتر میناں موئے گنواوے رتو جانوں جو لورک آوے"

مجھے تو مری لطف اندوزی تب ہی حاصل ہو گی جب لورک واپس آئے گا۔ ورنہ میں مر کر ختم ہو جاؤں گی۔

وہ کٹنی سے پوچھتی ہے:

"مالن بجین سُنہ تمہہ جنم کی نت نت جات"

کیا جنم بار بار ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ "دواو جگ" یعنی دونوں جہاں کے فقرے ملتے ہیں لیکن اس میں غیر اسلامی تخیل نہیں ہے۔ ایک جگہ تو صاف طور پر اسلامی تخیل کا پرتو ملتا ہے:

جی پیرا مور چاند لے دھر بھیں بھوجیو دھڑ ماٹی مُنہ پڑ بھیں

میری روح تو چاند نکال لے گئی اور بغیر روح کے جسم مٹی میں پڑ جاتا ہے یا دفن ہو جاتا ہے۔

ایک جگہ میناں کہتی ہے:

"جو ری مو دا سو ی تنہ نہ آوا"

جو مر گیا وہ واپس نہیں آتا۔ کیتھی لپی والے نسخوں میں 'تنہ' کی جگہ 'سا تہہ' ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

الغرض قرائن اور داخلی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ سادھن مسلمان تھے۔ کسی نے آج تک سادھن کو غیر مسلم نہیں بتایا۔

راقم السطور کے دوست شری اودے شنکر شاستری کو کئی نسخے "میناسَت" کے دیکھنے میں

آئے۔ ان میں الٰہ آباد ضلع کے گاؤں درویش پور (متصل فتح پور) کا نسخہ منیر کے نسخے سے ملتا جلتا ہے۔ کھیم داس داود پنتھی امردھوی نے سادھن کے اشعار پر اپنی تضمین پیش کی ہے کیتھی خط میں ہے اور ۱۷۰۹ سمبت مطابق ۱۶۵۳ء کی تاریخ اس پر ثبت ہے۔ بیکانیر کی ناہٹا پوتھی اور جودھپور کے نسخے بھی کیتھی خط میں ہیں۔ موخرالذکر دونوں نسخوں میں تمہیدی بند الحاقی معلوم ہوتے ہیں۔ منیر اور درویش پور کے نسخے میں یہ نہیں پائے جاتے۔ ہندو تخیل و عقیدت کا جس قدر اور جس عنوان سے اس میں ذکر آیا ہے اس سے سادھن عمداً احتراز کرتے ہیں۔ ان کا منشا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت، مذہب و ملت پردۂ خفا میں مستور رہے۔

دھن کرتار سرا ہوں تو ہیں امرت بچن دینہہ مکھ مو نہیں

اے خدا میں تیری بڑائی کرتا ہوں جس نے مجھے اس طرح کی اچھی زبان دی ہے۔ یہ بظاہر عمومی حیثیت کا شعر ہے لیکن دوسری جگہ سادھن شاعرانہ تعلی یا تفاخر کا کچھ بھی اظہار نہیں کرتے۔ اس کے بعد کا شعر تو بہ نسبت ایک مسلمان کے کسی ہندو ہی کے قلم کا مرہون منت ہو سکتا تھا۔

ایں کہس جیبھہ یہ موری کیونکر کردں سر بری توری

میری زبان سے جو نکلتا ہے وہ تو ہی کہتا ہے کیونکر میں تیری برابری کر سکتا ہوں۔ 'سر بری' یعنی برابری کا لفظ واحد مطلق کی عظمت وجلالت کے منافی ہے۔ یہ توہین ہے جس کا ارتکاب مسلمان نہیں کر سکتا جوگ اور گورکھ پنتھی مت کا ماننے والا ہی حسب ذیل اشعار سے اپنی کتاب کا آغاز کر سکتا تھا۔ اگر مینا اور لورک کی زبان سے یہ کہلوایا جاتا تو محل نظر نہ ہوتا۔

کہہ گاڑ روگن رنگ تھر کرے تپا روپ کیسے بدھ دھرے
دوئی مکھ سیتی پھیروں کنتھا گردین ہوئی نہ گورکھ پنتھا
گروبن ڈنڈ نہ جیبھہ ادھاری کوئی کیسے جگ بھیو بھکاری
گر بن جوگ نہ جائی جو کھیلا گرمو کہس بچن باد سدھی چیلا

گر بھد روپ جس اندھلا تمنہ نہ جاؤں ٹھاؤں
ھوئی سیکھوں کہیں کون بدھ جاؤں

اس الحاقی بند میں اور بندوں کی طرح سادھن کا نام نہیں آیا ہے۔

سادھن اور "میناست" کے زمانہ کا متعین کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ بلسبل دیوار نسو میں سادھن کا نام آیا ہے۔ چتور بھوج داس کی مدھو مالتی میں سادھن کی "میناست" کا قصہ شامل ہے اور سادھن کا نام بھی کئی جگہ ملتا ہے۔ مدھو (منوہر) مالتی سے میناں کا قصہ یہ کہہ کر سناتا ہے:۔

مالتی سن میناں کی بات | اپنی ست ھے اپنے ہاتھ
ست میناکو تو ھیں سنادیلہ | تھوڑا بات کہے سمجھا دوں

معلوم نہیں یہ کب کی تصنیف ہے۔ شری اودے شنکر شاستری کے پاس جو مدھو مالتی کا قلمی نسخہ ہے اس پر ۱۱۱۱ھ ہجری کی تاریخ دی ہوئی ہے۔ اراکان کے راجہ تھیری تھودھما (۱۶۲۲-۳۸) کے دربار سے مشہور بنگالی شاعر دولت قاضی اور علاؤل وابستہ تھے۔ بنگلہ زبان میں سادھن کے قصے کو دولت قاضی نے قدرے اختلاف و اضافہ کے ساتھ منظوم کیا تھا۔ پٹنہ میں تحقیقات ادب اردو کی طرف سے جو عظیم الشان نمائش منعقد ہوئی اس میں آگرہ ہندی انسٹی ٹیوٹ سے ایک قدیم دکھنی اُردو کی کتاب کا جو سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کی ملک ہے۔ عکسی نسخہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ کتاب بھی سادھن کی "میناست" کی ایک دوسری شکل ہے۔ لیکن نامعلوم مصنف نے شروع ہی میں لکھا ہے۔

رسالہ اتھا فارسی میں اوّل | کیا نظم دکھنی ستے بے بدل

اس میں بھی چندا، لورک گوالا "میناں نیک نام"، "بالا کنوز شیطان"، "پیر مختالہ" کٹنی کا ذکر ہے۔ "در بلا نیدن دوتی میناں را" اور "جواب وسوال و گفتار درمیان دوتی و میناں" کے عنوانات ہیں۔ لیکن اس دکھنی مخطوطہ کے عکس میں بارہ ماسہ کا تذکرہ جو سادھن کی "میناست" کا اہم جزو ہے موجود نہیں۔ اس کی جگہ شاعر نے چند حکایتوں سے کام لیا ہے اور ان سے اخلاقی نتائج مرتب کئے ہیں۔ مثلاً "حکایت دختر درویش وعادت گدائی"۔ ایک حکایت تین دوستوں کی ہے جنھیں طمع زر کے سبب اپنی جان گنوانی پڑی۔ گو مصنف سادھن کا نام کہیں نہیں دیتا لیکن اصل ماخذ میناست ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی فارسی شاعر نے سادھن کے کلام سے متاثر ہو کر ایک کتاب نظم کی جس کا دکھنی اُردو کا روپ کسی دوسرے نے دے دیا۔ زبان سے قدامت جھلکتی ہے لیکن تاریخ کتابت و تصنیف

نہیں ملتی ۔ سترھویں صدی کی معلوم ہوتی ہے ۔ ان سب سے قدیم تر تو وہ نسخہ تھا جس کی ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں کتابت ہوئی اور جس کی نقل منیر شریف کے نسخے کے کاتب نے سترھویں صدی میں کی ۔ منیر شریف کا نسخہ ایک مجموعہ ہے جو سارا سترھویں صدی میں لکھا گیا ۔ اس مجموعہ میں دو جگہ سنہ کتابت اور کاتب کا پتہ ٹھکانہ بینڈھنگے طور پر درج ہے ۔ یوگ ساگر کے اختتام پر یہ عبارت ہے ۔ "پوتھی یوگ ساگر بزبان ہندوی انصرام شد فی التاریخ ذوالقعد ۹۱۱ھ موضع خاصہ مرحق مالک بکلاون سندا توں بار بتاریخ بستم روز جمعہ زکی می نمائم ۔" پھر ایک صفحے میں جائسی کی "اکھراوٹ" کے اختتام اور سادھن کی مینا ست کے آغاز کے درمیانی حصے میں یہ عبارت پائی جاتی ہے "تمام شد پوتھی اکھروتی بزبان ملک محمد جائسی ۔ کتاب ہندوی کاتب الملک کاتب حروف فقیر حقیر محمد مقیم ساکن پرگنہ سندالزن عرف بکلاون خاص عملہ پرگنہ نظام آباد سرکار جونپور صوبہ الٰہ آباد بوقت ظہر یوم جمعہ زکی (دفی ۹) شہر ذوالقعد ۹۱۱ھ در موضع خاصہ مقام کنورہ عملہ پرگنہ نیکون بر سرکار مسطور است تحریر یافت زیادہ گفتار نوشتن اظہار نیست ۔"

ظاہر ہے کہ کاتب نہایت کم سواد تھا ۔ چونکہ سارا مجموعہ اسی کے قلم کا لکھا معلوم ہوتا ہے اور اس میں پدماوت بھی ہے جو شیر شاہ کے عہد میں مکمل ہوئی ۔ اس لئے ۹۱۱ھ کا سنہ کسی دوسرے کاتب کا دیا ہوا ہے ۔ "اکھراوٹ" جائسی کی اولین تصنیف قرار دی جا سکتی ہے ۔ اس کا موضوع مختلف اور مذہبی ہے یقیناً ۹۱۱ھ کے قبل لکھی گئی ۔ مینا ست بھی معرض وجود میں ۹۱۱ھ کے قبل آ چکی تھی ۔ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ عہد اکبری کے پہلے صوبہ الٰہ آباد کا وجود نہ تھا ۔ جونپور کی سرکار بھی بعد کی چیز ہے ۔ پریاگ اور الہباس آگے چل کر الٰہ آباد ہو گیا ۔ اکبری قلعہ کی بنیاد رکھی گئی ۔ ایک صوبہ قرار دیا گیا ۔ ظاہر ہے کہ کاتب اول کی دی ہوئی تاریخ کاتب دوم کے نام اور پتہ کے ساتھ خلط ملط ہو گئی ہے ۔ مجموعہ تو سترھویں صدی کا ہے ۔

"مہری نامہ" کا جس صفحہ سے آغاز ہوتا ہے اس کی پشت پر چند مختلف دوہے جو برج بھاشا میں ہیں قلم برداشتہ کسی نے لکھے ہیں ۔ اس میں عہد شاہجہانی کے چند مشہور امرا اور خود شاہجہاں کی تعریف کی گئی ۔ کمال اور ہاشم شاعروں کے، جن کے یہ دوہے ہیں، نام بھی آئے ہیں ۔ ایک نے اپنی عمر بھی بتائی ہے ۔ "پڑھت کمال عمر بیس بئیس برس کے ۔" ایک دوہے کا عنوان ہے "کبت بیر شاہجہاں بادشاہ غازی ۔" دوسرے میں "شاہجہاں بلوند بلی" کی مدح سرائی ہے اور اسی میں خانجہاں

لودی" اور" اجّت (عظمت) کھاں" کی لڑائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے "کبت بیر مہابت کہاں بابو"
کے آخر کا مصرع یہ ہے:

"پڑھت کمال بابو اجمت کو تول موکون دیجی بیس بیگھا کے چک ایک انکاہی۔"

ایک کبت کا عنوان ہے "کبت بیر میرانصاحب بیر خانجہاں جیو" ایک مصرعہ یہ ہے:

"خانجہاں بُن سانگ سروتر اتم ہاشم کاب سنایو۔"

ایک شعر ہے جو اس قلم کش نے پہلے دیا ہے اس سال کا پتہ ملتا ہے جب اورنگ زیب
نے شاہجہاں کو مقید کیا:

شاہجہاں جیو کے اورنگ زیب کو مانت تننگ کومال ملئے ھے
کوپ چڑھے برجھی بھوزندم بھوت کو کنبھم رکت دھرے ھے
ہمچہ کبت جب بھلی دل میں دل سو رسرا ہت سو بھلے ھے
اُتیتن برچھی سرطان کھبن اتیتن کمہو مور گند ھے ھے

بلاشبہ موجودہ نسخہ کی کتابت عہد مغلیہ اور دور شاہجہانی میں واقع ہوئی لیکن "یوگ ساگر"
"مناسنت اور اکھراوٹ" کو اس کے کاتب نے کسی پہلے کے نسخے سے نقل کیا جس پر سنہ کتابت
سنہ ۹۱۱ درج تھا۔

منیر کے نسخے کا پہلا اور جودھپور، بیکانیر وغیرہ کے نسخوں کا دوسرا بند دنیا کی بے ثباتی عالم اسباب
کے عارضی و فانی ہونے پر زور دیتا ہے:

جنہہ کل بیلیو یہ اسدل گجدل دسلیو
سادھن بھنی تے کیبیہ پر تتھمین جینہاں نا رہیو

اس کلجوگ میں جن لوگوں نے عیش و عشرت میں زندگی بسر کی۔ گھوڑے ہاتھی فوج دل بل اکٹھا
کئے وہ کیا ہوئے۔ بقول سادھن لوگ انھیں بھول گئے۔ ان کا نشان تک باقی نہ رہا۔

جاتا دیکھوں یہ سنسار و   کالو گاتہ دھرہ ھوبیارو
پانی ایس بلبلا ہوئے   جو آوا سو رھا نکوئے

جوبن موھن لینہہ سنبھارے　　　ٹونان ٹامن پھیریں جھارے

لیت درب مالن پُن گئی میناں کے بار

جمنھ بدنھ راکھے ست سوں کون ڈولاوے پار

جہ راکھے کرتار تاکو بار نہ بانکی　　　جو لاگے سنسار ساڈھن جمانہ کی چینھی

ساتن نگر کے کنور نے جس کا ظاہر و باطن یکساں نہ تھا اور جو کپٹ روپی نارد کا پوت معلوم ہوتا تھا۔ رتناں مالن کٹنی کو بلوایا اور کہا کہ اگر تو میناں کے قدم کو راہ راست سے ڈگمگا دے اور مجھے اس کا یقین دلا دے تو میں ایک نئی زندگی پاؤں اور تجھے چوندری کا کپڑا پہناؤں۔ مالن نے اس کا بیڑہ اٹھایا اور سب کے سامنے ست اور حق و راستی کا روپ دھارن کرتے ہوئے آگے بڑھی۔ جو بھنے موھنے لبھانے ٹونا ٹامن والے اس قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنے کو سج دھج کر روپے پیسے لے کر میناں کے دروازہ تک جا پہنچی۔ ساڈھن کہتے ہیں کہ صورت تو خطرناک تھی لیکن جسے خدا راہ حق پر رکھنا چاہے اسے کون ڈولا سکتا ہے۔ جس کا خالق پشت و پناہ ہے اس کا بال بھی کوئی بیکا نہیں کر سکتا۔ ساری دنیا بھی اس کے پیچھے پڑ جائے تو بدی کے سایہ کی اسے شناخت ہو ہی جائے گی۔

بعد کے بند منیر شریف کے نسخے میں یہ ہیں :-

(۳)　مالن جائی مندر بیں بیٹھی　　　میناں جہاں سنگھاسن بیٹھی

چنبیلی پھول جو سارا دھارو　　　کیند بھینٹ اور دینہ جو ھارو

ھنس کے پوچھی میناں رانی　　　کھواں گون کینھہ پردھانی

کھاد دین ٹن مالت میناں　　　آنکھیں کس بوس میناں

تو ربتیں دھائی موہ کینھاں　　　ہیں بار ہیں تو وہ استتن دینھاں

من نرجی ھنییں گھبرے پڑی آگ تن موہ

سنور سنیہہ جبت آپ جیوں ہی تن آیوں توہ

سیس نویں بھیں لاگ موکہ انبرت سن کیٹی

ساڈھن دھنک چڈھائی جیوں تھر دھو کے اھیریا

یہ دنیا فانی ہے۔ جنھیں تم پیار کرتے تھے کہاں گئے۔ زندگی تو بس پانی کا ایک بلبلا ہے جو اس دنیا میں نمودار ہوا آخر میں ناپید ہوا۔

پھلس پتنگ جو دیئی اوپانے　　آوت دیکھے جات نجانے

یک جھٹ اج زندن گیانھاں　　پرتھیں رہا نتھنکر چمیتھاں

جنھیں ایک زمانہ میں نذریں دی جاتی تھیں۔ سوغات پیش کئے جاتے تھے۔ ان کا آنا تو دیکھا گیا جانا معلوم نہ ہوا۔ جو تیتھر پتی جلیل القدر راجہ تھے ان کا بھی پتہ نشان اب نہیں ملتا۔ سب کے سب عدم آباد کے شکار ہوئے۔

ہم تن دن یک چل چل اٹھیں　　کھوا آکھ سمجھوں تا کھیں

ہماری بھی تو ایک دن چلا چلی ہے۔ اگر کوئی سمجھنے کے لئے تیار ہو تو بتایا جائے۔

دھواں کیر دھور اہر پر تھیں کوئی نرھا ندان

سادھن روئی مر بچاری جیوں جیوں منہ تواں

یہ دنیا کیا ہے دھواں کا ایک غبار۔ اس کا کچھ اتا پتہ نہیں ملتا۔ سادھن جب جب اس بات پر غور کرتے ہیں زار و قطار رہا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتے ہیں۔

کوڈی کوڈی جوڑ موئی کرپن باپڑی

گی گدنت کڑ ورمن پچھتا وا پاپی یہ

جن تا روئی صفت بخلانے کوڑی کوڑی جوڑ کر دولت اکٹھا کی اور کروڑوں روپے زمین میں گاڑ گڑ رکھے وہ کیا ہوئے۔ دل میں حسرت لئے ہوئے اس دنیا سے خالی ہاتھ چل بسے۔

اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے:

ساتن کنور نگر کے دوتا　　گیت روپ نارد کے پوتا

تیہی زنتاں مالن ھنکووائی　　ست سوں مینان ذیہ ڈولائی

دوت بجن جیوں مینہ پاوؤں　　تو مالن پچو ندر پھرا وؤں

مالن پان دوت کر لینھاں　　ست روپ سبہ آگیں کینہاں

مالن مندر میں جا پہنچی جہاں میناں سنگھاسن پر براجمان تھی ۔ اُس نے چمپا کا پھول اور چار زری کا ہار بھینٹ دیا ۔ دعا و سلام کہا ۔ میناں نے ہنس کر پوچھا ۔ کہاں سے تمہارا آنا ہوا ۔ تم کون ہو ۔ کٹنی نے کہا اے مالتی کے پھول جیسی میناں تو کیسی انجھنی باتیں کرتی ہے ۔ تیرے باپ نے مجھے تیری دودھ پلائی مقرر کیا تھا ۔ میں نے تجھے اپنا دودھ پلایا ۔ میرا من نہ مانا ۔ دل تیرے بغیر گھبرانے لگا ۔ بدن میں فراق کی آگ سلگنے لگی ۔ تیرے پریم سے دل کو ایسی بے کلی تھی کہ تجھ سے ملنے چلی آئی ۔ ساددھن کہتے ہیں کہ کٹنی سر جھکا کر بیٹھی تھی ۔ منہ سے تو امرت برسا رہی تھی لیکن من کپٹ اور فساد سے بھرا ہوا تھا ۔ جس طرح شکاری تیر کمان میں جوڑ کر شکار کے ٹوہ میں رہتا ہے ۔ وہی حال اس کٹنی کا تھا

(۴۲) مینن بات ساچ کے جانی　　کٹنی کی بولھ پتیانی
تبھی نائوں بیگ بلائی　　کُم کُم مردن کی نھوائی
گھیور پاپڑ آن جیئواوا　　دکھن کی چیر آن پہراوا
رھیسی کٹنی انگ نہ سمائے　　اب موہنہ کت میناں جائے
کھس تور دیکھوں اب بھیسا　　چھوٹی لٹین بہنگ بھئے کیسا
میل چیر تور دیکھوں کہ نہہ دیکھوں جوگ
سیس نہ سینڈور کاجر کاہ بھیو سبہہ بھوگ
بھس رہن کو تھا سات تیہہ تہہ منہ مکھ رودی
دوت لکھن تہ پاس سادھن آپ سنبھاری

میناں نے کٹنی کی بات سچ جانی ۔ اس کے بیان پر اعتماد کیا ۔ فوراً نائن کو بلوایا ۔ اس کے بدن میں زعفران اور دوسری خوشبودار چیزوں سے مالش کرائی ۔ غسل کرایا ۔ گھیور کی مٹھائی اور پاپڑ کھلوایا ۔ دکھن کی ساڑی پہنوائی ۔ کٹنی جی ہی جی میں خوش ہوئی کہ اب میناں میرے پھندے سے کہاں نکل سکتی ہے ۔ مکاری سے کہنے لگی ۔ اے میناں میں تیری یہ کیسی صورت دیکھ رہی ہوں ۔ لٹیں چھوٹی ہوئی ہیں ۔ بال بکھرے ہوئے ہیں ۔ کپڑے میلے کچیلے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے تو نے جوگ سادھ رکھا ہے ۔ نہ سر میں سیندور نہ مانگ میں کاجل عیش و آرام کو تیاگ دے دیا ہے ۔ سادھن کہتے ہیں کہ جس کے دل میں سات خانے ہوتے ہیں وہ اوپر سے تو

پریم جتاتا ہے' منہ سے روتی صورت بناتا ہے۔ ایسے گرہن کے گنٹیوں سے اپنے کو سنبھال چاہیئے۔

(۵۸) پتا مورا نو کا ہتن راجا | پتا راج مورے کونی کا جا
بیہڈہ دُکھ موہ پڑیو تو آئے | اس دُکھ پڑو سوت کنہ جائے
بھری کی دہیہ چاند گنواری | لیگئی سیندور مور اُتاری
کا کہنہ مالن کروں سنگارا | موہ پرییتم کو کمنت پیارا
پیرن کری مورجس کینھاں | باری ہیں موہ دُکھ دینھاں

بھری کی بھاگ دن اوچھی سیت ہو بیری ہوئے
کرہ جو بانکی دیو دھرے مالن ایسا کرے نکوئے
تا سئوں کیجئی نیہہ جا سوں جگ بھر رہے
تا سون کون سینہہ توٹے کا پچیں سوت جیون

میناں کہتی ہے۔ میرے باپ تو ایسے راجا نہیں جو کسی کا کہنا نہیں مانتے۔ (اس لئے اگر میں چاہوں تو وہ کوئی اقدام کر سکتے ہیں) لیکن مجھے ان کے راج کاج سے کیا سروکار ہے۔ مجھے تو جو دُکھ جھیلنا ہے وہ میرے خاوند سے فراق کا دُکھ ہے۔ یہ دُکھ میری سوت پر مسلط ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ گوالے کے سردار کی لڑکی چاندا گوالن (یا گنوار) میرا سیندور اتار کر لے گئی۔ اب میں کس کے لئے سنگار کروں۔ مجھے چھوڑ کر میرا جیتا چلا گیا۔ اور اسی کم عمری میں مجھے اُس نے ایسا دُکھ پہنچایا۔ میری قسمت پلٹ گئی بُرے دن آگئے۔ دوست دشمن ہو گئے۔ جب مندر اور دیوتا ہی منحرف ہو جائیں تو اسے مالن کوئی کیا کرے۔ سادھو کہتے ہیں کہ دوستی ایسی کرنی چاہیئے جو دونوں جہان میں نبھائی جا سکے جس کا پریم کچے دھاگے جیسا ہو' ٹوٹ جاتا ہے تو ایسی محبت کیوں کوئی کرے۔

(۶۱) دوتی بچن کہت گھبری | کپٹ روپ رودن آنسری
تو دُکھ دیکھ مرت ہوں میناں | نیسیں آگ جرہوں تو دہ نیناں
رُت اساڑھ پرکھا پیارو | سبھ کاہوں گھر بار سنبھارو
دیپ گئے بیسی آون ہارا | اندھیر کتھوں نہ دیکھوں بارا

جہ گھر کنت تی کرہ بیراسو   سو نہ چھاڈ نہ بیسہ کرپاسو

تور دکھو سنت مرت ہوں بول چھاڈدی موہ

جس مالت کر یہو نرا چوکن مردوں توہ

جنھ ست اوپر چاد سینہہ است نہ رچئ

بکئ پڑو جائی تو جاؤ سادھن ست نہ چھاڈیئ

میناں نے جب یہ بات کہی تو گویا کٹنی کی ہکی بکی بند ہوگئی۔ مگر اس مکارہ نے چھل کپٹ سے پھر کام لیا۔ رونی صورت بنائی۔ آنسو گرائے کہنے لگی۔ تیرا دکھ دیکھ کر اے میناں میں مری جا رہی ہوں۔ تیرے غم میں جل رہی ہوں، دل کی آگ آنکھوں سے نکل رہی ہے۔ دیکھ تو یہ اساڑھ کا موسم ہے برسات شروع ہوگئی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو درست کر رہے ہیں۔ جو پردیس گئے تھے وہ بھی واپس آرہے ہیں لیکن تیرے بارے میں تو چاروں طرف اندھیرا ہی دکھائی پڑتا ہے۔ تیرا محبوب تو کہیں نظر نہیں آتا۔ جس کے گھر کا مالک موجود ہے وہ عورت عیش کرتی ہے۔ اپنے خاوند کو اپنے سے جدا نہیں ہونے دیتی تیری دردناک کہانی سن کر میں مری جا رہی ہوں۔ تو اپنے خاوند کا موہ چھوڑ دے۔ اگر تو کہے تو جیسے مالتی کے پھول پر بھونرا منڈلاتا ہے، میں تجھے بھی ایک بھونرے سے ملا دوں۔

بارہ ماسہ کا دوسرا بند یہ ہے :۔

(۷) دوتی دوت بچن جیوں کھا	مینن دھائی اوکر کھو چھا
ردکھی نیناں نکھی بیناں	بولی ستی مہاست میناں
لاج کان توہ کھت شائے	اس اوکھر تیں بولس دھائے
چار دن نار تاہ کرھیا	ایک چھاڈ جین دوسر کیا
ایک ایک گرت جی دیوں	جگ دوسرا کرنا ہوں نہ لیئوں

مور بھنور سن مالن روپ کی ہو جبئ کوئی

ات ری شیام گو بریرا بھنور کے سر بر ہوی

مار اکیلی سیج ساون برسے گھناں

پانی ھوئی گریج ساجن رسیا باہرے

دلّالہ نے جب اس کٹناپن کی باتیں کہیں تو میناں کو غصہ آیا - دوڑ کر اس کے چہرہ پر قہر آلود نگاہ ڈالی - آنکھیں چڑھا کر آواز بلند کر کے مہاستی میناں بولی - تجھے کچھ لاج ، شرم اور لحاظ نہ آیا - ایسی باتیں تیری زبان سے کیونکر نکلیں - میں تو ایسی عورت کا دل جلا ڈالوں جو ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف رجوع کرے - میں تو ایک ہی کی رٹ لگا کر اپنی جان دے دوں گی اور اس دنیا میں کسی دوسرے کا نام نہ لوں گی - میرے بھونرے کی شکل و صورت قابل پوجنے کے ہے - کالا گبرو میرے ساونرے سلونے شیام کی برابری کر سکتا ہے ؟ ساون کی رت ہے - پانی برس رہا ہے - عورت کی سیج خالی ہے - ساجن کہتے ہیں کہ اس کا خاوند باہر ہے اس لئے اس کا کلیجہ پانی ہو رہا ہے -

(۸) ساون میناں آئی تلانان گھر گھر سکھی ہنڈولا تانان
دھر پر بھئی کسنبئی رتناری نانہ سر کھیے کھلے دتماری
کنت سہاگن جھولہ بارا گاو نہ گیت اُوٹھے جھنکارا
اور نہ دکھ تہ نہ سکھ رین دھیلی جھر جھر مرہوں سیج اکیلی
ساون گنگ بھئے مو نیناں تور دکھ دیکھ مروں ہیں میناں

جو بن جات نجانب گئی بار پچھتاب
آں بھنور تو وہ مردون لی نہ جگت کچھ جاپ
یہ جگ جیس سینہہ سوجانی جہ دوئی رچا
کپٹ روپ سبھ کہیہ ساجن دوش نہ لاگئی

مالن کہہ رہی ہے میناں ساون آگیا - سب سکھیوں نے گھر گھر ہنڈولا ڈال دیا - زمین ہری بھری سرسبز و شاداب ہو گئی - لال کوسنبھی ساڑی ساری زمین نے پہن لی - سہاگن عورتیں جھولا جھولتی ہیں - ان کے گیت کی جھنکار اُٹھ رہی ہے - انھیں نہ دکھ ہے نہ تجھے سکھ - تو تو دن رات اکیلی سیج پر سوکھ کر مر رہی ہے - تیرا دکھ دیکھ کر میں تو مری جا رہی ہوں اور میری آنکھیں ساون بھادوں کی گنگا بہا رہی ہیں - یہ جوبن یا جوانی کی خوب صورتی کب چلی جائے پتہ نہیں - چلے جانے پر پچھتاوا تو بہت ہوگا - اس لئے میں چاہتی

ہوں کہ تجھے ایک بھونرے سے ملا دوں ۔ اس دنیا سے اور تو کچھ لے جانا نہیں ۔ یہاں کے پریم کو تو کچھ وہی جانتا ہے جس نے دونوں کو بنایا ہے ۔ سادھن کہتے ہیں کہ یہ عورت چھل سے یہ سب کہہ رہی ہے ۔ اس پر الزام کیوں لگایا جائے ۔ یہ تو اس کا کام ' اس کا پیشہ ہی ہے ۔

(۹) سن مالن ساون تہ بھاوے   جاکر پیہہ پردیسی آوے
بھوگ بھگت سبہ دھریو تائے   موہ دیکھیں سنسار اُجاڑے
رت (رتو) مانوں چولورک آوے   تا تنتر میناں موئیں گنواوے
تین پاپن موہ پاپ سناوس   یہ باتن بیتن او کھر پاوس
موری پتا باپ او بھائی   سُن پاؤ نہ تو مارا ڈائی

مالن بچن سنہ تمھ جنم کی نت نت جات
کانچیں دودھ بنا سپتی جائی پرنتر پھاٹ
بھادوں گھیر گمبھیر نیئن گنگ کو سنہہ جہری
کیوں کر پاؤں تیر سادھن کہیوں ہار پن

میناں نے جواب دیا اے مالن سُن ساون کا مہینہ تو اسے بھائے جس کا محبوب پردیس سے لوٹ آئے ۔ میں نے تو سب عیش و آرام کے سامان الگ کر دیئے ہیں ۔ میرے لئے تو یہ دنیا اُجاڑ ہو گئی ہے ۔ میں تو موسمی کیفیتوں سے تب ہی دل بہلاؤں گی جب میرا خاوند لورک میرے پاس واپس آ جائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنی جان دے دوں گی ۔ تو پاپن ہے جو مجھے پاپ کی باتیں سنا رہی ہے ۔ کیا تو ان باتوں سے اپنا موقع نکال سکتی ہے ۔ اگر میرے باپ اور بھائی سن پائیں تو تجھے مارے بغیر نہیں رہیں گے ۔ مالن سُن ! کیا جنم بار بار ہوتا ہے ۔ کچے دودھ کی طرح جو آخر میں پھٹ جاتا ہے جسم بھی برباد ہو جاتا ہے ۔ یعنی سچا پریم نہ رہنے سے زندگی ناس ہو جاتی ہے ۔ سادھن کہتے ہیں کہ بھادوں کا مہینہ گہرا اور گمبھیر ہوتا جا رہا ہے ۔ آنکھیں میناں کی پریم سے بھری ہوئی ہیں ۔ بغیر اچھی کشتی کے اس کو کنارہ کیونکر مل سکے گا ۔

---

[۲]

گذشتہ اشاعت میں ساد حسن کے میناست کے ۹ بند منیر شریف کے نسخے سے نذر قارئین کئے جا چکے ہیں۔ بقیہ ۱۳ بند کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مختصر نظم کے اور اجزا جو ۲ بند پر مشتمل ہیں ہندی کے نسخوں سے لے کر درج کر دیئے جائیں تاکہ مکمل تصویر نظر کے سامنے آجائے۔ اس کے بعد فارسی اور ہندی خطوں کے نسخوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی طرف بھی توجہ دلانی ضروری ہے۔ فارسی رسم الخط میں جہاں تک سنسکرتی اور پراکرتی الفاظ کی صحیح ادائیگی کا تعلق ہے کچھ کمزوریاں ہیں۔ اعراب تو کاتب نے دیئے ہیں لیکن بعض جگہ نہیں پائے جاتے۔ کسی جگہ کچھ زائد لفظوں کی وجہ سے بھی دقت محسوس ہوتی ہے۔ باوجود ان باتوں کے راقم السطور کا خیال ہے کہ بہ حیثیت مجموعی منیر شریف کا تنہا فارسی نسخہ شاعر کی زبان اور اس کے عہد کی بول چال کی بہ نسبت ہندی عبارت کی زیادہ صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اب رہا الفاظ اور اشعار کی تبدیلی کا سوال اور دو ہوں اور سور مٹوں کے اختلافات۔ تو ہو سکتا ہے کہ اس میں پنڈتوں کا تصرف اور عبارت کو چست اور شُدھ کرنے کا جذبہ شامل اور داخل ہو مگر اس امر کے متعلق ہندی زبان کے عالم اور لسانیات کے ماہر ہی کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ بہر کیف منیر شریف کے نسخے میں بقیہ بندوں کے اشعار جس طرح درج ہیں وہ پیش کئے جاتے ہیں۔

---

[۱] معاصر۔ حصہ ۱۷

(۱۰) بھادوں میناں گھٹا جھکورا — اونچ کھال بھر بیٹر ہلورا
گھن گرجے برسے اتوانی — کانپ کریج لوہو ہوی پانی
سراسیت بھین بادر لاگے — دیکھ پھانت ہیں پور کہہ تھاگے
دادر پیہا کہکنہہ مورا — سونی سیج ہیہ پھاٹے تورا
سنگھی سہیلی رس من بھادا — کیوٗ رہن کیوٗ رووئی پرادا

جوبن کاہیں نہ بھوگس الپ ٹیس سکھ چھانہ
کیتی بھنور جلیت ہیں کنول پھول درمانہ
جوبن دیوکوں بھائی پی بھیسر پریت نہ چھوڑیئے
سوکوں نکھرہ کنسلائی ہوتے جوبن پریت بن

مالن کہتی ہے کہ اے میناں بھادوں میں بادل چھایا ہوا ہے۔ اونچی نیچی زمین پانی سے بھرگئی ہے۔ بادل گرجتا ہے۔ موسلا دھار پانی برس رہا ہے۔ سردی سے کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔ خون پانی ہو رہا ہے۔ بادل تالاب اور کالی زمین کو جھک کر چومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ طاقت جواب دینے لگتی ہے۔ مینڈک پپیہے اور مور اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔ تیری سیج سونی ہے۔ تیرا کلیجہ تو اور بھی شق ہوتا ہوگا۔ نہ کوئی سہیلی ہے نہ ساتھی جو من کو بہلا دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چاہے اپنا ہو چاہے پرایا رو رہا ہے۔ کیوں اس جوانی میں تو عیش کے مزے نہیں لوٹتی اور سکھ کو تیاگ دے رکھا ہے۔ کنول کے پھول کے قلب میں نہ معلوم کتنے بھونرے بھوگ بلاس (عیش) کر رہے ہیں۔ تو اپنے حسن وشباب کو غارت کر رہی ہے۔ اپنے محبوب کے عشق کو نہیں چھوڑتی۔ بغیر پریم کے چہرے مرجھا جاتے ہیں اور حسن وجوانی برباد ہو جاتی ہے۔

(۱۱) یہ سن میناں اٹھی رسائی — اب او کھرتوہ بولوں دہائی
تہ گہنہ جیں امرتی کھائی — جاکی پاپ سنا دس آئی
جوری مورا سوی تمنہ نہ آوا — تہ نت کو آپنہہ ڈھنکاوا
وہ گت جائے نہ باندہے تہتھی — تہ جوبن سوکون پہ ریتی

تل یک سکھ جنم کر پاپو تہ نت کون بٹھارے آپو

جو جر گئے جس اوبڑی دھائی پاپ تس آہ

سورس ہوئی لورسوں اتر دیپ تب کاہ

سُن شار دوھر بان برہن برہ جوگنا اس

ین ارجن کی بان من سنبہ سر چوکے نہیں

یہ سن کر میناں برافروختہ ہوئی۔ کہا۔ سن دائی اب تو کچھ نہ بول۔ اس تہمیل نے جس کی بات تو سنانے آئی ہے کیا آب حیات پی رکھا ہے (امرتی کا پھل کھایا ہے؟) جو مرجاتا ہے وہ پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ ایسی جوانی سے کوئی کیوں موہ کرے جو آدمی کو گھمنڈ میں باندھ دیتی ہے۔ جو اس دنیاوی عیش و آرام کو تل بھر کے لئے حاصل کرتا ہے اس کے عوض وہ جنم بھر کا پاپ مول لیتا ہے ایسے پاپ سے کوئی کیوں اپنے کو داغدار کرے۔ اگر میں ایسے پاپ سے جو جلا دیتے ہیں بچ بھی جاؤں اور میرا محبوب لورک آگیا تو میں اسے کیا جواب دوں گی؟ سردکال کے ماہتاب سے برہنی یعنی فراق زدہ عورت کا درد و الم جوگنا ہو جاتا ہے۔ جس طرح ارجن کے بان تیکھے ہوتے ہیں اور کام دیو کے بان اچوک ہوتے ہیں۔ اسی طرح سردکال کے چندر بان سے بھی چھٹکارا نہیں ملتا۔

(۱۲) سن میاں اب جیٹھ ہا کنوار و جنی تاگ سبھ گوندنہ ہارو

اومیچ ساد گنیاں گت ہوئے بیسھ بھوگ بن رہے ناکوئے

جو نہ وہ دہ اوئی بھورراری تروتی کھیلنہ پرم وہاری

تین آپ ہو کاھے اوڈ پرس مور بول کا ھنیں تین چیلس

دھن جوبن جین ہونت کہاوا کئی بار پاجہیں پچھتاوا

سوت کیہس تہ اوپر تورین گھنت نہ کان

تہ نت کا تیں جھوروس کا نہیں ہوس ایان

جہ راتا موہ بیوہ ہون چیری تہ سوت کے

ورتی واروں جیو سادھن ہنس کے راکھئین

مالن کہتی ہے کہ میناں سُن اب کنوار کا مہینہ آ گیا۔ ساری عورتیں تاگے سے ہار گوندھ رہی ہیں۔ جب خواہش بیدار ہو جاتی ہے تو ایک کمزور لڑکی کا کیا حال ہوگا۔ عشق محبوب کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ دھدکتی جھپاتی جب پھیل جاتی ہے تو عورتیں دہمار کھیلنے لگتی ہیں۔ تو کیوں خود کو اس طرح بے قدر کر رہی ہے؟ دن گذر رہے ہیں تو پچھتاوا ہی ہوگا۔ تجھ پر جس نے ایک سَوت مسلط کر رکھا ہے اور جسے تیری عزت کا کچھ بھی خیال نہیں آیا اس کے لئے تو کیوں اپنے حسن و جوانی کو برباد کر رہی ہے؟ یہ کیسی نادانی ہے؟ میناں جواب دیتی ہے کہ میرا محبوب جسے چاہتا ہے، جس سے اس کو لگا ہو گیا ہے میں اس سوت کی باندی بننے کے لئے تیار ہوں۔ میں اس پر واری جاؤں۔ اپنے کو اس پر قربان کر دوں۔ سادھن کہتے ہیں کہ ہنسی خوشی سوت کو بھی برداشت کر لینا چاہئے۔

(۱۳) سن مالن کنوار کن آوی — لورک بن موہ جگت نہ بھاوی
ہوی کنیاں گت پر بہ دیواری — مو لیکھیں سنسار اُجاڑی
بھوگ بھگت کے نیر نجاؤں — سیت گھام کی ڈر نہ ڈیراؤں
مانی رُت جا کر پیو پاسا — موہ بھوگ نس دیوس اُداسا
کروت سیس دِیُٔ جو لورا — تبھوں رنگ نہ ڈولے مورا

یہ جوبن لورک بناں جار کروں میں چھار
پریت جائی اِنہ باتن سرگ ہوی تکہ کار
دیجئی جاتہ او تہائی کھا جبئی تہ جبئی بیلسئی
لیوگیو مونڈ چڑھائی سادھن کرہن سچ موئی

میناں نے اپنی بات جاری رکھی۔ کہا۔ مالن سُن۔ کنوار کا مہینہ آیا تو مجھے کیا، لورک کے بغیر مجھے کچھ نہیں بھاتا۔ کناگت یا پتر پکش جو بدی آسن یعنی کنوار کے نصف آخر میں منایا جاتا ہے اور دیوالی کا پرب جس میں دیئے جلائے جاتے ہیں میرے لئے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ میرے لئے تو جہان اُجاڑ ہے۔ میں عیش و آرام کے پاس تک نہ پھٹکوں گی۔ سردی گرمی کا مجھے کچھ ڈر نہیں ہے۔ جس کا محبوب اُس کے پاس ہے وہی تو موسمی کیفیتوں سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔ مجھے تو رات دن

فراق نے اداس اور غم زدہ کر رکھا ہے۔ اگر لورک میرے سر پر آرا بھی چلوا دے تو میرے بدن میں جنبش تک نہ ہوگی۔ لورک کے بغیر میں اپنی جوانی اور حُسن کو جلا کر خاکستر کر دوں گی۔ ایسی باتوں سے (جو تو کہہ رہی ہے) پریم نشٹ ہو جاتا ہے اور بہشت میں جانے پر بھی من کی کالکھ نہیں چھوٹتی۔ کہتے ہیں کہ کھاؤ پیو عیش کرو۔ سادھو کہتے ہیں کہ جو لوگ جوڑ توڑ کر دھن جمع کرتے ہیں وہ سر پر لاد کر تو اسے نہیں لے جاتے۔۔ بخیل بھی آخر موت کا شکار بن جاتے ہیں۔

(۱۴) اوتم کاتک پرب دیواری | سبہ کو ڈکھیلے پرم وہماری
جگ جوبن بہو گورے سنسارو | توکہنہ میناں بہت بیچارو
باںبھن چھتری بیسین ناری | برمین بتین سونگ سونادی
مانہ پرب جھنپسو جاتی | تین پٹی بہنیں مانگ کے تاتی
تو دیکھت آور لیگیو | چھاوس تو وہ نہ آیئن بھیو

جوبن کا ھیں نہ بھوکوں کا کھو دس وہ لاگ
ٹہرین سندھ ھیر بھاڑ جب جب دکھیوہ جاگ
جو راتا جنہ پاس سوجن تا کنی من بسے
تا تر کے کر آس لی دھن جو بن پانھنان

مالن کہتی ہے کہ اس بڑے کاتک کے مہینے میں جب دیوالی کا پرب منایا جا رہا ہے اور سب عورتیں پریم کا دھمال کھیل رہی ہیں۔ سارے جہاں کے لوگ اپنے حسن و جوانی کا لطف حاصل کر رہے ہیں۔ اس وقت بھی تو اے میناں تفکر اور بچار میں غلطاں ہے۔ براہمن چھتری ویش جینی بازی سنارن تمام یا مشغلہ غرض کہ جھنپسو جاتی کے لوگ پرب منا رہے ہیں۔ لیکن ایک تو ہے کہ تیرا سہاگ تپ رہا ہے۔ تیرے دیکھتے دیکھتے وہ کسی دوسرے کو لے کر چل دیا۔ تجھے چھوڑ دیا۔ تیرا اپنا نہیں ہوا۔ اپنی جوانی کا لطف کیوں نہیں لیتی۔ مزہ کیوں نہیں لوٹتی ہو کس کے لئے تو اپنی جوانی برباد کر رہی ہے۔ سارس کی آواز سن کر جب میں چونک اٹھتی ہوں اور تجھ پر نظر پڑتی ہے تو میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ جو جس کو چاہتا ہے اس کے پاس رہتا ہے۔ اس کے دل میں اس کا عشق سرایت کر جاتا ہے۔ تو کس کی اُمید پر اپنے

دھن اور جوبن کو مہمان بنا کر بیٹھی ہوئی ہے۔

(۱۵) کاکر کاتک پرب دیواری — جھوٹہ بات کا کھس گنواری
پر بہ بار دن مانے سوئی — جہ سر پر مالن جہئی ہوئی
جی میرا مور چاندلے دھرھین — بن جی دھر مانٹی میں پر ھین
مانٹی لاگ جیون آپ بنارو — دوؤ جگ دھرم پر نشٹ ھارو
رُت اور پرب لور سنگ ماناں — پیہہ بن جگت دُھند کی جاناں

رنگ بھوگ کی پر تھیں تل یک کرے نتھائے
جگ جگ جھوٹی پاتکہ تنہہ نت تس کو جائے
گیا بتاروں کوئی جگ رانا بیری گھنساں
چرت کھیلا دی سوی تبھوٹی تبھوٹن بیلئی

میناں نے جواب دیا — میں اس کاتک اور دیوالی کے پرب کو لے کر کیا کروں؟ تو تو گنواری ہے جھوٹی باتیں کیوں بناتی ہے۔ پرب کے دن تو وہی مناتا ہے جس کے جسم میں جان ہو۔ میری جان یا روح تو چاندا لے گئی۔ بغیر روح کے جسم یا دھڑ مٹی میں پڑ جاتا ہے۔ اگر میں اس مٹی کے جسم کے لئے اپنے کو غارت کر دوں تو دونوں سنسار میں میرا دھرم نشٹ ہو جائے گا۔ ریت اور پرب تو میں لورک کے ساتھ ہی مناؤں گی۔ اپنے محبوب کے بغیر میرے لیے سب کچھ دھند یا دھوکا ہے۔ عیش و عشرت سے تن کی خواہشات محض ایک تل یا لمحہ کے لئے پوری ہو سکتی ہیں۔ اس کے لئے جگ جگ کا جھوٹھا الزام (گناہ) کیوں کوئی خود پر عائد کرے۔ دنیاوی باتوں میں جو آلودہ رہتا ہے وہ اپنے جسم کو برباد کر دیتا ہے۔ یاد رکھو جو اپنے چال چلن سے کھلواڑ کرتا ہے وہ جھوٹ اور فریب کا شکار ہوتا ہے۔

(۱۶) مانٹی مانٹی کہا بکھانس — مانٹی بھید نہ میناں جانس
مانٹی ماہ ڈشٹ بدھ کھیلا — پرم انس مانٹی منہ میلا
سو برن بھول جو مانٹی بھولے — مانٹی دیکھ جو مانٹی بھولے

ماٹی بھوگوے ماٹی کھائے ۔۔۔ ماٹیہ اوہ بھی رنگ سو آئے
ماٹی برلا بوجھے کوئی ۔۔۔ ہنس کھیل پُن ماٹی ہوئی

کا نچ سوت جس توٹے تس ٹھس کا پو لور
اگھن جھیل بیرا سہو کھا سو نہ جوں مور
جوں جی جائی تو جاؤ ساڈھن ست نہ تیاڈئی
پاپہ دیہہ بہائی ست کے کرنی آگری

کلٹی کہتی ہے اے میناں مٹی مٹی کی تو نے کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ مٹی کے بھید کو تو کچھ جانتی بھی ہے۔ مٹی ہی میں تو بدھاتا (خدا) نے قوت باصرہ رکھی ہے۔ اسی مٹی میں تو اس نے آتما (روح) کو داخل کر دیا ہے۔ مٹی کا جسم سونے کا پھول پھولتا ہے۔ یعنی اس میں روح بستی ہے۔ مٹی ہی سے عیش و عشرت کی خواہشات کی تخلیق ہوتی ہے۔ مٹی کے بھید کو شاید ہی کوئی کما حقہ جانتا ہے۔ ہنسی کھیل سب مٹی ہو جاتا ہے۔ جس طرح کچا سوت آسانی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح لورک کی تجھ سے پریت بھی ٹوٹ گئی ہے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کہ کسی بانکے چھیلے سے ملاپ کر لے۔ اس کے ساتھ بھوگ بلاس کر۔ میرا کہنا مان لے۔ اگھن کا مہینہ اس کے لئے بہت موافق ہے۔ سادھن کہتے ہیں کہ اگر جان بھی جائے تو راہِ حق کو نہ چھوڑو۔ ست یعنی حق و راستی کا فعل جسم کے پاپ کو بہا دیتا ہے۔ خرابیوں کو دور کر دیتا ہے۔

(۱۷) جوں مالن لورہ اس بھاوا ۔۔۔ نان موہ روئین نہ پہ بھس آوا
جاسوں میں اپن جی ہارا ۔۔۔ کون مانگوں جون سو جی مادا
راج دیئی تو کون بڑائی ۔۔۔ بھیکھ منگاوی کا گھٹ جائی
یہ در جون ست چھاڈ پرائی ۔۔۔ تا کر پاپ گرہ کا آئی
بچن تمھاری دھرم سنادوں ۔۔۔ پُن کا لورہ کہو ڈرسادوں

جبرت اگھن میں مالن جی راد دھربون جھائی
اگھن جھیل بیرا سہو موری نہت نہ جائی

سنورہ سیپنس سیج الوں بھانت سنواری
جاؤں سپھاٹ کریج سادھن سائیں باھرے

میناں نے جواب دیا اے مالن سُن لورک کو اگر یہی بات بھاتی ہے تو میں کیا کروں؟ مجھے تو سنوروتے بنتا ہے نہ ہنستے۔ جسے میں اپنا دل دے چکی ہوں اگر وہ غضب میں آکر میری جان ہی لے لے تو کیا بُرا ہے۔ اگر وہ راج پاٹ دے دے تو اس میں کیا بُرائی ہے۔ اگر وہ مجھ سے بھیک ہی منگوا دے تو اس سے کیا گھٹ جائے گا۔ اگر اس ڈر سے کوئی اپنا ست چھوڑ کر بھاگ جائے تو اس کا پاپ، اس کی کرنی اس کے آگے آئے گی۔ ارے مالن میں تو اپنے دل کو جلتی آگ میں ٹھنڈا کر رکھا ہے۔ اس اگہن میں میری جگہ تو ہی اس چھیل سے بھوگ بلاس کر لے۔ سادھن کہتے ہیں کہ اگر خواب میں بھی اپنے سانولے سلونے محبوب کے لئے سیج سنواری جائے تو چوں کہ سوامی (خاوند) باہر ہے جاڑے سے کلیجہ کانپ اُٹھے گا۔

(۱۹) میناں پوس مانس دیکھو آوا — جاڑ پون ہنسار جناوا
لپنس کے پون تہاں جبھی اپارا — ھاڑہ نہ رہا ڈول تن ہارا
کہب تمہار نہ بھاپہ میناں — اکہیں بول تیں سن مورمیناں
رہس اکیلی جاڑ نہ جائے — من کو مدن سنتاوے آئے
روئیں ادھر نیر جبرے نیناں — اینہیں بول مور مانہ میناں

نوں نیہہ نت بیر سبھہ کامن چہ سنسار
آچھہ رسیا میر وتوں راکھ بول ہمار
جھو ٹھا نیہہ نہ کبھی جگ رانا بیری گھنساں
سادھن سیس کے راکھئے جاسوں پڑی سینہہ کا

کٹنی کہتی ہے کہ میناں اب پوس کا مہینہ آگیا۔ جاڑے کی ہوا بہہ رہی ہے۔ رات کی ہوا جب زور سے چلتی ہے تو بدن کانپ اُٹھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدن کی ہڈیاں ڈول رہی ہیں تیری باتیں ایسی ہیں جو جنچتی نہیں۔ تو کیوں ایسا بولتی ہے۔ میری بات سُن۔ اکیلے میں جاڑا نہیں جاتا۔

عشق کا دیوتا کامدیو تو ایسی ہی حالت میں بے چینی پیدا کرنے کے لئے آجاتا ہے۔ تیرے منہ پہ رونی صورت ہو رہے ہیں۔ آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہتے ہیں۔ اے میناں میری بات سن لے۔ عشق و محبت کی دنیا میں کامنی عورتیں جس پریم کی متلاشی رہتی ہیں تو بھی اس کی جوہ کر۔ میں آج ہی تجھے ایک عاشق سے ملا دیتی ہوں۔ میری بات رکھ لے۔ سادھن کہتے ہیں کہ دنیا میں جھوٹا پریم کرنے والے دشمن ہوتے ہیں۔ جھوٹا پریم نہ کرو اور فی الحقیقت جس سے سچا پریم ہے اس کے سامنے سر جھکا دو۔

(۱۹) سن رتناں تیں مالن دھائی — مُٹھ بھورو جو بھنور بھئی جائی
پوس مانس کا کرہی مورا — جیا بجھر کے جی لے گیا لورا
لورک برہ توئی مور انگا — سورج سینہہ بجھر ہیں مانگا
برہ جیبیل جیہ سیجہ ہوئے — تاکی بار نہ چاہے کوئے
بھوگ بھگت موہ کچھ نہ بھاوے — جولہ لور نہ ہم گھر آوے

برہ تسار سیج دکھ میناں کڑو وا اھے سنتاپ
پانچ بھوت کی حتھیا اہو جاکس پاپ
سمند کہئی پوڑا جائے پون کہئی باندھا تھر رہے
سادھن کیہو سوکتائی ناگہ اکیلی پیو رہے

میناں کہتی ہے اے رتنا مالن سن تو اس کو بھلا دے میں ڈال جو ندی کے بھنور میں بہ جائے۔ پوس کا مہینہ میرا کیا کرے گا؟ میرے بدن کو جھلنی بنا کر لورک میرا جی لے گیا۔ لورک کی برہ میں میری مانگ تپ رہی ہے تو بھی میں سورج سے اسی کے پریم کی خواستگار رہوں۔ میرے لئے تو میرا برہ ہی میرا شوہر بن گیا ہے۔ میرے دل کے سیج پر جو آپ روپی جھیل براجمان ہے اس کا بال بھی کوئی بیکا نہیں کر سکتا بھوگ بھگت یعنی عیش و عشرت مجھے کچھ نہیں بھاتا۔ جب تک لورک واپس نہیں آتا یہ ہی حال رہے گا جواب میں کٹنی کہتی ہے کہ اے میناں برف پڑ رہی ہے۔ فراق میں تیری سیج دکھ سے بھری ہوئی ہے اور یہ ایسا دکھ ہے جو بہت کڑوا اور آزار دہ ہے۔ تو جو چال چل رہی ہے کیا اس سے پانچوں عناصر کا خون نہیں ہوتا؟ کیا یہ پاپ نہیں ہے؟ سمندر کو کیسے عبور کیا جا سکتا ہے؟ ہوا کو کیسے باندھا جا سکتا

ہے تاکہ ساکن ہو جائے ۔ سادھن کہتے ہیں کہ ماگھ کے مہینے میں معشوق کیسے اکیلی رہ سکتی ہے لیکن جو کیا اسے قائم رکھنا چاہئے ۔ اسے بھگتنا ہی ہوگا ۔

(۲۰) ماگھ تسار کہوں سُن ہیرا ۔۔۔ ہیئیں اکھیتی توسے سریرا
پَون تسار سید کے باجا ۔۔۔ سُر نرمُنی جن دیوتا بھاجا
بھاجے پانچ اندری کی سینیاں ۔۔۔ بھنور لوکانی کانت منہ میناں
میں بن لور بھاج نہ جانوُں ۔۔۔ ماگھ چوُکن لاگی دانوُں
سنور پیتی سیج بچھائی ۔۔۔ پیہہ بن کیسہوں جاڑ نجائی

دو نہ جگ آگ دیوں جہاں نہ بسی جن سور
جھوٹھی بات تیں بہوروس کہا سنوں کا تور
نیہ کا ہی کر پاپ بہیہ کارن سر دیجئی
سادھن کون نتساپ بیرن سوم زاں بھلا

پھر کنئی کہتی ہے کہ ماگھ میں برف پڑنے سے جو پیڑا (اذیت) ہوتی ہے اسے میں جانتی ہوں ۔ تو بھی سن لے ۔ یہ درد دل میں سما جاتا ہے ۔ اس سے بدن جلتا ہے ۔ برفیلی ہوا آواز کرتی ہوئی جب بہتی ہے رشی دیوتا آدمی سب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں (گھبرا جاتے ہیں) اور پانچ اندریوں کی فوج بھی بھاگ نکلتی ہے ۔ اے میناں تیرا بھونرا (خاوند) بھی کہیں بھاگ کر چھپا ہوا ہے ۔ جواب میں میناں کہتی ہے میں لورک کے بغیر بھاگنا کیا جانوں ۔ ماگھ روپی دانو (کشش) چوکوئے زور سے چمٹ جاتا ہے ۔ میں نے تو اپنے جھیتے کے لئے سفید چادر کی سیج بچھا رکھی ہے ۔ عاشق کے بغیر جاڑا تو نہیں جاتا لیکن میں دونوں جہان میں آگ لگا دوں گی ۔ تیرا کہنا کیسے سنوں ۔ تو تو مجھے جھبو ٹھی باتوں سے بہلانے میں ڈالنا چاہتی ہے ۔ مالن کہتی ہے کہ یہ پاپ کیوں کر رہی ہے ۔ اپنے پیا کے لئے اپنا سر دے رہی ہے ۔ سادھن کہتے ہیں کہ اگر کوئی بیرن (دشمن) شرارت پر کمربستہ ہو تو مرنا ہی بہتر ہے ۔

(۲۱) دھر منہ پان کرا ھوں چاؤ ۔۔۔ پاپ کے پتہ دھردں نہ پاؤ

کا کرو دھرم باپ کہ کیڑا   لور پنہتہ مکتاوی بیرا
اوہی پران اوہی جیون مورا   کیا سوں بن کو نکھد لورا
کی ہر جاؤوں گی لاگوں تیرا   ہہٹ جاؤں ماجھ میں میرا
جہ تن آگ برہ جھکجھورے   تہواں سیت کہواں جورے

تل یک پر تھمین جانہ جار کے کرو سنبھار
با چھیں تو پچھتائے جھو ٹھا یہ سنسار
جو بن آیو بار سادھن سات نہ کر سکے
اُتر گئے تھے پار سر دہنوں جورے نہیں

میناں کہتی ہے کہ دھرم کے مطابق چلنے کی مجھے چاؤ ہے۔ باپ کے راستے پر ہر گز قدم نہ رکھوں گی۔ دھرم اور باپ تو الگ رہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ لورک ہی میرا بیڑا پار کرے گا۔ وہی میرا تن ہے، میری جان ہے۔ بغیر لورک کے کہو میں کیا کر سکتی ہوں۔ خواہ میں بہہ جاؤں، خواہ پار لگوں، خواہ بہتے بہتے کنارے پہنچ جاؤں۔ جس کے بدن کو برہ کی آگ جھکجھورتی ہے، جہاں عشق کا بخار چڑھا ہوتا ہے وہاں ٹھنڈک کا کیا گذر؟ اس ساری دنیا کو تل برابر سمجھو اور اس جاڑے میں اپنے کو سنبھالو ورنہ پچھتانا پڑے گا۔ سادھن کہتے ہیں کہ یہ سارا سنسار جھوٹا ہے۔ جو بن آنے پر جب اس کا سنبھار نہ ہو سکے تو جان لو کہ آب، اُتر جانے کے بعد سر قلم کرانے پر بھی نہیں لوٹتی۔

(۲۲)   کیپا گن مدن نہ مانے کہا   او چھرے برہ یون تن دہا
برہ آگ تن تل نہ بجھائے   کا ہیک باپ سادس دہائے
جبہ گھرنا نہ سونار اسولی   تیئی کہسلنہ نت مجاگن ھولی
کمکم کیسر بلیسی بارا   چھونہ رس دیکھنہ سبھو رتنارا
نا پنچے برہ یون کر ماناں   بن تجبیتی بھوگی نکر باناں

رُت کھیلے بہہ بلیئے پرم انگ نہ سمائے
تنہوں سمجھو نہ دکھیو رسیا دیوہ بیرائے

ساوَھن بِنڈ بھیو بسنت برھن برہ چوُ ڈ گناں
پر ناری لُبدھا کنت سو تہہ کر یہ کیسے جئے

مالن کہتی ہے پھاگن میں مدن یعنی کام دیو کہنا نہیں مانتا اور برہ اُچھلنے لگتا ہے۔ ہوا بدن کو جلائے دیتی ہے۔ فراق کی آگ اگر تن میں لگ گئی تو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بجھتی۔ تو اپنی دودھ پلائی دائی کو پاپ کا الزام کیوں دیتی ہے۔ جس کے گھر میں شوہر موجود ہے اس ناری کا بہت مول (قدر) ہوتا ہے۔ وہ پھاگن میں روز ہی ہولی کھیلتی ہے۔ کم کم زعفران بدن پر ملتی ہے۔ اسے چاروں طرف سب لال ہی لال دکھائی دیتا ہے۔ (خوش وخرم رہتی ہے) ہوا کی طرح برہ مچلتا ہے۔ جنگل کے ہرے درخت پتوں کے جھڑ جانے سے کھاکھنڈ ہو جاتے ہیں۔ ایسی رُت میں شوہر دار عورت ہنستی ہے، کھیلتی ہے، موج اُڑاتی ہے۔ پریم عضو عضو سے پھوٹا پڑتا ہے۔ یہ سب دیکھ کر بھی کچھ نہیں سمجھتی۔ میں تجھے تیرے عاشق سے ملا دوں گی۔ ساوھن کہتے ہیں بسنت کے دن آ گئے۔ فراق زدوں کے لئے اذیت چوگنا ہو گئی۔ ایسی عورت جس کا شوہر سوت کے موہ مایا میں پھنسا ہو وہ کیسے جی سکے گی۔

اس جگہ منیر شریف کا نسخہ مضمون کو تشنہ چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔ آخری اوراق جن میں تتمہ کے ۶ یا ۷ بند ہونے چاہئیں غائب ہیں۔ جو دھیورا اور درویش پور کے ہندی رسم الخط والے نسخوں میں یہ بند موجود ہیں اور قصہ کا تسلسل تمام رہتا ہے۔ مختصر طور پر قصہ یہ ہے کہ لورک اپنی بیاہتا بی بی میناں کو جو ایک راجہ کی بیٹی اور عصمت مآب عورت ہے، چھوڑ کر ایک دوسری عورت چاندا یا چندا پر فریفتہ ہو کر اس کے ساتھ کہیں دور چلا جاتا ہے۔ بیچاری میناں کس طرح مندر میں اپنے دن بتاتی ہے اور شوہر کی یاد سے دل کو بہلاتی رہتی ہے۔ اس درمیان میں سات نگر کے شیطان سیرت راجکمار نے اسے دیکھ لیا اور اسے اپنے بس میں کرنا چاہا۔ رتنا مالن ایک کٹنی نے انعام کی لالچ میں میناں کو راجکمار سے ملا دینے کا وعدہ کیا۔ بھیس بنا کر میناں کے پاس گئی اور خود کو اس کی دودھ پلائی دائی بتایا۔ میناں نے اس کی بات پر اعتبار کیا۔ اس کی خاطر مدارات کی۔ دلالہ نے پہلے تو میناں کے حسن و جوانی کو سراہا۔ پھر اس کی اُداسی اور عدم زیب و زینت کی وجہ دریافت کی۔ موقع پا کر اس نے میناں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی۔ ہر مہینے کی کیفیتوں پر زور دے کر اس فراق زدہ لیکن عفت شعار ہندوستانی عورت

کو بار بار کسی عاشق سے مل کر عیش و عشرت کی ترغیب دینا شروع کیا۔ اساڑھ سے پھاگن کے مہینے تک جو دونوں میں باتیں ہوا کیں اُن کا ذکر آچکا ہے۔ بقیہ تین مہینوں۔ چیت، بیساکھ، جیٹھ۔ کے متعلق جو ساد حسن نے بند نظم کئے وہ پیش نظر نسخے میں نہیں ہیں۔ لیکن ان میں بھی تقریباً وہی سب باتیں اور وہی انداز گفت وشنید ہے۔ اب ہم ہندی رسم الخط والے نسخوں سے بقیہ احوال حوالۂ قلم کرتے ہیں تاکہ تصویر مکمل صورت میں نظر کے سامنے آجائے۔

(۲۳) پرم دوتی کپٹ تئے کھیلس | نرکہہ کُنڈ آن سو میلس
بنو سہاگ کمس کوہ کوہ انگا | سیندور جھوٹھو نا نہہ بنو منگا
گیت ناد چنچار پچو تار | تنہیں رو چیئے جن پاس پیار
موہی تو پہہ بن جگ اندھیاری | میں کا کھیلاہوں پرب دھماری
کنت سہاگن جھولئے بارا | موھی لورک بن جگ اندھیار را

کنت نیہہ چیت چو بھئو اور نہ من مہہ بھاؤ
تو مہی دن کروں بدھاونا جب لورک گھر آؤ
ساد حسن چڑھا بسنت بیرتین پر مقا چنو گونا
پر ناری اُبدیت کنت جیوں نے مرنا بھلا

میناں نے کہا میں تجھ کو تو بڑی کٹنی ہے۔ کتنا پاکر رہی ہے۔ کپٹ کی باتیں بتاتی ہے اور مجھے نرک کُنڈ میں ڈالن چاہتی ہے۔ بھلا بتا تو بغیر سہاگ کے جسم کی زیب وزیبائش کیسی؟ مانگ میں سیندور کیسا؟ گیت ناد (باجا) چاچر (ایک چوب کے ادگرد جمع ہوکر ہولی منانا) پچو نار (پیار بار ان والا ایک باجا) یہ سب تو اسے اچھے لگیں جس کے پاس اس کا محبوب ہو۔ میرے لئے تو بغیر میرے محبوب کے سارا جگت تاریک ہو رہا ہے۔ میرے لئے پرب دھمار (ایک قسم کا گیت جو ہولی کے موقع پر گایا جاتا ہے) بے معنی ہے۔ سُہاگن عورتیں ہی پرب تیوہار مناتی ہیں، جھولے جھولتی ہیں۔ میرے لئے تو بغیر لورک کے ساری دنیا اندھیر ہے۔ یہ سب چیزیں فضول سی ہوکر رہ گئی ہیں۔ میرے تن من میں تو خاوند کی چاہ بسی ہوئی ہے۔ دوسری کوئی چیز نہیں بھاتی۔ میں تو اسی دن بدھاوا گاؤں گی جس دن لورک میرے

گھر واپس آئے گا ۔ سادھن کہتے ہیں کہ اب بسنت کی رُت آگئی ۔ برہنوں کا برہا چوگنا ہو گیا ۔ کنت یا خاوند دوسری عورت پر فریفتہ ہے ۔ ایسی زندگی سے مرجانا ہی بہتر ہے ۔

(۲۴) چیت راؤ رت آئی تُلانی ۔ رِتو بسنت مدھوکر من مانی
اگر کپور پھول یہ باس ۔ کامنی پھول سیج بھری داس
رادھی پور دکھ سیج چڑھی ناری ۔ مانے پتی سنگ پرم دھماری
چنچل مدن نہ مانے کہا ۔ سنت برہ ناگ ہوئی ڈھا
آئی دیکھوں توھیں پریم پیارا ۔ ایک مانس سوں بول ہمارا

چیت بسنت پریم رِتو میناں مانہوں بھوگ
پر تیھیں جات نہ دیکھی کہا کرت ہیں لوگ
یون جر مُی بیولا کے جیسے دھواں نہ دیکھیئے
جریں کیا کی آگ سادھن ست سوں دیکھیئے

مالن کہتی ہے کہ اب تو چیت کا مہینہ آگیا ۔ اس بسنت رُت میں بھونرے گنگنا رہے ہیں ۔ اگر (عود) کافور اور پھول سب کو اچھے لگنے لگے ۔ عورتوں نے اپنے سیج پر پھول بچھایا ہے ۔ اپنے خاوندوں کے ساتھ خوشیاں منا رہی ہیں ۔ ایسے موسم میں چنچل کام دیوتا مانتا نہیں ۔ برہ یعنی فراق ناگ بن کر تکلیف دے رہا ہے ۔ اگر تو کہے تو میں تیرے لئے ایک تیرا چاہنے والا لادوں ۔ میری بات اس مہینے میں تو مان لے ۔ چیت کے بسنت رُت میں اے میناں عیش و عشرت منالے اس زمین پر یہ سب جانے کتنی دیر لگتی ہے ۔ لوگ کچھ کر نہیں پاتے ۔ سادھن کہتے ہیں کہ پیو کے لئے ایسی آگ میں جلنا چاہئے جس میں دھواں دکھائی نہ دے ۔ اپنے ہی جسم کی آگ سے جلنا چاہئے ۔

(۲۵) جو مالن پیو کارن جر بھئی ۔ دو جیوں جگ مانہی نس تر بھئی
مرن جین کو سب کا دُدھاوے ۔ تھورے جیون کو ڈھنگاوے
اگم گنڈ نہ جائی تھائی ۔ بسر ٹھاؤں وہ سبے لسائی
لاگ انکھ رین چلی جائی ۔ بھور ہوت روی کرن دکھائی

تل یک بوند کا ڈھک سر پر و   گا نجی بوند بنسے جس رو پر و

جوبن رتن جاری کئے یوں اوڑاو دے چھار

یہو سیر و دیکھوں لور کہیں اور نہ دیکھیے پار

سو جانئے جو تمی پیر برہ دکھاونا دیکھے

کوئل بران سر پر ساد حسن ست سوں لیکھے

میناں نے جواب دیا اپنے خاوند کے لئے جل جانا ہی مناسب ہے تاکہ دونوں جہان سے چھٹکارا مل جائے مرنا اور جینا تو سب کے لئے مقرر ہے ۔ اس تھوڑی سی زندگی کو گمراہی میں ڈال کر کیوں کوئی برباد کرے ۔ یہ تو ایک عمیق غار ہے جس کی تھاہ ہی نہیں لی جاسکتی ۔ اگر کہیں اس کا راستہ گم ہوگیا اور آدمی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو پھر سب کچھ ختم ہوجائے گا ۔ آنکھ لگتے ہی رات ختم ہوجاتی ہے ۔ رات آنکھوں میں بیت جاتی ہے اور مجبور ہوتے سورج کی کرنیں دکھائی دینے لگتی ہیں ۔ ایک تل (لمحہ) اور ایک بوند برائی کی جسم کو برباد کردیتی ہے جس طرح ایک بوند سے کچا دودھ پھٹ کر بیکار ہوجاتا ہے تو کیا کہتی ہے میں تو اس جوبن روپی رتن کو جلا کر راکھ کردوں گی تاکہ ہوا اسے اُڑا لے جائے ۔ لورک کے لئے اپنا سر تک دے دوں گی ۔ دوسرے کی طرف نگاہ بھی نہ ڈالوں گی ۔ یہ اب وہی جان سکتا ہے جس کے دل میں کسی کے برہ کا درد سمایا ہوا ہے ۔ برہ کا گھاؤ دکھائی نہیں دیتا ۔ کوئل اتنی کالی ہوتی ہے کہ آسانی سے دکھائی نہیں دیتی آواز سے پہچانی جاتی ہے ۔ جسم ، درد ، فراق سے کالا پڑجاتا ہے ساد حسن کہتے ہیں کہ یہ سب یعنی حق سے دیکھا جاسکتا ہے ۔

(۲۶) میناں اب آدا بیسا کھا   مدان بھو دنگم تا کئے پا کھا

بینوں جیوں دیکھوں یون تھکائی   برہ ناگ جیوں ڈس ڈس جائی

تیوں تیوں لہری رنگ بھر آوے   بیو کا گارو رہن کون جیاوے

ایہیں جنم گنوائے باری   اے کامنی سُن بول ہماری

رس کئے رہتے دیوی دو تی جیاری   تیں کا معے اب جوس گنواری

تن پرچھیئے من او بھئے الپ ہیں سوگمار
برہ اگن میناں جری جرجر ہووے مے چھار
کیا گئی، سو بھوگ بیس گنوارے مے سکھی
گھڑی گھڑی رنت سوگ سادھن جنم گنوائے

مالن اب بھی باز نہیں آئی کہتی ہے۔ اب بیساکھ بھی آگیا۔ اس میں کام دیو روپی ناگ موقعے کی تاک میں رہتا ہے۔ جوں جوں نظر ڈالتی ہوں توں توں ہوا کو بڑھتے دیکھتی ہوں اور ویسے ویسے اس ناگ کے ڈسنے سے جسم میں لہریں آتی ہیں۔ کنت (خاوند) روپی گاڑور (اوجھا) کے بغیر کون تجھے جلا سکتا ہے۔ تو تو اپنی زندگی فضول اس طرح برباد کر رہی ہے۔ اے پیاری سندر عورت میری بات سن لے۔ اب تو عیش و عشرت کے دو چار ہی دن رہ گئے ہیں۔ تو کیوں ایسا گنوار پنا کر رہی ہے۔ تیرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ یا دُبلا ہو رہا ہے۔ مَن اکتا رہا ہے۔ تیری عمر ابھی کچی ہے۔ پھر بھی برہ کی آگ میں جل کر کیوں خاک ہوئی جا رہی ہے۔ یہ کایا (ظاہری) جسم بغیر بھوگ (عیش و عشرت) کے گنوا دینے کے لائق نہیں ہے۔ سادھن کہتے ہیں کہ یہ گھڑی کا سوگ زندگی بھر کب تک چلے گا۔ کیا ساری عمر اسی طرح بتانا ہوگا۔

(۴۷) کیرن آگ کی جیٹھ سیرائی — جری جری دھرتی چھاڑا ڈورائی
بہتوں نہ بجھوں لو کرنا ووں — برہ جاری کئے چھپارا ووں
سنگھ اھیر کینہہ جودھائی — تو ہی کئے چیت کی سیر کھائی
اب یہ بارہ مانس تلانئے — دن ایک لئے لو گھر گھانئے
بھورے آئی دن مور تلانی — اب ہنوں ستی لور گھرانی

تو رکھا میں میٹھوں ست راکھو کرتار
پاپ پن داد بھوگ ست کی گرنی آگری
پاپی نہ پاوے بھوگ سادھن ست کئے کیجئی

میناں کہتی ہے سورج کی کرنوں سے جیٹھ تپ رہا ہے تو پتے اور اس آگ سے زمین کے ذرے ذرے اُڑے جاتے ہیں تو لورِ بن برہ کی آگ سے جل کر ہوا میں خاک اڑا کر بہا دے تب بھی لورک کا نام اور اس کی یاد نہیں چھوڑ سکتی۔ برہ کو میں خود جلا کر خاک کر دوں گی اور اس خاک کو اڑا دوں گی۔ بھلا تو جس نے سنگھ (شیر) کا شکار کیا ہے اس کے جی میں کبھی شکار کی بات آ سکتی ہے۔ اسی عرح اگر بارہ مہینے بیت گئے تو بیت جائیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے دن پھر لوٹیں گے اور میں اپنے لورک کے گھر کی ستی رانی ہوں گی۔ کرتار نے میرا ست رکھا تو تیری باتیں میں مٹا دوں گی اور لورک کی پریت تمام رکھ کر دونوں جہان کو روشن کر دوں گی۔ سادھن کہتے ہیں کہ پاپ اور پُن دونوں ہی بھوگ ہیں لیکن ست کی کرنی سب سے بہتر ہے۔ پاپی کو کبھی چا بھوگ میسر نہیں ہوتا ست کے ذریعے ہی سے ملتا ہے۔

(۲۸) جنم نہ چیت ڈولا دوں کاؤ — موسے بارنہی جاؤ تو جاؤ

میننے مالن دھری جھکوری — ہنُت پت میں راکھوں توری

دوتی دوت بچن سب تورا — مُن ستی پاوے کی کھول لورا

آپو اوتر تیسی تندا ری — نت اٹھاوؤں آن دیت ہے گاری

لوگ پنچ کے ھوتی نہ کانی — سرسوں آجو اوتر تیھسوں پانی

رتو اتر تیو رس اُترس موسے کچھ نہ بھاو

تو ہے کروں بدھا وُ جب لورک گھر آوُ

جو جس کرئیے سو پاوے ان بن بھانت سنواریٔ

سادھن چیمہ کئے بار سا بچے۔ ھوئی سر دیجئی

میناں نے کہا میں جیتے جی اپنی چیت یعنی لورک کی یاد اور تمنا کو نہ چھوڑوں گی۔ مرنے پر جل جائے تو جائے اور یہ کہہ کر اس نے مالن کو بہت ڈانٹا۔ پھر کہنے لگی۔ میں نے اب تک تیرا بہت لحاظ کیا۔ تیرے یہ دوت بچن یعنی کٹنا پن کی باتیں کہیں لورک نہ سن لے۔ میں اب تک گھری گھری تیکھی باتوں کو جو گالی سے کم نہیں سنتی رہی ہوں۔ لوگ باگ پنچ سب کو تیری باتیں غصہ دلاتی ہیں۔ میں تو تیرے جواب سے پانی پانی ہو رہی ہوں۔ تیوہار یا نا تیوہار، جذبات یا نا جذبات مجھے یہ سب کچھ اچھے نہیں لگتے ہیں۔

میں تو خوشی مناؤں گی جب لورک گھر واپس آئے گا۔ چاہے جتنی طرح کی بندشیں باندھی جائیں۔ سادھن کہتے ہیں کہ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی اسے ملتا ہے۔ اپنے محبوب کے لئے حق و راستی پر قائم رہ کر اپنا سر بھی قلم کرا دینے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

(۲۹) میناں مالن بنیسر بلائی　　دھر جھونٹا کٹنی نیہوارئی

مُنڈ مونڈائی کے سیندور دینھاں　　کار پیر دوئی ٹیکا دینھاں

گدھ آن کے دھای چڑھائی　　ہاٹ باٹ سب نگر پھرائی

جو جس کرے سو پاوے تیس　　کٹنی لوگ پکاریں ایس

لائی پائی کئے کاٹے کان　　کوُدوں بوئے لو نیہو دھان

ست میناں کو تھر رہ سادھن راکھو کرتار

کٹنی ماری دکاری کینہ گنگ کے پار

پاپ پُن دوئی بیج جس بوئی تس تیہجئی

سادھن جیسا کیجئی تیسا پھل آگے لہے

اب میناں نے مالن کو نزدیک بلایا۔ اس کا جھونٹا پکڑ کر اس کو مُرغا بنایا۔ اس کا سر مونڈوا کر اسے کالے پیلے ٹیکے لگوائے۔ گدھے کو منگا کر اسے اس پر چڑھوایا۔ راستے، بازار سارے شہر میں اکی تشہیر کرائی۔ اسے جو دیکھتا تھا کہتا تھا یہ کٹنی ہے۔ جو جیسا کرتا ہے اسے ویسا ہی ملتا ہے۔ کودوں بونے پر دھان کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ سادھن کہتے ہیں کہ پاپ اور پُن (گناہ و ثواب) دو بیج ہیں۔ ان کو جس طرح بویا جائے گا ویسا ہی اُپجاؤ ہوگا۔ جیسا کیجئے ویسا ہی پھل لیجئے۔

اب ہم منیر شریف کے فارسی اور دوسرے ہندی نسخوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں انھیں قدیم ہندی کے جانکاروں اور بدوالوں کے سامنے سطور ذیل میں پیش کر کے انھیں دعوت فکر و فیصلہ دیتے ہیں۔ قوسین میں ہندی نسخوں کے الفاظ یا جملے ہیں۔

(بندا) بِن (رائے)۔ ہم پن (آپن)۔ آتھسین (کہا)۔ ڈینھاری (ڈھپاڑ)

تنوان (تلان)۔

(بند۲) توہ (تیہوں) ۔ ست روپ (کپٹ روپ) ۔ ٹونا ٹامن (ٹونا ٹمبر) جہاری (ساری) ۔ لیت درب مالن پن (کپٹ روپ چلی دوتی) بار (بال) چھانہ کی چنیھئی (چھانہ چھانڈری)

(بند۳) کھاوتہین (کہہ دوتی) پتین (پتا) پڑی آگ (آگ برہ) سنور سنیہ جیت آپ جیو بہی تن آنیوں توہ (سنورے چنتا اوکچی ہہئین آتی توہ) کینہ ہہنیٹ اودھینہ (دینہ ہہنٹ اکھنہ)

(بند۴) ساج کی جانی (ساج کری جانی) کٹنی کی بولھہ پتیانی (کٹنی کے بولن پتیانی) ۔ کھس توردیکھیوں اب جیا ۔ جیونی لٹیں ہنگ بھئے گیسا (میل چیر تور دیکھیوں میناں ۔ سیندوریس نہ کا جرنینا) میل چیر تور دیکھیوں کر مرد یکھوں جوگ ۔ سیس نہ سیندور کاجرکاہ ہیو سب بھوگ (بدن جوتی تورے دھول کت اودرس آپو ۔ مانگ کوش توری ستیل سرہ جیتر تور بالیو) ہیرن کوٹھا سات نیہ تیہ منہ مکھو رودی (ہیرن کوٹھا جاس موکھو (دوین نہین بھئے)

(بند۵) کا کہنہ (کوئی کا) ۔ بیرن کرئی لورجس کینھاں (بیری نہ کریں لور جس کینھاں) ۔ سو (جو) کرہ جو باکی دیو دھرے مالن (کریں جو باکے دو دیو دھرا) جا سوں دوئی جگ تفرہے (جا سو اورعیبا تھنی) ۔ تا سوں کون سینہ ٹونی کا بنیں سوت جیوں (وا سوں کون سینہ ٹوٹے کا جے سوچ بیول)

(بند۶) کہت (سُنت) تیئیں آگ جو بیوں توہ نیناں دیئے آگ جہری بیونس نیناں) اندھیر کتھوں ندکبھوں بارا (تور ہیو تیبر نہ دیکھنوں بارا) سونہ تیجا ڈہنہ (ناری نہ جیا ندگی) ۔ ست (دیکھیو)

(بند۷) دوتی دوت بچن جیوں کہا (دوت بچن جب دوتی کہا) مینن دہائی ادکر مکھو تیجا ۔ (میناں دوٹر دہائی مکھو گہا) سادھن (کامنی)

(بند۸) دھر پر بھی گسنبھی زنماری (ہری ہری بھو ئیں گسنبھی ساری) اور نہ دکھہ تنہ تکھ (اوانہ سوکہہ تمہہ دکہہ) سورٹھا بالکل بدلا ہوا ہے ۔

(بند۹) دوسرے شعر کے مصرعوں میں تقدم تاخر کا فرق ہے ۔ رُت مانوں (رجوں مانوں) اوکھر (اوسر) نت نت جات (نت نت ہوی) کا نچیں دودہ بنانسٹی جا پرنتر بہاٹ (کا نچے دودہ بنسے جائی سپرے تن کھیہ) کوسنہ (گوری) ۔

(بند۱۰) سراسیت بھن بادر لاگئے ۔ دکھیہ بہانٹ تیھیئیں پور کہہ بھاگئے (ساگر

سنگ سُھین بادر لاگا۔ دیکھہ کے ڈرھیہ پورکھ بھاگا) جوبن کا ھیں نہ بھوگس آلپ بیس سکھ چھانہ۔ کیتے بھتوبلست جیس کنول پھول درمانہ (جوبن کا ہے نہ بلیسی سنکا اوٹھی نہ تو منہ۔ آئی بھنور تو دھے سیکھوں کھانا لوجو موہنہ) جوبن دیؤں بھاۓ پی پیہہ پریت نہ چھوڑیی (جوبن جائی تو جاؤ پیہہ کے پریتی نہ جاۓ ھے۔)

(بند ۱۱) پیسن (نتے) نہ کہنہ جیں (تیھی کیھوں) سوی تنہہ نہ آوا (سو ساتھ نہ آؤ) دہ کت جائی نباندھی تیھتی۔ نہ جوبن سوکوں پریتی (ڈھکے جائی نہ باندھے باتی۔ تو بھی جوبن سون کون پریتی) کرپایو (کنہ پالیو) کون بٹھاوے) جو جرکئی جس اوبری (کہ جرکۓ جس اوبری) سورس ؟ (درشن) سن سادھر (سر دیہر) بن ارجن کی بان من منتھہ سر جو کۓ نہیں (جس ارجن کے بان مدن مار جو کۓ نہیں)

(بند ۱۲) جتی (نۓ) اوبچ ساہ کنیاں کت ہوے۔ پیہہ بھوگ بن رہتے نکوۓ (اوپجے سنگ کون گتی ہوۓ۔ پی بھوگتے بن رہے نکوۓ) جو نہ دہ دہ اونی بھوراری۔ ترنی کھیلنہ پرم دھماری (جو نہ دو دہ ہوئی ایسہیں بھنڈاری تبئی کھیلن پریم دھماری)۔ مور بول کاہین تین پیلس (موری بات نہ کاھے مانس) نہ نت کا تین پھوروس (تیھی نت جوبن کھووس)۔

(بند ۱۳) منیر کا پانچواں شعر ہندی نسخوں کا تیسرا شعر ہے۔ بھوگ بھگت کے نیر نچانوں۔ سیت گھام کہ ڈرنہ ڈیراونوں۔ (بھوگ بھوگت میں تاسوں نانوں۔ جو بالن آپن کے جانوں)۔ منیر کا چوتھا شعر ہندی نسخوں میں نہیں ہے اور ہندی نسخے کا پانچواں شعر (کل کا دکھ کس آپوھی لائی۔ کاری ماس کس لیۓ سکھلائی) منیر کے نسخے میں نہیں پایا جاتا۔

(بند ۱۴) پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ بالکل مختلف ہے "سبہہ کوؤ کھیلی پرم دھماری" (جھونٹر بات کا کھیس گنوری)۔ منیر کا تیسرا ہندی نسخوں میں نہیں ہے اور ہندی نسخوں کا پانچواں شعر منیر کے نسخے میں نہیں ملتا (چھانڈ گۓ سوت اپہی نیہو۔ تا کۓ نیہہ لاگے جیؤ دیہو) جوبن کا ہیں نہ بھوگوں (جوبن رتن بھوگ کرو)۔ جورا تا جنہ پاس (جورا تا تیہی پاس) تا ترکیکر

اس لی دھن جوبن پا دھناں (تو ہی دھرتی کے آس سا دھن جنو ماٹی پڑی) ۔

(بند ۱۵) پر بہ باردن (پر بہ دیواری) جہ سر یہ (تیہی سر یہ) دھر ہیں (دھرا) پڑھتیں (مرا) لورک سنگ ماناں (لورک سنگ مانو) دھند کی جانان (دھندکری جانوں) رنگ بھوگ کے پر تھمین یک کرے منتہاۓ ۔ جگ جگ جھومتی پاتک تنہہ نت تس کو جاۓ روگ بھوگ کئے پر تھمین تل یک کرے سہاۓ ۔ جگ جگ جھولے پاتکمہ کو آپو ہی ڈھنکاۓ کوئی جگ راتا بیری گھناں (سوئی جگ راتا ماٹی بسے) جھوٹھن بلیبی (جھوٹھا بولیا) ۔

(بند ۱۶) تس تمس کا نبولور (تس جس کا نپے لور) توں جیتی جاۓ تو جاؤ (تو جیہ جا لے توجاۓ) پا پہ دیہہ (پاپہ دیت)

(بند ۱۷) کا (کہہ) یہ درجون ست چھاد پڑائی ۔ تا کر پاپ کرہ کا آئی (جیت چلنا سو پول پرائی ۔ تا کر پاپ پڑے تو ہی دھائی) دھرم نساؤں (دھرم گنوادیں) ہن کا لورہ تکہ ڈرساؤن (ہن لورھنہ کا تکہ دوساویں) جرت اگن میں مالن جی میرادھر یوں بجھائی ۔ اگمن چھیل بیرا سہو موری دھست تمہ جائی (جرت آگ منہ مالن جیرا دھر یوں بجھائی ۔ اگمن چھیل میرا دون کھا سنو جو مورہ) سنورہ بینیں سیج الوں بھانت سنوارئی ۔ جاؤں بھاٹ کر سیج سادھن سائین باھرے (سور بینتی سیج الوں بھانت ڈساینے ۔ جاؤ ے کھاٹ کر سیج سادھن سائین باھرے) ۔

(بند ۱۸) جاڈیوں بنسار جناوا (جہ کا یون تسار جناوا) نس کے یون تھان ممی اپارا ھارنہ رہا ڈال تمہارا (ڈاروئی یون جو چھے اپارا ۔ کا نچے کرہ کا ڈولن ہارا) کب تمہار نہ بھا بیناں الیس بول نہین سُن موربیناں (کا نیچے دیہہ نیر جھرے بیناں ۔ کرب تمہار نہ بھاجُی بیناں) رہس اکیلی جاڈ نجاۓ ۔ من کو مدن سنتا دے آوے ۔ سو بیتی جاڈ نجائی ۔ امنگ مدن بیرجن ترسائی) پانچواں شعر تو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔ ہندی نسخوں میں یہ ہے (ماتوں بول تو جیہیں دیہو بیرائی ۔ پوس اکیلی جاڈ نجائی) چھٹے دوہے کا پہلا شعر بھی نہیں ملتا ۔ توں نینہ نت بیر سبہ کا من جہ سنسار (توں نینہ آتی کا منی بلیس بیہو سنسار) ۔ سورٹھے کے پہلے مصرعہ میں جگ راتا کی جگہ ہندی میں " جگ پنڈت " ہے اور دوسرا مصرعہ " سادھن سیس گے راکھئے جا سوں پڑی سینہ کا

(ستیا کیجئے نیہہ سادھن ست سورا کھئے) تو بالکل مختلف ہے۔

(بند ۱۹) پہلا شعر نہیں ملتا۔ ہندی نسخے میں یہ ہے (کہہ میناں ادھٹو دوتی جائی۔ توھیں تو بھورا پیو بھورائی) دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ بھی مختلف ہے (کایا جیو موس لیگا لورا) لورک برہ توی مورا لنگا۔ سورج سینہہ بھر میں مانگا (لورک برہ پنے مور منگا۔ سورج سناہ بہھر مورا لنگا) بدہ جھیل جیہ پجھ ہوئے تاکی بار نہ چاپنی کوئے (برہ اگنی موہ تل نہ بجھائی۔ کاکری بات سناوس آئی)۔ بھوگ بھگت موہ کچھہ نہ بھاوے۔ حولہ لور نہ ہم گھر آوے (بھوگ بھوگنت کے پنتھہ نہ جاؤں۔ سیت دھام کے ڈر نہ ڈراؤں) اس کے بعد کا دوہا بھی بالکل مختلف ہے۔ ہندی نسخے میں یہ ہے (دوھوں جگ آگ دیٔوں میں جہاں نہ سرجن مور۔ جھوٹ بات لاگ جھوکہن کھا سنؤوں کا تور) سورٹھے کے کچھ الفاظ بھی بدلے ہوئے ہیں۔ سمندر کنئی پورا جائی پون کس باندھا تھر رہی۔ سادھن کیو سوکھتائی ماگھ اکیلی بہو رہی (سمندر کاپیرے کوئی پون باندھ کی تھر رہے۔ سادھن کو دُنہ کھتائی ماگھ اکیلی تہی)۔

(بند ۲۰) ماگھو تسار کہوں سُن بیرا۔ تھنٹیں اکھیتی توسے سربرا (ماگھو تسار کہوں سنو باری۔ پون برہ نت کھنچے ساری) پون تسار سبہ کے باجا۔ سُر نر من جن دیؤنا بھاجا (سنگھ تُسار سبہ کئے باجا۔ سور نر سور دیوتن بھاجا) بھنور لوکائی کانت منہ میناں (کنتھو ر بھنور لوکا نیو میناں)۔ اس کے بعد کے اشعار تو منیر کے اور دوسرے ہندی نسخوں میں بالکل الگ الگ ہیں۔ منیر کے نسخے کے ۱۹ دیں بند کا دوہا اور ایک اور شعر ہندی نسخوں میں قدرے اختلاف کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہندی نسخوں کے اشعار یہ ہیں (سور بینتی جا دنجائی۔ آدھی کئے مدن ترسائی آئی + برہن سیج تیبل جو ہوئی۔ تاکر سیون نہ جانے کوئی۔ برہ سیج دکھہ میناں ماپنے بہت سنتاپ + پیچ بھوت کی تہایہ کا بے کو پاپ + مالن جبھں بیوگ بھنور کنبل رس باپنجے۔ سادھن پوراسوگ گو بر ورا سر بری کرے)

(بند ۲۱) دھرمنہ پان کراھون جاؤ (مالن دھرم کرت جیو جاؤ) کاکر دھرم پاپ کر تیرا لور جنتھہ نکتا دی بیرا (کاکر باپ دھرم کوئی کیرا۔ لورا پائی نکتادے بیرا) جہ تن آگ برہ

جہکجہورے تہواں ست کہ جھواں جوڑے (جبھی تن آگ برہ کی برے تنہہ تُسار جاڈا کاکرے) تل ایک بھوگ سوگ پنی بہورے ہوئی پچھتاب دھری ایک کو مالن کو آپو ہی ڈھنکاب) ست نہ کر سکنے (سچ نہ کر سکے)

(بند ۲۲) نانہ (کنت اکم کم کیسر (کم کم چندن) بارا (باری) دیکہہ سبہ رتنا را (دیکہہ جگت رتنا رای) ناپچے برہ پون کہ ماناں۔ بن سینتی بہوکھا نکھر باناں (ناچے برہ پون کا ہرنی بنا سنگی بھئے اینگور برنی) تہوں سمجھ نہ دیکھ (تہنی دیکہہ ناہ سموجھے) سورٹھا ہین ملتا۔ ہندی کے نسخہ کا سورٹھا اس طرح ہے (رہیو جہو تھا سنسار جھوٹا نیہہ نہ کیجیئے۔ سادھن بسیہ کئے بار سانچے ہوئی سر دیجیئے)

اگر فارسی کا کوئی دوسرا نسخہ مل جائے تو بقیہ اشعار کے اختلافات یا تصرفات پر کچھ روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ بنگالی شاعر دولت قاضی کے غالباً کوئی فارسی نسخہ ہی زیر مطالعہ رہا ہوگا۔ اس لئے کہ اکثر اشعار منیر شریف کے نسخے کے الفاظ یا مطالب کا بنگالی چربہ معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ میرے دوست پروفیسر طرفدار نے مجھے بتایا۔ چند باتیں جو منیر اور ہندی نسخے میں پائی جاتی ہیں۔ چوں کہ بنگالی سے ان کا تعلق نہ تھا اس لئے دوسری شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً جھولا جھولنے کا رواج بنگال میں شاید نہ تھا۔ دولت قاضی نے کہیں بھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ چو ندری ساری بھی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ سادھن کا نام لیتے ہیں۔ میناست کے ساتھ لورچند رانی کا جوڑ ملاتے ہیں۔ علاول نے دولت قاضی کی ہندی نظموں سے ماخوذ بنگالی تصانیف کا تکملہ پیش کیا ہے۔ لیکن انہوں نے بہت سی غیر متعلق انہونی دیومالا کی روایت کا اضافہ کرکے بڑی گڑبڑی پیدا کر دی ہے۔ ان سے کوئی مفید مطلب بات نہیں نکالی جا سکتی۔ لیکن دولت قاضی کی کتاب "ستی مینا اور لورا چندرانی" کا بالاستیعاب مطالعہ شاید اصل حقیقت کی طرف ہمیں لے جا سکتا ہے۔ بہرکیف اب فیصلہ قدیم ہندی کے جانکاروں کے ہاتھ میں ہے۔ میرا مقصد تو ہمیشہ کی طرح بس اتنا ہے کہ اگر کوئی چیز گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی ہے تو اسے منظر عام پر لایا جائے تاکہ مزید تلاش و جستجو، تحقیق، تبصرہ تنقید کی راہ کھل جائے اور میں سمجھتا کہ میں نے یہ فرض جس طرح مجھ سے ہو سکا ادا کر دیا ہے۔

دکھنی اردو کے مخطوطات کا ایک مجموعہ

ماہ رواں (فروری) کے شروع میں انڈین ہسٹوریکل ریکورڈس کے جلسوں میں پٹنہ یونیورسٹی کا نمائندہ ہو کر اور اپنا مقالہ پڑھنے کے لئے مجھے حیدرآباد دکن جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے کرم فرما اور ہم وطن سید عبدالرحیم صاحب مجھے اور میرے محترم رفیق سفر مولوی فصیح الدین بلخی کو اپنے جائے قیام پہ اٹھا لے گئے ان کے اخلاق اور نوازشہائے گوناگوں نے ہمیں یہ محسوس ہی نہیں کرنے دیا کہ ہم پرائے دیس اور جگہ میں ہیں۔ بہرکیف نہ مجھے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اور نہ جو کچھ ہم نے دیکھا اور جو تاثرات لے کر واپس آئے اس کا ذکر مقصود ہے۔ میرے دوست پروفیسر عبدالقادر سروری نے دوبار ہمیں پروفیسر محی الدین زور سے ملانے کی کوشش کی مگر بدقسمتی سے ہم ان کے شرف ملاقات سے محروم رہے۔ منجملہ اور اداروں کے ہمیں یونیورسٹی لائبریری کے دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ شاہد صاحب "ڈپٹی رجسٹرار" اور دوسرے حضرات کے ہم ممنون ہیں کہ اردو مخطوطات کے متعلق ان کے ذریعہ ہمیں کچھ مفید مطلب باتیں معلوم ہوئیں تھیں۔ حضرت سید محمد گیسو دراز قدس سرہ العزیز کی اردو تصنیف "معراج العاشقین" کے قدیم ترین نسخے کی زیارت کا بڑا اشتیاق تھا وہ تو پورا نہ ہو سکا لیکن معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا قدیم ترین مخطوطہ اشرف کا ایک مرثیہ "نوسرہار" ہے جو ۹۰۹ھ میں تصنیف ہوا جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎ نو سو ہوئے اکلے نو۔ یہ دکھ لکھیا اشرف تو :: نام دھریا اس نوسرہار۔ یہ ہے میرے دکھ کا اکہار :: یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ یہ نادر نسخہ عنقریب شائع ہونے والا ہے پھر ہمیں الماری سے ایک مجموعہ مخطوطات نکال کر دکھایا گیا اور میری ساری توجہ بھی یہیں مرکوز ہو گئی دوسرے نوادر پر نظر ڈالنے کا بھی موقع نہ ملا۔ اس مجموعہ پر بھی ضیق وقت کے باعث جیسی نگاہ ڈالنی چاہی چند باتیں جو جاذب نظر تھیں کم از کم میرے لئے انہیں کے متعلق سطور ذیل ناظرین معاصر

کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں ۔

اس مجموعہ میں بیس چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں جن کی فہرست یوں دی گئی ہے ۔۔۔۔۔۔
(۱) اسناد العاشقین (۲) اربعہ عناصر (۳) تلاوۃ الوجود (۴) رسالہ سلوک (۵) معراج العاشقین (۶) رسالہ تصوف (۷) رسالہ تصوف (۸) رسالہ وجودیہ (۹) رسالہ تصوف (۱۰) رسالہ روح (۱۱) رسالہ تصوف (۱۲) رسالہ تصوف (۱۳) جنگ نامہ نفس ودل منظوم (۱۴) رسالہ خلق (۱۵) نالہ خلق (۱۶) رسالہ طریقت (۱۷) رسالہ احوال پیغمبراں (۱۸) رسالہ مسلمانی (۱۹) رسالہ اشرف المخلوقات (۲۰) رسالہ لیلی مجنوں ۔
نہ مجھے وقت تھا کہ بالاستیعاب کسی ایک رسالہ کا مطالعہ کروں نہ اہلیت وصلاحیت کہ سب کے متعلق چند ضروری باتیں ہی نوٹ کرلوں ۔ مثلاً ان کے ادوار ان کے مصنفین کے صحیح نام ، موضوع ومبحث تعداد اوراق لسانی ادبی خصوصیات وغیرہ تاکہ معلومات میں کچھ بھی اضافہ ہوسکے ایک آدھ گھنٹہ میں اوراق کی الٹ پلٹ کے دوران میں چند باتوں پر نظر اٹکی انہیں جلدی جلدی لکھ لیا اور اب خود اپنا لکھا ہوا بھی سب پڑھا نہیں جاتا ۔ بہرکیف جو کچھ میرے پلے پڑا اسے جوں کا توں پیش کردیتا ہوں ۔ جو حضرات دکنی زبان سے واقف اور صاحب ذوق ذی لیاقت ہیں اور کدوکاوش کے عادی ہیں اور جنہیں اپنے اوقات پر اختیار ہے ان سے استدعا ہے کہ اس مجموعہ کو ضرور منظر عام پر لائیں مجھے تو یہ بڑا قیمتی ذخیرہ معلوم ہوا ۔ تنگ دامانی مجبور کرتی ہے کہ اختصار پر اکتفا کی جائے ۔
"معراج العاشقین" کا رسالہ شائع شدہ رسالہ سے ملتا جلتا ہے تاریخ کتابت درج نہیں ترقیمہ کا بھی فقدان ہے ۔ مگر سارے رسالے شاید ایک ہی شخص کے لکھے ہیں جو بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے ۔ ایک رسالہ کا آغاز بعد حمد ونعت یوں ہوتا ہے "یہ رسالہ بات کہ بات کرنا کی کہاوت ہوئی ، کے جانتے پر تین تالاو ۔ اس میں دو سوکے ایک میں پانی نہیں ۔ دوجا ایسا میں تین کمہار دو اجاڑ ایک بستا نہیں وہاں بستی تین کمار ۔ دو لولے ایک ہات نہیں ۔ ادلی گھڑے تین بنائے ۔ دو پھوٹے ایک تو تلا نہیں ۔ او سنیں پکائی تین چاول ۔ دو کچی ایک پکتا نہیں ۔ اونی بھیر بلائی تین مہمانا ۔ اس میں دو روٹھے ایک اوت آنہیں ۔ ان کو جلائی تین موکھیں ۔ دو چوکی ایک لگتا نہیں فہم وفہم ۔ بیان خاتمہ ایں است الخ" میں نے کوشش کی تھی کہ جس طرح الفاظ کاتب کے قلم سے

نکلے تھے جوں کا توں انہیں نقل کرلوں۔ مجھے یاد ہے کہ بچپنے میں میری والدہ مرحومہ اسی قسم کے فقرے اکثر ہم بھائی بہنوں کو سنایا کرتی تھیں اور کچھ زبانی بھی تھیں لیکن مجھے اتنا شعور نہ تھا کہ ان کے معنی و مطلب کو سمجھوں اور فقروں کو ذہن نشیں کروں مگر چونکہ کئی بار یہ دہرائے گئے تھے ایک خاکہ سا ذہن میں رہ گیا۔

خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ میں بھی مجھے ایک پتلی مجلد کتاب دیکھنے میں آئی جس میں دو چھوٹے چھوٹے قلمی نسخے تھے ایک کا نام "جنونیہ رسالہ محمد وفا در شرح بعض عبارات ہندی" تھا۔ اصل نسخہ تو اس وقت سامنے نہیں لیکن پرانی بات کی بنا پر میں نے 'ہندی' فقروں کو نقل کر لیا تھا اور اس کی فارسی توضیح میں جو باتیں لکھی گئی تھیں ان کے کچھ ٹکڑے بھی لے لئے تھے۔ یہ رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے "...... می گوید بالستہ حرص و ہوا محمد وفا کہ روزے فقیر نشستہ بود یار موافق محب صادق سیدی عبدالمجید ایں کلام ہندی خواند و تکلیف کرد کہ معنی ایں کلام بگو بنا بر آنچہ در خاطر ایں خام آید بخامہ بند کرد ایں رسالہ را "جنونیہ" نام نہاد الخ" تتمہ کتابت یوں ہے "تمام شد رسالہ جنونیہ بروز اول (؟) وقت بکمپاس روز برآمدہ تاریخ یازدہم شہر جمادی الاول ۱۱۔۔ فصلی موافق ہجری النبی صلعم در عہد بادشاہ محمد شاہ خلد اللہ ملکہ۔ رقیمہ محمد غوث صدیقی بہاری"۔ اب ہم ان تو "ہندوی" فقروں کو بعینہ درج کرتے ہیں تاکہ صاحب بصیرت حضرات ان کا تقابل و تجزیہ کر سکیں۔

(۱) بات کی بات خرافات کی خرافات

(۲) کانٹی کی ایتی پہ تین تلاؤ

(۳) دو تو سوکھی۔ ایک میں پانی نا ہے

(۴) او نہا بسائی تین کانو۔ دو تو اوجر۔ ایک بسی نا ہے

(۵) ادھا بسائی تین کمہار۔ دو تو لولی پد۔ ایک ہاتھی ابا کھری نا ہے

(۶) او تیاں بنائی تین ہانڈی۔ دو تو پھوٹی۔ ایک کے تری نا ہے

(۷) اسموں پکائی تین چاول۔ دو کچی۔ ایک گلی نا ہے

(۸) ان پہ بلائی تین مہمان۔ دو تو روٹھی۔ ایک مانی نہ

(۹) ان سوں پہلائی یتین موگی ۔ دوئی چوگی ۔ ایک لکھی نانہ

حیدر آبادی مجموعے کے ایک رسالہ میں دو جگہ ہمارے بہار کے سب سے جلیل القدر صوفی بزرگ حضرت شرف الدین احمد منیری قدس سرہ العزیز (۶۶۱ - ۷۸۲) کا نام آیا ہے (۱) نقل مشہور ہے کہ جب حضرت موسیٰ پیغمبر علیہ السلام باری تعالیٰ سوں کہے تھے رب ارنی کر کرتب اونکوں آواز لن ترانی بجا آیا ۔ حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ العزیز در مکتوب اپنے لکھتے ہیں جو پیغمبر ہمارے کہے اس بات تئیں اجنا نہیں پر سکیتئیں نابل اس نعمت دکھتا ہے تو ناچہا نیکو دیتا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کیتئیں بخواست دیا مگر مہتر موسیٰ علیہ السلام مہائی نہیں دیا بلکہ جواب دیا کہ جو خاصی تون ایسا حق مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے" (۲) نقش کی آمدنی خود سے ہے لانا کسکا ہے جیسا کہ حضرت مخدوم شرف الدین منیری اپنے مکتوب (میں) اس طرح فرماتے ہیں" الخ

رسالہ وجودیہ" میں جس میں حضرت امین الدین علی بیجاپوری کا حوالہ ملتا ہے شروع کے فقرے یہ ہیں" یہ رسالہ وجودیہ ہے اگر کوئی یاد کرے گا تو اس سے فقیر درست ہے اگرچہ یاد نہیں کیا تو لقمہ فقیر کیا ہوا اور پوشاک خرقہ پنیا (پہنا) واجب نہیں ہے ۔ اسی رسالہ فقیروں کو لازم ہے اگر کوئی تجھ سے پوچھے گا کہ شریعت کے چار دہ پیر جو دہ خانوادے کون ہے جواب بول ۔

بارہویں رسالہ کی بھی کچھ عبارت میں نے نقل کر لی تھی جس کی اہمیت ظاہر ہے فارسی اور مشارقی دکنی کی آمیزش خاص طور پر جاذب نظر ہے " روح کیوں ہے سو حضرت داماد پیر شاہ صاحب ماہ شوال کے بادشیش تاریخ کوں حضرت شاہ امین الدین صاحب سوں سوال کئے ۔ یہ شاہ پور میں ۔ بات سن کر ایوں کہتے ہیں نور ہوا اور ذات میانے روح کیوں ہے جواب ۔ تب حضرت امین الدین علی صاحب داماد کوں جواب دیئے تھیں روح کو خدا کیا ہے نور کو وہ نا نہیں روح کوں نور کے بیلا پر کچوں جاؤ کر ہے ۔ بعد از چند روز از سیارہ آنحضرت امین الدین علی صاحب رحلت شدند ۔ از پس بعد از حضرت شاہ میر جی صاحب کے سبی ذکی وقت میں جو شاہ خلیل اللہ صاحب نبے ماہ ذوالحج کے چو تھے تاریخ فقیر شیخ زید او مبا بات کوں قوت پکڑ کر د مجلس آور دنی یوں کہے کہ آج لگ نور اور ذات کے درمیانے روح بے ہنا کہ معلوم نہ تھا سو میں تحقیق کردم شما قبول کنید ۔ یعنی جوں ہے تیوں ہنا کر دیتو ان وقت بابا خلیل اللہ یوں جواب

وادندکہ پیغمبر معراج نہایت کوں انپڑی ہور جبرائیل کوں آنگے ہو کہیے۔ تب جبرائیل کون کہے کہ آنگی ہونگا تو جل مروں گا۔ گر کہتے تو وہاں روح کون نور میں جاگا نہیں کریوں کہے۔ تب نقیر شیخ فرید یو کہے کہ نور تو سمجھ بے ورلے ذات کوں پایا سو کو بے تب بھی شاہ خلیل اللہ یوں کہے کہ روح کون تو خدا دانائی دیا ہے ہور نور کون تو کل دانائی ہے ہور روح تو محو ہوتا ہے ہور نور سوں کل دانائی سوں ذات کون پایا ہے۔ تو اس بات کو برادران قبول نئیں کئے۔ چیز نے فقیر شیخ فرید نئیں قبول کئے بار بے مجلس الیقین برادران نا قبول کئے۔ ہمہ مجلس یک طرف ہور۔ فقیر شیخ فرید ہور بزرگان شاہ مرد کروں تو بھی ہے ان کی بات بہ سید پنجہ جیبے میں نگ۔ بہت تکرار ہوا۔ اس کا قصہ لکھے ہیں۔ بہوت دارا زاست۔ اما مختصر میرا یان سو لتا ہوں بعد ازیک روز فقیر شیخ فرید اکر حضرت پیر کے خانقہ میں پوچھے۔ نور ہور ذات کے بیانے روح ہے کہ نہیں سو بنا را گرد۔ کر کہتے تب حضرت بابا خلیل اللہ جواب داد کر روح کا دخل معرفت لگ ہے لیکن خدا کے ذات لگ روح کون پہچانت دخل۔ بعد ازاں لذت میں ہوئی تجھے پیا پر رہتا ہے۔ اس تے بھی زیادہ بولنا سو جھوت ہے یہ بنا را تجھے ہے۔ تب حضرت فقیر شیخ فرید سوال کرد کہ نور میں روح بنا بات سیر ہور نور روح ہوا ہور پھر ذات کون دیکھنے کون رخ کیا۔ تب بابا خلیل اللہ یوں جواب دینے کہ نور ہور تو فثم وجہہ اللہ ہوا۔ یعنی پات دیکھے دسنے (دیکھنے) لگیا۔ وہاں رخ کرنے کو حاجت ہے تون کہہ کر یک مثال سنائی جو نکہ دو دیکھیوں کوئی گذر نہیں ہور تمام نور کون خیال ہے۔ ہور نور ہور ذات یچہ ہے بلکہ وہاں نور کون جاگا نہیں تو روح کون جاگا نہیں۔ روح کو جاگا کہاں جیسے کہ دلیکا یک مثال جون حضرت ابابکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا گھر لوٹائے خدا کے بل تب لوگاں پوچھے کہ عورت نیکر بایاں کے خاطر کیا رکھتے۔ تب حضرت صدیق کہے کہ اللہ ہور رسول پر رکھا ہوں کہے ــــــ

تسلی عالم"۔ فرید اور بابا خلیل اللہ کا حال تو مجھے معلوم نہیں مگر حضرت امین الدین اعلیٰ بیجاپوری اور حضرت میران جی شمس العشاق تو بہت مشہور ہیں۔ اوّل الذکر بڑے ولی کامل اور صوفی بزرگ تھے ۱۰۸۳ھ ہجری اور سکندر عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے عہد میں ان کا وصال ہوا۔ "رسالہ وجودیہ" انہی کا ہے آپ نے کئی تصانیف دکھنی زبان میں اپنی یادگار چھوڑیں شاعر بھی تھے اور متعدد اشعار آپ کے دستیاب ہوئے ہیں حضرت میران جی شمس العشاق آپ کے دادا تھے۔ اور آپ کے

والد کا اسم گرامی شاہ برہان الدین جانم ہے۔

اس مجموعہ کا آخری رسالہ لیلی مجنوں بھی نثر میں ہے۔ مصنف اور کاتب نامعلوم۔ شرح کے فقرے بڑے دلچسپ ہیں "مجنوں کون ہے۔ اور کون سے پیغمبر کے زمانہ میں ہوا ہے۔ اول نام مجنوں کا کیس تھا اور لیلی کہاں سے ؟ مجنوں لیلی پر عاشق کیوں ہوا سوں بولو اور دونوں کا قول و قرار کیونکر ہوا۔ دونوں کے ملاقات کہاں ہوا۔ مجنوں کون کون سی جاگا۔ مجنوں سلسلہ کدھر ہے کہاں جا کر پہونچتا ہے۔ مجنوں اپنے بدن کے کپڑے سٹ دیا تھا باپ اوس کا کس طرح کپڑے پنایا (پہنایا)۔ سب سہیلیاں لیلی سوں کہیاں بولیاں۔ لیلی مجنوں کوں جنگل میں کیا بول بھیجے۔ اوس سہیلی کے ہات کیا دے کر بھیج دیئے۔ اور کیا چیز مجنوں سوں لکو (؟) کمینکو کھائے۔ سو کیا کیسعد و حضرت امام حسینؑ مجنوں سے کیا سوال کئے مجنوں کیا جواب دیا مجنوں کہاں مؤا اور لیلی کہاں موئی۔ لیلی مرتے وقت کیا بول کر مرگئی۔ مجنوں کوں موت کی خبر کون پہنچائے۔ مجنوں اس خبر کو سن کر غش ہوئے ان کی حکایت ہے۔" واضح باد۔ قیس ابن عامر نظریف الملی امام حسین کا رضاعی بھائی تھا۔ اس سے ایک دیوان عربی منسوب ہے (مصری چھاپہ)

وضاحت بارہویں رسالہ کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے" این دست پیر است قضا نمودن برمرید بگیر اللہ فوق ایدیہم۔ عقل۔ طاعت حق۔ علم ذات۔ کمال معرفت۔ حقیقت معرفت۔ طریقت شریعت۔ بیان۔ نور اور ذات کے میانی فرق کیوں ہے۔ پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دینا آتی ہے بیعت رضوان کے واقعہ کی جس طرح ید اللہ کے ذریعہ قضا و قدر کے تصرفات تھے اسی طرح پیر کا ہاتھ بھی قضا و قدر کا مالک سمجھا جاتا ہے یہ تمام باتیں اس وقت حاصل ہوتی ہیں جب نور اور ذات کی معرفت انسان کو حاصل ہو جاتی ہے وجود کا یقین ہونا ضروری ہے اطاعت عبادت وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ شیخ فرید مصنف کتاب کے پیر کے داماد نے ۲۰ شوال کو حضرت امین الدین اعلی سے کہا کہ شاہ پور میں روح، نور اور ذات باری کا مسئلہ چھڑا آپ کا کیا ارشاد ہے جواب ملا تم روح کو چاہے نور کہو یا نور کو روح دونوں تو ایک ہی ہیں روح ذات باری تعالی سے علحدہ نہیں اسی کے نور کا پرتو اور عکس ہے جب تک کہ تجلی روح کی شکل میں ہے اسے روح کہیں گے نور نہیں اگرچہ کہ نور جا سے نزدہ بھی ہے لیکن تعین کی وجہ سے

اسے روح کہتے ہیں۔ پھر ۴ ماہ ذی الحجہ کو شیخ فرید نے اس بات کا زور دے کر اعادہ کیا اور دعویٰ کیا کہ ذات باری تعالیٰ ہی اصل ہے لاکھوں لاکھ دنیا کی چیزوں (تعداد تعینات) کے درمیان بھی روح و نور ہیں اور کہا کہ تم اسے مان لو۔ بابا خلیل نے فرمایا کہ انتہائی منزل نور پر جب رسول اللہ پہنچے اور یہ مقام جبرئیل تھا سے کہا کہ آگے بڑھئے حضرت جبرئیل عالم روحانیت میں تھے اور روحانیت کو عالم نور میں دخل نہیں اس لئے آگے نہیں بڑھ سکے فرمایا گیا ہے "چو در دوستی مخلصا [مخلصم] باقی عنانم ز صحبت چرا تافتی" تب "بگفتا فراتر ابعالم نماند۔ بماندم کہ نیروئی بالم نماند۔" "اگر یک سر موئے برتر پرم۔ فروغ تجلی بسوزم پرم۔"
اعتراض وارد ہوتا ہے کہ روح کو اللہ تعالیٰ دکھائی دیا لیکن نور تو سراپا ذاتی ہے اور روح محو ہو جاتی ہے نور میں پھر کیا وجہ ہے کہ جبرئیل اوپر نہ جا سکے۔ بات یہ ہے کہ جب روح نور میں محو ہو گئی تو وجود جبرئیل باقی کہاں رہا نور ہی نور تھا اور اس نور تک رسول اللہ کی رسائی ہوئی۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ شیخ فرید کی یہ معمولی بات بھی قبول نہیں کی گئی۔ لکھتے ہیں کہ اب بزرگان ہی مدد کریں تو یہ مسئلہ صاف ہو۔ چھ مہینے گذر گئے بحث جاری رہی۔ ایک روز شیخ فرید نے پیر کی خانقاہ میں آ کر پوچھا کہ نور اور ذات باری کے درمیان روح ہے یا نہیں اسے صاف ہونا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ روح کو معرفت سے ساتھ تعلق ہے۔ نہ روح ذات سے علٰحدہ ہے نہ نور سے۔ نور تو اصل ظہور ہے ذات الٰہی کا۔ جب روح کی پہچان ہو گئی تو نور اور ذات کی معرفت ہو جائے گی اور لذت ملے گی۔ اس سے زیادہ گفتگو کا موقع نہیں۔

دو مخطوطے

گذشتہ پوجا کی تعطیل کے اواخر میں اس ناچیز راقم السطور کو دہلی، امرتسر اور پشاور جانے کا اتفاق ہوا۔ ان تینوں شہروں میں بہتیری چیزیں جاذب نظر تھیں۔ جو کچھ دیکھا نہ دیکھنے کے برابر تھا۔ کسی چیز کا محض سرسری جائزہ تسکین خلش نہیں ہوا کرتا۔ جو حضرات ان مقامات کی قدامت و تاریخی اہمیت سے واقف ہیں ناچیز کے جذبۂ تاسف کا کچھ اندازہ کر سکیں گے۔ فرصت و وقت کی کمی اور حالات کی نامساعدت کے باعث اس طویل اور نہایت زحمت دہ سفر سے جس فائدہ کی امید تھی حاصل نہ ہو سکی۔ دہلی کے اکثر کتب خانوں کی سیر کی۔ خالصہ کالج امرتسر کے فارسی مخطوطات دیکھے اور پشاور میں جو نوادر علمیہ کل ہند ہسٹوریکل کمیشن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر فراہم کئے گئے تھے ان پر بھی نظر ڈالی، لیکن کسی سے کما حقہٗ استفادہ نہ کر سکا البتہ دہلی میں ناچیز کے فاضل دوست اور کرمفرما پروفیسر وزیر الحسن صاحب ایم اے کی مہربانی سے چند کمیاب نادر مخطوطات کے مطالعہ کی نوبت آئی موصوف ناچیز کو اینگلو عربک اسکول کے ہوسٹل سے باصرار اپنے دولت خانہ پر لے گئے۔ جب تک قیام کر سکتا تھا روک رکھا۔ اخلاق و عنایات کی حد کر دی۔ اپنا فراہم کردہ ذخیرہ جو بیشتر فارسی اور عربی مخطوطات پر مشتمل تھا ناچیز کے سامنے رکھ دیا بار بار اس شعر کی ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مینگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

تکرار کرتا تھا اور دست تاسف ملتا تھا بالآخر تین سب سے چھوٹی قلمی کتابیں علیحدہ کر لیں اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ نوٹ لئے اور اسی کو دہلی کا حاصل سفر سمجھا ان میں ناچیز کے نزدیک

سب سے اہم وہ مخطوطہ[1] تھا۔ جس سے مواد لے کر ایک طویل مقالہ (انگریزی) چدامبرم (جنوبی ہند) میں کُل ہند ہسٹوریکل کانگریس کے گذشتہ دسمبر کے سالانہ اجلاس کے لئے ارسال کیا جا چکا ہے۔ بقیہ دو مخطوطات[2] کے متعلق قارئین معاصر کی خدمت میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔ سطور ذیل میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کی ایک کمیاب کتاب سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

حافظ رحمت خاں کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ نواب علی محمد خاں روہیلہ بانی ریاست رامپور کے دست راست اور اٹھارہ برس ان کے ساتھ رہے۔ ۱۱۶۱ھ میں ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹوں کے محافظ اور دوآب کے تقریباً سارے روہیلوں کے جلیل المرتبت اور قابل الاحترام سردار تھے۔ روہیلکھنڈ اور بالخصوص بریلی اور پیلی بھیت ان کے عہد اقتدار اور دوران حکومت میں

---

[1] ایک چھوٹی سی جلد میں دو کتابیں ہیں جلال الدین طباطبائی کی مشہور کتاب بادشاہ نامہ جو عہد شاہجہاں کے پانچویں سال سے آٹھویں سال کے حالات پر مشتمل ہے موجودہ نسخے میں اصل کتاب کا ایک جزو پایا جاتا ہے لیکن دوسری اور زیادہ اہم اور قیمتی کتاب جو ناقص الآخر ہے اور جو ناچیز کے انگریزی اشارات سے بالکل خالی ہے۔ اس میں تقریباً ۲۶۴ خطوط ہیں جس میں ہر ایک خط بالواسطہ یا بلا واسطہ مہاراجہ مادھو سنگھ کچھوا مسند نشین ریاست جے پور سے تعلق رکھتا ہے اس میں ۹ نادر خطوط احمد شاہ ابدالی اور اس کے وزیر شاہ ولی خاں کے مہاراجہ جے پور کے نام ہیں۔ شاہ عالم کے خطوط نجیب الدولہ کے مراسلات اور روہیلہ سرداران حافظ رحمت خاں، سعداللہ خاں وغیرہ کے نام مکتوبات خاص اہمیت رکھتے ہیں ایک میں جنگ پانی پت کی روداد خود احمد شاہ ابدالی نے جے پور کے مہاراجہ کو لکھ بھیجی ہے۔ زیادہ تر مرہٹوں افغانوں اور راجپوتوں کے تعلقات پر ان خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔

[2] رسالہ مراۃ الملوک من تصنیف شیخ تاج الدین گنگوھی قدس سرہٗ العزیز کے متعلق آئندہ ایک مقالہ پیش کیا جائے گا۔ اگر کسی صاحب کے پاس ان تینوں کتابوں کے دوسرے نسخے موجود ہوں تو مطلع فرمائیں ناچیز ممنون ہوگا۔

بڑے عروج پر تھے گو برک اور میکولے نے اپنے خاص انداز میں ان کی خوشحالی اور روہیلوں کے لائق ستائش اطوار و عادات کے متعلق جو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مبالغے سے خالی نہیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کی تاریخ ہندوستان میں ایرانیوں اور روہیلوں کے تعلقات ایک خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ صفدر جنگ اور شجاع الدولہ ایرانی حکمران اودھ اور وزیر سلطنت مغلیہ اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے تعلقات پہلے بُرے نہ تھے۔ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور پھیلتے ہوئے فتوحات کا سیلاب۔ ایرانیوں اور افغانوں سب کے لئے یکساں طور پر خطرناک تھا۔ کئی بار ان کے مقابلے میں متحدہ محاذ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ سنہ ۱۷۷۲ء میں ایک آڑے وقت پر جب مرہٹے روہیلوں کے استیصال پر کمربستہ تھے شجاع الدولہ نے ان کی اعانت کی اور مرہٹوں کی گلو خلاصی ہوئی۔ انگریزی جنرل سر رابرٹ بارکر کے سامنے روہیلوں اور شجاع الدولہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اگر نواب وزیر مرہٹوں کی بلا کو کسی طرح ٹال دے اور روہیلکھنڈ ان سے خالی کرا دے تو اسے انہیں ۴۰ لاکھ روپئے دینے میں عذر نہ ہوگا۔ مرہٹے نواب وزیر اور انگریزی فوج کے اجتماع کو دیکھ کر اور دکھن سے متوحش خبریں پاکر روہیلکھنڈ خالی کرنے پر مجبور ہوئے اور ۱۷۷۳ء میں روہیلوں نے اطمینان کی سانس لی مگر باوجود اس تجدید دوستی کے جو دفع فساد مرہٹہ کے موقع پر معرض ظہور میں آئی ایرانیوں اور روہیلوں کی دیرینہ عداوت پھر رونما ہوئی ملک دواب کا وہ علاقہ یعنی اٹاوہ و شکوہ آباد جو پہلے افغانوں کا تھا اور جسے مرہٹوں نے اپنی عملداری میں شامل کر لیا تھا اس پر شجاع الدولہ نے قبضہ کر لیا یہ بات روہیلوں کو گراں گذری شجاع الدولہ اپنے چالیس لاکھ کا مطالبہ کرنے لگا۔ اور بقول جنرل چیمپن اس پر کچھ اضافہ کا بھی خواستگار رہا۔ فرخ آباد کے افغان نواب مظفر خاں ابن احمد خاں بنگش نے ایک خط برادرانہ کو جس میں حافظ الملک نے شکایت کی تھی کہ تم شجاع الدولہ سے مل گئے۔ حالانکہ اس کا رویہ ہمارے خلاف ہے نواب وزیر کو دکھلا دیا شجاع الدولہ کو موقع ملا۔ اٹاوہ سے ملک افاغنہ کی طرف کوچ کر دیا انگریز اس کے حلیف تھے۔ بنارس میں شجاع الدولہ اور گورنر جنرل ہسٹنگس سے ملاقات ہو چکی تھی۔ روہیلوں کے خلاف انگریزوں نے نواب وزیر کی حمایت پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ نواب وزیر نے حافظ الملک کو ایک شقہ اتمام حجت کے لئے بھیجا اور چالیس لاکھ

کا مطالبہ کیا جسے دے کر اس نے مرہٹوں سے روہیلوں کی جان و آبرو بچائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شجاع الدولہ کو اپنی گرہ سے نہ کچھ دینا پڑا تھا نہ کسی جنگ کی نوبت آئی تھی اور مرہٹے خود ہی اپنے وطن کو چلتے بنے تھے مگر معاہدہ کی رو سے یہ باتیں لازمی نہیں تھیں اور روہیلوں کو اس کی پابندی ضروری تھی۔ مولوی عبد الغنی صاحب اخبار الصنادید میں ہم عصر مورخوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حافظ الملک نے جب خط زر طلب اپنے اقربا و شرکا کو دکھلا کر سمجھایا کہ یہ روپیہ واجب الادا ہے۔ لہٰذا ہر شخص اپنے حصہ رسدی ادا کرے ورنہ فوج انگریزی سے سب کی مفت آبرو جائے گی لیکن شجاع الدولہ نے دوندی خاں کی اولاد سے سازش کر لی تھی اس لئے ان احمقوں نے ان روپوں کے دینے میں جن کے ضامن ان کی اور دوسروں کی طرف سے حافظ الملک ہوئے تھے پہلو تہی کی اور لڑائی کے لئے صلاح دینے لگے۔ بعضوں نے تنگدستی کے عذر پیش کئے۔ غرور شجاعت کی ترنگ میں لڑائی کی ترغیب دی اور شرکت کا وعدہ کیا۔ غرض لڑائی ٹھن گئی۔ شجاع الدولہ کے طلب کرنے پر ایک انگریزی بریگیڈ کرنل چمپین کی سرکردگی میں فروری ۱۷۷۴ء میں نواب وزیر کی فوج میں آکر شامل ہوا اس جنگ میں جو اپریل ۱۷۷۴ء میں میران پور کٹرہ (ضلع شاہجہاں پور) کے مقام پر واقع ہوئی پہلے توپ چلی روہیلہ حسب عادت قدیم دفعتہً دھاوا کر کے توپ پر آ پڑے ہزاروں کا ڈھیر دلوں سے خاتمہ ہوا پھر ہوائی شاپ چلنے لگی روہیلوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ سرسٹھ سال کے بوڑھے بہادر حافظ الملک نے براہ تہوری ایک نشان ہاتھ میں لے کر اپنی جمعیت کے ساتھ نواب وزیر تک پہونچنا چاہا کہ گولے کے صدمے سے جو سینہ پر لگا گرے شجاع الدولہ کے ایک روہیلہ سردار سلطان خاں برادر مرتضیٰ خاں بڑیچ نے ان کا سر کاٹ کر آقا کے سامنے حاضر کیا نواب وزیر ہاتھی سے اترا اور سر حافظ الملک سے مخاطب ہو کر کہا خدا شاہد ہے کہ میں ایسا روز بد تمہارے لئے نہیں چاہتا تھا۔ کسی شاعر نے مادہ تاریخ کہا ہے

چو از لفظ ظفر تاریخ جستند :: پئے باقی سر حافظ بریدند

یہ ایک حسرتناک واقعہ ہے جس کی یاد بعض حلقوں میں ابھی تک نہیں بھولی جس کا غلغلہ ہندوستان سے انگلستان پہونچا جس کے لئے گورنر جنرل ہسٹنگس کی مجلس دار العوام میں بہت کچھ لے دے کی گئی جس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر اس

معاملہ کا موضوع کچھ دوسرا ہی ہے۔ ہمیں تو دیکھنا ہے کہ جس بزرگ کی سیاسی زندگی کا یہ انجام ہوا اس کے اخلاق حالات مذہبی اور سیاسی عقائد اور اس کے ذاتی رجحانات کا اس اپنی تحریر سے کیا اندازہ ہوتا ہے۔ صاحب حیات حافظ رحمت خاں نے دعویٰ کیا ہے "ہمارا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے ہیرو کا قلب نکال کر دنیا کو اصلی حالت مشاہدہ کرادیں۔ اس قلب کے محسوسات و واردات کو کچھ ہیں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور کچھ ناظرین سمجھیں" جس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اس سے اس دعویٰ کی حقیقت پوشیدہ نہیں۔ ان کی شخصیت کو سمجھنا حقیقتہً بہت دشوار ہوتا ہے لیکن ان کی تصنیفات اور تحریریں بہت کچھ ان کی شخصیت پر روشنی ڈال سکتی ہیں افسوس ہے کہ حافظ الملک کی کوئی تصنیف کردہ کتاب بجز خلاصۃ الانساب کے دستیاب نہیں ہوئی۔ الطاف علی صاحب بریلوی ان کی دو کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن ان سے استفادہ نہیں کرتے ایک دوسری کتاب کا ذکر کرتے ہیں جسے حافظ الملک نے پشتو کی ایک قدیم کتاب سے ترجمہ کیا تھا۔ نہایت غیر ذمہ دارانہ طور پر علی گڈھ کا گریجویٹ اپنی مایہ ناز کتاب میں لکھتا ہے کہ اس کتاب کا ایک نسخہ بانکی پور خدا بخش خاں کی لائبریری میں موجود ہے۔ ہمیں تو اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ لہذا خلاصۃ الانساب کے ناقص نسخے سے جو کچھ مواد حاصل ہو سکتا ہے اسی پر اکتفا کر کے اسے ہدیۂ ناظرین معاصر کیا جاتا ہے۔

پیش نظر نسخے میں محض ۴۲ صفحات ہیں اور ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں ہیں۔ اس کے ۵۳ اوراق کی ایک دوسری فارسی کتاب اس جلد میں شامل ہے چونکہ یہ ناقص الاول و ناقص الآخر ہے پتہ نہیں چلتا کہ کس کی تصنیف ہے۔ مسائل فقہیہ مسائل تصوف اذکار صوفیۂ کرام ادعیہ وغیرہ پر یہ دوسرا نسخہ مشتمل ہے۔ ہم اسے نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ خلاصۃ الانساب کا ابتدائی صفحہ بھی موجود نہیں اور معلوم نہیں آخر کے کتنے اوراق غائب ہیں۔ حافظ الملک نے حسب دستور قدیم کتاب کا آغاز حمد و ثنا سے کیا ہے۔ چند اقتباسات قابل توجہ ہیں "ثنائے است مرآں خدا را کہ ما باں را بشرف نور اسلام مشرف ساخت و بوفائے وعدۂ روز میثاق قالوا بلیٰ محکم و مستحکم گردانید و بخلعت دین احمدی و ملت محمدی سرفراز فرمود کہ جمیع رسل ماضیہ و اُمم سابقہ را آرزوے آں بودہ کہ اگر مایاں از جملۂ امت محمد آخر زماں می بودیم چہ خوش بودے و اگر درعہد وے پیدا می شدیم چہ نیکو بدے و ثنائے است

مرآں خدارا کہ مایاں را بطریق اہل سنت وجماعت محکم ومستحکم گردانید واز طرق دودہ مذاہب باطلہ مجتنب ومحترز نمود کہ آں مذاہب روافض ومعتزلہ وخارجیہ وشیعہ وغیرہم است بموجب حدیث مجموع ایشاں ہفتاد ودو فرقہ اند وجمیع اہل نار اند نعوذ باللہ منہا ۔۔۔۔۔۔

واں فرقہ واحدہ کہ از جمیع انسان مستثنیٰ شدہ فرقہ اہل سنت وجماعت است کہ ایشاں را فرقہ ناجیہ گفتہ شدہ است وناجیہ بمعنی نجات یابندہ است از عذاب دوزخ چراکہ ایشاں بطریق صواب وصراط مستقیم ثابت وقائم اند وفرق دیگر چنانچہ روافض وخوارج ومعتزلہ وغیرہ ایشاں ہمہ بر غلط وخطا رفتہ ودرتحت وعید اند کہ آخر الحدیث وھو کلھم فی النار ۔ اس دلچسپ بحث پر حافظ الملک کچھ اور بھی فرمانا چاہتے تھے مگر قلم کو روک کر وعدہ فرماتے ہیں کہ آخر کتاب میں اپنے مزید تاثرات پیش فرمائیں گے اگرچہ دریں مقام چیزے گفتگوئے دیگر ہم درحق اہل بیت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم وخلفائے راشدین واصحاب کرام رضی اللہ عنہم ودر رد روافض وخوارج بہ فہم قاصر ایں عاجز رسیدہ اما چوں ایں دیباچہ امکان گنجائش آں ندانست ۔ ازاینجا موقوف گردیدہ در آخر کتاب انشاء اللہ تعالیٰ بیان آں کردہ خواہد شد" افسوس ہے کہ ہم تک یہ آخری ٹکڑہ نہیں پہونچا ۔ لیکن قارئین معاصر کی دلچسپی کے لئے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جو اس کتاب کا نام رکھا ہے وہ بھی ان کے مذہبی غلو کی غمازی کرتا ہے ۔ "خلاصۃ الانساب مشتملہ علیٰ رد الرافض والمرتاب"۔ حافظ عبدالغنی صاحب اخبار الصنادید میں حافظ الملک کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں " وہ مذہبی معاملات میں بڑے متعصب تھے ۔ ان کے قواعد ایسے سخت تھے کہ اُن کا برتنے والا آج کل وہابی کہلاتا ہے" لیکن حافظ الملک ایک راسخ العقیدہ حنفی مسلمان کی طرح حب اہل بیت سے خالی نہیں تھے ۔ لکھتے ہیں ۔ "ثنائے است مراں خدارا کہ مایاں را دوستدار اہل بیت واصحاب کبار گردانیدہ ودرجہ بدرجہ بمرتبہ ایشاں شناسا ساخت ودرحق ہیچ یکے بغض وکینہ درخاطر مانینداخت پس امید کہ نتیجہ ایں چنیں محبت ووداد ذریعہ مغفرت مایاں شود ووسیلۂ نجات شود وبہ نعیم ابدی وبہشت جاودانی رساند ۔

خدایا بحق نبی فاطمہ — کہ بر قول ایمان کنی خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول — من ودست ودامان آل رسول

اس کے بعد "نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم" کی منزل آتی ہے۔ بجز اس کے کہ یہاں قرآن مجید کی آیتیں افغانی وسعدی اور دوسرے شعرا کے اشعار بار بار لائے ہیں کوئی چیز قابل ذکر نہیں۔ نعت میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں اسے ہر مسلمان ورد زبان یا حوالۂ قلم کرتا ہے۔ "بعد از حمد احد و درود احمد" مصنف تمہید و مبتدائے کتاب" کی طرف توجہ منعطف فرماتے ہیں اور کتاب کا اصلی سبب تصنیف بتاتے ہیں "میگوید عاصی پر معاصی امیدوار مغفرت حافظ رحمت خاں ابن شاہ عالم کوتہ شہ خیل بدل زئی بڑیچ عفر اللہ تعالیٰ ذنوبہ وستر عیوبہ دیدم کہ اکثر اشراف زادگاں ولایت بہ حسب قسمت انجور سد از ملک و وطن خویش بیجا شدہ آمدہ در ہندوستان متوطن گشتہ اند و پشت در پشت گذشتہ آل و اولاد ایشاں انساب خود ہا را فراموش کردہ، ہیچ نمی دانند کہ کسے باکسے نزدیک تر و کدام یا کدام قریب تر مگر اینقدر می دانند کہ فلانے زخیل و فلانے زقوم ہستیم پس چوں کہ بندہ ہم ابا عن جدٍ ولایت برائے ست چناں کہ قبلہ گاہی ابوی و اعمام بندہ از راہ قسمت آنجور ہندوستان آمدہ ساکن شدہ بودند بندہ ہم در پس ایشاں آمدہ طرح اقامت در اینجا انداخت۔ پس چونکہ بندہ را و ایشاں را نیز توالد و تناسل شدہ جمع کثیر گشتیم ہر چند کہ از فرزنداں سعادتمنداں خود و اولاد ایشاں از نسب خود شناختن اقربا و ذوی القربا استفسار نمائم ہیچ نمی دانند و قریب و بعید نمی شناسند لاجرم انچہ باین فقیر بتفصیر از انساب خود و غیر خود اطلاع بودہ فراخور علم و دانش خود بیاں نمودہ در تحریر آوردتا بترک تعلیم ان معائب نگردد و در مواخذہ نیفتد . . . . و نیز از رعایت صلہ رحمی کہ از جملہ واجبات است بے بہرہ نمانند قال اللہ تعالیٰ لا تعبدون الا اللہ و بالوالدین احسانا و ذی القربیٰ۔ و ہم در نیں مجہول النسب نشوند کہ موجب تخفیف ایشاں خواہد بود . . . . از اکثر اہل عجم نسب خود ضائع شدہ است مگر از قوم افغاناں ضائع نشدہ است زیرا کہ در تفاسیر و تواریخ از ابتدائے دور حضرت ابراہیم و حضرت یعقوب صلوات اللہ علی نبینا و علیہما تا غایت ملک طالوت و از طالوت تا افغان قیس عبدالرشید تا ہذا الیوم شاخ در شاخ گروہ در گروہ قبیلہ در قبیلہ آمدہ اند فکیف یکون مجہول النسب لان العلتہ فی عدم الاکفاءۃ جہالتہ النسب وھی لم توجد فی حقھم فظھر انھم صحیح النسب۔

یہاں پہونچکر مصنف کتاب کو تفاخر نسبی کے متعلق اسلام کی صحیح تعلیم کا احساس ہوتا ہے۔

قرآن مجید کے متعلقہ مشہور فقرات کو حوالہ قلم کرتے ہیں لیکن پھر اپنے ذاتی خیالات و رجحانات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ نجابت و شرافت ذات کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ دلیلیں پیش کرتے ہیں اور حدیثوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اپنی کتاب کا اصل مقصد و ماخذ بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں

اگرچہ نزدیک حق تعالیٰ نسب را اعتبارے نیست و فخر آدمی از ذات و نسب است قال اللہ تعالیٰ فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذٍ ولا یتساءلون بلکہ حرمت و منزلت آدمی از ورع و تقویٰ است قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَ اللہِ اَتقٰکُم لیکن در عالم روزگار و امور دنیوی وقر و وقار آدمی بسبب شرافت ذات و نجابت اصل می باشد چنانچہ عادت ہم براین جاری شدہ کہ رسل و انبیاء از قبیلہ اعلیٰ و اصطفٰی مبعوث می گردانید تا در چشم مردماں حقیر نیایند و بہ دیدۂ استخفاف در ایشاں ننگرند و ہم چنیں شرع شریف نیز ایشاں را اعتبار دادہ است چنانچہ تعزیر شریف و خسیس برابر نیست کما جاء فی کتب الفقہ اذا قال یا الفاء یتنبۃ یا ناکس ان قال لا اشراف عزر و الا لا (فلا) و ہم چنیں در حق نبات اشراف و ارذال نیز ترتے آمدہ است کما قیل منکوحتہ ایت آن تطبخ و تخبز فعلی الزوجہ ان یاتی بمن تطبخ و تخبز ان کانت من نبات الاشراف و الالا و از رسول مقبول نیز ایں چنیں بہ صحت پیوستہ است کقولہ علیہ السلام اذا جاءکم سیدُ قوم فاکرموہ۔ و دیگر مجہول النسب می شود و مطعون و معیوب میگردد و از صلۂ رحمے کہ از جملہ وجوبات است محروم می ماند وھکذا در مواضع بسیار کہ حاجت بیان ندارد۔ پس چونکہ معرفت انساب و اقارب خود از جملہ ضروریات دانستہ شد معرفت انساب غیر در بعضے مقام نیز ضرور تر باید دانست چنانچہ معرفت نسب حضرت نبوی مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم تا چہار پشت کہ متفق علیہ است چنانچہ بگوید کہ ایمان آوردہ ام بہ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام یعنی محمد ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب ابن ہاشم ابن عبدالمناف کہ از جملہ مفروضات است و ہم چنیں معرفت انساب ائمہ اربعہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بقول بعضے بداں کسے کہ مذہب او باشد بہتر و اولیٰ است چنانچہ حنفیاں را کہ نعمان بن ثابت بن طاؤس بن ہرمز و ھکذا مالکیاں را و حنبلیاں را و شافعیاں را تا مذہب ایشاں صحیح گردد۔ و ہم چنیں

معرفت نسب ابنائے واہل عصر نیز در چنیں معاملہ روزگار کہ ازاں لابدی و ناچارگی می باشد مثل ازدواج خواہران و دختران کہ در کتب آمدہ است کہ اولاد را بر والدین خود چند حقوق می باشد کہ بعضے ازاں جملہ ایں است کہ نام والد خود خوب و نیکو بہ نہند و علم دین ویرا بیاموزانند و جمیع اوامر و نواہی حق جل و علی را بشناسند و بجائے نیک منسوب سازند و بمقام احسن و مستحسن ازدواج دہند۔ تا حق اولاد ادا شدہ بحق خود برسند و با اولیاء ایشان عار و بدنامی لاحق نگردد۔ لاجرم آنچہ من حقیر پر تقصیر از انساب خود و دیگر اقوام افغانان از کتب تواریخ چنانچہ تواریخ خان جہانی و تواریخ شیر شاہی و تذکرہ برہان السالکین اخوند درویزہ قدس سرہ معلوم شدہ در حیز بیان آوردہ و آنچہ صورت حال بعضے اقوام افاغنہ از سبب عدم تسطیر کتب مذکورہ مخفی و مستور ماندہ بود از آنجا کہ بندہ ولایت زائے بود و بر اصل و نسب ہر یک قوم اطلاعے داشت معہذا از ثقات معتبر و رؤسائے ہر قوم کہ از فضل ایزدی بعلاقہ نوکری و چاکری بسیار از بسیاری پیش اینجانب حاضر بودند تحقیقے و تفتیشے کردہ شدہ چنانچہ بعد تواتر و بہ مرتبہ صحت و تعیین رسیدہ آنرا مثبت گردانیدہ باقی واللہ اعلم حقیقۃ الحال بنا برایں رسالہ مختصرہ مسمیٰ بہ خلاصۃ الانساب خود و غیرہ مطابق علم و استعداد خویش تصنیف شدہ مرتب گردید و بہ خلاصۃ الانساب مشتمل علی رد الرافضی و الترہات مسمی گشت تا ہر کہ از اولاد اینجانب و کوتہ خیل وغیرہ اقوام افاغنہ ازیں مستفید شدہ بہرہ ور گردد و بخویش و بیگانہ و قریب و بعید وقوف یابد۔ ایں عاصی پر معاصی امیدوار فضل باری را بوسیلہ ایں رسالہ بدعائے خیر خاتمہ و جمعیت دارین و سلامتی کونین یاد و شاد فرماید کہ بموجب ارحموا ترحموا دمے نیز متوقع مرحمت و دعا گردد اَللّٰھُمَّ احسن عاقبتنا فی الامور کلہا و اجرنا من خزی الدنیا و عذاب الآخرۃ آمین یا ارحم الراحمین۔

دیوانِ سیّد راجا (رحمۃ اللہ علیہ)

اب سے تقریباً بارہ برس پہلے ایک صاحب نے مجھے ایک قدیم فارسی مخطوط دکھلایا جو بالآخر کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور کے لئے خرید لیا گیا۔ اس نسخے میں جو ناقص الاوّل معلوم ہوتا ہے کئی باتیں جاذبِ نظر تھیں۔ کسی صوفی بزرگ کے جن کا تخلص راجا تھا اور جو بیاض تھے ۱۵۹۹ اشعار اس دیوان میں موجود ہیں۔ بجز ۹ عربی ابیات کے کل کے کل فارسی زبان میں ہیں زیادہ تر متصوفانہ غزلیات ہیں جن میں حروف تہجی کا قاعدہ ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے جا بجا قطعات کے علاوہ دو مثنویاں سات رباعیاں اور ۶۹ اشعار پر مشتمل ایک زوردار قصیدہ ہے جس میں علم کلام کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ شاید سب سے اہم آخری تین غزلیں ہیں جس کا پہلا مصرعہ فارسی اور دوسرا ہندی ہے ان کی مجموعی تعداد ۴۳ ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ شروع کے کتنے اوراق غائب ہیں۔ ایتھے ETHE نے انڈیا آفس لائبریری کے ایک مخطوط "دیوان راجا" کا ذکر کیا ہے جس پر ۱۱۰۵ھ کی تاریخ کتابت درج ہے مگر جو مطلع نقل کیا گیا ہے وہ بانکی پور کے نسخے میں موجود نہیں۔ ہم طرح وہم قافیہ اور ہم ردیف اکثر غزلیں ہیں۔ موجودہ نسخہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے "آندم کہ دے زمانے یاد دوست خود بجا شد۔ آندم وصت باقی اندر زماں نہ گنجد" بانکی پور کا نسخہ قدیم ترین معلوم ہوتا ہے شاید مصنّف کی وفات کے کچھ ہی سال بعد لکھا گیا۔ خط صاف نستعلیق ہے کاغذ کہنہ و فرسودہ قدرے کرم خوردہ ہے۔ آخری صفحے کی عبارت حسب ذیل ہے "تمام شد نسخہ دیوان سیّد راجا قدس سرہٗ العزیز بوقت استوا بروز پنجشنبہ بتاریخ بست و ہفتم من شہر رمضان المبارک فی سنہ ۱۰۹۶ ہجری مطابق جلوس میمنت مانوس سنہ ۳۱ در عہد خلافت ابو المظفر محی الدین محمد اورنگزیب عالمگیر بادشاہ غازی و بعمل نواب مستطاب بزرگ امید خاں و دیوان فضیلت نشان میر معز۔

کاتب و مالک نسخہ ہذا فقیر ذرۂ حقیر ابو العادل محمد (مٹائے ہوئے الفاظ) .... ولد عبدالسمیع بن .... شفیع صدیقی مالک و ساکن سلیم پور .... مضاف سرکار صوبہ بہار"۔

نواب بزرگ امید خاں امیر الامرا نواب شایستہ خاں کے بیٹے اور شہنشاہ اورنگزیب کے ممیرے بھائی تھے جروہ حاجی پور کے مشہور اور قدیم مزار مسمی ماموں بھانجہ کے قدیم وثائق میں مجھے دو پروانے" بزرگ امید خاں خانہ زاد عالمگیر بادشاہ" کے عطا کردہ دستیاب ہوئے تھے ایک سے معلوم ہوا کہ ۳ محرم ۳۶ھ کو شیخ بایزید متولی مزار کو پچاس بگہہ زمین عطا کی گئی تھی۔ ان کاغذات میں صفی خاں سابق صوبیدار اور متعدد دیگر ناظمان بہار کے پروانے اور سندیں بھی ملی تھیں۔ اسی سال یعنی ۱۵ ربیع الاول ۱۰۹۴ھ میں ہم صفی خاں معتوب و معزول صوبیدار بہار کو دربار شاہی میں پاتے ہیں۔ بزرگ امید خان کے تقرر بہار کی تاریخ اب متعین کی جا سکتی ہے دوسرے پروانہ پر ۱۰ محرم ۳۳ھ جلوس کی تاریخ ثبت ہے۔ صاحب مآثر عالمگیری لکھتے ہیں کہ ۱۱ ذی قعدہ ۳۳ھ کو بزرگ امید خاں" صوبیدار بہار" خان جہاں بہادر ظفر جنگ کی جگہ الہ آباد کے ناظم مقرر ہوئے۔ لیکن آگے چل کر اسی کتاب میں مرقوم ہے کہ ۸ رجب ۳۸ھ جلوس کو بزرگ امید خاں" صوبیدار بہار" فوت ہوئے اور ان کی جگہ فدائی خاں کو حکومت بہار تفویض کی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ امید خاں پھر بہار واپس ہوئے اس لئے اسپہبد رخاں کے متعلق مرقوم ہے کہ الہ آباد میں بزرگ امید خاں کے" انتقال" سے جو جگہ خالی ہوئی وہ ان سے پر ہوئی۔ بہرکیف تتمۂ دیوان کی عبارت اپنی جگہ بہت صحیح و درست ہے تاریخ و نام سے کوئی دقت پیدا نہیں ہوئی۔ میر معز مشہور ایرانی مرزا جان مشہدی کے نواسے تھے۔ ۱۰۹۳ھ میں ہندوستان تشریف لائے اورنگ زیب نے اپنی سالی شاہزادہ اعظم شاہ کی خالہ زاد دختر شاہنواز صفوی سے ان کی شادی کرادی اور انہیں پٹنہ اور بہار کا دیوان مقرر کیا۔ عرصہ تک بہار میں اس عہدہ پر فائز رہے لیکن بزرگ امید خاں سے بقول صاحب مآثر الامرا ان کی نہیں بنی نفاست پسند ناظم کے بنا کردہ حوض پر کھیتی کرنے پر نزاع واقع ہوئی۔ میر معز نے حاجی پور میں قیام لیا۔ یہاں کی زرخیز زمین ہر دہ کی کاشت، کٹھل کی ندرت وغیرہ کے متعلق میر معز کا

ایک دلچسپ خط ان کے مکتوبات میں محفوظ ہے جو سیف خاں سابق صوبیدار بہار اور خاتون تاج ممتاز محل کے نسبتی بھائی کو اس وقت بھیجا گیا جب وہ ناظم الہ آباد تھے مدرسہ سیف خاں، مسجد سیف خاں اور محلہ سیف خاں ان کی یادگار رہیں ہیں۔ میر معز ایک فاضل ادیب اور نغز گو شاعر تھے سنہ ۳۲ھ میں انہیں موسوی خاں کا خطاب اور دکن کی دیوانی عطا ہوئی تھی۔ مالک و کاتب نسخہ کا حال کچھ معلوم نہیں۔

زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں سید راجا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق باوجود کد و کاوش تلاش و تفتیش کچھ تشفی بخش واقفیت حاصل نہ ہو سکی۔ ایتھے نے لکھا ہے کہ کسی تذکرے سے راجا تخلص کے کسی بزرگ کا پتہ نہیں ملتا بہت سے بزرگوں کی طرح ان کے حالات بھی پردۂ خفا میں مستور رہے۔ مخزن الانساب فی نسب السادات الفاطمہ مولفہ مولوی سید کریم الدین مرحوم بہاری نے اس نام کے دو بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ سید راجا عرف سید راجو جو سید قطب الدین کڑا وی کی نویں پشت میں تھے۔ اور سید راجا ابن سید نقی چشتی ـــــ موخر الذکر کے اجل خلفا میں میر سید اسد اللہ چشتی مودودی کا نام آتا ہے۔ ان میں کسی کا زمانہ متعین نہیں کیا گیا نہ یہ معلوم ہو سکا کہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ البتہ صحیفہ شہبازیہ مولفہ مولوی محمد یونس بہاری سپرنٹنڈنٹ مدرسہ حسامیہ (مطبوعہ صوفی پرنٹنگ ورکس پنڈی بہاء الدین پنجاب) میں عہد شاہجہانی کے ایک بزرگ سید راجا کا ذکر آیا ہے جو بھاگل پور کے مشہور عالم صوفی حضرت مولانا شہباز کے مرید خاص تھے۔ حضرت شہباز سنہ ۹۵۶ھ میں دیورہ ضلع گیا میں متولد ہوئے۔ تیس برس کی عمر اور سنہ ۹۸۶ھ میں بھاگل پور تشریف لے گئے جہاں محلہ ملنا چک میں درس و تدریس رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ اور وہیں سنہ [illegible]ھ میں رحلت کی اور مدفون ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں اپنے ایام شاہزادگی میں باپ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں سے برگشتہ ہو کر بہار پہنچا بھاگل پور میں حضرت شہباز قدس سرہ کے پاس بغرض دعائے فتح و نصرت حاضر ہوا۔ آپ علمی درس میں مشغول تھے زیادہ التفات نہ فرما سکے لیکن اتنا ہندی میں کہا "بچھن اچھے ہیں"۔ شاہ شجاع نے بھی شاید ان کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ان کے خلفا میں شاہ خواجہ میر علی۔ مولانا منان۔ سید نظام الدین قطب الدین وغیرہ کے علاوہ

دیوان سید راجا کا نام بھی صحیفۂ شہبازیہ میں آیا ہے۔ موخر الذکر بنگال کے میدنی پور دیناج پور وغیرہ اضلاع میں بغرض تبلیغ و اشاعت بھیجے گئے تھے۔ علم رمل کی تعلیم مولانا خواجہ علی کو اور دعوت سیفی حضرت دیوان سید راجا کو عطا کی گئی تھی۔ حضرت سید راجا اپنے مرشد کی تجہیز و تدفین میں شریک تھے لہذا ۱۰۹۷ھ تک یقیناً زندہ تھے۔ تاریخ وفات معلوم نہیں ۱۰۹۷ھ کے قبل ہی ہوگی۔ اس لئے کہ قدس سرہ العزیز کا دعائیہ فقرہ اس کی شہادت دیتا ہے۔ داخلی شہادت کچھ پائی نہیں جاتی۔ ان کے مجموعہ کلام میں کچھ نہیں ملتا جس سے ان کے سوانح یا اس دور کے واقعات پر کچھ روشنی پڑسکے۔ البتہ ایک شعر پر کسی قدر نگاہ ٹھٹکتی ہے ؎ شہباز شہسوارم پر پائے قدس دارم۔ سبحان شسکار آرم اللّٰہ جُبّ لبُّم۔ شاید یہاں اشارہ ہو کہ آپ حضرت شہباز کے مرید تھے۔ آگے چل کر بتایا جائے گا کہ سید صاحب عروض میں پابندی اوزان اور دوسرے قیود کو کبھی کبھی نظر انداز کر دیتے تھے۔ اضافت مقلوبی کی مثال بھی ملتی ہے ہوسکتا ہے شہباز شہسوارم اصل میں شہسوار شہبازم ہو یعنی حضرت شہباز کا ایک اچھا سپاہی اور ان کا تربیت کردہ شہسوار۔ یوں تو اس شعر میں سید صاحب نے انسانی حوصلے اور روحانی قوت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عزم بلند کی مدد سے انسان دوسروں کو اپنے حلقہ میں لا سکتا ہے خود خالق کائنات کو گرویدہ کرسکتا ہے اپنے دام محبت کا اسیر بنا سکتا ہے یہ مضمون دوسرے شعراء کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے بھی فرمایا ہے ؎ در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے۔ یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ۔ اقبال کا اردو شعر بھی اس جگہ یاد آتا ہے ؎ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

حضرت سید راجا عربی، فارسی، ہندی تینوں زبانوں میں بلا تکلف اپنے خیالات کو موزوں شکل میں پیش کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ عربی کے ایک قطعہ نما غزل کے جو نو اشعار پر مشتمل ہے اور جو شاید کسی دور افتادہ مرید کو مخاطب کرکے لکھی گئی۔ پہلے اور آخری شعر یہ ہیں ؎

حبیبی صحی کنت دهراً مدیدا۔ فالآن قد صرت عنی بعیدا

... جا بقلب سلیم۔ تہدی علی کل حال شهیدا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث

اور بزرگوں کے اقوال برابر حضرت راجا کے زیر مطالعہ رہتے تھے اس غزل کا مقطع شاید بڑے پیر حضرت عبدالقادر جیلانی کے شعر سے "انا الموجود فاطلبنی تجدنی۔ فان تطلب سوائی لم تجدنی" متاثر ہوکر زبان پر آیا ہو۔ سید صاحب قرآن وحدیث کے برمحل اور برجستہ ٹکڑے اپنے کلام اور مضمون کی تائید میں لاتے ہیں سے کُنتُ سمعاً کُنتُ بصراً کُنتُ حق۔ کُنتُ یدہٗ کُنتُ رِجلہٗ بہر آں۔ یہاں مشکوٰۃ شریف کی مشہور حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بندہ ریاضت ونوافل وغیرہ کے ذریعہ سے خدا سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ خدا ہی اس کا سامعہ، اس کی نگاہ، اس کا ہاتھ، اس کا پاؤں بن جاتا ہے سے پیش از وجود ہر کس کاتب نوشت حرفے۔ جَفَّ القلمُ بما ھُوَ کائن چگونہ گردد سے اُنظر الی جبینی گوید رأیتُ ربی۔ ہذا دلیل حسبی اللّٰہ حُبُّ کُم سے ایں حدیث مَن عَرَفَ را فہم کن۔ ورنہ عارف کے شوی در عارفاں سے تفصلی صغیراً اے جواں آیت وحدیث در قرآں۔ تاگر شود بر تو عیاں نگر بجز اقوال تو سے گر تو بخواہی اے دلا تا شاد باشی دائما۔ اندر نگر کن متکا الا علی اللہ زہے دریم وجہ اللہ بیاں کردم ترا دادم نشاں۔ تاروے من بینی عیاں دیگر چہ می خواہی بگو سے آفتاب نور نعم ہر طرف چوں جلوہ داد۔ چشم باشد یا نباشد جلوہ جز مقصود نیست۔ یہ مثالیں بطور نمونہ از خروارے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے کلام عربی ہو یا فارسی چنداں در خور اعتنا نہیں لیکن خیالات کی بنا پر بہت وقیع اور قابل قدر ہے۔ حضرت راجا شاعری میں پابندی اوزان کا لحاظ کہیں کہیں نہیں رکھتے الفاظ میں ترمیم وتصرف کی مثالیں ملتی ہیں لفظ کا غیر صحیح استعمال اتنا نہیں جتنا اس کی حرکات میں غیر وضعی ترمیم عروض اور صحت الفاظ سے جا بجا اور کسی قدر جو بے پروائی برتی ہے اسے محض کاتب کے تصرف پر محمول کرنا زیادتی ہوگی ہوسکتا ہے کہ حضرت راجا پر گو شاعر تھے قلم و کاغذ کے پابند نہ تھے کثر دوسرے صوفی شعرا کی طرح برجستہ اپنے خیالات کو منظوم شکل میں پیش کرتے رہتے تھے۔ روانی خیال میں دوسری باتوں کا چنداں دھیان نہ رہتا ہو مریدین جوں کا توں اسے نقل کر لیتے تھے شاعر نے نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہ کی ہو کم سواد مریدین بھی ایسے اغلاط کے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔

؎ مطلوب نہ طلبیم کہ ایں طلب حرام است ۔ واللہ نگوئیم کہ در شرک بمانیم ؏ چیزے کہ خوردی
در دہر پرستش شود از وے اگر ــــــ جس معنی میں سید صاحب نے طلب کو استعمال
کیا ہے اس میں لام پر فتحہ ہونا چاہئے دہر میں انہوں نے ہائے ہوز کو متحرک کر دیا ہے اور بھی
کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ؏ درمیاں بہشت خاصان جائے شہدائے بود ۔ ؎
براق چوں راندیم ز ناسوت بہ لاہوت ۔ از بعد نوشتیم کہ در قرب بمانیم ؎ در خدا مسدود کردی
وا کردی در خدا ۔ ایں ہوا را اے برادر کے خدا دار در وا ؎ شہباز لامکانم بیروں ز کون مکانم ۔
مسجود انس و جانم مطلب تو شیانم ؎ نیست تنگے بعد دیدن روئے خوباں بے حجاب ۔ سید
راجا گشت مجنوں خصلت دیگر گرفت ؎ حقیقت لایزالی را نبود دلا کیف ۔ بدیدم در مکاں
لیکن منزہ از مکاں دیدم ؎ چاکری مخلوق کردن کار دانا کے بود ۔ بر در مخلوق رفتن جز خوری
نیست نیست ؎ قلب مومن حرم خانہ دخل غیرے شد حرام ۔ یک زنے را دو شوہر خفیہ
یکجا کے بود ۔

لیکن حضرت راجا کے کلام میں اچھے اچھے شعر بھی ہیں ۔ زبان میں بھی مجموعی طور پر کافی
سلاست اور روانی ہے بعض شعر تو نہایت صاف اور سادہ ہیں اور ضرب المثل کی حیثیت
رکھتے ہیں ؎ گر راست خواہی برو راہ راست ۔ بجز راست رفتن دریں رہ خطا است ــــ
؎ بیخ برکن آں درختے را کہ در وے بار نیست ۔ عاشقاں را کار با کار دست و با گفتار نیست ۔
برجستہ و برمحل محاوروں سے بھی کلام خالی نہیں ؎ اے مرد درمیداں بیا گر سر رود رفتن بدہ ۔ با عشق
درمیداں بیا گر سر رود رفتن بدہ ۔ بعض اشعار مضمون اور خیالات کے لحاظ سے بہت خوب اور بلند
پایہ ہیں ؎ چوں طمع بریدیم داز خویش گذشتیم ۔ با دوست بماندیم و دے دوست نخواہیم ــــ
ایں دواں کا فرق محض حرص و طمع کی دنیا تک ہے جب ہوس و آز کی جڑ ہی کٹ گئی اور ہم اپنے
خود ساختہ حدود سے باہر ہو گئے تو پھر دوست سے اس طرح مل جاتے ہیں کہ دوست کی خواہش
کا سوال ہی باقی نہیں رہتا ؎ آزاد بگشتیم چو از خویش برستیم ۔ تا باد چنیں باد کزیں حال نہ مانیم
جب ہم نے اپنی ہستی کو کسی کی ذات میں فنا کر دیا اور اپنے آپ سے گذر گئے تو یہ ہماری حقیقی

آزادی ہے اور یہ کیفیت بھی جب تک ہے تب ہے، ہمیشہ رہنے والی نہیں ۔ تفویض ہمہ کار چو بر یار بکردیم ۔ دیدار نہ جوئیم و غم بہشت نہ داریم ۔ اگر لفظ بہشت کی غیر وضعی ترکیب سے قطع نظر کی جائے تو یہ شعر بھی اپنی جگہ اچھا ہے ۔ ہر خواہشات معشوق کے حوالے کر دی گئیں تو پھر علیحدہ سے کوئی خواہش ہمارے دل میں پیدا ہو اور من و تو کی تفریق قائم رہے ناممکن ہے ۔ نہ اب بہشت کی آرزو پیدا ہو سکتی ہے نہ دیدار خدا کی وہ دل ہی اس کے پاس ہے جس میں خواہشات پیدا ہوتی ہیں ۔ ؎ چوں بقائے لایزالی در نہاد ما نہاد ۔ صد ہزاراں نیستی در ذات ما زیبا نہاد ۔ جب ابدی البقا نے میری فطرت میں اس نے رکھ دی تو لاکھوں نیستی میری ذات میں مضمر کر دی یعنی انسان اپنے منتہائے حقیقت کے لحاظ سے لایزالی ہے ۔ اس کی روحانی ترقیاں ہر نئی منزل میں ایک نیا لباس وجود اور خلعت بقا حاصل کرتی ہیں اسی لحاظ سے اس کی مسلسل پرواز عالم لایزال میں اور فنا و بقا میں جاری رہتی ہے اور ہر گذری ہوئی منزل نئی منزل کے مقابلے میں فنا کے مترادف و ہم معنی ہے ۔ اس کا مفہوم رومی کے مشہور شعر ؎ ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام ۔ ہم چو سبزہ بار بار روئیدہ ام ۔ میں بھی موجود ہے ۔ یہ شعر بھی نہایت خوب ہے ۔ سید صاحب اور مولانا روم کے ان دو اشعار کی روشنی میں اس حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جس کا تعلق سرور کائنات اور دیگر انبیا علیہم الصلوۃ کی ذات سے ہے اگرچہ انبیاء کل کے کل گناہوں کی آلائش سے پاک اور مطہر ہوتے ہیں لیکن ایک منزل سے دوسری منزل بقا کی طرف صعود کے لئے توبہ زینۂ ارتقا کا کام دیتا ہے کیونکہ توبہ کے لغوی معنی رجوع یعنی رجوع الی اللہ کے ہیں ۔

جو حضرات سید راجا اور مولانا روم کے ان دو اشعار میں ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ کی جھلک دیکھتے ہیں وہ مشہور اردو شاعر سودا کے ان اشعار کو ملاحظہ کریں ؎ مدعا آگئے سے ہے نشو و نما ۔ ہر جگہ کرنا خودی سے ہو فنا ؛ ہے غرض قالب سے دل ہر ایک کا ۔ تملعت خالق میں بد اور نیک کا ؛ لیک انسانات سے تا وحش و طیر ۔ دیکھیں قالب سے مطلب ان کی سیر ۔ یوں کلام مولوی دے ہے خبر ۔ یعنی میں جس دل میں دیکھا بیٹھ کر ؛ کچھ نظر آیا نہ غیر از اسکی ذات ۔ اس قدر پایا محیط کائنات ۔

سید صاحب کے دیوان کی اور بزرگوں کی طرح ایک نمایاں خصوصیت اخلاقی اور ناصحانہ کلام ہے ایک پورا قطعہ جس کا پہلا شعر یہ ہے سہ چوں جان ز تن گردد جدا از فعل تو پرسد خدا۔ پس تو چہ گوئی اے گدا آنکہ بگو احوال خود ۔ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے ان ۲۶ اشعار میں سید صاحب ہمیں سمجھاتے ہیں کہ اپنی تمام زندگی دین اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر ہی گذارنی چاہئے۔ ورنہ کامیابی تو علیحدہ رہی عذاب دوزخ سے کسی طرح چھٹکارا نہیں مل سکتا ہے وہ تمام جزیات جو قرآن و حدیث میں بتائی گئی ہیں قیامت کے پہلے اور حیات بعد الممات کے متعلق نہ صرف ایمان لانا بلکہ ان کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنا ضروری ہے ۔ منکر نکیر ۔ صور اسرافیل ۔ پل صراط ۔ میدان حشر میں نفسی نفسی کی پکار جزا و سزا ۔ غرض ان کل باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ دو مثنویاں بھی اس ضمن میں قابل ملاحظہ ہیں دوسری مثنوی میں جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے سہ از دوزخ نہ ترسم نہ جویم بہشت ۔ کہ تقدیر من بو سابق نشست :: سید صاحب نے منجملہ اور باتوں کے دو پر خاص طور پر زور دیا ہے ایک منفی دوسرا اثباتی ۔ انسان کی نجات اس کی کامیابی اس کی روحانی اور مادی ترقی کا راز ان دو باتوں میں مضمر ہے ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی ذات کو مشیت خداوندی کے سپرد کر دے اور دوسری بات خودی و انانیت سے باز رہنا ہے کیونکہ انانیت و خودی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو تباہی کا مرکز بنا دیتی ہے کہتے ہیں سہ ز ابلیس عبرت ببایدگرفت ۔ خودی در خدائی نہ شاید گرفت :: ابلیس کا قصہ اور بلعم اسرائیل کی داستان چھیڑ کر ہمیں جتاتے ہیں کہ یہ خودی کے ہولناک نتائج تھے سہ بجز خود پرستی ندیدم بدی ۔ تو از خود گذر کن کہ گفر ست بدی :: پہلی مثنوی میں بھی جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے سہ اہل دل را جز خواطر نیک اولی کے بود ۔ از اوام درگذشتن کار غفلا کے بود :: کئی اچھے اچھے شعر ہیں جن میں نصیحت آمیز اور عبرت انگیز باتیں بتائی گئی ہیں ۔ اور بھی متعدد اشعار ہیں جن میں خوف خدا ۔ رضا جوئی خدا ۔ شرم و حیا ۔ پاسبانی نفس ۔ توبہ و استغفار ۔ کار خلق ۔ راست جوئی کی تلقین کی گئی ہے ۔ اور خود پرستی خودنمائی حب دنیا سے برأت و بیزاری کی تعلیم دی گئی ہے سہ اے جواں کائے بکن کا حسنت باشد خلق را ۔ جہد کن تا کار تو مقبول باشد خلق را ۔

شاعر کے عقائد و مشرب کا صحیح جائزہ لینا اور اس کی روشنی میں مختلف مضامین کو حل کرنے کی کوشش کرنا اور تفصیلی تبصرہ کا حق صاحب ذوق اور ذی صلاحیت حضرات کو ہی پہونچتا ہے لیکن چونکہ حضرت راجا سے بہت کم لوگ واقف ہیں، ان کا دیوان کمیاب ہے اور اس سے اس زمانے کے صوفی شعراء کے جذبات و عقائد پر کچھ روشنی پڑتی ہے اس لئے اس پر ایک سرسری نظر بے محل اور غیر ضروری شائد نہ سمجھی جائے۔ صوفیوں کے دو مستقل گروہ ہیں ایک وحدت الوجود کا قائل ہے اور دوسرا وحدت الشہود کا حضرت سید راجا کا عقیدہ متعدد بزرگوں کی طرح وحدت الوجود تھا لیکن ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کی تفریق پر زور نہیں دیتے۔ خانقاہ نشیں ہیں اور خانقاہی ماحول سے پورے طور پر متاثر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ راسخ العقیدہ سنی اور عالم شرع بھی ہیں۔ تفضیلیت کا بھی شائبہ ان میں نہیں پایا جاتا۔ صاحب طریقت ہوتے ہوئے شریعت کی اہمیت کا انہیں احساس ہے تعلیم دینی و ظاہری کو تعلیم سلوک کے لئے ضروری سمجھتے ہیں انکے نزدیک دوسرے متقدر صوفیا کی طرح باطن کے طلب گار کے لئے ضروری ہے کہ علوم ظاہریہ یعنی قرآن مجید، حدیث، فقہ، منطق، اصول فقہ و کلام سے کما حقہ واقفیت حاصل کی جائے۔ نہ صرف علوم شرعیہ اور اس کے متعلقات سے ہی آگاہی ہو بلکہ پیر و مرشد کی ہدایت بھی ضروری ہے فرماتے ہیں ؎ علم باید علم کامل تا بیابد راہ را۔ کے بود بے شیر مسکہ کے بود بے پیر پیر ؞ ابتدائے علم باید انتہائے ذوق و شوق۔ شوق قمری در نگر از عشق او پوشیدہ طوق ؞ صرف باید نحو باید فقہ باید با اصول۔ علم کلی خوب باید تا بود ادرا وصول ؞ علم را آموز اول آخر ایں جا پائے نیست۔ جاہلا را پیش حضرت حق تعالیٰ جائے نیست ؞ علم حق نور لیست روشن شل او انوار نیست۔ بے چراغ علم ہرگز پیش یاری بار نیست ؞

طریقت کی وادی میں داخل ہونے کے لئے اور بھی مدارج ہیں جن کی تفصیل کی ضرورت یہاں نہیں۔ کیفیت کے عالم میں بعض صوفیا خدا کی تجلیات ہر چیز میں آشکار پاتے ہیں۔ سید صاحب بھی اس سے بری نہیں۔ متعدد اشعار دیوان میں اس قسم کے موجود ہیں ؎ ہر جا کہ برفتیم بجز دوست نہ دیدم۔ ایں قول بگفتیم صوابست خطا نیست ؎ آشکارا یافتم من سر پنہاں

درجہاں بگاہ احمد گاہ آدم گاہ حوا یافتم ۔ گاہ او معشوق آمد گاہ عاشق آمدہ ست ۔ زین معانی گاہ لیلیٰ گاہ مجنوں یافتم ٭ سالہا باشد کہ می جستم حبیب خویش را ۔ ایں زماں در ہر چہ دیدم عین او را یافتم ٭ چوں وجود کس ندارد بالحقیقت جز خدا ۔ زیں وجود محض مطلق عین ہر جا یافتم ٭ ے وجود محض مطلق را ہمہ جا ہر زماں دیدم ۔ بہر سوئے بہر گوشے بہر صورت عیاں دیدم ے ہر چہ بینی جز خدا ہر گز مبیں ۔ وہم غیرے داں کہ جز پندار نیست ے در دہر ہمہ ذات خداوند تعالیٰ ست ۔ جز ذات خدا ذرہ ہمہ وہم و گماں ست ٭ رآجا کہ دریں دہر جہاں بود ہمیں گفت ۔ چیزے کہ بہ ہستی است خود آں عین ہمانست ٭ بادی النظر میں حضرت رآجا کے کلام میں ہندو مسلم خیالات کا بھی اشتراک پایا جاتا ہے بعض اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے تصوف پر ویدانت کا اثر ہے شنکر آچاریہ کے اکّم ادویتم کے ساتھ مایا کے نظریہ کی بھی جھلک ان کے تخیل میں دکھائی دیتی ہے کہیں کہیں خدا کی صفات اپنی طرف منسوب کرتے ہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیا پر بھی اپنی فضیلت جتاتے ہیں بعض اشعار سے تو ٹپکتا ہے کہ خدا کو اپنا زیر فرماں بتاتے ہیں کہیں کہیں حلول کا شائبہ بھی دکھائی دیتا ہے ے افلاک باکواکب مسکن ملا اعلیٰ ۔ ہر ایک زجا کریبا شاداں شدہ است مارا ٭ ذاتے کہ ہیچ گونست صورت نہ بست ہرگز ۔ آں ذات خود بصورت انساں شدہ است مارا ے باخلق حنیا بجے راجا نہ ماند ایں جا ۔ زیرا کہ در اطاعت یزداں شدہ است مارا ے در ملک خود مالک منم ہر چیز را بالک منم ۔ ایں رکشتم آں راز نم کس را نباشد چوں چرا ۔ وحدت الوجود کے قائلین پر اکثر بظاہر عقائد اسلامیہ کی مخالفت کا دھوکہ ہوتا ہے ۔ اکثر ایسے پہلو نکل آتے ہیں جو حقیقت میں صوفی شعراء کا اصل مقصود نہیں ہوتے ۔ سید صاحب وحدت الوجود کے ساتھ اتباع سنت سنیہ کے قائل تھے خدا و رسول ، امر و نواہی ، عذاب و ثواب سب پر ان کا ایمان تھا ۔ انبیا و اولیا کی نبوت وولایت کا ذکر کرتے ہیں ے انبیا و اولیا را حق بداں ۔ ہر معنی کردہ ام با تو عیاں ے انبیا و اولیا را حق ببیں ۔ ایں سخن تقلید نبود بالیقیں ۔ پیغمبر آخر الزماں اور حضرت علی امیر مومناں کے اقوال سند میں لاتے ہیں ے من رآنی گفت آخر مصطفےٰ ۔ چند باشی در حجاب این و آں ے لو کشف گفتہ علی پاک دیں ۔ بشنو ایں اشعار و شو مرد یقیں ۔ ان کے متعدد اشعار کا ماخذ حدیث ہے یا قرآن ے آدم کہ

علی صور گشت نمودار۔ واللہ بہ تحقیق ہمہ چیز دراں است۔ یہ تفسیر ہے خلق آدم علی صورتہ کی ؎

تو نیست بودی در جہاں بے نام بودی بے نشاں۔ با وصف خود کردم عیاں دیگر چہ می خواہی بگو ؎

در کنج چوں بودم نہاں بے نام بودم بے نشاں۔ از بہر تو گشتم عیاں دیگر چہ می خواہی بگو۔ یہاں مشہور حدیث کُنتُ کنزاً مخفیاً الخ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب تک لاتعین کے اندر ذات باری تھی اپنے آپ کو وہ خود ہی جانتا تھا کوئی جاننے والا نہ تھا جب ممکنات کی شکل میں ذات باری نے تجلّی کی انسان نے معرفت حاصل کی اس کے وجود کو ظاہر کیا۔ خدا کے وجود کا انسان سے ظہور ہوا۔

ایک غزل کا مطلع ہے اور خوب ہے ؎ در عقل نہ گنجیم کہ ما نور خدائیم۔ در فہم نیائیم کہ بے نام و نشانیم۔ دنیا کے مفکرین کا یہ عاجزانہ اعلان ہے کہ کوئی انسان حقیقت کا راز اب تک نہ معلوم کر سکا روح کیا ہے، روح اور جسم کا تعلق کیوں کر ہوتا ہے اور کس طرح علیحدگی ہو جاتی ہے۔ کائنات کے اندر یا باہر صرف دو ہی چیزیں ہیں جن کی کنہ و حقیقت تک رسائی ناممکن ہے ایک تو خدا کا وجود دوسرے انسانی حقیقت حکیم عرب کا قول ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ جس انسان نے اپنی حقیقت کو سمجھ لیا اس نے خدا کی معرفت حاصل کر لی۔ ہم عقل کے حدود میں نہیں سما سکتے کیوں کہ ہم خدا کے نور ہیں لہذا نہ خدا عقل میں سما سکتا ہے نہ اس کا نور۔ فہم و ادراک کے حیطہ میں ہماری اسیری ناممکن ہے ہم کون ہیں، کیا ہیں، کیونکر ہیں۔ یہ تمام باتیں ایک معمہ ہیں جسے کوئی فلسفی اب تک حل نہ کر سکا قرآن کی آیت ہے وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؕ خدا تمہاری ہستی میں ہے کیا تم نہیں دیکھتے ؎ در عشق چنانیم کہ معشوق فراموش۔ در ذکر چنانیم کہ مذکور ندانیم۔ شاعر وادی عشق اپنی گم گشتگی کو نہایت خوب صورت انداز میں پیش کر رہا ہے کہ ہم عشق و محبت میں کچھ اس طرح خود فراموش ہیں اور فنا فی العشق کا یہ زور ہے کہ معشوق کا تصور بھی باقی نہیں۔ اور یاد محبوب میں ہم اس طرح کھو گئے ہیں کہ کس کی یاد ہے اور کس کا ذکر ہے یہ بھی نہیں جانتے اسی غزل کا ساتواں شعر ہے ؎ از درد فراقش بہ ہمہ حال بنالیم۔ با آنکہ شب و روز ہمہ عین وصالیم۔ یہ ایک ایسا شعر ہے جو شعرائے صوفیہ کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے لیکن اس کی حقیقی تعبیر ایک معمہ ہے اور درد فراق اور اس کے اثرات کا بھی اظہار اور پیوستہ وصال

کا ادعا بھی ہے۔

دیوان میں سات رباعیاں بھی ہیں۔ ایک رباعی یہ ہے ؎ آنچہ آں جا عین باشد عین
ایں جا کے بود۔ مرغ کوچک گرچہ مرغ ست عین عنقا کے بود ؛؛ آب دریا عین دریا عین دریا عین آب
قطرہ مسکیں گرچہ آب ست عین دریا کے بود ؛؛ حقیقتِ وجود پر ایمان ہے لیکن یگانگت کے باوجود
تمام کائنات عین ذات باری نہیں ہو سکتی اس میں شبہ نہیں کہ موجیں، لہر، گرداب وغیرہ دریا کی حقیقت
سے علیٰحدہ نہیں۔ لہر بھی عین دریا نہیں اگرچہ دریا کی حقیقت ان تمام اشکال و مظاہر میں یکساں
داخل ہے۔ اس مسئلہ کو سید صاحب بڑے حسن و خوبی سے ظاہر کرتے ہیں فرماتے ہیں۔ ایک قطرۂ
مسکیں پانی تو ضرور ہے مگر عین دریا نہیں۔ مرغ کوچک مرغ ہونے کے باوجود عنقا نہیں ہو سکتا۔
امتیازات جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتے ہیں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے خالق و مخلوق۔ باقی و
فانی۔ زائل و لایزال کبھی ہم حقیقت نہیں ہو سکتے معترضین وحدت الوجود کو سید صاحب کا یہ
ہی جواب ہے۔

ایک قصیدہ کلامیہ جو ۶۵ اشعار پر مشتمل ہے دیوان راجا کی نمایاں خصوصیات میں شمار
کیا جا سکتا ہے۔ شروع میں فرماتے ہیں ؎ آں کلام ذات باری اے جواں۔ بے عبارت بے
اشارت بے نشاں ؛؛ بے تغیر بے تبدل بے حلول۔ در عبارت گشت منقول بر زباں ؛؛ ایں عبارت
گرچہ حادث آمدہ است۔ بوحنیفہ گفت او را عین واں ؛؛ ایں عبارت گر نبودے عین او۔ بے وے
بودے روایش پیش آں ؛؛ آں کلام ذات او محفوظ گشت۔ بے حروف اندر صدور حافظاں ؛؛
آں کلام ذات باری بے نزول۔ گشت منزل در جمیع امتاں ؛؛ آں کلام ذات وے مکتوب گشت۔
بانزاہست در کتاب کاتباں ؛؛ از کتابت ہست منزہ آں کلام۔ گرچہ آید در کتاب کاتباں ؛؛
گاہ آں توریت آید گہ زبور۔ گاہ آں انجیل آمد گہ قرآں ؛؛ گرچہ آمد در حدیث حادثاں۔ لیک او
دائم منزہ ہست ازاں الخ اس قصیدہ میں بھی وحدت الوجود کے مسائل پر بحث کی گئی ہے لیکن زیادہ
زور کلام الٰہی منشائے الٰہی پر ہے۔ جس طرح ذات باری قدیم ہے ویسے ہی کلام الٰہی بھی قدیم ہے
لیکن ؎ ایں سمائی در قدم ہست او قدیم۔ گشت حادث درمیانِ حادثاں۔ واجب الوجود

کے تعینات میں اشکال مختلفہ ظاہر ہوتے ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے کوئی تفرقہ نہیں کلام الٰہی ایک ہے شکلیں بدل جاتی ہیں کہیں صحیفہ کی شکل میں جیسے صحائف انبیاء سابقہ کبھی کتاب کی شکل میں جیسے توریت، زبور، انجیل و قرآن مجید۔ لیکن سب ایک ہی خدا کے کلام اور یکساں ہیں۔ کیونکہ ہر صحائف و کتب میں ایک ہی ہدایت ہے۔ خدا کی وحدانیت اور انبیاء و رسل کی ہدایت اور امر و نواہی جس طرح ذاتِ واحد کے لئے نہ مکاں ہے نہ زماں نہ کوئی نشان اسی طرح کلام الٰہی کیلئے نہ مکان ہے نہ زمان۔ بین الدفتین جو کچھ ہے ہماری انہام و تفہیم کے لئے کیوں کہ ہماری ہدایت اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ الفاظ بغیر تلبیس و تقدیس کے اگر ہوتے تو بلا وضو کے اس کی قرات روا تھی مگر ایسا نہیں اس لئے اس پر وجود خداوندی کا شائبہ ہے۔ پھر وحدت الوجود کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا ہے۔ تعینات و مظاہر کا فرق ذات واجب الوجود سے دکھلایا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ فرق جو کچھ ہے وہ تعینات کے اعتبار سے ہے ؎ ایں سمائی در ہمہ جا شد محیط۔ بے تنقل در مکاں از لامکاں ؛ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ط کی مشہور آیت ہے جس کی شرح میں کئی اشعار منظوم ہوئے ہیں۔ سید صاحب کہتے ہیں کہ ذات باری تمام کائنات کو آسمان کی طرح احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن اس احاطہ میں وہ حال و حلول کے شبہوں سے پاک ہے۔ ہنود کے عقیدہ و تنار کی تردید موجود ہے، لامکاں سے مکاں کے حدود میں وہ منتقل ہو جائے یہ ممکن نہیں ایک شعر ہے ؎ ایں سمائی شد ملوث چوں بکفر۔ گشت ناسق درمیان فاسقاں۔ ایک شعر کے ذریعہ ارشاد فرماتے ہیں کہ آئینہ خانۂ عالم میں ذات باری کے مظاہر بہ قدرت مختلف شکل و صورت میں ضو فشاں اور جلوہ ریز ہوتے ہیں مگر اس تجلی میں شرک کی صورت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اس کی ہمواری و یکسانیت ہے جو اس کی یکتائی کو بتلاتی ہے ایک جگہ حلول کی نفی کرتے ہیں کہتے ہیں کہ کائنات کے ہر فرد ہر ذرہ میں وہی ایک وجود جاری و ساری ہے با ایں ہمہ وہ حد و قید سے پاک و صاف ہے اور محیط مطلق ہے، کئی اشعار جاذب نظر ہیں جس سے ہم قطع نظر کرتے ہیں ایک شعر میں مشہور آیت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اگر تمام سمندر روشنائی ہو جائے اور ع "تا ابد اشجار عالم گر قلم" تب بھی ذات باری کے کلمات کی تشریح کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔

الغرض سید راجا رحمۃ اللہ علیہ راسخ العقیدہ سُنّی مسلمان تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ روادار اور وسیع القلب صوفی بزرگ بھی تھے ہندوستان سے انہیں محبت تھی، ہندوؤں سے میل جول رکھتے تھے ہندوؤں کے مذاہب و فرق زبان، فلسفہ و خیالات، عبادات و ریاضات سے واقف ہی نہیں ان کی قدر بھی کرتے تھے۔ اچھی باتوں کو خواہ وہ کسی کی بھی ہوں اپنانے میں انہیں کوئی جھجک نہ تھی۔ اپنے بنیادی عقائد سے سرمو انحراف روا نہیں رکھتے تھے تشبیہات و تمثیلات میں ہندی خیالات و عقائد کا بھی اظہار بلا تامل اپنے اشعار میں کرتے تھے۔ تغزل اخلاق تصوف کے علاوہ ان کے دیوان کی خاص خصوصیت اس کی تین غزلیں ہیں جس کا پہلا مصرع فارسی اور دوسرا ہندی ہے۔ ان کے پہلے بھی مسلمان شعراء میں اس کا رواج تھا امیر خسرو سے منسوب ہے زرگر پسرے چو ماہ پارا۔ کچھ گھڑیے سنوائیے پکارا۔ نقد دل من گرفت و بشکست۔ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا۔ ز حال مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں۔ کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں الخ ہم ان مشہور اشعار کو خسرو دہلوی سے منسوب تو نہیں کرتے مگر کسی دوسرے خسرو کے تو ضرور تھے غرضکہ حضرت راجا کے سامنے مثالیں تھیں لیکن ان کے ہندی مصرعے بہت زیادہ توجہ کے مستحق ہیں اس لئے کہ "فی الحقیقۃ" یہ انہیں کے ہیں (کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں) ہندوستانیوں کے ایک خاص فرقہ یوگیوں اور تانترکوں کے عقائد و اعمال کی جس قدر ان میں ترجمانی کی گئی ہے شاید ہی کسی دوسرے صوفی شعراء کے کلام میں ملے برج بھاشا، کھڑی بولی اور اودھی کا امتزاج بھی قابل غور ہے۔

فرماتے ہیں ؎ مرد باید تا بسوزد جان و تن را بہر یار۔ مار آسن دیہہ جالی بیٹھ جوئی چت مار۔ یعنی آسن جما کے بدن کو جلا ساکے چت یا نفس امارہ کو مار کے انسان راہ راست پا سکتا ہے اور اپنی مراد کو پہنچ سکتا ہے۔ جوگیوں کے ۸۴ ریاضتی طریقوں میں ایک طریقہ ہے جسے بھوت سدھ کہا جاتا ہے ؎ پائے در گرد او و دل را ببرد از غیر دوست۔ پاؤں باندھے، من موندے، بیٹھ کے دھونی جگائے۔ اسی بھوت سدھ طریقہ میں پدم آسن بھی داخل ہے ایک خاص طرح پر پلتھی مار کر بیٹھنا ما سوائے دھیان کو ہٹانا دھونی رمانا اور تلاش حق میں کھو جانا ؎ گوش بند و چشم دوز و جان بیار و

پیش حق ۔ کائے سادھے پادون باندھے پانچ اتمان بھوت مار ؛ فارسی مصرعہ تو صاف ہے اور حضرت نقش بندؒ کے شعر سے "چشم بند و گوش بند و لب ببند ۔ چون نہ بینی سرّ حق بر ما بخند" کی یاد دلاتا ہے لیکن ہندی مصرعہ تشریح طلب ہے اس میں بھی جوگیوں کی بھوت شدھو کی ریاضت کی طرف اشارہ ہے کائے (جسم) کو سادھ کر یعنی اس پر قابو پا کر پاؤں کو سمیٹ کر ایک خاص انداز میں بیٹھ کر ان عناصر سے یعنی پانی، آگ، مٹی، ہوا، اور اتیھر (اکاس) سے جن سے ہمارے جسم کی ساخت ہوئی ہے اپنے کو علحدہ کر کے یعنی ان کے مضر اثرات کو دور کر کے کیونکہ ذمائم و عیوب کی تہ میں بھی یہ ہی پانچ عناصر چھیتی، جل، پاوک، گگن اور سمیر ہوتے ہیں جوگی اپنے مقصود کو پہونچتا ہے ۔ (۴) کن برول از گوش غفلت در محبت پوش طوق ۔ کادہ مندر اکھول کنٹھا سیس چھیدی کر دوار ۔ اس ہندی مصرعے میں بھی جوگیوں کی ریاضت کی طرف اشارا پایا جاتا ہے سر کو ایک خاص انداز میں تا ناک کنٹھ اور مستک کے درمیان سیدھا راستہ بن جائے ۔ مستک سے چھید کے ذریعہ امرت زبان پر گرے اور کنڈلینی یعنی چکر دار ریڑھ کی ہڈی سے گذرے یہ ہی طریقہ ہے روح کو ابدی طمانیت حاصل کرنے کا۔ مندرا یا مودرا مارگ بھی ایک قسم کی ریاضت ہے جو انگلیوں کی ایک خاص حرکت پر مشتمل ہوتی ہے۔ پیشانی سے اوپر سر میں چھید سا ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ جوگیوں کے عقیدہ میں روح کنڈلینی کے ذریعہ اپنا راستہ بنا لیتی ہے (۵) تن بدرّد پاشکم این عقل کوتہ لب شکند ۔ پھار کنٹھا چھوڑ کھپر توڑ ڈنڈا دھرم اودّھار ۔ ایک ایسی منزل آتی ہے جہاں عقل اپنی کوتاہ دامنی سے بیکار ہو جاتی ہے مادی جسم اور اس کے علائق ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے اس منزل پر قدم رکھنے سے پہلے ہی چاہئے کہ خود کنٹھ (حلقوم) کو چھید کر سر (کھپّر) کو توڑ کر اور میرو ڈنڈ کو یعنی پیٹھ پر جو بڑی لمبی ہڈی گودا سے لے کر ناک تک پھیلی ہوئی ہے اسے توڑ مروڑ کر اپنی نجات کا بندوبست کرے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کنٹھا کے معنی جوگیوں کی مالا مقصود ہو اور دھرم کے اودّھار کے لئے یہ سب باتیں ضروری سمجھی جاتی ہوں (۶) عشق بازی نیست بازی بلکہ جان در باختن ۔ کھیل راول جیو اوپر کھیل ہے یہ کھیل سار ۔ راول (جوگی کی ایک قسم) کو چاہئے کہ جان پر کھیل جائے یہ ہی سب سے اونچا (سار) کھیل ہے (۷) ساخ ہستی را ببرّ د بیخ ہستی بر کند ۔ چت سوں سبھ ڈال توڑی کاٹ

ترور جبڑ اد پاڑ - ہندی مصرعہ سے فارسی مصرعہ کی وضاحت ہو جاتی ہے ۔ نفس اور علائق دنیا کو جو شجر (ترور) و شاخ کے مانند ہیں بیخ و بُن سے ختم کر دینے میں ہی نجات مضمر ہے (۸) در ولایت فقر فخری بادشاہی می رود - ست بھکھیا ہو مانگے منگتا دھرمی بھکار ۔ پیغمبر اسلام کا قول ہے الفقر فخری یعنی ولایت روحانی میں فقر و فخر کی بادشاہت ہے ۔ سالک یعنی دھرمی بھکاری کو سب سے محبوب چیز جس کی طلب ہوتی ہے وہ ست ہے یعنی ذات حق وہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں رکھتا (۹) سر گشتہ اندر گریباں شستہ اندر لامکاں ۔ سُن آسن بسن پرم ستی تن او دھار ۔ آسن (کھانا پینا) بسن (لباس پوشاک) سے سُن (یعنی بے حس و بے پروا) ہو کر ذات حقیقی میں فنا ہو جانا ہی نجات حقیقی کے مترادف ہے (۱۰) می زند اینجا خیمہ را بالائے ختم آسماں ۔ سُن من سون بند لاگی ہوئے دِشتا سرگ پار ۔ سالک کو مقام لامکاں میں خیمہ زن ہو جاتا ہے ۔ جوگی کا من ماسوا اللہ سے بری اور معطل ہو جاتا ہے اس کی نظر بہشت سے (دِشتا) پرے پہنچ جاتی ہے (۱۱) صورت زیبائے او چوں دید آجا بے حجاب ۔ رنگ (آ) روپ ماتا کو رحید رہا تن بسار ۔ پردہ کا اٹھنا تھا کہ کام (عشق کے) دیوتا نے قلب و دماغ کو ماؤف کر دیا تن بدن کی سدھ جاتی رہی اب حسن محبوب تھا اور دیوانی و سرشاری ۔

مندرجہ بالا غزل میں مضمون و خیالات کے اعتبار سے جس طرح کا تسلسل پایا جاتا ہے دوسری تیسری غزل میں اس حد تک موجود نہیں (۱) اندریں رہ کے تو اندر خسیس بوالہوس ۔ سیج دیکھے سو چڑھے جو کاٹے سر آگیں دھرے ۔ سیج کے معنی بستر کے ہیں (۲) عاشقاں را اے جواں خون جگر باشد شراب ۔ پیمبہ پیالا پیم کا لوہو بھونا کو بھرے ۔ لوہو بھونا یعنی خون بہائے مطلب صاف ہے (۳) ہر کجا بید دوست را فارغ بگردند ز مرد ۔ جیمہ پیارا بجھوری تیمہ ا دگر بار (ا) ہیر (ا) کرے ۔ روح محبوب سے بچھڑ کر اس کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے (۴) عاشقاں را جز خیال دوست دیگر ہیچ نیست ۔ سادھو سے کے سو کرے جو سادھ سبھ ہون پر پرہرے سادھو وہ ہے جو سب خواہشات (سادھ) کو تیاگ دیتا ہے (پرہرے) (۵) عشق بازی جان بازی نیست جز جان باختن ۔ دیکھ پتنگا بر سو آگ ماہیں کیوں جرے ۔ دیکھو ناجز ذرا بیار (پیار) پتنگا کیوں کر خود کو جلا دیتا ہے (۶) نیست تنگے عقل را در عشق بازی کار نیست

ہوگا رن بیرہ وادی دیکھ ستی کیوں جرے ۔ فراق زدہ (بیرہ بیدھا) عشق محبوب میں خود کو نذر آتش کرکے ستی ہو جاتی ہے (۷) درمیان تیغ بنداں مرد میداں نادراست ۔ نرزند کوٹ منہ سوں کوٹ اک آگیں لڑے ۔ نبرد آزما بہادر قلعہ (کوٹ) سے آگے بڑھ کر ہتوں سے اکیلا جنگ کرتا ہے (۸) مرد جنگی جنگ جو بدشاد گردد وقت جنگ ۔ بج کاجے بج باجے رن دکھیں پھر پھرے ۔ جنگ شروع ہو جاتی ہے باجے بجنے لگتے ہیں علم لہرانے لگتے ہیں (۹) شست ہمت شست دل در جنگ چوں حاضر شود ۔ مار لاگے جیو بھاگے دیکھ کھانڈا تھر تھرے ۔ جب مار پڑنے لگتی ہے جی بار دیتا ہے تلوار کو دیکھتے ہی تھر تھراہٹ اور کپ کپی شروع ہو جاتی ہے (۱۰) رو تو عاشق شاد شاد پیش جاناں جاں بدہ ۔ پیو درشن کون پاوے جیو جیوٹ جو مرے ۔ مطلب واضح ہے (۱۱) عاشقاں را فنا زکردنی در قرآں آمد خطاب ۔ بہیو بہیو کی جیو دیجیے جوں پپیہا بن پھرے (۱۲) جز حدیث یار جانی ہر حدیث باش گو ۔ ایک سامی چپ راکھے اور دوجا بیسرے ۔ سو ذکر محبوب کے ہر ذکر کو چھوڑ دو ۔ سالک بجز ذات حقیقی کے ہر ایک چیز بھول جاتا ہے (۱۳) مرد حق یک رنگ باشد از دو رنگی فارغ است ۔ سیدرا جا ایک راتا ایک ستین رت کرے ۔ سیدرا جا بس ایک ہی دیوانے ہیں دوسرے سے دوستی نہیں رکھتے اور اس میں ختم ہونا چاہتے ہیں ۔

آخری غزل کے اشعار حسب ذیل ہیں (۱) عشق بازی ہر کسے را کے بود ۔ بیرا گ سیدھا بیرہ بیدھا چاہئے ۔ انسان کامل (بیرا گ سیدھا) یعنی فراق زدہ (بیرہ بیدھا) ہوتا ہے (۲) کس نیابد جان جان را رائگاں ۔ پیو سندر جیو دیتس پائیے ۔ تم اپنے حسین محبوب کو جان دے کر پا سکتے ہو (۳) درد عاشق در جگر باشد مدام ۔ بیرہ بیدن کا وہ آگیں آگیے کس کے (کا) آگے کہا جائے (آگیے) جو درد (بیدن) فراق (بیرہ) میں ہے (۴) گر خدا توفیق بخشد در جہاں ۔ چاہو چھبلے برہ بھاگ کھا بھاگ لکھنے ۔ اگر توفیق خدا شامل حال ہو تو اسی سے لو لگن ، لگاؤ اور جدائی اور فراق کی بولی بولو (۵) وصل جاناں نے بجو میسر کسے ۔ بھاگ بانکا ہیم رس کیوں چاکھے ۔ جس کی قسمت (بھاگ) بد (بانکا) ہے اسے شربت دید و عشق کہاں میسر (۶) با خلق جاں گر توانی بس بیا ۔ لاج لاگے رن سو جوں بھاگئے ۔ اگر جان دینی منظور ہو تو آگے بڑھو ۔ جو میدانِ عشق

سے منہ موڑنا ہے اسے شرم آنی چاہیے (۷) جاہدوا فی اللہ آمد در قرآں۔ کا دپہ کھانڈ نفس شیطاں مابیئے (۸) جملہ سوزد ہر کہ دارد سوز عشق۔ جیوں ہنونت جھار لنکا جاریئے۔ ہنومان کی طرح لنکا کو جلا کر پھونک دو۔ (۹) عمر فانی آں زماں باقی شود۔ گنت اپناں سیج پر جڑھ کے رائیے۔ اپنے محبوب (کنت) کے ساتھ بستر پر چڑھ کے مسرت ابدی حاصل کرو (۱۰) گفت راجا سالہا دارم ہوس۔ وقت مرنا ہو سیتین جائیے۔ برسوں راجا اسی دُھن میں رہا کہ مرکر فنا فی المحبوب ہو جائے۔

نوٹ: مضمون کی کتابت کے بعد پروفیسر شیونندن سہائے ہندی شعبہ پٹنہ کالج نے راقم السطور کو دوران گفتگو میں ہٹ جوگ مت کے متعلق جو باتیں بتائیں اس سے حضرت راجا کے بعض ہندی مصرعوں اور ہندوؤں کے بعض خصوصی عقائد سے واقفیت پر کچھ روشنی پڑتی ہے ہم صرف اس مت کے متعلق کچھ عرض کرتے ہیں جو چودھویں صدی میں عروج پر تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ سترہویں صدی میں بھی اس کا زور ختم نہیں ہوا تھا۔ جوگیوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کے اندر ساری کائنات سموئی ہوئی ہے اور وہ محیر العقول طاقت کا خزانہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی میں چھ چکر ہیں سب سے نیچے مولادھار۔ پھر سوادھشتان۔ منی پور۔ اناہت۔ وی شدھ اور آگیان۔ مولادھار چکر میں جو سورج کی مثال ہے کنڈلنی شکتی سانپ کی طرح حلقہ کئے رہتی ہے۔ جب یہ شکتی (طاقت) بیدار ہوتی ہے یا کی جاتی ہے تب منجملہ تین شریانوں۔ اڑا۔ پنگلا۔ سوشومنا کے موخر الذکر شریان کے ذریعہ سیس (مغز سر) تک جا پہنچتی ہے۔ سر کے اندر سہنس دل کنول ہے یعنی ایسا کنول جس میں ہزار پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ اس میں ایک چھید ہوتا ہے جسے برہمہ اندر کہتے ہیں۔ اس تک جب کنڈلنی شکتی پہنچ جاتی ہے تو امرت (آب حیات) ٹپکنے لگتا ہے جسے پی کر وہ آمر اجر (غیر فانی ولایزال) ہو جاتی ہے اور برہمہ اور انسان میں من و تو کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ انسان خدا تک جا پہنچتا ہے۔

صوبہ بہار میں قلمی کتابوں کے ذخیرے

جناب مدیر معیار

تسلیم

رسالہ معیار سے علمی اور ادبی خدمات کی جو توقع ہے، اُس کی بنا پر سطور ذیل کے ذریعے سے ناظرین کی توجہ صوبہ بہار کے چند علمی خزائن کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں بہار کو کتب خانہ مشرقی پٹنہ پر بجا ناز ہے، لیکن اس نادر کتب خانے کے علاوہ بھی بعض لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں بیش بہا مخطوطات گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ علمی ذخیرے بے توجہی کے باعث کیڑوں کی نذر ہوتے جارہے ہیں۔

جب انڈین ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن کا اجلاس سنہ ۱۹۳۰ء میں پٹنہ میں منعقد ہوا تو مجھے قدیم کتب تواریخ کی جستجو میں صوبے کے مختلف مقامات کی سیر کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں رائے سلطان بہادر کے تباہ حال کتب خانے کو دیکھنے کا موقع ملا، جو دیوان محلہ پٹنہ سیٹی میں ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر سوبی مل چندر سرکار صدر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج، پروفیسر کالی کنکر دت اور راقم الحروف نے تین دن کی محنت کے بعد کئی قدیم مخطوطات اس علمی ذخیرے سے منتخب کیے۔ لیکن ہمیں اجازت نہ ملی کہ انھیں تاریخی نمائش میں پیش کریں۔ محلہ ہر مندر پٹنہ سیٹی میں ایک مندد بھائی کے پاس قلمی کتابوں کا ذخیرہ ملا، جسے اُنھوں نے بدقت تمام ہمیں دیکھنے دیا۔ اگر ان علمی ذخیروں کی حفاظت نہ کی گئی تو یہ بہت جلد ضائع ہو جائیں گے۔ پٹنہ کے علاوہ گیا اور آرہ کے اضلاع میں بھی چند نادر الوجود نسخے موجود ہیں۔ گیا میں منو لال

صاحب کا ذاتی کتب خانہ نادر روزگار مخطوطات سے مالا مال ہے۔

مذکورۃ الصدر تاریخی نمائش کی مجمل فہرست، جسے مطبع حکومت ہند کلکتہ نے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے مطالعے سے صوبے کی علمی دولت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس فہرست میں ۶۴۱ سے ۶۶۷ تک جو کتابیں، وصلیاں اور مخطوطات ہیں۔ وہ دیوان ناصر علی مرحوم کے وقفی کتب خانے سے حاصل کیے گئے تھے۔ یہ کتب خانہ کنجوا ضلع سارن میں بہ حالت تباہ موجود ہے۔ اس مردم خیز بستی کو شہنشاہ عالمگیر نے ایک سیدہ کو "بہ تصدق فرق مبارک" بہ طور معافی مدد معاش عطا فرمایا تھا۔ دیوان سید ناصر علی انھیں سیدہ کی اولاد سے تھے۔ اور شاہ عالم ثانی کے ہم عصر تھے جیسا ان کی مہر اور عالی شان عمارتوں کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے۔

موصوف نے لاکھوں کی جائداد چھوڑی جس میں اٹھارہ ہزار سالانہ کا وقف بھی شامل ہے۔ موصوف نے اپنے وصیت نامے میں جو فارسی میں ہے، سب سے محبوب چیز جسے وقف کیا ہے وہ کتب خانہ ہے جس میں شاہی کتب خانوں کے چند مخطوطات ابھی تک موجود ہیں۔ دیوان موصوف نے وصیت نامے میں اپنے اخلاف سے بار بار تاکید کی ہے کہ کتب خانے کے تحفظ اور اس کی بقا کا سامان کریں۔ افسوس یہ ہے کہ گو موصوف کی اولاد میں فرسٹ کلاس ایم۔ایس۔سی انگلستان کے تعلیم یافتہ گریجویٹ، ڈپٹی مجسٹریٹ اور سابق ایم۔ایل۔سی بھی ہیں لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے جد اعلیٰ کے وصیت نامے کی سب سے اہم ہدایت پر عمل کریں۔

دیوان ناصر علی کے کتب خانے سے چند کتابیں بہ طور مشتے نمونہ از خروارے تاریخی نمائش میں لائی گئی تھیں۔ تاریخی نمائش کی فہرست کے مطالعے سے ان کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مرتب نے چند ضروری باتیں نظر انداز کر دی ہیں، بلکہ کہیں کہیں حقیقت سے بھی دور پڑ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر فہرست مذکورہ کے صفحات ۴۷، ۴۸ ملاحظہ ہوں۔

(۱) مخطوطہ نمبر ۶۴۴، **دیوان ھمایون** کے لیے صرف دو الفاظ "منقش" اور "خوش خط" کافی سمجھے گئے۔ حالانکہ بہ قول مسٹر ہانک بیرسٹر پٹنہ اس دیوان میں جو نقاشی ہے، وہ سولھویں صدی عیسوی کے کشمیر آرٹ کا نمونہ ہے۔ مسٹر ہانک مغل آرٹ کے ماہر ہیں اور ان کے پاس مغل آرٹ کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ تاریخی نمائش کی فہرست سے دیوان ہمایون کی اہمیت نہیں ظاہر ہوتی۔ دیوان ہمایون کا یہ واحد نسخہ ہے جو دیوان ناصر علی کے کتب خانے میں ہے۔ کتب خانہ مشرقی کے دیوان کا مصنف ہمایوں اسفرائینی ہے، اور دیوان موصوف کے کتب خانہ وقفی کے دیوان کا مصنف کامران کا بھائی اور ہندوستان کے سب سے بڑے بادشاہ کا باپ ہمایوں ہے۔

(۲) مخطوطہ نمبر ۶۴۲، "**دلکشا**" کے متعلق شکر ہے کہ فہرست میں چند سطریں لکھ دی گئی ہیں: "مصنف بھیم سین کایستھ، سال تصنیف ۱۱۲۰ھ = ۱۷۰۸ء۔ عہد اورنگ زیب میں دکن کے حالات کے لئے یہ کتاب بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ بہت کمیاب۔ ہندوستان میں **دلکشا** کا شاید یہی ایک نسخہ ہے۔ ناچیز اس کتاب پر ایک مقالہ حوالہ قلم کرنے کا ارادہ کرتا ہے جو رسالہ معیار کی کسی اشاعت میں شائع ہوگا۔

(۳) مخطوطہ نمبر ۶۴۷ **منتخب الوزرا** یہ بھی ایک نادر الوجود نسخہ ہے۔ جس پر متعدد مہریں ہیں اور پانچ مقامات پر "عرض دیدہ شد" مع تاریخ لکھا ہوا ہے۔ کتب خانہ مشرقی کا نسخہ **آثار الوزرا** اس سے مختلف ہے **منتخب الوزرا** کا مصنف قاضی احمد الابراہیمی حسینی ہے سال کتابت ۱۰۲۹ھ ہے۔ مصنف نے جا بہ جا اپنے ماخذوں کے حوالے دیے ہیں، اور دوسری جلد لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

(۴) مخطوطہ نمبر ۶۶۰ **ماثر الاقبال**۔ "تاریخ اسلام تا عہد امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ" اوراق ۳۱۰، سطریں ۱۷ فی صفحہ خوشخط۔ نستعلیق دو مہریں ہیں ایک دیوان ناصر علی کی اور دوسری میر معصوم خاں کی۔ کتابت روز چہارشنبہ شہر رجب المرجب ۱۰۹۲ھ قدرے کرم خوردہ۔ دوسرا صفحہ کرم خوردہ ہے۔ مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ آغاز کتاب

"ذکرِ احوال سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم" سے ہوتا ہے۔ کتب خانہ مشرقی اور برٹش میوزیم میں اس کا کوئی نسخہ نہیں۔

(۵) مخطوطہ نمبر ۶۵۲ **بیان واقع** اس کی اہمیت کے لئے ایلیٹ کی تاریخ ہند کی آٹھویں جلد، صفحہ ۱۲۴ تا ۱۲۶ ملاحظہ ہو۔

(۶) **مراۃ الاسرار**: ایک مشہور کتاب ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانہ مشرقی میں بھی ہے لیکن کھجوا کا نسخہ قدیم ترین معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بیشتر صفحات کے حاشیے پر جو تحریریں موجود ہیں ان کے متعلق کتاب میں یہ عبارت درج ہے: "نسخۂ مسطور در نظر مبارک حضرت شیخ عبد الرحمن چشتی رسیدہ است و اکثر بہ دستخط خاص ...." اس کے بعد کاغذ پھٹا ہوا ہے۔ شیخ عبد الرحمن مذکور اس کتاب کے مصنف ہیں۔ تاریخ کتابت ۱۰۶۵ھ (= ۱۶۵۴ء) ہے۔

میں انجمن ترقی اردو، صوبہ بہار سے گذارش کرتا ہوں کہ صوبہ بہار میں جتنے خانگی کتبخانے ہیں، ان کے مخطوطات کی فہرست بنانے کی کوشش کرے۔ دیوان ناصر علی کا کتب خانہ خصوصاً قابل توجہ ہے۔ یہ کام بے شک بہت مشکل ہے، لیکن اگر کتب خانوں کے مالک انجمن کی معاونت کریں تو فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ میں آگے بیان کر چکا ہوں کہ صوبہ بہار میں مختلف مقامات پر نادر الوجود مخطوطات موجود ہیں، جن کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر جلد توجہ نہ کی گئی تو یہ بیش بہا مخطوطات ضائع ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کے پاس مخطوطات کے ذخیرے ہیں، اُن سے میری یہ استدعا ہے کہ ان علمی خزائن کو برباد نہ ہونے دیں، لوگوں کو اجازت دیں کہ ان کتابوں کو دیکھ سکیں اور اگر ضرورت ہو تو بعض کتابیں انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار، یا کتب خانۂ مشرقی کو عطا کر دیں تاکہ یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچیں، اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔ کتابوں کو کیڑوں کی نذر کر دینے کا کیا فائدہ ہے؟ اگر انجمن ترقی اردو تمام مخطوطات کی فہرست شائع کر دے تو یہ بڑی کارآمد چیز ہوگی۔

طبقاتِ بابری

مصنّفہ: شیخ زین الدین خوافی

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کی سوانح حیات، حالاتِ زندگی، تاثرات اور فکر و نظر کا صحیح ترین، معتبر مفصل ماخذ خود اس کی خود نوشت کتاب تزک بابری ترکی زبان میں ہے جس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اکبر و جہانگیر کے عہد کے نام ور سپہ سالار اور اکبر کے اتالیق، بیرم خاں کے بیٹے، ہندی دوہوں کے خالق، عبدالرحیم خان خاناں نے سب سے پہلے ۹۹۸ میں بابر کی خود نوشت سرگذشت کو مکمل طور پر فارسی کا جامہ پہنایا اور اسے واقعاتِ بابری کا نام دیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جس پر ۱۰۸۲ کی تاریخ کتابت ثبت ہے اور اردو ترجمہ گورگانی کا اور پاکستان میں شائع شدہ اردو میں اس کی تلخیص کتب خانہ مشرقیہ، یعنی خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ترکی زبان میں تزک بابری کا مکمل ترجمہ ایک فرانسیسی عالم پادیٹ دی کورٹیس نے ۱۸۷۷ میں مکمل کیا۔ الیٹ کی ترکی زبان کا ترجمہ ۱۸۵۷ میں شائع ہوا۔ ارسکن نے جارج لیڈن کے انگریزی ترجمے کو اپنایا اور بابر اور ہمایوں پر اپنی مشہور کتاب لکھی۔ سب سے جامع اور حواشی و تلخیصات سے بھرپور انگریزی ترجمہ مشہور انگریزی مورخ، ڈاکٹر بیورج کی فاضلہ دانش مند اہلیہ مسز بیورج کا ہے، جو بہت مستند سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارا مقصد

بجائے تزک بابری کے ان کے تراجم کے ایک دوسری ہی کتاب طبقات بابری کو منظر عام پر لانا ہے۔ یہ کمیاب اور نسبتاً غیر معروف کتاب ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی، اور اس کی اُس زمانے کی دقیق مبالغہ آمیز فارسی انگریزی ترجمے کے لیے مانع رہی۔ اسے بابر کے ندیم خاص اور صدر۔ زین الدین خوافی نے تزک بابری کے اصل ترکی کے اس تھوڑے سے حصے کی جو ہندوستان میں بابر کے فتوحات پر مشتمل ہے اپنے طور پر شرح و تفسیر، تفصیل و زوائد کے ساتھ سخن گوئی و عبارت آرائی کی ہے۔ اور انشاپردازی کا زور دکھایا ہے۔ صاحبِ نگارستان نے اسے فتوحاتِ ہندوستان کا نام دیا تھا مگر مورخ نے اپنی کتاب کے ضمیمے میں ایک اہم اور دل چسپ بات لکھی ہے کہ سرجان ایلیٹ کے ذخیرے میں ایک چھوٹی ضخامت کی کہنہ، کرم خوردہ قلمی کتاب تھی جس کا کاتب 'عبداللہ' صاحب حبیب السیر کا پوتا تھا جس نے ابوالفضل کی آئینۂ اکبری کی بھی کتابت کی تھی اس مخطوطہ کا سالِ کتابت ۹۹۸ تھا اور یہی عبدالرحیم خان خاناں کے فارسی ترجمہ واقعات بابری کی بھی تاریخ ہے۔ برٹش میوزیم میں بھی اس کا ایک نسخہ تھا۔ شاید اُسی کی نقل رام پور کے کتب خانے میں پہنچی۔ اس کے اسی نسخے کی فوٹو کاپی جو پٹنہ کے کتب خانہ مشرقی کے لیے حاصل کی گئی راقم السطور کے پیشِ نظر ہے۔ فوٹو اکثر جگہ مایقرا نہیں ہے۔ کہیں کہیں کچھ سطروں کا عکس بھی نہیں اُبھرا۔ ساری کتاب کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۴۷ ہے۔ ہر صفحہ ۱۵ سطور پر مشتمل ہے۔ شروع کے صفحۂ اول کی عبارت جسے انگریزی میں فلائی لیف کہتے ہیں، مشکل سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کا عنوان تاریخِ بابری ہے پھر جو پڑھا جا سکا یہ ہے:

"این کتاب افادت ایاب در بیان حالات و واقعات حضرت بادشاہ غفران پناہ ظہیر الدین محمد بابر پادشاہ است کہ فاضلِ کامل مطلع انوار عزت فرضی شیخ زین الدین خوافی کہ در ملازمت آں بادشاہ وافر شوکت و منصب الصدارت منصوب بود..... بر ہمان طریق کہ بترکی فرمودہ اند بقلم آوردہ و تغیر در آں کلماتِ فصاحت سمات

راہ نداده ... وتمامی خصوصیات بلاد ہند را تحقیق کرده تحریر نموده...
و بے شائبہ تکلف و رائحہ فضیلت (؟) .... آراستہ۔ گلشنے است
از گلبن نکات و اشعارات (؟) پیراستہ۔"

اس کے بعد اور تو سب کچھ، مٹا ہوا یا غائب ہے البتہ ایک لفظ "الف" دکھائی دیتا ہے
جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ کاتب یا مالکِ کتاب نے یہ تعارفی تاریخ گیارہویں صدی
کے کسی ماہ و سال میں مندرج کی۔ ورق اول کے صفحہ اول سے اصل کتاب کا متن شروع ہوتا
ہے۔ آغاز بہ اسمہٖ و سبحانہٗ اور بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتا ہے۔ خاتمہ کتاب میں کوئی
تحریر ایسی نہیں جس سے مصنف کا نام یا تاریخ کتابت کا پتہ چلتا ہو۔ مصنف اپنی کتاب
کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ خاتمہ بے ربط ہے بے جوڑ عبارت پر ہوتا ہے۔ رانا سانگا
سے کنوا کی جنگ میں بابر کی فتح۔ چندیری کی تسخیر اور شمال مشرقی علاقہ جات میں افغان امیروں
کی سرکوبی کا مکمل بیان نہیں ملتا۔

مصنف کی انشاپردازی مبالغہ آمیز انفاظی کا نمونہ شروع میں مل جاتا ہے۔ بے جا
نہ ہوگا اگر اُسے ہو بہو نقل کر دیا جائے۔ شیخ زین الدین اس ابتدائیہ کو یوں شروع کرتے ہیں:

"در روز جمعہ غرۂ ماہ صفر ختم اللہ بالظفر بہ سال نہ صد و سی و دوم
از ہجرت خیر البشر کہ خسرو انجم در برجِ قوس منزل ساختہ بود و بخانۂ
کمان در آمده، کماندارانِ پادشاہی لوائے اطاعت برافراخت رایات
نصر سکہ پناہ کہ زینت افزائے مہجۂ مہر و ماہ است از دار الامان کابل
کہ مقر خلافت و اقبال و مستقر عزت و جلال است، بہ ہدایت
عنایات ازلی و قیادتِ سعادتِ لم یزلی بہ جانب سواد الاعظم ہند کہ
علیکم السواد الاعظم مخبر از عزت و شان اوست و مشعر بر وجوب
التسخیر میمنت نشان او متحرک گشت .... و اوتار و اطناب در آں
از نجوم و شہاب در گذشت۔

بیت :

فرو شد بہ ماہی و بر شد بہ ماہ
بنِ نیزۂ و قبۂ بارگاہ

زہے بارگاہی کہ چوں آفتاب
ز مشرق بہ مغرب رساند طناب

زہے نیزۂ ہم چوں اعلامِ دیں
ز رفعت رسیدہ بہ چرخِ بریں

سپہرس چو افراخت رایات فتح
ز رایات آں ساخت آیات فتح

قضا دادِ اعلام او را نصیب
ز نصرٌ من اللہ فتحٌ قریب

سرجان ایلیٹ نے مسٹر داوسن کے اشتراکِ عمل سے ۸ جلدوں میں ہندوستان کی فارسی تاریخوں اور تاریخی مواد پر حامل کچھ ادبی کتابوں سے بھی اقتباسات لے کر مجموعات تاریخ کے شیدائیوں کے لئے مہیا کیا تھا۔ پیش لفظ کے طور پر اپنی تنقیدی رائیں بھی ان دونوں مستشرقین سے حوالہ قلم کی تھیں۔ چوتھی جلد میں طبقات بابری کا بھی مختصر تذکرہ دونوں میں موجود ہے۔ دو مختصر اقتباسات بھی بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ ایک میں جو بابر اور ابراہیم لودی کی جنگ سے متعلق ہے۔ ایلیٹ کا قلم کچھ تسامح یعنی فک و اضافہ کا مرتکب ہو گیا۔ نہ معلوم خود راقم السطور نے ایسی کتنی غلطیاں طبقات کے اپنے انگریزی ترجمے میں جس کی حسب لیاقت کوشش کی گئی ہے اور جو زیر طبع ہے' نادانستہ طور پر یا اپنی کم فہمی کی بدولت کی ہوں گی بہرکیف' اب طبقات بابری کے مصنف کے متعلق تذکرے کی کتابوں سے جو کچھ تھوڑا بہت مواد ہمیں ملتا ہے' اس کا ذکر کرنا ضروری

ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے شیخ زین الدین پر ایک جھلکی نظر ڈالی ہے، لیکن **طبقات شاہجہان** اور **مخزن الغرائب** میں کسی حد تک تفصیلی اور اہم حالات ملتے ہیں۔ دونوں میں بڑی یکسانیت ہے۔

شیخ المشائخ زین الملت والدین کہ اکمل مشائخ زماں بود، یعنی زین الدین عبدالصمد خوافی کے پوتے زین الدین خوافی ــــ متخلص بہ وفائی، اپنے زمانے کے مشہور شخص تھے۔

"مشہور است کہ در ہندوستان صدر الصدور مستقل بابر بادشاہ بود او را مسجدے است۔ در آگرہ مدرسہ کہ آں طرف آب جون (جمنا) واقع شدہ۔ صاحب کمالات صوری و معنوی بود۔ در معمہ و تاریخ در بدیہہ یافتن...... در سائر جزئیاتِ نظم و نثر و انشا بے قرینۂ زمانِ خود بودے۔ گویند کہ بہ مجلس اول کہ بابر بادشاہ را ملازمت نمودہ پرسیدند کہ سنِ شما چند باشد۔ بدایۃً گفت قبل ازیں بہ پنج سال بہ چہل سالہ بودم و حالا چہل سالہ ام دو سال دیگر را چہل سال تمام شود۔"

یعنی اس کے قبل پانچ سال ہم میں باقی تھے، اب چالیس کا ہوں۔ دو سال دوسرے ملیں گے تو چالیس کا ہو جاؤں گا۔ خلاصہ یہ کہ یہ حضرت ۳۸ سال کی عمر میں سب سے پہلے بابر بادشاہ سے ملاقی ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ایک اور روایت ان دونوں تذکروں میں ملتی ہے:۔

"مشہور است کہ شیخ زین الدین روزے بہ زیارت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس اللہ سرہٗ العزیز رفتہ قطعہ گفتہ سہ

شیخنا بادا ترا از حق ہدایت بر دوام

آں گدائم من کہ گویم الہدایا مشترک

[میں کون ہوں کہ ہدایا مشترک کے الفاظ زبان پر لاؤں]

گوئی تنہا مشترک زناں پے گرگفتی پیش ازیں

مشترک ساز ازمی گوئی کہ تنہا مشترک

غم گریباں گیر شد سر در گریباں چوں کشم

شوق دامنگیر آمد پا بہ داماں چوں کشم

اس کے بعد بھی کچھ ہے جسے ہم نظر انداز کرتے ہیں' پھر لکھتے ہیں :

" او تاریخ نوشتہ مشتمل بر احوالِ فتحِ ہندوستان و شرحِ غرائب

آں و دادِ سخنوری در آں دادہ۔ وفاتش در حدود چہار دہ در سن

اربعین و تسعمائہ (۹۴۰) بودہ۔ در مدرسۂ خود ساختہ مدفون است "

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شیخ زین اور بابر کے درمیان سب سے پہلے کب مڈبھیڑ ہوئی۔ بارہ سال کی عمر میں بابر فرغانہ کی چھوٹی سی ریاست کا فرماں روا ہوا۔ اس کی قسمت میں الٹ پھیر ہوتا رہا۔ خراساں، سمرقند سے لڑتا بھڑتا گذرتا ہوا تیس سال کی عمر میں ۹۱۰ ہجری میں کابل کا مالک ہوا۔ اپنی عمر کے ۳۵ سال گذارنے کے بعد ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا۔ سات برس میں پانچ حملے ہندوستان پر کیے۔ کابل، قندھار، بلخ، بدخشاں سے لوٹتی رہی۔ سب سے زیادہ کامیاب حملہ صفر ۹۳۲ میں شروع ہوا اور ۹۳۷ میں جب اس نے وفات پائی تو بھیرا سے بہار تک سارے ملک کا فرماں روا تھا۔ ۹۳۲ ہجری کے قبل بابر کے دربار میں شیخ زین کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ دلی، کابل، سندھ کو پار کر کے توس گنبد دیہہ خواجہ رستم قریۂ سلطان پور غریق اریق بیدا بیر میں تھوڑا تھوڑا قیام کرتا ہوا اور دریاؤں پر بہتے ہوئے جالوں میں جلوس کرتا ہوا' بابر بادام چشمہ و باغ وفا سب کو چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ جالہ میں شعر و شاعری اور صبوحی کا دور بھی چلتا رہتا ہے۔ دفعتاً جب ۱۷ صفر شنبہ کو بعد انتظار شدید شہزادہ ہمایون بابر کے پاس حاضر ہوتا ہے۔ تھوڑی سی

زجر و توبیخ کے بعد پھر چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ شیخ زین الدین کے ساتھ بھی اور بھی شعراء ہیں جن میں ان کے ایک عزیز قریب شیخ ابوالو کی بھی نظر آتے ہیں۔ یقیناً اس کے کچھ قبل ہی سے وہ بابر کی مجلس میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ حالانکہ جس شاعرانہ اجتماع میں شیخ علی جان بیچارے کی کھلی اُڑائی گئی تھی اور خود بابر ایک بیت میں ایسے استہزا کا مرتکب ہوا تھا جس کا خمیازہ دماغی پچھتاوے کی صورت میں بہت دنوں تک اُسے بھگتنا پڑا، اور آخر میں عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی ایسا نہ کرے گا۔

بابر نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں سخت تنقیدی رویہ اختیار کیا ہے۔ خوبیاں کم، کمی اور گھٹیا پن بہت سی باتوں میں زیادہ سے زیادہ اسے دکھائی دیں۔ مبالغہ آمیز بیان اور تحقیرانہ انداز اس کی کم فہمی اور عدم واقفیت کی غماز ہیں۔ لطافت، حسن صورت، طبع و ادراک، ادب و تمیز، اخلاق و مروت، ہنر و میر، سیاق و اندام سب میں کچھ نہ کچھ کمی اور غیر موزونیت، بالخصوص مرد و عورت کے لباس اور پوشش میں اسے دکھائی دیں۔ اس کی نظر میں ہندوستان میں نہ آبِ سرد تھا نہ آبِ رواں، نہ اچھا گوشت نہ اچھے گھوڑے، نہ انگور نہ خربوزہ، نہ بازار اور بستان نان و طعام، نہ حمام تھا نہ مدرسہ نہ شمع نہ شمع دان و مشعل۔ عوام ننگے پاؤں رہتے تھے۔ کمر کے گرد حصۂ اسفل پر محض ایک لنگوٹی باندھے رہتے تھے۔ عورتیں ایک لمبا کپڑا استعمال کرتی تھیں۔ جس کا ایک سرا جسم سے لپٹا رہتا۔ دوسرا سر کو ڈھانپے رہتا تھا۔

"رعیت و مردم ریزہ ہائے تمام برہنہ می گردند۔"

اس کے مقابلے میں بابر اپنی چھوٹی ریاست فرغنہ اور کابل و قندھار و ہرات کے موسموں، مرغزاروں، بازاروں اور مدارس کے دل کش مناظر کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں بہت سی چیزوں کا فقدان نظر آیا۔ صاحب طبقات بابری نے اپنے خسروانی آقا کی تاسی میں اپنے طور پر انھیں باتوں کو دُہرایا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر بیورج کے ایک قول یا گرفت کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

لکھتے ہیں کہ شیخ زین نے جان بوجھ کر بابر کے کچھ سخت حقارت آمیز الفاظ کی کسی حد تک پردہ پوشی کی کوشش کی ہے۔ اسے فارسی کے بجائے ترکی زبان کی عبارت پر اکتفا کرنا ضروری سمجھا۔ اس لیے کہ ترکی جاننے والے تو کم تھے، مگر فارسی کا پڑھے لکھے لوگوں میں عام رواج تھا۔ شیخ زین بابر کی وفات کے تین سال بعد تک زندہ رہا۔ طبقات کو کب منظرِ عام پر لایا، معلوم نہیں۔ ڈاکٹر بیورج کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ بابر کا بیان خاصہ طویل ہے لیکن شیخ زین کا دیا ہوا ترکی اقتباس بہت مختصر ہے۔ اور

"دیوتی ہان چرکین"

یعنی گندے چراغ برداروں کے بیان پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد شیخ زین ہندوستان کے اجسام آبنوسی، ان کے بہائم صفت اور برہنہ تن ہوتے لنگوٹ بندانِ ہند مکشوف العورت انھیں بتایا ہے۔ کیا یہ الفاظ کم اہانت آمیز ہیں؟ بادشاہ نے ہندوستان کی کچھ خوبیوں کا بیان بھی کیا ہے۔ ہندوستان ایک بڑا عظیم ملک ہے۔ بڑے بڑے پہاڑ اور دریا سے بھرا ہوا، سیم و زر سے پُر، پیشہ وروں کی کثرت جو باپ دادوں کی روش پر چلتے اور اس فن میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ صرف آگرہ میں رہنے والے سینکڑوں کی تعداد میں سنگ تراش بابر کی بنوائی عمارتوں کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ طبقات میں اسے کچھ زیادہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور مقابلے میں بابر کے مورثِ اعلیٰ تیمور کے جارحانہ، مدافعانہ کارروائیوں اور سنگ تراشوں کو سمرقند کی عمارات کے لیے استعمال کرنے کا زیادہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بابر اور شیخ زین دونوں باہر سے آئے تھے، سن رسیدہ تھے۔ ماوراالنہری ملکوں کی فضا اور مناظر کے جو نقوش ان کے دل و دماغ پر مرتسم تھے، بھلائے نہیں جا سکتے تھے۔ اور مختلف ملکوں کے حالات، رہنے والوں کے رسم و رواج، عادات، اخلاق میں یکسانیت اور مماثلت کی کمی ہی تھی۔

یہاں ایک اور امر کی طرف بھی توجہ مبذول ہوتی ہے۔ طبقات میں ہرات کی اتنی تفصیلات نہیں ملتیں، جزئیات پر کافی روشنی نہیں پڑتی جتنی اصل ترکی کی تزک یا

اس کے فارسی ترجمے میں کہیں کہیں اختلافات بھی ہیں۔ کچھ اضافہ بھی پایا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جہاں تک مواد و واقعات کی ترتیب اور تسلسل کا معاملہ ہے۔ شیخ زین نے بابر کی تقلید کی ہے۔ مختلف افغان امیروں، حکمرانوں، قلعداروں اور مغل ترکوں اور ان کے بادشاہوں سے تعلقات کے احوال' اول الذکر کی رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ پسپائی و سرکوبی اور موخر الذکر کی فتح یابی و تسلط کی داستان تقریباً دونوں میں یکساں طور پر مندرج ہے۔ زبان و بیان کا انداز جُدا جُدا ہے۔ متعلقہ مقبوضہ علاقوں اور بلاد کے محاصل اور آمدنی کے جائزہ میں بھی زیادہ اختلاف نہیں پایا جاتا۔ موسم اور اوقات کی تقسیم کا بیان' آب پاشی کے ہندوستان کے قدیم رواجوں رہٹ' اور چرس کے طریقوں کی تفصیلات کم و بیش طبقات و تزک میں ایک ہی طرح کی ہیں۔ آگرہ کے نواح میں باغات کا لگانا' حمام وایوان' زینہ دار کنوئیں یعنی باؤلیاں بنوائیں، شاندار عمارت کی تعمیر' بادشاہ کے اصلاحی نکات و اختراعات کا تذکرہ دونوں میں موجود ہے' طبقات میں تزک سے اخذ کیے گئے ہیں۔

شیخ زین۔

" از غرائب خصوصیات ہند حوالیش و عجائب رسوم آں کشور و اہالیش کہ آں بر صفحۂ ضمیر حق پذیر بادشاہی منقش گشتہ' بر زبانِ قلم گذشتہ بود۔ کلکِ ترجمان بغیر زبان و نقصان بر صفحۂ بیان نگاشتہ از تغیر و تبدل احتراز نمود۔"

اس کے بعد اشارہ کرتے ہیں کہ میدان خاصۂ سلیمانی بہت وسیع تھا' اور اس کا اشہب قلم اتنا تیز عناں تھا کہ خود اس کا فارسی مرکب انامل کلک کلی ترجمانی سے قاصر تھا (اسیرۂ درآمدہ) لہٰذا قطرۂ زبان ہی رہا یعنی بادشاہ کا قلم اتنا تیز رفتار تھا کہ اس کا اپنا قلم اس کے مقابلے میں عاجز تھا۔ اس لیے بہت کا تھوڑا ہی لکھا۔ اس کے بعد ایک مختصر اقتباس تزک کے ترکی زبان کا ہے۔ پھر رجوع کرتا ہے:

" بہ حکایات جہانبانی بادشاہ غازی و شروع در آں بہ ذکرہ گنج شانی

و خزانۂ پردازی" (صفحہ ۱۸۷ تا ۱۸۸)

طبقات بابری کے افادی پہلو کم نہیں۔ اس کی ادبی حیثیت پُرشکوہ، زوردار انشا پردازی کے علاوہ تاریخی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کتاب ایک ایسا اہم عہد معاصر سرچشمۂ معلومات اور بابری تاریخ کا ماخذ ہے جس پر توجہ دینی چاہئے تھی نہیں دی گئی۔ اُسے محض ترکی زبان کی تزک کا ایک سطحی چربہ مصنوعی بلاغت، لسانی لفاظی، سخن گوئی کا نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اس میں نئی اور ذاتی مشاہدات پر بھی جو باتیں یا مواد معقولات ہیں، ان پر نظر ڈالنے کی کہیں کوشش نہیں کی گئی ہے۔ راقم السطور نے ایک عزیز دوست کی فرمائش پوری کرنے کی جرأت کی ہے اور کتاب کو انگریزی جامہ میں پیش کرنے کی ہمت کی ہے۔

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

یہ ترجمہ زیر اشاعت ہے۔ یہ راقم السطور کی سعی مشکور ہو یا نہ ہو تاہم کتاب کی پذیرائی شاید اُس حد تک نہ ہو جس کا حسن ظن راقم السطور کے دوست کو ہے جن کی فرمائش پوری کی گئی ہے لیکن لوگوں کی توجہ تو طبقات بابری کی طرف ضرور منعطف ہو جائے گی۔ اور یہی کافی ہے۔ اس مختصر مضمون میں طبقات کی تاریخی اہمیت کے اظہار کے لیے محض چند باتوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

صفحہ ۱۴۵ کی حسب ذیل عبارت لائق توجہ ہے:-

"در تاریخ نہ صد وسی و چہار (۹۳۴) کہ لمعات رایات اسلام شعار بادشاہی پرتو نصرت بر چندیری انداخت۔ چنانچہ ذکر خواہد شد۔ (اس کی اور ایسے کئی مواعید کی وفا کی نوبت نہیں آئی) حصارش و قہر و غلبہ از میدنی رائے نامی کہ جملت الملک کہ سنکا (رانا سانگا) بود۔ در طرفۃ العین گرفتہ بہ قتل عام و غارت پنج شش ہزار حربی خونخوار را

و اموالِ شان در عرصۂ اخذ طرف ساخت ۔ مترجم ایں الفاظ و معنی
حسب الفرمان حضرت سلیمانی بہ تعمیر مساجد و نظام خیر و اعدام و انہدام
آثار کفر و ہوم کلیسا (؟) و دیر مشغول بود ۔ عمارات خیر عالی اساس متجاوز
از حد و قیاس مشاہدہ نمود کہ اکثر را افگندہ، گاہ آلودہ بودند و بر دیوار ہائے
زرکاری زنگِ زرگاری افزودہ کثافت نجاست اک کثیفاں متوجہ ۔
طرا قدس ضمیر اطہر بادشاہی چناں مرتفع شد کہ گویا ہرگز نبود ۔"

اس کے پہلے شیخ زین "کافر حربی" "حاکم بد اصل ولایتِ چتوڑ" یعنی رانا سانگا کی متغلبانہ کارروائیوں کا ذکر کر چکے تھے ۔

"ہنگام اختلال سلطنتِ سلاطین ہند، سر بہ فتنہ جوئی و سرکشی برآوردہ
بسیاری از ولایاتِ ہند را بہ تصرف کردہ است از آں جملہ رنتھنبور و
سارنگ پور و چندیری کہ ہر یک شہریست جامع و بسیار از قصبات و بلاد
ہر یک را تابع ۔ مساجد رفیع البنیاد، معابد وسیع الفضا لا تعداد و لا تحصیٰ
از جہت استیصال آں (کافر لعین و سائر حربیانِ بے دین کہ تابع
وے بودند پائے گاواں بودن کہ مقصود بالعبادہ ہندواں است ۔"

راقم السطور کو ایک تاریخی اجتماع کے موقع پر بڑودہ جانے کا اتفاق ہوا ۔ دیگر نمائندوں کے ساتھ مہارانی ہولکر کی شاندار رہائش کی سب سے اوپر کی منزل پر پہنچایا گیا ۔ سنگ مرمر کے فرش زمیں کی گائے کے گوبر سے تزئین کی گئی تھی ۔ ہمارے گاؤ پرست ہندو بھائی بھی اس منظر سے کسی حد تک منغص دکھائی دیئے ۔

بابر نے تزک میں مندروں کا جا بجا ذکر کیا ہے ۔ شیخ زین نے صفحہ ۱۷۹ میں جو کچھ بابر نے ہندوؤں کے بارے میں لکھا ہے دہرا کر وہ ہر ایک مسلمانوں سے متعلق اپنی معلومات کی بنا پر جو کچھ لکھا ہے وہ نئی چیز ہے ۔ بابر نے صرف اشارہ کیا تھا :

"رعایائے تمامی ایں دیار کفار اند تن سخی ۔"

لیکن شیخ زین نے اضافہ کیا :

" در جمع کردن زر اہتمام تمام دارند ۔ کفار ان مند ہم تناہنجی اندو زنار بند (برہمن) "

اس کے بعد شیخ زین بالکل نئی باتیں مسلمانوں کے متعلق لکھتے ہیں ۔ تزک میں اس کے بارے میں کچھ نہیں پایا جاتا ۔ شیخ زین لکھتے ہیں :

" مسلمانان در این خطہ بعد سلاطین حکام جمعی اند ایمہ نام کہ سلاطین اسلام در سوابق ایام کہ فتح آن دیار نمودند از دار اشارہ از ولایات دیگر آوردہ جہت نصب اعلام اسلام و اعلای سوای شریعت سید انام در امصار و مداین ساکن ساختہ اند وجوہ معاش و اقطاعات از خراج ممالک برای ایشان تعین نمودہ و دریافت آں جمع را اکنوں در حدود کثرت تمام است و ہمہ بغایت قلیل الاستحقاق و کثیر الابرام ۔ اکثر ظاہر آرایان ناقبول و خود ستایان بوالفضول اند ۔ بر سبیل ندرت مردم عزیز دراں میانہ نیز پیدا می شوند ۔ اما آں جمع خود را پیدا نمی سازند و چشم طمع بر حکام و حطام دنیوی نمی اندازند وجوہ اسباب عامۂ آن دیار از بہرہ تا بہار ہمہ ہنگام این تالیف در ظلال تسخیر رایات ظفر شعار بادشاہ اسلام در شمار بود و بہ سہ کروری کسید کہ غایت بہ امضا رسیدہ فرمان بادشاہی در اجرائے آں جامع زواید محدودہ نافذ گردیدہ ۔ "

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ سارے ردایات صحرا نشین قبائل سے بھرے ہوئے ہیں اور ہر قبیلے کا اپنا خاص نام ہے اور امتیازی نشان ہے ۔ اس بلاد کے ساکنان و متوطنان قبائل مختلف الاسامی اند ۔ اس کے بعد اصحاب حرفہ کا ذکر کرتے ہیں کہ اپنے آباؤ اجداد کے پیشہ و اشغال سے وابستہ رہتے ہیں ۔

" رسم آن ملک آن است کہ فرزند ہر کس در حرفہ و کسب تابع

خود است ۔"

افغان امیروں میں جن بڑی ہستیوں نے بابر کی اطاعت قبول کی تھی ان میں علی خاں بھی تھا۔ تزک میں اس کا نام اور اس کی اطاعت گذاری کی طرف محض ایک اشارہ ملتا ہے۔ لیکن شیخ زین اپنے مشاہدات اس کی شخصیت کے متعلق پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

" مشارٌالیہ و فرزند انش بہ ایادیٔ تربیت نواب کامگار بادشاہ احسان شعار بہ اوج افتخار و ذروا اقتدار بر آمد واکنوں طوق نقارہ حسب الفرمان بادشاہی می افراز ردی نواز و رفیع الاعلام و بلند آوازہ است ..... بین الاقران ذوالاقوام امتیازش بے اندازہ ......
و مشارٌ الیہ در ہند مشہور بہ شجاعت است و چناں تہمتن قوی ہیکل است کہ در بزرگی تند و عظمتِ بلند ضرب المثل است۔ ہر مرکب طاقتِ مرکوب او نیارد و ہر در وسعت در آمدنش ندارد۔ ہمیشہ در خانہ و بازار و نہان و آشکار بہ خائیدن برگ تنبول مشہور است و دہانش مملو از برگ تنبول کسے دیرا از تنبول خاری و دہانش را از تنبول خالی ندیدہ است۔ و تارک ایں معنی در مجلس عالی ہم نہ گردد ۔"

دوسرے اشجع روزگار کی چشم دید شجاعت کا حال صرف زین کے طبقات ہی میں مل سکتا ہے۔ امیر محمد علی جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں :

" او را زخم تیر بر پا رسیدہ ۔ چند روزے از پایش انداختہ بود۔ در روز معرکۂ بزرگ (جنگ کنواں) باوجودیکہ تاب قتال نداشت و رخصت ماندن یافتہ بود در ہنگامۂ اشتعال و آتش حرب بے اختیار شدہ نوکرانِ خود را فرمودہ بود کہ او را سوار ساختہ بودند۔ بہ فوج در نہایت

آراستگی درمیان معرکہ بجوش ؟ در آمد۔ چنانچہ مردم کہ درسوز بیشتر اورا بربستر دراز دیدہ بودند تعجب نمودند" ص۱۱۱

طبقات میں کئی باتیں تاریخی اہمیت کی پائی جاتی ہیں جو تزک میں نہیں ملتیں۔ ایک عمارت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خانہ سنگین مشتمل بہ چہار طاق و چہار ایوان و چہار حجرہ خورد کہ مطلقاً از جنس آب وگل و آہنگ و آہن وغیرہ ذالک از آں چہ موجب اتصال اجزا بود ہنرمندان سنگ تراش قطعات سنگین و رنگین راچناں بہ یک دیگر اتصال دادہ اند کہ خرد خوردہ دادند را بہ مشاہدہ آں تعجب تمام و حیرت مالاکلام است و ایں قطعہ در تاریخ اتمام آں رقم زادہ کلک ترجمان مؤلف است ؎

این طرب خانہ سنگیں کہ بود کعبہ مثال
قبلہ حاجت ارباب و دل اہل وفا
نو عروسست گل اندام کہ در دشت بہشت
چار طاق از پئے آرائش او بیت فضا
نیست یک ذرہ و یک قطرہ دراں از گل و آب
ہمہ سنگ است بہ آمیزش و ہم ماندہ بجا
بس کہ موزون و متین است و پر از معنی راست
ہست رنگین ظہور است بہ نزد فضلا
بانیش کعبہ آفاق بود زاں سبب ش
خانہ کعبہ آفاق شدہ سال بنا"

آخری مصرعہ "خانہ کعبہ آفاق" سے ۹۳۵ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اسی طرح کی اور بھی کئی باتیں ہیں۔ شہزادہ فاروق ابن بابر کی ولادت کی تاریخ تزک میں دی ہے۔

شیخ زین نے اس میں اضافہ کیا ہے۔

"ولادتش است ۲۳ شوال ۹۳۲ھ واقع شدہ و فاتحہ را در واقعہ ۹۳۴ھ تحریر خواہد شد۔ (ص ۲۴۴) پیش ازاں کر نظر عطوفت اثر پادشاہی منظور درگردد سرادقات کہ اقبالش بہ ستر عظیم العجاب عمیم کُلُّ نفسٍ ذَآئِقَۃُ الموت منور گشت۔"

۹۳۴ کا ایک اور واقعہ درج کرتے ہیں:۔

"تاتار خاں سارنگ خوانی کہ حاکم بہ استحکام گوالیار بود۔ تسلیم گوالیار را بہ لیت و لعل موقوف گشتہ۔ بہ امروز و فردا می انداخت چوں سنگا کافر (رانا سانگا) قلعہ کندانہ گرفتہ و بیانہ قریب آمدہ۔ چندے از رایان و خواجگان قدیم گوالیار و بعضے از مسلمانان اتفاق نمودہ در مقام گرفتن گوالیار از تاتار خاں مذکور در آمدند و از رفتن ایشان تاتار خان بہ تنگ آمدہ بہ تسلیم گوالیار رضا داد۔"

(۲۳۳) شنبہ ۱۴ جمادی الاولیٰ کو بابر کی فوج رانا سانگا سے جنگ کے لیے حرکت میں آئی۔ بادشاہ صاحب تدبیر کے خاطر خطیر میں ایک مناسب میدان جنگ کی جہاں پانی کی کمی نہ ہوگی فکر خطور کرتی ہے۔ اور دو آب بزرگ کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ایسا ذخیرہ پانی کا سکری میں موجود تھا۔ خدشہ تھا کہ رانا بڑھ کر اس پر اپنا قبضہ جمائے گا۔ شیخ زین لکھتے ہیں:

"چوں در آں نواحی آب کہ اُردو بزرگ از آں نمی تواں کرد در غیر قصبۂ سکری کہ بعد از آں شش حضرت اعلیٰ بہ شکری یعنی بہ شین معجم نام کردہ است۔ و اکنوں بہ ایں نام اشتہار دارد محل دیگر نیست محتمل

کفار آں منزل را شغلی کردہ کار و اہل اسلام را مشکل سازند۔"

ظاہر ہے کہ چھوٹی 'س' مہملہ کو بڑی 'ش' معجمہ سے بدل بابر نے سکری کو شکری تب ہی بنایا ہوگا جب اسے کنواں کی جنگ میں رانا پر فتح یابی حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن جنگ پانی پت کی تفصیلات طبقات میں نہیں ہیں اور جنگوں کی جو چندیری اور چتوڑ کے حکمرانوں سے ہوئیں وہاں تک کتاب نہیں پہنچتی۔ بہت پہلے ہی ختم ہوجاتی ہے لیکن شیخ زین کا قلم نہیں رکتا۔ کچھ آگے کی باتوں کی طرف بھی اشارے کردیتے ہیں۔

تیمور اور بابر کے حملۂ ہندوستان' تعداد فوج' مدافعانہ کارروائیاں اور دوسرے امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیمور اور بابر کے فتوحات و مشکلات کا تقابل کیا گیا ہے' جائزہ لیا گیا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ تزک اور واقعات دونوں میں شیخ شرف الدین یزدی کی مشہور کتاب سے چند باتیں اخذ کی ہیں۔ شیخ زین کے اقتباسات زیادہ تفصیلی اور پُر معلومات ہیں جو اسی کے لفظوں میں لکھتے ہیں :۔

"در خاطر بعض لشکریان خطرۂ تمام را ہ یافتہ بود۔ چنانچہ در وقت تعین مواضع فرو دآمدن آیان در حمت حضرت صاحب کلام کہ در ہمہ حال شامل اہل کمال بودند از بعض علمار رفیع مقدار کہ ظفر کردار ملازم رکاب ہمایوں آثار بودند۔ مثل خواجہ افضل پسر مولانا شیخ الاسلام سعید جلال الحق و دین و مولانا عبد الجبار پسر افضل قضاۃ مولانا عماد الدین خوارزمی ایں را بہ اشفاق سوال فرمودند کہ جائے شما کجا خواہد بود۔ ایشاں از دہشت کہ آں سخناں کہ شنیدہ بودند بے اندیشہ بر جواب مبارزت نمودند۔ کہ جائے بندگان در آں محل کہ خواتین و عورات باشند۔" (۱۵۴)

ترکی تزک اور اس کے فارسی ترجمے اور طبقات کے درمیان بہ ظاہر کچھ چھوٹے چھوٹے متعدد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ سب کا ذکر ضروری نہیں۔ علی قلی خاں کے ڈھالے ہوئے توپ کلاں کی سنگ اندازی کا امتحان لیا جاتا ہے :

بہ صحرائے کہ سنگ عظیم القدر عظیم الشان ہزار و ہفت صد گز
کہ دیگ را تعبیہ کردہ بودند رفت ۔"

تزک میں بجائے سترہ سو کے سولہ سو گز ہے سولہ گز مار یا شست ہے (۲۴۵)
فیل کے خوراک کی مقدار بقول طبقات یک قطار شتر تھی۔ تزک میں دو قطار لکھا ہے (۱۵۹)
تزک تیمور کو ٹیل کے قلعہ کن کوٹا یا گن گوٹا کے محاصرے کا ذکر موجود ہے۔ لیکن امیر نظام الدین علی خلیفہ اور ان کے ہزاری دستے کے متعلق کچھ نہیں بتلایا گیا۔ (۵۷)

اب ہم ان چھوٹے اختلافات سے قطع نظر کر کے کچھ اور باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ طبقات میں ترکی اقتباسات جو ملتے ہیں ایسے اندراجات کی کوئی توضیح نہیں کی گئی ہے۔ ترکی اقتباسات عبدالرحیم خان خاناں کی کتاب واقعات بابری میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان اور ہندوستانیوں کی من قصہ میں بابر نے دل کھول کر جو بہت کچھ مبالغہ آرائی کی ہے، خان خاناں نے اسے تمام تر فارسی میں منتقل کر دیا ہے۔ بیرح کے خیالات آرائی کی طرف جو محل نظر ہے اوپر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ شیخ زین کو جھجک محسوس ہوئی اور خان خاناں جو اس قدر ہندوؤں میں ہر دل عزیز تھا اسے کچھ تکلف نہیں معلوم ہوا۔ سب سے پہلے تزک کی ترکی لمبی عبارت اِس تعارف سے شروع ہوتی ہے :

"ایں معانی را کہ در ترجمانی نالائق است و معذرت کہ نواب خاقانی ہم بر عبارت حضرت سلیمانی موافق مصرع حکمت جنیدن از لب لقمان چہ خوشتر است ۔ لازم تغیر در آں رانمی دارد و معذرت آں حضرت را تیمناً در ہمان لفظ عبارت می آرد ۔ (۲۰ - ۱۸)"

بابر کی بنوائی ہوئی ایک چھوٹی سنگین مسجد کا ذکر کرتے ہوئے شیخ زین ایک ترکی جملہ لاتے ہیں جس کے معنی ہیں کہ "یہ مسجد ہندوستانی وضع کی ہے اس لیے جاذب نظر نہیں (۳۲۲)

خواجہ کلاں کی بیت جو دہلی کی ایک عمارت پر لکھ کر وہ چلا گیا تھا۔ بادشاہ کو بہت سخت لگی۔ جواباً خود رباعی نظم کی، جو ترکی ہی میں تھی۔ (۱۹۴)

استاد علی قلی کی توپ ڈھلنے میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی۔ توپ چی کا مارے دہشت کے برا حال تھا لیکن بادشاہ کی دل جوئی نے سنبھالا دیا۔ یہاں بھی ترکی کے الفاظ آئے ہیں۔ (۲۲۶)

سلطان ابراہیم لودی کی بوڑھی والدہ بابر کو زہر دلوانے کی کوشش کرتی ہے۔ شیخ زین ایک طویل ترکی اقتباس طبقات سے میں درج کرتے ہیں جو بادشاہ کے قلم سے وارد ہوا تھا اور کابل بھیجا گیا تھا۔ شیخ زین نے خود کئی فرامین فتوحات وغیرہ کے متعلق لکھ کر بابر کی طرف سے کابل کو بھیجا تھا۔ زہر خورانی کے واقعے کے متعلق اشارہ کرتے ہیں :

"کیفیت ایں واقع در ضمن کتابت کہ کلک گوہر بار بادشاہی تحریر آں نمودہ بہ جانب کابل ابلاغ یافتہ۔ ایں راوہمان مکتوب احسن از انشار ..... آن مکتوب این است۔"

خلیفہ شیخ زین اور یونس علی بادشاہ کے ایما بلکہ حکم سے خراسانی طرز پر نواح آگرہ میں دکنار دریا عمارتیں بنواتے ہیں۔ یہاں بھی ترکی کا جملہ استعمال میں آیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ بادشاہ کا خمیر قضا تاثیر ہمیشہ مقتضئ تسخیر ہند بود۔ واقعات کا ذکر کرنے کے بعد بادشاہ کے عزم صمیم کا ذکر بھی ترکی الفاظ میں استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہ اپنی کامیابیوں پر عجب دغرور نہیں کرتا۔ نفائس مخفیات قضا و قدر در میان ہند۔" ترکی جملے جو آئے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس دولت کے حصول کو اپنی طاقت پر محمول نہیں کرتا۔ اس سعادت کے نصیب ہو جانے کو اپنی کوشش و ہمت کی بدولت نہیں جانتا۔ خداوند تعالی کی عنایت سمجھتا ہوں۔ (۲۶۱)

گنجِ فیّاضی

خانوادۂ رشیدیہ کے ایک بزرگ کا ملفوظ

دورِ قدما میں ہندوستان کے باہر تصوف و طریقت کی تعلیمات اور اصحابِ طریق و صوفیائے کرام کی حیات، نفس کشی، ریاضت و مجاہدات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ اللمع، رسالہ قشیری (عربی) کشف المحجوب (فارسی) تمہیدات، عین القضات، فتوح الغیب، عوارف المعارف وغیرہ کو خاص کر اولیت اور اہمیت حاصل ہے۔ مختلف سلاسل اور طبقات کی شروعات اور خانقاہی نظام کی بنیاد بھی ہندوستان کے باہر ہی پڑ چکی تھی۔ حضرت ابوالقاسم قشیری (م ۴۶۵ھ) کے زمانے یعنی پانچویں صدی ہجری میں جناب و نشاق کی خانقاہ مرکزِ فقر و تصوف کی حیثیت سے مشہور ہو چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اسلام کے ساتھ ساتھ تصوف کا ہندوستان میں ورود ہوا تو اُس کے پہلے ہی اس کے سارے عناصرِ ترکیبی ظہور پذیر ہو چکے تھے، مکمل ڈھانچہ تیار ہو چکا تھا۔ باہری زیبائش و آرائش بعد کو ہوتی رہی جو کچھ ہندوستان میں ہوا اسے مسائلِ سلوک کی تشریح و توضیح ہی کہی جا سکتی ہے۔ اسے کسی اور چیز اور کسی خاص نئے اضافی امر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے لکھے گئے۔ تاریخ اور تذکروں میں بزرگانِ دین اور اصحابِ طریقت کے حالات و خیالات، طریقۂ کار، طرزِ زندگی، اثر و رسوخ پر روشنی ڈالی گئی۔ خاص قسم کی مذہبی کتابیں جنھیں مکاتیب و ملافیظ کا نام دیا گیا ہے بہت پہلے سے لکھی جانے لگی تھیں۔ ہندوستان میں چشتیہ، سہروردیہ، شطاریہ، فردوسیہ

قادریہ، نقشبندیہ، مداریہ یہاں تک کہ ملامتیہ سلاسل کے پیروں کے مخلص مریدوں نے بھی ملفوظات و مکتوبات کی تدوین پر بہت توجہ صرف کی۔ بہت سی ایسی کتابیں تو ناپید ہو گئیں اور چند کی اصلیت کے متعلق شکوک و شبہات کا اظہار ہونے لگا۔ ان کتابوں میں اتباع کتاب اللہ و سنت نبوی اور پابندی شریعت پر متقدمین نے صوفیا و علماء کی تحریروں کی طرح زور دیا گیا تھا۔ بہت سے معتقدات میں اشتراک تھا۔ اختلاف و انحراف کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن ان صوفیاء کی کچھ اپنی امتیازی خصوصیات بھی تھیں۔ جو تصوف کی شکل اختیار کرکے وجود میں آچکی تھی۔ اس میں یونانی، ایرانی تخیلات کا عنصر نمایاں تھا۔ ہندوستان میں بھی ہندو مذہب کے معتقدات اثر انداز ہوئے۔ کچھ حد تک ہندی فلسفہ اور ہندی مراسم کے چھاپ کا پڑ جانا ناگزیر تھا۔ مکاتیب و ملافیظا کا بیشتر حصہ تو مسائل تصوف، اذکار و اشغال، تزکیہ نفس، مجاہدہ مراقبہ، ترک ماسوا اللہ، خشیت الٰہی، توحید وجودی یا شہودی، سلوک و طریقت کی تعلیم، زہد و ورع، صبر و رضا، توبہ و استغفار اوراد و وظائف، اخلاقی اصلاح اور نیک کاموں کی تلقین، کسب معاش، گداگری سے تنفر، عدل و مساوات کی تعلیم، حلال و حرام کی تمیز، نکاح و وراثت، تواضع و انکسار، نام و نمود، خدمت خلق کی ضرورت پر زور، غرور و تکبر اور حیلہ شرعی کی مذمت، ذمائم قبیحہ سے احتراز کی ہدایت اور ایسی ہی سب باتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ صوفیا اور مشائخ اپنے متعلق کچھ نہیں کہتے تھے لیکن اگر پوچھا جاتا اور اس پر اصرار ہوتا جواب میں کچھ ایسی باتیں اشارتاً یا وضاحتاً قلم و زبان پر آجاتیں جن کا تاریخ تنقید حالات حاضرہ پر تبصرہ سے کسی حد تک تعلق ہوتا ہے۔ اپنے سلسلے کے بزرگوں سے غائبانہ عقیدت اور کسب فیض کا ذکر تو آتا ہی تھا لیکن ساتھ ساتھ مکتوبات میں کم ملفوظات میں زیادہ کشف و کرامات لا یعنی توجہات گنڈہ، تعویذ، شرک و بدعت کے رسوم و رواج، پیر پرستی، گور پرستی، اصحاب مزارات سے حاجت روائی کے لئے دعائیں مانگنا اور اس پر یقین غرض کہ بہت سی ایسی باتیں تھیں، جن کی ارباب شعور کے نزدیک نہ اہمیت ہے نہ دینی جواز، ان کے مطالعہ کرنے والوں کے سامنے یہ سب چیزیں آجاتی ہیں۔ البتہ ایک اچھی بات ان ملفوظات میں جو نظر آتی ہے وہ مقامی ملکی زبانوں سے اصحاب طریقت اور صوفیائے کرام کی آشنائی و وابستگی ہے شروع شروع میں کم بعد کو

بہت زیادہ نسبتاً صاف تر ہندی دوہرے، فقرے فارسی اشعار کے ساتھ استعمال ہونے لگے۔ معدن المعانی میں صرف ایک دو فقرے ہیں۔ مکتوبات حضرت شمس بلخی میں سات ہندی دوہرے لکھے ہیں جو عسیر الفہم ہیں۔ معدن الاسرار یعنی ملفوظات حضرت قاضن علا شطاری مرتبہ راجہ علی راج گیری کی ساری کتاب میں محض ایک فقرہ ہے جو مخدوم جہانیاں حضرت سید جلال بخاری سے منسوب کیا گیا ہے۔ "کھنڈو بے بھندہ کہاں" یہ فقرہ بہت ہی اہم لسانی اعتبار سے ہے، لیکن یہاں اس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ گنج رشیدی، گنج ارشدی، گنج فیاضی میں بھی ہندی جملے اور فقرے جو خاصے صاف اور قابل فہم ہیں بکثرت ملتے ہیں۔ ان سے جہاں ہندوستانی اُردو کی ہمہ گیر تسخیری توانائی کی غمازی ہوتی ہے وہاں صوفیا کی موقع شناسی، حُب الوطنی، رواداری، یک جہتی وغیرہ کا کتنا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کی زندگی کا ایک اہم مقصد تبلیغ و اشاعت اسلام بھی تھا۔ اگرچہ کوئی بھی کھل کر کسی حد تک تفصیل سے اپنے طریقۂ کار اور اس کے اثرات و نتائج کے متعلق زبان و قلم سے ہمیں کچھ نہیں بتاتا۔ کبھی کبھی محض اشارتاً کچھ ذکر کر دیتے ہیں لیکن زیادہ تر جفاکشی، ریاضت و مجاہدہ کی تعلیم، درس و تدریس کا تذکرہ اور کئی اعتباروں سے علم و عمل کا امتزاج خانقاہی نظام تربیت میں نظر آتا ہے۔ خانقاہ کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے کھلا رہتا تھا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ وارد و صادر کی پناہ گاہ، ہندوؤں و غیر مسلمین کے لئے مقام ہدایت، مختلف لوگ، مختلف زبانیں بولنے والے دُور دُور سے آکر ایک جگہ بیٹھیں اور ہم کلام ہونے کی کوشش کریں تو اُس کا لازمی نتیجہ ایک کی زبان پر دوسرے کی زبان کے اثر کا پڑنا تھا اور اس سے ہم آشنائی اور تعلقات میں اضافہ ضروری تھا۔ ایک ملی جلی الفاظ سے مرکب زبان کے وجود میں آنے کا امکان تھا۔ مزارات کی زیارت اصل مقصد رہا ہو، یا حلقۂ ارادت کی وسعت اور اپنے سلسلہ کے پھیلانے کی سعی یہ بات متاخرین صوفیا میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ فقرا اور مشائخ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ لیکن آج کل تو اس کا رواج بڑھ گیا ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ ایک نئی زبان کی تخلیق میں سنسکرتی تت سم الفاظ گھس کر تدبھو کی شکل اختیار کرتے گئے۔ اس بارے میں صوفیا کی دین بالخصوص بہ نسبت اور اسباب کے

بہت زیادہ تھی ۔ راتری، رات ہو گئی ۔ پریشٹھ، پیٹھ بن گئی ۔ اذیں قبیل الفاظ کی تبدیلی اور فارسی عروض و قواعد کا دھیرے دھیرے اثر ہونے لگا ۔ اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا بہت بڑا ہاتھ ہے ۔ ایک نئی زبان اُردو یا ہندوستانی کا وجود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ دیسی اور بدیسی کے تعلقات میل جول، کاروبار کا سلسلہ زمانۂ اولین میں ہی شروع ہو گیا تھا بلکہ بہت آگے بڑھ چکا تھا ۔

اوپر کے اجمال کی تفصیل کے لئے کتابوں اور مواد کی کمی نہیں ہے ۔ لیکن ہم سطورِ ذیل میں صرف ایک کتاب کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں ۔ جس میں سفرنامہ بھی ہے، مکتوبات بھی ہیں اور ایک بزرگ طریقت کے روزانہ زندگی کے معمولات کی تفصیلات بھی ہیں ۔ جون پوری خانقاہ رشیدیہ کے یہ تیسرے اہم رُکن تھے ۔ اُن کی وضع شخصیت اقوال و افعال ایک دو سال کے معمولات اور پٹنہ اور سارن اور پورنیہ میں سیاحت کے تذکرے، ایک عقیدت مند مخلص مرید غلام شرف الدین مہداوی نے مرتب کیا ہے ۔ بانی خانقاہ حضرت دیوان عبد الرشید (تولد ۱۰۰۰ھ بہ عہد اکبر ۔ وفات ۱۰۸۳ھ بہ زمانۂ اورنگ زیب) قطب الاقطاب ان کے منجھلے بیٹے اور جانشین مخدوم بدر الحق شیخ محمد ارشد (تولد ۱۰۴۲ھ وفات ۱۱۱۳ھ) کو قدوۃ الاولیا اور مرخر الذکر کے پوتے اور خانقاہ رشیدیہ کے تیسرے سجادہ نشین حضرت قمر الحق ابو الفیاض غلام رشید ارشد (تولد ۱۰۹۶ھ) ابن شیخ مجیب اللہ (تولد ۱۰۷۱ھ ۔ وفات ۱۱۰۹ھ) کو پیر دستگیر کے خطاب سے ہر جگہ یاد کیا گیا ہے ۔ راقم السطور کو تین بار جون پور خانقاہ رشیدیہ میں جو بازار میر مست میں واقع ہے جانے کا اتفاق ہوا ہے ۔ پہلی مرتبہ عزیزی ڈاکٹر حسنین بھی ساتھ تھے ۔ سرسری طور پر چند کتابوں پر نظر پڑی ۔ تیسرے موقع پر سارے کتب خانہ کو دیکھ سکتا تھا لیکن عزیزی طیب ابدالی صاحب کی اتفاقی بیماری نے آرزو پوری نہ ہونے دی ۔ کچھ عربی کی کتابیں جو خود حضرت دیوان عبد الرشیدؒ اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں نظر میں آئیں ۔ گنج رشیدی کی دو مکمل جلدیں ۔ گنج فیاضی اور کئی کتابیں جو بزرگوں کے مراسلات پر مشتمل تھیں بالخصوص جاذب نظر تھیں لیکن استفادہ کی نوبت نہیں آئی ۔ زیر نظر گنج فیاضی کا نسخہ نہایت کہنہ، خستہ اور کرم خوردہ ہے ۔ غالباً یہ وہی نسخہ ہے جو کسی زمانے میں راج گیر کی خانقاہ میں تھا ۔ راقم السطور کو پروفیسر طیب ابدالی نے اس مقالہ کے لئے مستعار

دیا ہے۔ ایک اچھا نسخہ بہار شریف کے محلہ محل میں شاہ زاہد سجاد صاحب کے ذخیرۂ کتب میں بھی ہے۔ زاہد صاحب حضرت جعفر ابن مولانا اسلم پٹنوی مدفون در شریعت آباد کے اخلاف میں ہیں۔

مخدوم محمد عبد الرشید کا نام مراسلات اور مکاتبات میں محمد لقب شمس الدین اور تخلص شمسی دیا گیا ہے۔ فیاض اور دیوان بھی انھیں کہتے تھے۔ یہ اپنے والد ماجد جمال الحق شیخ مصطفےٰ عبد الحمید عثمانی کے مرید تھے اور وہ خود شیخ محمد بن شیخ نظام امیٹھوی متوفی ۹۸۱ھ کے حلقۂ ارادت میں تھے۔ رشد و ہدایات اور تلقین و خلافت کی اجازت دیوان صاحب نے قدوۃ العارفین حضرت شیخ بنارسی بن شاہ معین الدین سے حاصل کی تھی۔ سکلائی اپنے وطن سے بہ غرض تعلیم جون پور تشریف لے گئے۔ شیخ نور ساکن بردنا پرگنہ انگلی کی صاحبزادی سے عقد کیا۔ ان سے دیوان عبد الرشید اور دوسرے بھائی پیدا ہوئے۔ خود بہار کے بلدۂ پورنیہ میں استقامت گزیں ہوئے۔ اور وہیں شیخ مصطفےٰ جمال الحق کا ۲۰ ذی الحجہ کو انتقال ہوا اور محلہ بازار چمنی میں مدفون ہوئے یہ مزار مرجع خلائق ہے۔ آج تک بڑے تزک و احتشام سے اس کا سالانہ عرس ہوتا ہے۔ بڑے صاحبزادے دیوان عبد الرشید نے جون پور میں استاذ العلما ملا افضل کی شاگردی میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ ملا محمود ولید پوری ثم جون پوری صاحب شمس بازغہ کے ہم درس و ہم سبق تھے ان کی ذات جامع کمالات تھی۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ اوائل میں درس و تدریس میں بہت اشتغال تھا لیکن اواخر میں اپنی زندگی کتب حقائق و معارف کے مطالعہ کے لئے وقف کردی تھی۔ کئی کتابیں تصنیف کیں۔ کتاب اسرار المخلوقات مصنفہ شیخ اکبر محی الدین پر ایک نہایت فاضلانہ شرح لکھی جو بہت مشہور ہوئی۔ کتاب رشیدیہ مناظرے ہیں۔ ارشاد السالکین مقصود الطالبین تصوف پر اور ایک دیوان اشعار۔ ان کی تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں جو ہنوز موجود ہیں۔ ۸۳۔۸۴ برس کے سن میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کے قبل خانقاہ رشیدیہ اور اس سے متصل مسجد اور کنواں تعمیر کرایا جو ہنوز باقی ہیں۔ گنج ارشدی میں آپ کی زندگی کے حالات کچھ زیادہ ہیں۔ گنج فیاضی کی فصل دوم میں بہ سلسلۂ نسب حضرت پیر دستگیر کچھوچھہ کام کی باتیں بتائی گئی ہیں۔

قبل اس کے کہ گنج فیاضی کے خط و خال، امتیازی خصوصیات اور مضامین و مواد پر سرسری نظر ڈالی جائے، دو باتوں کا تذکرہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ پہلی بات اس کے جامع کے متعلق ہے۔ شیخ غلام رشید کا وطن احمد پور مہداواں تھا جو منیر شریف کے نزدیک جانب مشرق ذی علم اور صاحبانِ تمول مسلمانوں کی بستی تھی ان کے خاندان کے افراد کا صاحبانِ صادق پور پٹنہ کے مورثوں سے گہرا تعلق تھا۔ مولوی عبدالرحیم صاحب زبیری الہاشمی عظیم آبادی نے اپنی مشہور کتاب الدر المنثور فی تراجم اہل صادق پور معروف بہ تذکرہ صادقہ میں بہت سے شجرے درج کئے ہیں لیکن کسی وجہ سے غلام شرف الدین مہداوی جامع گنج فیاضی کا نام نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ تو لکھا ہے کہ مولوی الٰہی بخش پہلے پہل مہداواں چھوڑ کر پٹنہ کے محلہ صادق پور میں استقامت گزیں ہوئے۔ حضرت سید احمد بریلوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر اپنے بیٹوں اور داماد کو فرنگیوں اور درازمویوں کے خلاف جہاد و مجاہدے کی اجازت دی اور شیخ الٰہی بخش کے والد کا نام شیخ ہدایت علی دادا کا نام شیخ محی الدین ثانی بتاتے ہیں اور انھیں شیخ امام الدین ابن شیخ کریم الدین کا پرپوتا قرار دیتے ہیں۔ شیخ غلام شرف الدین مہداوی انھیں شیخ امام الدین کے بیٹے اور شیخ کریم الدین کے پوتے تھے۔ سراج الحق میاں شیخ فیض محی الدین شیخ کریم الدین کے دوسرے بیٹے تھے اور امام الدین کے چھوٹے بھائی۔ شیخ الٰہی بخش کے چار بیٹوں میں سب سے بڑے احمد اللہ دوسرے ولی اللہ تھے۔ مولوی احمد اللہ کے صاحبزادے مشہور شہر طبیب حکیم عبدالحمید المتخلص بہ پریشاں کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالحکیم کے معزز اور محترم صاحبزادے مولانا عبدالخبیر، صوبہ بہار کے اہلِ حدیث حضرات کے قائد کا حال ہی میں انتقال ہوا۔

دوسری بات راقم السطور کی ذاتی دلچسپی کی ہے۔ دیوان ناصر علی گجہوی کے دادا میر قابل علی حسن پوروی کے متعلق گنج فیاضی میں کئی بار تذکرہ آیا ہے اور انھیں صریحاً حضرت ابوالفیض ابوالفیاض تماالحق رشید ارشد کے مریدوں میں بتایا گیا ہے۔ یہ راقم السطور کی پانچ پشت اوپر کے بزرگ خاندان میر جعفر علی ابن میر غلام محمد بانی بستی گجہوہ کے چھوٹے بھائی تھے۔

بروز پنجشنبہ ۱۳ صفر ۱۱۴۷ھ موضع بسونده میں شیخ ابو محمد ساکن مصطفےٰ پور کے ساتھ سید قابل علی حسن پوری تشریف لائے۔ پیر دست گیر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی ایک صنعت کا نمونہ پیش کیا۔

"بصنعتے تمام نوشتہ بودند کہ بظاہر خط جلی الفاظ ناد علی می نمود در دائرہ بخط خفی پنج سورہ وغیرہ آیات قرآنی وغیرہ مرقوم ساختہ بودند"۔

حسن پوری کے الفاظ سے اس کا اشارہ ملتا ہے کہ چھوٹے بھائی خاندان کے بیشتر افراد کے ساتھ ہنوز حسن پورہ آستانۂ مخدوم سید حسن سہروردی خویش مخدوم عبد الملک عشردی میں مقیم تھے اور ان کے بڑے بھائی میر جعفر علی اپنے والد محترم میر غلام محمد ابن پیر محمد کے ساتھ کھجوہ کی بستی کو "کوس جہاد" کے جنگل کو کٹوا کر بسا رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی جو پرانی مسجد کے نام سے ہنوز موجود ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ستائیسویں سال جلوس مطابق ۱۶ صفر ۱۰۹۵ھ ہجری میں ایک فرمان کے ذریعہ دو سو بیگھہ قابل زراعت زمین پرگنہ آندر سرکار سارن صوبہ بہار میں بہ طور مدد معاش اور مابحتاج بی بی بدی کو عنایت کی تھی گیجھی ڈاڑ اور جین پور کے بابوان نے ان اطراف کے سارے علاقے پر قبضۂ مخالفانہ قائم کر رکھا تھا۔ ان کی وجہ سے بڑی بڑی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نئی بستی کے بسانے اور حسن پورہ میں قیام کی طوالت کے یہ بھی اسباب تھے۔ سید قابل علی اور غلام محمد صاحبان کو شجرہ تیار کرنے کی ہدایت ہوئی۔ ۱۶ صفر یکشنبہ کو جب موضع چوکی قتال میں مخدوم شہاب الدین قتال کے مزار کی زیارت کے لئے ان کے پیر و مرشد تشریف لے جاتے ہیں تو ایک پاکر کے درخت کے نیچے "جامع ملفوظ اور سید قابل علی صاحب مقابل حضرت پیر دست گیر نشستہ از مشاہدہ جمال مبارک ایمان را تازہ ساختند" ایک موقع پر جامع ملفوظ لکھتے ہیں "سید قابل علی کہ مرید حضرت پیر دست گیر اند"۔ حضرت رسالت مآبؐ کے متعلق کچھ باتیں اُٹھاتے ہیں اور اپنے پیر و مرشد کے "فیض عام" کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"درموضع بسونده شریعت پناہ قاضی ثناء اللہ برائے سید قابل افیون طلبیدند شخصی کہ آوردہ بسہو وخطا بحضور پیر دستگیر آورد کسی از محفلے

منیف گفتہ کہ افیون است" بایں سبب ندامت بر سید مذکور رو نمودہ چنانچہ
حضرت پیر دستگیر برائے دفع ندامت سید مذکور تبسم فرمودہ عنایت فرمودند
گو نخواہد بود برائے وصل کتابت آوردہ باشد۔"

سید مذکور کی خوش عقیدگی ملاحظہ ہو:

"بایں ہمہ جامع مذکور می گفتند کہ اصلا دراں افیون نشہ نماند و تلخی ہم برفت"

سید صاحب ایک روز اپنے پیر سے:

"احوال بلدۂ جون پور استفسار می نمودند"۔

مشہور ہے کہ ان کا خاندان کسی وجہ سے گجرات کے بٹوہ رسول آباد سے ظفر آباد جون پور میں پہنچا اور وہاں سے حاجی پور ہوتا ہوا حسن پورہ میں وارد ہوا۔ ایک موقع پر سید قابل علی مذکور نے ذبیحہ کے متعلق جو گفتگو ہو رہی تھی اس میں بھی حصہ لیا۔ دوشنبہ ۲۴ صفر کو جب پالکی پر سوار ہو کر حضرت قم الحق حسن پورہ کی طرف روانہ ہوئے تو اوروں کے ساتھ سید صاحب بھی جلو میں تھے۔ پیر کا چماد ان بہ ہزار الحاح خدمت گار سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے بوسہ دیا جب پیر نے دیکھا تو فرمایا "حوالہ دیگر نمایند" کہنے لگے۔ "حضرت بہزار منت این سعادت نصیب من شدہ" لیکن پیر نے پھر کہا "حوالہ کسی دیگر نمایند شخصے آمدہ گرفت"۔

ایک روز تمباکو کی حلت و حرمت کی بحث چھڑ گئی۔ گفتگو نے طول کھینچا۔ پیر دستگیر نے ارشاد فرمایا:

"بر تقدیر نفع چہ گونہ حکم بہ حرمت تواں نمود"۔

سید قابل علی نے ملا محمد شاکر بحاث کو مخاطب کر کے کہا:

"ہر گاہ پیر شما می نوشند شمارا باید کہ دو حقہ بنوشند"۔

پیر دستگیر نے فرمایا:

"چہ لازم است کہ آنچہ فعل پیر نماید مردم ہم نمایند"۔

اس پر قابل علی صاحب نے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہوئے معلوم نہیں کہاں سے

لے کر:

"نقلے نمود کہ شخصی را آزار سخت گشتہ رسول علیہ السلام سوئے برگ
تمباکو را اشارت نمود کہ ازیں شفای تست چوں خورد شفا یافت۔
حضرت پیر دستگیر فرمودند ازیں خوابہا ثابت نمی شد حکم شرع آنچہ مقرر
است موافق آں حل و حرمت می باید"

ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ تمباکو کا پودا نئی دنیا میں کلمبس کی دریافت تھا۔ سنہ۱۵۸۵ء یا ۸۶ء میں سر والٹر ریلے نے ورجینیا سے اسے انگلستان پہنچایا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے سر ٹامس رو سفیر انگلستان نے من جملہ اور سوغات کے تمباکو کی پتیاں بھی بہ شکل تحفہ پیش کیں۔ مغل شہنشاہ نے اس کے مزہ کو خود سے دریافت کرنا چاہا جب انگریز سفیر نے اس کی تعریف کی۔ ایک ہی کش لینے پایا تھا کہ سر گھومنے لگا۔ غضب ناک ہو کر سارے قلم رو سے اس کے اخراج کا حکم دے دیا۔ کچھ دنوں بعد کھنے سننے سے بھیجا۔ دربار کے حکما سے پوچھ تاچھ کی۔ انھوں نے حقے کی ایجاد کی تاکہ پانی میں پہنچ کر دھواں بجائے مضرت کے باعث لذت ہو۔

حسن پورہ میں جب حضرت تمراللہ تشریف لے گئے اور باغ سید ابوتراب اور پھر وہیں سید کمال الدین کے مکان میں قیام کیا تو

"بعد مغرب بحسب درخواست سید قابل بخانۂ ایشاں تشریف بُردند
سید مذکور مع چند قبائل خود داخل سلسلۂ حضرت قادریہ گشتند"

زیر نظر نسخہ گنج فیاضی کے آخر میں تین سو اکیاسی اوراق کی تعداد مندرج ہے۔ لیکن گننے سے یہ تعداد کچھ کم پائی گئی۔ شروع کے کچھ اوراق غائب ہیں۔ سطور کی تعداد پندرہ، خط صاف شکستہ آمیز نستعلیق اندراج کی آخری تاریخ سرخ روشنائی میں ۱۲ رمضان روز یکشنبہ ۱۱۴۳ھ دی گئی ہے۔ حالانکہ ایک جگہ ۱۱۴۹ھ کا واقعہ درج کیا گیا ہے۔ اس کے تحت پیر و مرشد کی شان میں ان کے ایک مرید خاص شاہ محمد رضا جودت کے دو لمبے قصیدے ہیں اور اس میں ملفوظ کے قطعات تاریخ بھی دئے گئے ہیں۔ تتمۂ کتاب کے دو تین شعر

قابلِ ذکر ہیں۔

نمود جمع چو عثماں غلام شرف الدیں | بود ز مصحف ثانی نشان او تائید
باین عمل کہ نمود آں عزیز پاک نہاد | ز جور چرخ و غم عاقبت ہمیشہ رسید
خرد بہ تمیہ سالے کشید تا از غیب | ندا رسید کہ آمد ترا کلام مجید

دوسرا قطعہ

چوں مرتب گشت ملفوظ امیر ذوالکرام | پیر برحق مرشد مطلق امام محترم
سالِ تاریخش چو پرسیدم سحر گہہ از خرد | زد رقم ہاتف کہ باد اگنج فیاضی الم

سب سے اخیر کی عبارت بھی قابلِ توجہ ہے :

"بخط خام احقر الانام فضل اللہ المشتہر بین الانام بعلی ابراہیم قدوسی ابن قدوۃ السالکین حضرت امیر غلام جعفر مد اللہ ظلہ ابن پیر دستگیر خواجہ عبد القدوس الموسوم بامیر محمد اسلم بن حضرت امیر محمد جعفر قادری بن حضرت امیر ابوالحسن بن حضرت امیر مبارز بن حضرت عبد الباقی بن قدوۃ العارفین حضرت امیر سید ابراہیم الحسینی البحشتی الکاکوی لا زال فیضان ارواحہم علینا در سنہ یک ہزار یک صد و چہل و نہ ہجری در عمل بادشاہ محمد شاہ خلد اللہ ملکہ ۱۹ جلوس والا اللّٰہم اغفر لکاتبہ ولقاریہ بتاریخ دہم ماہ صفر المظفر"

کتاب کی تبویب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر ایک باب میں دو فصلیں ہیں۔ باب اوّل کے شروع کے چند اجزا غائب ہیں ان کا موضوع ولادت، پرورش، تعلیم و تربیت ہے۔ اس ضمن میں جامع نے تین خاص مریدوں کا ذکر کیا ہے۔ محمد اعظم محمد آبادی، پیر محمد عارف حسینی پھلواری اور میاں عزیز اللہ بلگرامی، جن سے انھوں نے کچھ استفادہ کیا۔ باب اوّل فصل دوم میں انھوں نے اپنے پیر کے نسب اور آبا و اجداد کا ذکر کیا ہے۔ باب دوم ارادت و خلافت کے متعلق ہے۔ باب سوم میں استادان حضرت پیر دستگیر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں آنحضرت کے خلفا

کا ذکر ہے اور قریب ستر بہتر مکتوبات ہیں۔ پہلی فصل میں خلفائے کے نام، دوسری میں مکتوبات کی عبارت۔ باب پنجم کا ورق ایک سو چھ سے آغاز ہوتا ہے۔ اس میں ملفوظات ہیں۔ سُرخ روشنائی میں گیارہ محرم روز دوشنبہ ۱۱۴۷ھ لغایت ۱۲ رمضان روز یکشنبہ ۱۱۴۷ھ ملا محمد وحید پٹنوی کے گھر سے بعد نماز عصر اپنا سفر شروع فرماتے ہیں۔ روز روز کی تفصیل ارشادات موعظات کے اذکار، کچھ حکایتیں، کچھ دوہے ہر روز کے معمولات میں ہیں۔ جامع ملفوظ ساتھ ساتھ شریک سفر رہتے ہیں۔ جو کچھ سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، قلم بند کرتے ہیں۔ نہ کوئی ترتیب ہے نہ تنظیم۔ کئی مواقع ایسے آتے ہیں جب کسی کے استفہامی مکتوب کا طویل جواب پیر دستگیر جامع ملفوظ کے ہاتھ سے لکھوا کر بھجوا دیتے ہیں:۔

"۷ رمضان بروز سہ شنبہ قریب ظہر پیر دستگیر از خلوت برآمد شدند۔ در نشست گاہ این کہیں نشستہ فرمودند کہ شیخ مجدالدین احمد از سرای میر نوشتہ اند کہ بعض نماز تراویح را سُنت نمی دانند و می گویند کہ رسولؐ خدا نخواندہ خلیفہ ثانی احداث نمودہ اند در جواب این مکتوب ازین کہیں نویسانده فرستادند بعینہ مرقوم می شود۔"

اس طویل مکتوب میں بموجب عقائد حضرات اہل سنت والجماعت تاویل و تصریح کی گئی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ رسولؐ نے بہ جماعت تراویح کی نماز پڑھی تھی۔ لیکن بعد ازاں شفقت بر اُمت فرمودہ موقوف نمودند۔" حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت بھی پیش کی گئی ہے کہ رسولؐ تراویح کی نماز کی ترغیب تو کرتے تھے لیکن "بہ جد و جہد نمی نمود" اس ضمن میں شرح وقایہ، ہدایہ، فتاویٰ عالمگیری، فتاوائے ابراہیم شاہی کی عربی عبارتیں بجنسہٖ پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں مکتوب الیہ کو ہدایت کی گئی ہے۔

"آں سعادت مند باتفاق برادر عزیز و یک کس دیگر نماز بجماعت گزارند رونقِ اسلام شود۔"

گنج فیاضی میں من جملہ بہت سی مفید مطلب اور عام دل چسپی کی باتوں کے جیتے یتیم پوتے کی پرورش و پرداخت میں شفیق اور جان چھڑکنے والے جد و جدہ کا انہماک اور اہتمام اور ان کی تعلیم و تربیت میں ذاتی توجہ اور جد و کد کا تذکرہ کبھی ہے۔ اس زمانے کے خانقاہی نظام تعلیم و تربیت میں کن باتوں کو ملحوظ نظر رکھا جاتا تھا۔ ابتدائی مراحل اور اس سے اوپر کے منازل میں کیا طریق درس تھا۔ نصاب تعلیم کس حد تک خالص مذہبی اور محدود تھا۔ عقلی علوم کی درسیات میں گنجائش رکھی گئی تھی یا نہیں۔ ایسی ہی باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

جامع ملفوظ لکھتے ہیں :-

"چوں زمانۂ مکتب آں حضرت رسید (سن و سال کا ذکر نہیں ہے) جد بزرگوار آنحضرت تعلیم بسم اللہ از زبان مبارک خود باں حضرت فرمودہ بعد تعلیم بسم اللہ سورۂ فاتحہ و معوذتین و سورۂ اخلاص قدوۃ العلما باں حضرت تعلیم فرمودہ بعد ازاں شیخ محمد انور بنگالی را تو کر برائی تعلیم آنحضرت نمودہ بعد ختم مصحف و پندنامہ و نامۂ حق و چند جز نصاب صبیان قدوۃ الاولیا میزان از زبان مبارک شروع کنانیدہ و تعلیم تمام میزان در پنج باب منشعب خود فرمودند بعد ازاں شیخ عبدالرشید عرف عبدو بنگالی طالب علم را برائی نگاہ داشت ... سپرد نمودہ از استادان دیگر ہم بموجب امر قدوۃ الاولیا ... چوں نوبت بارشاد ملا سعدالدین باآنحضرت رسید قدوۃ الاولیا در تعلیم آنحضرت خود مشغول گشتہ و فرمودہ کہ تکرار میاں شیخ باقر بہاری نمودہ باشند حسب امر سعادت دانستہ بجای آوردند تا نسخۂ کافیہ خود قدوۃ الاولیا تعلیم فرمودہ و تکرار از شیخ باقر می دادند چوں نوبت ارشاد قاضی شہاب الدین ملک العلما "دولت آبادی" رسید خود قدوۃ الاولیا تعلیم می فرمود نوبت تکرار رفت" تا شرح عقائد ملا سعد الدین تفتازانی بحاشیۂ خیالی در خدمت قدوۃ الاولیا می خواندند بعد ازاں قدوۃ الاولیا بوصال الہی شتافت بدیگر استادان

شروع فرمودہ۔"

یہاں جامع نے ایک دل چسپ بات لکھی ہے :

"در وقت طفلگی حضرت پیر دستگیر بہ بازی مشغول می گشت و میل طبیعت بخواندن نمی شد. بخدمت قدوۃ الاولیا ظاہر ساختند بزبان ہندوی فرمودند "درزی کا پوت جیئے گا تو سئے گا"

جب آپ دس یا گیارہ سال کے ہوئے تو آپ کو قدوۃ العرفا شیخ عبدالجلیل مدرس بن مولانا حضرت شمس صدیقی خال حقیقی قطب الاقطاب حضرت دیوان جیو (حضرت دیوان عبدالرشید) کے گھر پر بہ غرض تعلیم بھیج دیا گیا۔

باب سوم میں آنحضرت کے استادوں کی مزید تفصیل دی گئی ہے۔ کچھ باتیں دہرادی گئی ہیں :

"در خدمت میاں شیخ النور بنگالی اکثر قرآن خواندند در خدمت شیخ بدر الدین چند سورۂ قرآن و در خدمت شیخ عبدالرشید عرف عبدو بنگالی اکثر منشعب و قدرے زبدہ خواندند و در خدمت میاں شیخ باقر بہاری اکثر تصریف و زبدہ و چند چیز دستور المبتدی و اکثر ضریری در ترجمۂ معینیہ اکثر و تکرار از ارشاد ملا سعدالدین تفتازانی و تکرار کافیہ نمودند و از خدمت میاں شیخ پیر محمد عرف پیرو پسر میاں شیخ النور بنگالی مذکور چند سورہ از قرآن عالیہ و اکثر تکرار مصحف نمودہ و در خدمت شیخ عبدالحلیم بہاری تصریف چند جز خواندہ و در خدمت میاں شیخ حسام الدین مٹھن پوری تصریف چند جز خواندہ و در خدمت مولوی امین الدین اکثر تہذیب و شرح تہذیب و قطبی اکثر تصورات بر حاشیہ میر و کتب صرف و نحو و چند ورق شافیہ صرف دہ پانزدہ ورق سمع نمودند۔ و در خدمت میر محمد باقر ولد حضرت میر سید جعفر پٹنوی قطبی و تصدیقات تمام و چند جز میر و در خدمت مولوی محمد جمیل ابن حضرت شیخ عبدالجلیل ابن حضرت مولانا شمس نسخۂ رشیدیہ و لوز الانوار و رسالہ جبر و اختیار ملا محمود (ولیدپوری ثم جون پوری

> صاحب شمس بازغہ) وشرح عقائد ملا سعد الدین از ابتدا عذاب قبر حاشیہ خیالی وشرح
> وقایہ تا کتاب البیع۔ ومطول با حاشیہ تا احوال مسند الیہ وشرح مطالع چند جزء اول
> بحاشیہ میر وہدایہ جلد ثالث تمام جلد رابع قدرے واز خدمت قدوۃ الاولیا
> حضرت شیخ محمد ارشد رشید در روز مکتب بسم اللہ معوذتین وسورۂ اخلاص وقدرے
> میزان وپنج باب منشعب از اول وارشاد ملا سعد الدین تمام وارشاد قاضی شہاب
> الدین ملک العلماء اکثر ومختصر معانی اکثر چند جزء حاشیہ خطائی وشرح عقائد ملا
> سعد الدین از عذاب قبر تا تمام کتاب خواندہ۔"

ان تفصیلات سے جو باتیں مترشح ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ابتدائی درسیات کی کتابیں تقریباً وہی تھیں جو آج بھی ہیں۔ ادب برائے نام تھا۔ عقائد اور معقولات پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ عقلی علوم، ریاضی، طب، نجوم وغیرہ کا کیا ذکر، حدیث، تفسیر کی مشہور کتابوں تک کا ذکر نہیں۔ مثلاً مشارق الانوار، جلالین اور دوسری حدیثیں اور تفسیریں ان کا کوئی سرے سے ذکر ہی نہیں۔ فن خطاطی کا کیا ذکر، کتابت کی تعلیم کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں مصنف اپنے پیر کے اکیس مریدان خاص کا مع ولدیت وسکونت ذکر فرماتے ہیں جو سلاسل رشیدیہ، قادریہ، چشتیہ، مداریہ، سہروردیہ، فردوسیہ کے اجرا کے لئے اپنے شیخ سے مجاز تھے۔ ان میں دو محمد آباد بنارس کے، چار پٹنہ کے، تین پورنیہ کے، دو راجگیر کے اور ایک ایک منیر شریف، بہار شریف موضع بدن پور من اعمال سرکار تاج پور سارن موضع دوجرا من اعمال پرگنہ پھلواری نوڈیہہ من اعمال قصبہ ابراہیم پور بہار تکیہ من اعمال پرگنہ نیگڑا شمالی بہار اور جون پور کے اطراف کراکٹ من ڈادر اور محلہ مدار اور سیکنڈری بھاگلپور کے رہنے والے تھے۔" بعد تحریر تمام ملفوظ گنج فیاضی" خط خفی میں کئی مزید نام مع دیگر تفصیلات ولدیت وتوطن کے دیئے گئے ہیں۔ یہ حضرات بنگال، بہار، جون پور کے مختلف قصبات کے رہنے والے تھے۔ اسی باب کے فصل دوم میں ستر بہتر مکاتیب کا عربی و فارسی مکمل متن مع چند ہندی فقروں کے حوالہ قلم کیا گیا ہے۔ جن بزرگوں کو سب سے زیادہ مکتوب بھیجے گئے۔ ان میں ملا بدیع الدین ولد میاں شیخ محمد یحییٰ بن قاضی محمد حسین ناصحی ساکن یحییٰ پور من اعمال

بلدۂ جون پور (۱۴) ملا محمد میر وحید پٹنوی (۱۶) میر علی ابراہیم ابن میر سید غلام جعفر پٹنوی (۷) میر محمد اسلم پٹنوی و اہل خانہ (۶) ملا شیخ محمد شاکر (۴) شیخ محمد اکبر اہل اللہ راجگیری ۔ شاہ محمد مراد ۔ شیخ فیض محی الدین ۔ شیخ خدا بخش دلد ملا شیخ محمد شاکر کے نام ایک یا دو خطوط ہیں ۔ یہ خطوط کچھ تو نجی حیثیت کے ہیں مگر بیشتر مختلف نوع کے مسائل تصوف سے لبریز ہیں ۔ حضرت دیوان عبدالرشید شیخ اکبر محی الدین عربی ۔ مولانا جامی صاحب لوائح مولانا محمد عبدالحق محدث دہلوی ۔ حضرت سید اشرف جہانگیر حضرت سید محمد گیسو دراز وغیرہ کے اقوال اور کلمات حقائق بہ عبارت عربی و فارسی درج ہیں ۔ عالم جواہر عالم اعراض کشف و شہود، تجدد امثال ۔ اسمائے الٰہی نفی و اثبات اذکار اشغال، قضا و قدر، جبر و اختیار، رویت الٰہی ۔ ولایت محمدی، فرائض شرعی، اموات کی تجہیز و تکفین اوراد و وظائف کی ہدایت و تلقین، ایمان ابی طالب، خلافت شیخین ۔ ابطال عقائد اہل تشیع و اہل اعتزال، خوارج و روافض (کہ ہر دو گمراہ اند) کے بارے میں بہت کچھ ان خطوط میں اور اس سے زیادہ بار بار مختلف مقامات پر مجالس و موعظات کے موقع پر کہا گیا ہے ۔ مکتوب ۳۲ میں (جامع فضائل سعادت مندی میر علی ابراہیم جیو سلمہ اللہ کو تاکید کی گئی ۔)

"برمذہب اہل سنت و جماعت مستقیم بودہ را از فرقۂ ضالۂ شیعہ شنیعہ باشند۔"

پھر فدک کے معاملہ پر سنی عقائد کی تشریح و توضیح کی گئی ہے ۔

اس کے بعد باب پنجم میں ملفوظات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو ورق ۱۰۶ اسے ۸ کتاب تک پھیلا ہوا ہے ۔ درحقیقت گنج فیاضی کا یہی اصلی اور خاص حصہ ہے جو تقریباً ۲۶۵ اوراق کو محیط ہے ۔ بہت سے صوفیائے کرام اپنے زوایا جماعت خانے یا خانقاہوں میں بیٹھ کر طریقت و شریعت کے امتزاج مسائل تصوف اذکار و اشغال میں انہماک رکھتے تھے ۔ درس و تدریس اور نشر و اشاعت دین اسلام کے امور انجام دیتے تھے ۔ کچھ بزرگ صوفیا اپنے دائرہ عمل کو زیادہ وسعت دینے کے لئے سفر و سیاحت اور حلقہ مریدان میں آمد و رفت اور گشت ضروری سمجھتے تھے ۔ جہاں جاتے مختلف طبقات کے لوگوں سے ملتے ۔ ان میں اُمرا بھی تھے اور عمائدین حکومت بھی ۔

جاگیرداروں کے اہل کار بھی تھے اور ناظمان اور نوابان کے ملازم اور عملے بھی معمولی لوگ مزدور پیشہ، اہل کسب، نوربا‌ف، نداف اور دوسرے اہل پیشہ بھی ہوتے۔ علی اشرف خاں فوج دار سارن کا نام بار بار آیا ہے۔ اور یہی حال قاضی ثنا ء اللہ قاضی پرگنہ بار (سارن) سید عطاء اللہ محتسب خزانہ حسام الدین قاضی پرگنہ آندر، کریم اللہ خاں فوج دار شاہ پور، سعید خاں قاضی بلدہ جون پور اور بھیکم رائے کوتوال بلدۂ شیخ امام الدین پسر شیخ قبول محمد زمین دار وراحۂ مادھو پور بڑھریا (سارن) یہ سب حضرات اکثر (برائے ملازمت آمدند) خود حضرت پیر دست گیر جب موضع گوسائیں چھپرہ میں پہنچے تو تکیہ کبیر دھن میں خود جاکر وہاں کے ہندو فقیر سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ جامع ملفوظ نے کئی جگہ لکھا ہے کہ ان کے پیر طریقت صحبتِ اغنیا کو زہر قاتل سمجھتے تھے۔ غربا اور فقرا کی صحبت کو ترجیح دیتے تھے "صحبت امرا و حکام و اغنیا خوش نمی آید۔ رفتن بہ غربا مثل نوربافاں خوش بودند فی الواقع از غربا بسیار خوش بودند۔" نہ کوئی تکلف تھا نہ بزرگی کی نمود و نمائش بڑھ، پیپل، بیل، املی، جامن، پاکڑ، گولر، کاٹھن کے درختوں کے تلے فرش بچھ جاتا۔ کبھی کبھی تو "بر بوریائے شکستہ جلوس فرمودند" کبھی زمین کی مٹی ہی فرش بن جاتی۔ لوگ اِدھر اُدھر سے اکٹھا ہوجاتے۔ موعظہ فرماتے۔ شریعت و طریقت، فقر و توکل، تسلیم و رضا کے ساتھ اقوال و افعال بزرگان کی روایتیں بتائی جاتیں۔ مذہبی و معاشرتی زندگی کے مسائل جیسے نکاح، مہر، وراثت، باہمی رواداری وغیرہ کے متعلق سوالات کیے جاتے۔ جوابات ملتے۔ اذان، نماز پنج گانہ با جماعت کے فرائض انجام دیئے جاتے۔ رشد و ہدایت کی تعلیم ہر نماز کے بعد شروع ہوتی۔ کھلا ہوا میدان ہو یا کسی مکان کا اوسارا، صحن و دالان مقام تبلیغ اور درس گاہ بن جاتی۔ لوگوں کے ارسال کردہ مکاتیب کے جوابات لکھوائے جاتے اگر کسی جگہ بیت الخلاء کا انتظام نہ ہوتا تو حضرت پیر دستگیر میدان جاکر فراغت کرلیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن بستیوں سے حضرت گزرے ان کے مسلمان باشندے بجائے خوش حالی کے اکثر مفلوک الحال تھے۔ تہذیب و شائستگی کا معیار بہت اونچا نہ تھا لیکن خلوص تھا اور مذہبی جوش تھا۔ پیر دستگیر اکثر تالاب دریا یا ندی میں داخل ہوکر غسل و طہارت سے فارغ ہوجاتے تھے۔ یہ روز عموماً جمعہ کا ہوتا تھا۔ شاہ گھیسا اذان دیتے تھے۔ نماز باجماعت کے بعد صاحب خانہ طعام پیش کرتے۔ سب کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اس کے بعد کچھ دیر کے لئے قیلولہ

فرماتے ۔ وقت عصر تجدید وضو کرتے ۔ حالانکہ بعد نوم تجدید وضو کے برعکس عقیدۂ ابن عربی کے قائل نہ تھے ۔
اکثر عصر کی نماز میں خود امامت کرتے لیکن کبھی کبھی دوسرے کو آگے بڑھا دیتے اور خود پیچھے کھڑے ہو جاتے ۔
نماز ظہر کی ہو یا مغرب کی اکثر دوسروں کی اقتدیٰ میں نماز جماعت ادا فرماتے ۔ امام ماموم مقتدی مقتدی
بن جاتا ۔ کھانے میں بھی کچھ تکلف نہ تھا ۔ کسی ملفوظ میں پلاؤ، قلیہ، مزعفر وغیرہ کا کہیں نام نہیں آتا ۔ بھات
برنج باریک ماش، مونگ پوری، چپاتی پلول، ساگ، جغرات، شیر برنج اور کبھی کبھی کچھ شیرینی بالخصوص
فاتحہ کے موقع پر اور شیر گاؤ حاضر کیا جاتا ۔ فرماتے تھے ۔ "ہیچ طعامے بہتر از شیر نیست" لباس بھی بہت سادہ
تھا ۔ جبہ و قبا و عبا کا ذکر نہیں ملتا ۔ دستار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ پوشش پارچہ سفید لنگ و چادر
کا ذکر آیا ہے ۔

"۲۲ ربیع الاول بروز خیاط را طلبیدہ یک جامۂ سفید و ازار پوشاک خاص
خود قطع کنانیدہ ۔"

نماز جمعہ کے پہلے غسل کرتے :

"پارچۂ سفید پوشیدہ چادر لوی بر دوش مبارک نہادہ برائے نماز جمعہ
بیرون آمدند ۔"

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا :

"شخصی بود ہمیشہ جامۂ چھینٹ می پوشید ۔ گفتند تو ہمیشہ جامۂ چھینٹ
می پوشی ۔ گفت من پیر خود را باین لباس پوشیدہ یافتہ ام ۔ لہذا ایں
لباس را دوست می دارم ۔"

مزارات کی زیارت کرتے ۔ فاتحہ پڑھتے کسی کے مرنے کی خبر پاتے تو جاکر نماز جنازہ میں شریک ہوتے
مٹی دیتے کوئی بیمار پڑتا تو عیادت کو جاتے ۔ عیادت کو ثواب جانتے ۔ حضرات چشتیہ و قادریہ کے
مزارات پر سماع و عرس کا اہتمام ہوتا ۔ ۱۴ ر جمادی الاول سہ شنبہ ۱۱۴۷ھ کو :

"عرس شیخ الاسلام والمسلمین قطب اہل اللہ سر مد حقیقت حضرت راجے سید
احمد حلیم اللہ مانک پوری قدس سرہٗ کا موقع تھا آستانۂ غلام احمد پسر راجے غلام

معین عرف راجے داتی پسر راجے حضرت غلام محی الدین نبیسہ و جانشین حضرت راجے سید احمد حلیم اللہ پر مع چند رفقا مشتمل بر شیخ محمد باقر جیو" خویش حضرت میر سید نور الدین میر سید احمد شیخ محمد رضا و ایں کمین مسکین جامع ملفوظ تشریف ارزانی فرمودہ خود و حضار مجلس فاتحہ خواندہ چوں در خانوادہ چشت سرود سماع تجویز نمودہ اند۔ قوالان خوش الحان دف را نواختند و بسرود ایں غزل پرداختند۔

گر ماہ گویم مر ترا ماہ جبیں رخسار کو

گر سرو گویم دلبرا با سرو ایں رفتار کو

الی آخرہ..... آتش عشق در عشاقان جوش نمود از ہوش ربود میاں سید میر نبیسہ برادر سید راجے گہ سمع نمودند چوں حالت از ہستی تبدیل گردید دستار بقوال بخشید بعد ازاں کہ قوالاں ساکن گشتند۔ بہوش آمدند باز فاتحہ بر درج مستور خواندہ شربت و پان آوردہ قسمت کردند۔ حضرت پیر دستگیر رخصت گشتہ بدولت خانہ آوردند۔"

پورنیہ میں اکثر آنا جانا رہتا تھا خاندان رشیدیہ کے افراد اور مریدین کا اعراس کے موقع پر اجتماع ہوتا۔ سنہ ۱۱۳۰ھ میں جب آپ اپنے جد بزرگوار پر دادا شیخ جمال الحق کے مزار کی زیارت کے لئے پورنیہ تشریف لے گئے تو قمر الحق کا لقب اور ابو الفیاض کی کنیت دادا نے عطا کی۔ بہار میں حضرت مخدوم جہاں یحییٰ شرف الدین احمد منیری اور منیر شریف میں آپ کے والدین جد واخ کے مزارات پر فاتحہ کے لئے اکثر حاضری دیتے۔ ملفوظ کا آغاز سنہ ۱۱۴۶ھ سے ہوتا ہے لیکن ایک اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس کے بہت قبل ۶ شوال سال گزشتہ سے بہار میں دخول اور سفر کا سلسلہ شروع ہوا۔ جامع ملفوظ لکھتے ہیں:

" دریں سفر کہ از ششم ماہ شوال" تا سنہ و ماہ مذبور چہ قدر مردم داخل سلاسل چشتیہ قادریہ مداریہ فردوسیہ گردیدہ بیاض بدست مبارک بود شمار فرمودہ بزبان مبارک آوردند کہ از ذکور و اناث پانصد و شصت و یک مردم اللھم اغفر اجمعین۔"

۱۹ محرم بروز شنبہ ۱۱۴۷ھ جب آپ مصطفےٰ آباد عرف بھوال پور میں مقیم تھے۔ نماز عصر شاہ مکارم کی اقتدیٰ میں ادا کر کے بیٹھے ہوئے تھے کہ :

"میر افضل از نوکران نواب علی وردی خاں آمدہ نشست پُرسید کہ حضرت در صوبۂ بنگالہ تشریف ارزانی داشتہ اند فرمود بہ پنڈوہ برائی زیارت مزار حضرت نور قطب عالم رفتہ ام۔"

پتہ نہیں پنڈوہ بنگال میں آپ کا کب جانا ہوا۔ بہار شریف میں مخدوم جہاں کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد آپ پٹنہ پہنچے۔ پٹنہ جنکشن سے کچھ فاصلہ پر جانب مغرب ایک محلہ ہے جو پہلے شریعت آباد کے نام سے مشہور تھا۔ صاحبان محل بہار شریف کے مورث اعلیٰ سید جعفر پٹنوی مرید خاص حضرت دیوان عبدالرشید کا وہاں مزار ہے۔ حضرت قمرالحق کے سپرد قسمت نامہ شریعت آباد کے متنازعہ فیہ معاملہ کو سلجھانا تھا۔ میر محمد مہدی ملا محمد وحید حافظ محمد تبسم میر رضی الدین اور رفاہت خاں کے دستخط اور ان کی مہریں، اس کاغذ فیصلہ پر ثبت کرانے کے بعد ایک پرچہ میر محمد مہدی کو اور دوسرا پرچہ غلام جعفر کو سپرد کیا۔ اسی کے چار روز بعد بروز جمعہ پندرہ محرم آپ نے سبل پور پہنچ کر بذریعہ کشتی دریائے گنگ کو عبور کیا اور موضع بستی میں پہنچے۔

جن لوگوں کی نظریں اقتصادی امور پر خاص طور سے پڑتی ہیں ان کے لئے سڑک یا راستے طریق یا پتھ اور مختلف مقامات واشخاص کے حالات وکیفیات کی بڑی اہمیت ہے۔ دہ وقصبات کی زرعی حالت، تجارتی اور صنعتی چیزوں کی پیداوار اور کھپت ذرائع نقل وحمل، لوگوں کو خوش حالی یا بدحالی کے متعلق ہر ممکن معلومات حاصل کرنے کی کد وکاوش کرتے ہیں۔ ملفوظات کے موضوع خاص قسم کے مذہبی اور کسی حد تک معاشرتی ہوتے ہیں لیکن کچھ اشارات تو مل ہی جاتے ہیں جن سے بعض نتائج مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ جن مقامات، دہ، قصبات سے جامع ملفوظ اپنے پیر دستگیر کے بذریعہ کشتی یا پالکی یا چوپال گزرنے ٹھہرنے، اقوال وافعال کا ذکر کرتے ہیں ان میں کچھ ایسی بستیاں تھیں جن میں اب مسلمان آبادی کا نام ونشان نہیں بہتوں کی شکلیں بدل گئیں، کچھ ناپید ہوگئیں اور کچھ مختلف ناموں سے

پکاری جانے لگیں ۔ کن کن راستوں سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا جاتا تھا ۔ راستہ کیسا تھا ۔ ایک دوسرے کے درمیان کتنی آبادی تھی ۔ خاص زرعی پیداوار کیا تھی ۔ کن کن پیشوں کے لوگ رہتے تھے ۔ ان سب باتوں پر روشنی نہیں پڑتی ہے ۔ موضع بستی میں جہاں سبل پور سے دریا پار کر کے آپ پہنچے تھے مظفر پور یا قدیم سارن کے ضلع میں پڑتی تھی ۔ یہ بھی نہیں معلوم ۔ رائے پور، مصطفےٰ آباد عرف بھوال پور، برہمن پورہ، ادلہن پور، سادات آباد عرف بدن پور، بہار پور وغیرہ کے نام اکثر آئے ہیں ۔ ۲۶ محرم بروز شنبہ کو آپ نے دریائے گنگ کو عبور کیا تھا ۔ منیر شریف میں پھر لوٹے مزارات کی زیارت کی، فاتحہ پڑھی ۔ وہاں سے برپورہ پہنچے ۔ حمد پور، مہداواں جو جامع ملفوظ کا وطن تھا وہاں تشریف لائے ۔ پھر موضع شیخو چک سے ہوکر گھاٹ منیر سے ۲۹ محرم جمعہ کو دریائے گنگ کو عبور کیا اور دوبارہ سارن ضلع میں داخل ہوئے ۔ چیران چھپرہ کا سب سے پہلے نام آیا ہے ۔ وہاں سے "ٹیل پا" گئے اور باغ بنگلہ انگریز میں ٹھہرے ۔ آگے بڑھ کر شیخ بھکاری کے روضہ کی زیارت کی ۔ پھر بدن پور میں دوبارہ وارد ہوئے ۔ وہاں سے تاج پور پہنچے ۔ اور تاج پور قلعہ کے برج سے آپ نے تقریر کی ۔ پھر موضع سارن کے نزدیک دہ اسلام پور پہنچے نماز جمعہ کے لئے تاج پور لوٹے ایک شخص کی عیادت کے لئے قاضی پورہ پہنچے ۔ وہاں سے رمنا میں داخل ہوئے ۔ یہ ایک موضع نعمانکیر کے نزدیک وہاں سے چک میران تشریف لے گئے موضع لسو ندھہ سے پھر دعوت نامہ آیا ۔ وہاں حضرت سعد اللہ عرف شاہ مداری کی زیارت کیلئے تشریف لے گئے اور قاضی ثنار اللہ کے مکان پر ٹھہرے اورنگ آباد آگے کی منزل تھی ۔ وہاں سے موضع راما مو موضع جمیل پور پچھرائے فیاض موضع بھرت پور سے گزر کر موضع سارن میں پہنچے پھر موضع سیودہ میں داخل ہوئے اور کہا کہ "ایں جائے ملکیان است" بہار پورہ سے گزر کر موضع چھپرہ میں داخل ہوئے یہاں موضع بھرت پور سے گزر کر جو کی قتال وہاں سے پھر مصطفےٰ آباد عرف بھوال پور پہنچے اور یہیں مادھو پور ٹڑھریا کے لوگوں سے ملاقات ہوئی ۔ مادھو پور ٹڑھریا کا بت کدہ اور قلعہ دیکھنے کی چیزیں تھیں اور آنحضرت نے انھیں دیکھا ۔ پھر موضع ادکھی میں پہنچے جہاں سے آگے بڑھے تو گوسائیں چھپرہ کے نام کی ایک جگہ آئے ۔ گوسائیں چھپرہ میں ایک کبیر پنتھی سے جاکر ملاقی ہوئے پھر موضع رسول پور، موضع لبسولی، موضع جیولی ہوتے ہوئے حسن پورہ پہنچے وہاں سے درویش پور تشریف لے گئے ۔ ۲۷ صفر کو دریائے سندھی کو پار کیا موضع بھٹ کے پاس جھرئی ندی کو عبور کیا اور دیوہا میں داخل ہوئے ۔ وہاں سے گھاٹ دردلی سے دریائے گھاگرا کو عبور کیا ۔ قاضی پور پہنچے

اور ضلع بلیا میں داخل ہوگئے۔ ہدی پور میں حضرت مخدوم شاہ رکن الدین زاہدی کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور سکندر پور سے غازی پور کی سڑک پر سفر شروع کیا۔ غازی پور، جون پور، الہ آباد، جھوسی اور درمیان میں کئی مقامات سے گذرے۔

بہار کے جن دیہاتوں اور قصبات سے گزرنا ہوا اور غازی پور، جون پور، الہ آباد تک کے اطراف میں جہاں جہاں مقام ہوا وہاں علاوہ دینی فقہی اور تصوف وطریقت کے مسائل کے چند ایسی باتیں بھی دوران گفتگو میں آئیں۔ جن سے اس زمانے کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ چند امر قابل ذکر ہیں۔ شخصے قاسم علی پسر مرزا واصل بیگ ساکن رسول آباد من اعمال بلدہ جون پور کی شادی کی تقریب تھی۔

”پیر دستگیر پرسیدند مہر چہ مقرر گشتہ عرض نمودند پنجاہ ہزار روپیہ قاسم علی چوں چرا نمود آخر براں نکاح منعقد گرفت۔ حضرت پیر دستگیر فرمودند مردم منقول وقت بسیار می نماید۔“ یک مرتبہ حضرت دیوان صاحب در مجلس نکاح محمد بیگ پسر مراد بیگ کہ مرید قدوۃ الاولیا بودند رفتہ از نیم شب تا یک پاس روز مقدمۂ مہر بود فقیر دق گشتہ خواست کہ برخیزد آخر محمد بیگ گفتہ ناکح قبول نمود بعض فرمودند کہ حضرت دیوان جی در برات شیخ غلام حسین جانشین حضرت شاہ یٰسین بردہ بودند خود در مجلس تشریف نہ بردند۔ جائے دیگر نزول فرمودند چوں برائے نماز تہجد برخاستند متصل مجلس نکاح بود دراں جا مذاکرۂ نکاح بسمع مبارک رسید فرمودند چہ دنگا است جواب دادند ذکر مہر است فرمودند اوہا جاہلند وشما عالم وعارف را قدرت است ___ چوں مرضی قطب الاقطاب چنیں دیدہ شاہ حضرت یٰسین گفتہ ناکح قبول فرمودہ مردم از دق خلاصی یافتند بعدہ برزبان مبارک راندند کہ حضرت مولوی محمد حسین مہر فقیر را کہ ہم چہار صد درم مہر حضرت فاطمہ

علیہا التحیۃ والثنا مقرر فرمودند۔ شیخ محمد نافع عرض نمودند کہ مہر سیدۃ النساء العالمین این قدر بودہ کہ در سبعات کہ کتاب معتبر دراں چار صد درم مرقوم است در روضۃ الاحباب ہم مرقوم است چار صد درم و بروایتی چار صد و ہشتاد درم۔"

اس کے بعد حضرت علیؓ کا حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں اپنی زرہ کا بیچنا رسول کا اس میں سے کچھ لے کر صرف خوشبو وغیرہ کے لئے بقیہ کو بلالؓ کے حوالے کرنا کہ برائے جہاز فاطمہؓ حضرت ام سلمہؓ کے پاس رکھوا دیں۔

"خود آسیا بر دوش مبارک گرفتہ بخانہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ برسانند۔"

ایک جگہ مزار بزرگان پر جو کچھ کیا جاتا تھا' اس کی تفسیر ملتی ہے۔ آپ کے ساتھ ایک جماعت مزار متبرکہ حضرت دیوان صاحب گل اندودی کے لئے حاضر ہوئی۔ چودہ پارے کلام مجید کے پڑھے گئے پھر آپ نے:

"سبوچہ آب در دست مبارک گرفتہ آب بر قبر ریختند۔"

جمیع حاضرین نے جو حلقہ باندھ کر تربت کے اردگرد کھڑے ہوئے تھے یہی کیا پھر حضرت شیخ نے اپنے ہاتھ میں گلاوہ لے کر تربت پر ملا۔ ایسے ہی اور مزارات کے ساتھ کیا گیا۔ دوسرے روز صبح کو تجدید وضو کے بعد لوگوں کو طلب کیا۔ سب کے سب قدوۃ الاولیاء کے مزار کے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ شیرینی پان اور ایک پھول کی ردا اور ایک ردا پارچہ سفید کی ایک غلاف چھینٹ خام کا اور گلاب اور ارگجہ پہلے ہی سے تربت کے پاس رکھا ہوا تھا۔ حضرت لطف اللہ عرف منجھن نے پہلے قل پڑھا بعدہٗ پیر دستگیر نے پہلے سرور انبیاء بعد میں حضرت دیوان صاحب اور حضرت ارشد پر فاتحہ پڑھی:

"ارگجا بدست مبارک خود بہ قبر مالیدند بعدہٗ جمیع حضار نوبت بہ نوبت بایں سعادت رسیدند ایں کہیں کلاہ ارادت خود و یک کلاہ دیگر کہ حضرت پیر دستگیر عطا فرمودہ بودند اول از صندل از دست مبارک پیر دستگیر بعدہ ارگجا و صندل دیگر تر ساختہ بر تربت مالیدند بعدہٗ حضرت پیر دستگیر غلاف چیدہ کہ یک طرف خود گرفتند و دیگر ہر طرف جمیع حضار ید نہا گرفتہ بتربت گسترانیدند بعد ازاں ردای سفید پارچہ و ردای پھول ہمیں گسترانیدند و گلاب پاشیدند۔"

یہ سب باتیں اور مزارات کے ساتھ بھی کی گئیں پھر اکابر مشائخان منصب داران امرا و روسا و شہر دغربا کے آگے طعام پیش کئے گئے۔ طبقہائے قبولی بھی اس میں شامل تھے۔

"مجلسوں میں اکثر و بیشتر ذکر شیعہ و سنی افتاد" ایک مرتبہ فرمایا:

"روافض و خوارج ہر دو گمراہ اند ہمہ بے وقوف۔ دریں ملک خوارج کم روافض زیادہ"

بزرگان نقشبند کے متعلق فرمایا کہ:

"فقرای نقشبندیہ دریں زمانہ در مشرب صوفیا کم یافتہ می شوند ملا مذکور ہست"

یہ ملا شمس الدین خلف الصدق ملا شیخ معین تھے۔ ملا شیخ معین الدین خلیفہ اور مرید شاہ سلطان بلیا کے تھے:

"شاہ سلطان را در شریعت بسیار استقامت بود تا حدیکہ زنی از اقربائے خود را لنکاح دویم کردہ دار۔ ملا گفتند در واقعہ چنیں است حضرت پیر دستگیر فرمودند گفتن این آسان اما عمل نمودن مشکل است مرد بودند کہ دریں ملک ہند چنیں کردند۔ بعض ملا گفتند کہ میاں شاہ عمران پسر شاہ سلطان دریں ملک آمدہ بودند۔ بعضی شخص کہ آبا و اجداد ایشاں در سلسلۂ نقشبندیہ بودند۔ ایشاں در قادریہ آمدند تعرض نمودند و گرانی کردند من گفتم کہ شاہ سلطان ہم مرید شاہ آدم بنوری گشتند آبا و اجداد ایشاں مرید شاہ آدم نبودند و شاہ سلطان را اجازت سلسلۂ حضرت قادریہ از ملا محمد طاہر لاہوری است و شیخ احمد سرہندی پیر حضرت شاہ آدم را سلسلۂ سہروردیہ و قادریہ از اجازت است پس از سلسلہ قادریہ و از مریداں قادریہ چہ انکار است"

اس موقع پر آپ نے حضرت مخدوم شاہ احمد چرم پوش پیر پدر مخدوم مظفر بلخی کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے حضرت مخدوم جہاں حضرت احمد شرف الدین یحییٰ منیری کو ترجیح دیا۔ اور باپ کے

پیر کے حلقۂ ارادت میں داخل نہ ہو جائے۔ راجے حامد شہ مانک پوری چشتیہ تھے۔ ان کے والد بھی چشتیہ تھے لیکن آپ نے سلسلۂ سہروردیہ اختیار کیا۔

شیعوں کے بارے میں اور صوفیائے کرام کے برعکس حضرت قمرالحق کا لہجہ کچھ سخت ہو جاتا تھا جب مختلف فیہ مسائل آجاتے تھے۔ کبھی فرماتے :

"امامیہ سخن ہائے دروغ بسیار می گویند۔"

ملاشاہ علیم اللہ جیو مرید حضرت میر محمد اسلم پٹنوی کو تاکید کی :

"درخدمت ایشاں اکثر شیعہ شنیعہ فریب دادہ خود را صوفی می نمایند شاہ مذکور از چاپلوسی و فریب ایشاں فریب نخورند نصیحت بایشاں نمایند کہ از افعال شنیعہ باز آیند لازم است کہ شاہ مذکور بحسب امر و اطاعت پیر از طرف خود ہدایت آں قوم فرمایند۔"

ایک مرتبہ امام مہدیؑ کا ذکر چھڑا :

"شیعہ شنیعہ گفتند کہ حضرت امام مہدی پیدا گشتہ مختفی مانند آنچہ اہل سنت و جماعت می گویند حق است کہ حضرت امام مہدیؑ عالم را خواہد گرفت و در زمانۂ ایشاں عدل ظہور خواہد گشت پیدا نگشتہ اند خواہند شد از صلب حضرت امام حسنؑ خواہند بود چنانچہ جلال الدین سیوطی در تفسیر در منثور آوردہ اند مخدوم سید اشرف جہانگیر در مکتوب خود نگاشتہ عقل تجویز نمی کند از آں وقت امام چناں مختفی شوند کہ عہدی معلوم نہ نماید اگر بہ سبب ترس مختفی شوند پس آبائے ایشاں رضی اللہ عنہم با وجود ایں قدر از دست دیگراں ظلمہا کشیدہ مختفی نگشتند و بزعم شیعہ اہل ایران تمام محب امام اند چرا ظہور نہ فرمودہ۔"

اس سے بھی سخت تر متعہ کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے :

"شیعیان متعہ می نمایند بعیش نفس را می خواہند زنا است بہانہ بہ کلام بزرگاں اختراع کردہ حجت آرند۔"

ایک شیعہ صاحب مسمیٰ سید فضل علی پسر سید جلال الدین جن کے یہاں حضرت پیر دستگیر مہمان تھے، پوچھ بیٹھے کہ :

"قرآن چہل سی پارہ بود سیپارۂ کہ در مناقب اہل بیت بودہ برآوردند۔
گفتند غلط می گویند"

اس مختصر اشارہ کی اہمیت بہت ہے۔ کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں ایک نہایت بھاری بھر کم مجلد مُطلا اور مذہب نسخہ قرآن مجید کا کسی ایرانی غالی شیعہ عیار زمانہ ساز کا تیار کردہ جو بہو بیگم مادر آصف الدولہ کو جلب زر اور حصول منفعت کے لئے پیش کیا گیا تھا موجود ہے۔ آخر میں ایک مختصر سورہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کسی ایرانی نے سورۂ علیؑ و سورۂ فاطمہؓ کو تصنیف کر کے قرآن میں داخل کرنے کی کوشش کی اور اس کا چرچا آج تک خاص خاص حلقوں میں ہوتا رہتا ہے۔ حضرت قمر الحق بعد تناول طعام سید جلال الدین کے صحن دیوان خانہ میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مالک مکان کے بڑے بھائی سید محمد رضا آکر دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے :

"یک رسالہ قریب ہشت جز خواہد بود شاہ لطف اللہ نبیرۂ شاہ محب اللہ الہ آبادی مرا فرستادہ بودند من نقل آں گرفتہ ام متضمن آنکہ رجعت است حضرت امیر المومنین (علیؓ) بعد قیامت در دنیا خواہند آمد و انتقام از دشمنان خواہند گرفت سی صد سال خلافت خواہند نمود حضرت پیر دست گیر فرمودند کہ خرافات شنیدہ نباید در کلام مجید است کہ جنت دار ابدی است کہ خواہد ماند خلاف قرآن اعتقاد نمودن کفر است۔ قرآن مجمع الفریقین بلکہ جمیع قائل کلمہ طیبہ است و خلاف قرآن عقیدہ نمودن کفر شما قرآن می خوانند و خرافات ایشاں می گویند سید مذکور گفتند کہ من نوشتۂ ایشاں را گفتم۔ فرمودند ہمچو لااصل را نباید گفت بعد ازاں سید علی رضا رخصت گشتند بہ پائی حضرت پیر دستگیر دست رسانندہ بہ موضع راہی گشت"

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر اور حضرت جناب فاطمہ کے تعلقات کا ذکر کسی مرید نے چھیڑ دیا۔

شیعوں کے خیالات بیان کئے گئے - آپ پر برہمی کے آثار طاری ہوئے - فرمایا :

" انا قول الکاذب آنہا را بگویند کہ از کتاب معتبر بر آرند یقین کہ از کجا بر خواہند آورد کہ دروغ را بنیادی نیست در جواب آں ایں آیت بخوانند۔ إن الذین فتنوا المومنین و المومنات ثم لم یتوبوا فلھم عذاب جھنم و لھم عذاب الحریق آنہائے کہ مسلمانند از مرد و زن اذیٰ می کنند بر آنہا دروغ می بندند و توبہ نمی کنند آنہا را عذاب دوزخ است و عذاب سوزندہ بعد ازاں عنایت فرمودند کہ در سلسلۃ الذہب ملا جامی نوشتہ کہ شیعہ شنیعہ یک علی مرتضیٰ بتراشیدہ می گویند کہ پہلوانی بود بہ نفس کاری کرد و دل وی بخلافت بسیار مائل بود اما بہ غلبہ ابوبکر و عثمان مغلوب ماند و با ایں چنیں علی اسد اللہ الغالب می خوانند و مغلوب می گویند۔

اس موقع پر شیخ حفیظ اللہ قاضی پوری نے :

" چند شعری از حکیم سنائی از حکیم انوری بایں کہ خوارج در روافض ہمہ بیوقوف اند خواندند۔"

ایک مجلس میں حضرت نے فرمایا :

" عجب احمق رافضی اند نمی فہمند خلافت ایشاں را برای حظ نفس نمودہ ایں قدر جد و جہد می نمودند کہ چوں خلیفۂ اول بہ خلافت نشست دوازدہ پیوند بجامہ داشت چوں وفات یافت کفن کفایت میسر شد و خلیفۂ ثانی از خشت خام کہ درست می ساخت ازاں قوت می یافت و گاہی از بیابان ہیزم آوردہ قوت می نمودند چنانچہ ہیزم بر سر نہادہ در آمدند و کثرت مردم می بود ایں فرمود طرقوا امیرکم یعنی راہ بدہید امیر خود را و خلیفۂ رابع کہ بخلافت نشست تمام روز صائم میبود و بوقت افطار بہ یک کف دست آرد اکتفا می نمود۔ چہار سال خلافت داشت ہمیں عمل بود بعد شہادت خلیفۂ ثالث دوازدہ بند

نمودہ نشستند صحابہ بہ الحاح وجد تمام و ابرام تام کہ دین محمدی ضائع میشود آن را برآوردہ خلیفہ ساختند و از خلیفۂ ثانی مردم استفسار حال نمودند گفت چہ می پرسید تا کہ خلیفہ نبودم بآرام بودم الحال کہ خلیفہ گشتم بے آرامی تمام دارم اگر روز بخسپم کار رعیت ضائع میشود و اگر در شب بخفتم نفس از عبادت محروم می ماند بایں دو وجہ خواب چہ گونہ کنم۔ دستور خلیفۂ ثانی چناں بود کہ در شب سیری کرد تا احوال مردم مستحقاں نمودہ انجاح حوائج وی نمایند شبی بر در خانۂ بیوہ آمدہ استادہ شد کسی از وی پُرسید کہ احوال طفلاں تو چیست گفت چہ می پرسی استخوان عمر می خورم چوں روز گشت خلیفۂ ثانی او را طلبید کہ احوال من چرا نہ گفتی۔ وی گفت مرا چہ خدا ترا خواہد پرسید ترا می بایستی کہ خبر من نہ گرفتی بہر حال خلافت را وجہ سوای افشای دین نبوی دیگر نبود شیعہ از راہ حماقت ہر چہ گویند گویند۔"

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے متعلق فرمایا :

"وجہ باغیان مادر محمد ابن ابا بکر بعد فوت صدیق اکبر در نکاح حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ آمدہ و پرورش محمد ابن ابا بکر در خانۂ حضرت امیر یافت بعد ازاں کہ محمد ابن ابا بکر خانۂ عثمان را محاصرہ نمود۔ حضرت امیر برای مدد تشریف نبردہ بعد ازاں کہ خلیفۂ ثالث شہید گشتہ و حضرت امیر خلیفہ شدند محمد ابن ابا بکر دراں لشکر استقامت نمودہ آبان ولید ولد خلیفۂ ثالث داد خون پدر از حضرت امیر خواستہ انجام نیافت۔ در ذہن باغیان مذکور کہ رعایت امیر (علی) در حق قاتلان است ازیں جہت خروج و وجہ آن نیافتہ ندانستند کہ نفس علی مرتضیٰ مثل نفس محمد علیہ السلام است و نیات ایشان را ندانستہ کہ مدار بر نیت است توجیہ تشریف نبردن وجہ ایں بود کہ حضرت امیر برای مدد خلیفۂ

مظلوم با حضرت امام حسن شرب آب برای خلیفۂ ثالث فرستادند وگفتہ اگر بگوئید برای مدد شما می آئم۔ خلیفۂ ثالث بہ ابرام تمام منع نمودند کہ نیایند گفتہ فرستاد کہ رسول علیہ السلام را بخواب دیدہ ام کہ می فرمایند ای عثمان اگر جنگ خواہی فتح خواہی یافت و اگر خیر خواہی نمود افطار ہمراہ ما خواہی کرد من دوست می دارم کہ ہمراہ رسول خدا افطار نمایم و وجہ نیافتن داد آبان ولید (بن عثمان) بسبب عدم ثبوت قابل بطور شرع بود در خاطر جمیع باغیان گزشت کہ ہم چو متوسل اگر با داشتیم رعایت می نمودند حضرت امیر باین توسل رعایت نخواہند باشد بعد ازاں کہ ثبوت وجہ دریافتم نادم گشتند توبہ نمودند۔"

اسی ضمن میں کچھ پہلے "غنیۃ الطالبین" مصنفہ حضرت غوث اعظم کی بنا پر آپ نے فرمایا:

"مردان شخصی بودہ است کہ خلیفہ اول وثانی اورا از مدینہ اخراج نمودند در خلافت خلیفۂ ثالث مروان توبہ از احوال خود نمود عفو نمودند چوں قابل بسیار بود وزیر خود مقرر فرمودند و محمد بن ابا بکر را حضرت عثمان خلیفہ (والی وحاکم) مصر از طرف خود مقرر ساختند و دستور چناں بود کہ چوں کسی را خلیفہ (والی) می نمودند یک نامہ بدست غلام یا غیرہ معتمد می فرستادند کہ مردم استقبال نمودہ آرند حضرت عثمان بدست مبارک خود باہل مصر نوشتہ دادند کہ فاقبلوہ یعنی پیش آمدہ آرند چوں مروان وزیر بود آں خط از دست غلام گرفتہ نقطۂ بای دور نمودہ دو نقطہ بالا دادہ فاقتلوہ شدہ یعنی بکشید غلام نامہ می برد در لشکر محمد بن ابا بکر رسید نامہ از دست غلام گرفتہ چوں مطالعہ نمودند دراں دیدہ فاقتلوہ مرقوم بود آخر محمد بن ابا بکر با فوج منظم آمدہ خانۂ عثمان محاصرہ نمود آب وطعام بند ساختہ حضرت عثمان را شہید ساختند در خاطر باغیان گزشتہ کہ چوں قصاص قاتلاں نفرمودہ چنیں کس را خلافت نشاید معاویہ والی شام از طرف حضرت عثمان بود و فوج شایستہ داشتہ در خاطر باغیان

آمده که معاویہ را خلیفہ باید نمود"۔

گنجِ فیاضی میں چند تاریخی اشخاص کے بارے میں کچھ باتیں حضرت پیر دستگیر نے فرمائی ہیں۔ نمونتاً یہاں دو چار باتوں کا اعادہ کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ مسلمہ تاریخی حقائق سے کہاں تک ان کا تطابق ہوتا ہے۔ ایک وقت مشہور ہے کہ فتوے کے بعد آپ نے فرمایا کہ:

"جہانگیر بدبین خمر بوده روزی از علما پرسید که خمر در دین محمدی حلال است که حرام گفتند حرام۔ پرسید در دین ہیچ نبی حلال است در دین عیسیٰ۔ گفت در دین محمد ہاشیم د فرموده نه دی نه تمام شرمنده می شویم بدون شرب شراب ہلاک می شوم طاقیہائے فرنگیانہ تیاری گشت که بعد تیاری طاقی پوشیده فرنگی می شد شیخ نزد بادشاه آمده استفسار از طاقیہائے نموده بادشاه وجہش از شیخ گفت شیخ فرمود که برشما شرب خمر حلال است۔ جہانگیر گفت نوشتہ بدہید۔ شیخ نوشتہ بداد چوں از آنجا برخاست مردم از وجہ نوشتن پرسیدند شیخ گفت که اول بر تقدیر ہلاکی در دین محمدی شرب خمر جائز است و اگر اینہم نمی شد تاہم نوشتہ می دادم چرا که اگر بادشاه عیسوی می گشت دین محمدی برہم می خورد برائے استقامت دین محمدی من تنہا رفتن دوزخ قبول نمودم"۔

ایک روز عالمگیر اورنگ زیب کے بیٹوں اور سیدی فولاد کوتوال دہلی کا ذکر آیا۔ کسی نے کہا "کوتوال مفسد می شوند"۔ آپ نے فرمایا "لازم نیست که ہمہ مفسد باشند"۔ بطور مثال سیدی فولاد کوتوال شاہ جہاں آباد کے بارے میں فرمایا:

"اورا بادشاه عالمگیر جنید وقت می گفتند انصاف خوب می نمود بادشاه عالمگیر شاہزاده (محمد سلطان؟) قید کرده بود در خاطر اعظم شاه گزشت که اگر شاه عالم کشتہ شود و اکبر بطرف ایران رفت و محمد کام بخش چیزی نیست فکر این باید نمود بادشاه عالمگیر را در خدمت یکی از بزرگان نقشبندی سرہندی

اعتقاد کامل بود محمد کام بخش را مرید ایشاں گنانیدہ بود وی گفت اگر من مرید
نمی بودم مرید شما می گشتم اعظم شاہ کارسازی نہ لک روپیہ بمعرفت مہاجن
اناں بزرگ نمود آں بزرگ بہ طمع روپیہ از عالمگیر گفت کہ رسول خدا مرا فرمودہ
کہ بہ عالمگیر بگو کہ شرارت در نفس شاہ عالم بسیار است ایں را بکشند عالمگیر
گفت حضرت باز استخارہ نمایند کہ مقدمۂ عظیم است بعد آں بزرگ گفت کہ
رسول ناطق بکشتن شاہ عالم است۔ عالمگیر تامل نمود جوابی نہ گفت بعد آں
بزرگ بہ طمع خام گفت کہ عالمگیر اگر شاہ عالم را نمی کشد آفت عظیم بعالمگیر خواہد
رسید آنچہ پیغام رسول بود رسانادم بیشتر اختیار دارند، عالمگیر ترساں و متامل
گشت۔ سیدی فولاد کوتوال را طلبید ایں ماجرا گفت سیدی عرض نمود کہ
فکری در خاطر آوردہ ام خدا راست کند لاکن شاہ فریاد کسی نخواہند شنید ہمیں
کہ از حضور بادشاہ آمد بے تامل بر کوٹھی مہاجناں عمدہ فرستاد، کوٹھی و محلہ
ساماں بصورت گرفتہ آرند چوں زندگانی شاہ عالم در تقدیر بود یک روزنامچہ
بر آمد کہ نہ لک روپیہ بابت اعظم شاہ برای ایں کہ عالمگیر شاہ عالم را بکشد نام
آں بزرگ کہ مرقوم بود باو رسانم کوتوال روزنامچہ را نزد بادشاہ عالمگیر آوردہ نمود
بادشاہ مہاجن را طلبیدہ آں مہاجن اقرار نمود کہ من مہاجن ام ہر کہ پیش من می دارد
می دارم۔ بادشاہ عالمگیر آں بزرگ را طلبیدہ فرمود اگر نام فقیر نداشتند می کشتم
حفظ جاں شما ایں است کہ بحرمین شریفین بروید از شرمندہ و نادم بحرمین رفت۔"

۱۸ ربیع الثانی روز شنبہ ۱۲۴۷ھ کی مجلس میں آپ نے فرمایا:

" عالمگیر بادشاہ تربیت خاں را کہ چہار ہزاری بودہ ایلچی نمودہ پیش بادشاہ
ایران فرستاد و عبد الخالق را کہ منصب سہ صدی داشت واقعہ نگار ساختہ ہمراہ
خان مذکور کردہ دادہ چوں بہ شاہ ایران رسیدند نامۂ بادشاہ خود گزرانده
شاہ دیدہ ناخوش گشتہ گفت کہ بادشاہ ہندوستان بے ادب است کہ

نام مرا بہ سطر نوشتہ و کنیت و لقب یاد نکردہ شیخ عبدالخالق گفت کہ بادشاہ ما عامل بر قرآن مجید و متسناً بہ سنن الٰہی است ۔ در قرآن مجید نام خدا و رسول وی در سطر می نویسند و بالای آں نمی نگارند و خدای تعالیٰ دوست خود را بنام یاد کردہ کہ محمد رسول اللہ و الذین معہ اشداء علی الکفار ... الی آخرہ و دشمن خود را بکنیت یاد کردہ بعد ازاں شاہ ایران گفت کہ بادشاہ ہمایوں نامہ را مطالعہ می کند اشارت برآں بود کہ ہمایوں چوں شکست خوردہ پناہ بشاہ ایران گرفتہ و از فوج شاہ ملک خود را گرفت ۔ شیخ گفت در واقعہ تیمور نامہ مطالعہ می نماید اشارت براں نمود کہ تیمور ملک توران و ایران گرفتہ بود بعد ازاں شاہ گفت تو چہ کسی شیخ عرض نمود کہ واقعہ نگارا آنچہ نیک و بد باشد در قلم می آرم و بادشاہ خود را اطلاع بدہم، شاہ گفت چہ منصب داری شیخ منصب خود و منصب خاں موافق مرقوم الصدر بیان ساخت شاہ گفت بادشاہ تو احمق است کہ گفتۂ چہار ہزاری را اعتماد نماید و گفتۂ سہ صدی را معتبر می شمارد شیخ گفت بادشاہ ما متسناً بہ سنن الٰہی است خدای تعالیٰ محمد رسول اللہ را پیدا نمودہ و برای واقعہ نگاری کراماً کاتبین مقرر ساختہ شاہ از قابلیت شیخ بسیار خوش گشتہ گفت کہ می بایست کہ بجای خاں ترا می نمود و بجای تو خاں را می ساخت ۔"

جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو جو باتیں آپ کی زبان مبارک پر جاری ہوئیں اس میں کچھ تو واقعاتی اور ایک بے سروپا امر کا ذکر آیا۔ صاحب ملفوظ لکھتے ہیں :

"بعد ازاں مرزا محمد امین بیگ نائب جاگیردار جان نثار خاں (دیزۂ قمرالدین خاں اعتمادالدولہ وزیر اعظم محمد شاہ کہ از دست بھگونت کشتہ شد) کہ بہ قصبہ سرای ہیر رفتہ بود ازاں جا آمدہ از اسپ فرود آمدہ در خدمت رسیدہ ملازمت نمود

بعد از خیر و عافیت استفسار از وطن در میان آمد گفت کہ جد من از عین سرای اصفہان آمدہ مولدم در دہلی است بعد ازاں ذکر عمل نواب سعادت خاں (برہان الملک بانی سلطنت اودھ) و خرابی راجہ مہابت خاں آمد گفت کہ قطب الملک و حسین علی خاں (سیدان بادشاہ گر) در یک ساعت چہ شدہ باوجودیکہ برگرامی خواستند بادشاہ می نمودند حضرت پیر دستگیر فرمودند کہ احوال عالم ہم چنیں است بریں نقلی بر زبان مبارک آوردند کہ شاہ تیمور بر بادشاہے تاختہ بود بادشاہ در قید سپاہی آمدہ اما سپاہی نہ دانستہ بود کہ بادشاہ است وی را در چارپائی از رسن بستہ بود چند ساعت قدری کھچڑی بوی داد وی در آوندی خورد بر آتش نہادہ یکا یک سگ آمدہ دہن آوند گرفتہ بردہ آں محبوس بیحد بخندید سپاہی را بسیار تعجب آمد کہ دریں وقت بہ ایں تکلیف مبتلا است و قوت ہم از دست رفتہ باعث خندیدن چیست ازاں محبوس بجد تمام پرسید د آخرش او بگفت کہ مقدمہ یک پاس است کہ ماکول عرض نمودہ کہ آوند باورچی خانہ مسں آلات بر صد شتر بار گشتہ باہم آوندہا افتادہ اند گفتم کفایت می نماید دریں وقت باورچی خانہ من در دہن سگ رفتہ قدرت الٰہی ملاحظہ آمدہ آں سپاہی دانست بادشاہ ہست اعزاز نمود۔“

ایک مرتبہ نورجہاں کے بھائی آصف خاں پدر ممتاز محل سے ایک واقعہ منسوب کیا گیا[1]

---

[1] شاہ جہان آباد دہلی کی ایک پیرزال کا گھر وزیر آصف جاہ کے ایک ہزاری سوار جمعدار کے مکان کے متصل تھا۔ اس نے اپنی حویلی کی وسعت اس پیرزال کے مکان کے حصے کو لے کر بڑھائی اور اس کی فریاد کو کوئی سنتا نہیں تھا۔ شاہ جہانگیر کشتی پر سوار ہو کر شکار کے لئے روانہ ہوا۔ راہ میں ایک حسین تنبولن نے چند بیڑے پان پیش کئے۔ بادشاہ نے چند اشرفیاں بھجوا دیں۔ پیرزال اس کی دکان (باقی اگلے صفحہ پر)

یوں تو گنج فیاضی جیسی ضخیم کتاب میں جو ساڑھے سات سو صفحات کو محیط ہے بہت سی باتیں ہیں جو مختلف مذاق اور طبائع کے لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث اور جاذب نظر ہو سکتی ہیں۔ انتخاب و تلخیص کسی ایک شخص کے ہاتھ سے ناتشفی بخش ہی ہوگی لیکن کچھ تو کرنا ہی ہے منجملہ اور باتوں کے، جو لوگ ملفوظات کی لسانی خصوصیات پر نظر رکھتے ہیں انہیں اس میں چھوٹے چھوٹے آسان ہندی کے فقرے جن میں بعض کہاوت کا حکم رکھتے ہیں اور کچھ مشکل الفہم دوہے بھی انھیں ملیں گے۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" ایک مشہور فقرہ ہے جو اس میں موجود ہے۔ دوسرا فقرہ "درزی کا پوت جو جئے گا سوئے گا" اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ اٹھائیسویں مکتوب میں صاحب ملفوظ فرماتے ہیں:

"کبیر موحد خوب گفتہ

کہے کبیر میں وہ گورو داس : جو آپن بکھرے رہے اداس"

یعنی وہ اپنے آپ میں مست تھے۔ دنیا داری سے الگ تھلگ اداس اور پریشان خاطر۔ مکتوب ۲۶ میں حضرت فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ کا قول نقل کرتے ہیں:

جس کا سائیں جاگت سو کیوں ہوئے اداس

میں جا ہوں کہ اُڑ ملوں سو پر بین اُڑا نہ جائے

کیا کہوں اس دیپ کون جو پر نہ دیا بنائے

میں رکت پانی رکھوں جو نہ لبش ہوئے ہمار

اچھر دیئی کاگج پڑھو دیکھوں درس تمہار

۱۹ ربیع الاول روز جمعہ جب متوجہ بہ جون پور گشتہ چوں چوں نزدیک رسیدہ

(بقیہ حاشیہ) میں بیٹھی تھی فریاد کرنے لگی۔ بادشاہ نے غضب ناک ہو کر آصف جاہ کو ملزم جمعدار کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ آخر پیرزال شاہ کے انصاف سے مرہون منت ہوئی۔ نئی دیوار بنائی گئی اور حالات سابق دستور کر دیئے گئے۔ جب تک پیرزال زندہ رہی پانسو برق انداز اس کی حفاظت کرتے رہے اس لئے کہ اس نے بادشاہ سے اپنے خوف کو ظاہر کیا تھا۔

حضرت مخدوم فرمود :

"سوندھی باس آوتے ہے"

۲۶ ربیع الثانی یکشنبہ کو حضرت نے شیخ سید فضل علی کو مخاطب کر کے کہا :

بگو ای طوطی روحانی من	مگیر الفت برنگیں پنجرۂ تن
نہ تو لالا ہے نہ پنجرہ رہے گا	بلا کر لال تجھ کو کیا کہے گا
پیارے لال سوں نیہا نہ جوڑا (الفت)	موا وحرص سوں توں مکھ نہ موڑا

فرمایا :

ایں اشعار از جعفر است بخوانید ایشاں بموجب امر عالی بہ الحانی می خوانند۔

اسی قسم کی چیز میاں شاہ اہل اللہ راجگیری کو ایک مکتوب میں آنحضرت نے لکھوائی۔

جب تجھ کو پوچھے لال پیارا	اس پنجڑے بیچ توں کیا کیا سنوارا
چہ خواہی گفت اے طوطی جوابش	بکن امروز فکر ایں خطابش
نہ تو رہے نہ یہ پنجڑا رہے گا	بلا کر لال تجھ کو کیا کہے گا

میر تقی میر کا شعر یاد آجاتا ہے جو شاید اس طرح ہے ۔

جو پوچھے گا کوئی تو کیا کہئے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

۳۰ صفر بروز چہار شنبہ آپ نے کبیر کے یہ دوہے پڑھے :

"گورو گوبند دوؤ ٹھاڑے ہے	اب کہ کے لاگوں پائے
بلی ہاری جاؤں وہ گرد کے جن	گوبند دیو بتائے

قریب قریب اس کے ہم مضمون اُردو کا ایک مشہور شعر ہے ۔

جس نے بندے سے کر دیا مولا
لاکھ بار ایسے پیر کے صدقے

۱۹ صفر سہ شنبہ کو بزبان مبارک آوردند دوہرہ ۔

دو مارگ دیکھوں بہ حاطہ اب دیئی چلا بے ڈکھ پاتا

مکتوب ۷۴ ایک عسیر الفہم دوہرا بیان فرماتے ہیں ؎

آلی دسکھی ہجیتا اوگن میں کیا تیتا کرے نہ کوی

کالا ہوا سو مکھرا کیتیا دَ ہوں روئے

اے سکھی میں نے جیسے جیسے کام کئے کسی اور نے نہ کیا، جس کا منہ کالا ہوا وہ کتنا زار و قطار روتا ہے۔

۱۶ صفر بروز یکشنبہ ایں ہندوی بزبان مبارک، راندند ساکھی ؎

جب ہم تم رہے سیت سروپ ہمرا تمہرا ایکے روپ

جب ہم گیا میں لیا باس تم بھئے ٹھاکر ہم بھئے داس

بعدازیں کہ غلام شد ہر چہ دادند بکند و ہر چہ تکلیف دہد نماید چنانچہ مشہور است کہ جیری کا کان کوں سائیں ہاتھ ایں ہمہ بلیات از علم آمدہ ..... الخ

۱۵ ربیع الثانی کو حضرت راجے حامد شاہ مانک پوری کے متعلق لکھتے ہیں کہ مخدوم شاہ حسام الحق نے ان سے حضرت خواجہ محمد عیسیٰ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا "جس پر ٹھکرے تس پر ٹھاکر" اور حضرت حسام الحق کا یہ فقرہ نقل کیا ہے" ان کے نکاس تمہرے بسار" یعنی تمہارا پہنچنا اور ان کا وصال ایک ساتھ ہوگا۔ ۱۷ ربیع الثانی چہارشنبہ کے تحت یہ فقرہ مندرج ہے۔"گدائی کیا آگ لگائی" مخاطب نے کہا " گدائی آگ بجھائی"

۲۱ رجمادی الاول روز شنبہ ایں دوہرہ بزبان مبارک راندند

جو دھندھا[1] جے من بسے سیں سو جہ سو دھند

ایہہ کارن تیسے سادھئے کرے... چیت بندھ

---

[1] یعنی جو دھندھا جس کے من میں بسے گا وہ اسی کے مطابق کام کرے گا اور وہی اُس کا دھن ہوگا دھیان لگاکر خدا کو یاد کرنا چاہئے یا پریم سے دل لگاکر سادھنا کرنا چاہئے۔ سب راستے ایک ہی منزل تک لے جاتے ہیں۔

۱۶ر جمادی الاول بروز شنبہ کے تحت ایں کبت بدیہا خواندند

سے کا سے نہ جاؤں نہ جاؤں پیا

کہہ نیر تھ نین بھئے ہر دئے نیچ ھیرے

جاپ جپوں نہیں منتر پڑھوں نہیں آس بچوں بسودھا دھر کیری

مورت مگدھ ھئ ہوئے گیان دھرو کب شیخ مبارک ٹھیکہ ہے تیری

میری تو اور المہ نہیں ہر ہو ہر ہو ہر ہو گت تیری

بسودھا معنی زمین اور اس کے باسی۔ یعنی میرا تو آخر وقت نزدیک ہے شیخ مبارک ہی پاگل گانے والے ہیں اور کوئی میرا سہارا نہیں ہے۔ ہر پاشیو کو بھی ہر حال میں (گت) میں یاد کرنا چاہئے۔ ۲۶ر شنبہ وقت عشا آپ کی نشست صحن بنگلہ میں تھی۔ شخصے ساکھیھائے کبیری خواند۔ ساکھیاں درج نہیں کی گئیں۔ ۲ر شعبان روز شنبہ کو بزرگان جھوسی کے مزار پر آپ تشریف لے گئے۔ شاہ تاج ولد حضرت خواجہ کلاں حضرت شاہ یٰسین خلیفہ شیخ طیب اور دوسرے بزرگان کے مزارات کی زیارت کے بعد آپ روضۂ حضرت شاہ تقی پر پہنچے جو گنگا وجمنا کے سنگم کے کنارے ایک پختہ کنواں کے پاس اور اونچی دیواروں کے اندر تھا۔

"شخصی محمد رضا از مریدان شاہ تقی آنجا حاضر بود بعد معانقہ و مصافحہ و استفسار خیریت حضرت پیر دستگیر از تاریخ وسنہ وصال حضرت ایشان (حضرت تقی) استفسار نمودند مشارٌ الیہ گفتند کہ قطب گنج العرش (۱۳۶۴ = ۷۶۵) و تقریباً گفتند کہ کبیر مرید ایشان ست وچند ساکھی کہ در وصف حضرت شاہ تقی کبیر گفتہ بود خواندند بعدہ زیارت حضرت شاہ شعبان کہ والد شاہ تقی اند فاتحہ خواندہ رخصت شدہ۔

پیر کی تاریخ سے مرید کی تاریخ کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم ہندی داں حضرات کو گنج فیاضی سے لے کر یہ نیا تحفہ جو کبیر اور ان کے پیر پر نئی روشنی ڈالتا ہے پیش کر کے اپنے اس ناچیز مقالہ کو ختم کرتے ہیں۔

لالہ اُجاگر چند اُلفت

:- اور :-

ان کی نادر غیر مطبوعہ تصانیف

لالہ اُجاگر چند اُلفت بارھویں صدی ہجری کے ایک قابل فارسی داں، اچھے انشا پرداز، نہایت طباع، بلند خیال اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اسی عہد میں عظیم آباد پٹنہ بھی ایک مانا ہوا علمی مرکز تھا۔ اور مقامات کی طرح علاوہ بہار کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول اور خوش آئند تعلقات کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ الفت ہندو تھے اور تاعمر ہندو رہے، لیکن اسلامی تمدن کا ان کی ہمہ گیر طبیعت پر کافی گہرا اثر پڑا تھا اور مسلمانوں سے ان کے روابط دوستانہ اور تعلقات مخلصانہ تھے۔ اُنہوں نے مقامی جنگی مہموں میں شرکت کی۔ رؤسا اور امراء کی طرف سے ان کے نام مکاتیب ارسال کیے جن میں حالات حاضرہ اور چشم دید واقعات کو قلم بند کیا۔ ان کی تحریریں ان کے زمانہ کی معاشرتی اور ادبی خصوصیات کی جھلک دکھاتی ہیں۔ افسوس ہے کہ ایک ایسے شخص کے حالات و کمالات جو اس عہد کے ہندو مصنفین اور شاعروں کی صف میں ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہے، جس کے خدمات کافی وقیع ہیں، اب تک پردۂ خفا میں مستور ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مصنف "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" اور عزیز بلخی مرحوم مولف "تاریخ شعرائے بہار" تین چار سطروں سے الفت کے متعلق کچھ زیادہ حوالۂ قلم نہ کر سکے۔ لالہ بندرابن داس خوشگو الفت کے ہم عصر تھے اور گہرے تعلقات رکھتے تھے،

چند کام کی باتیں خوشگو نے بتائی ہیں۔ لچھمی نرائن شفیق نے جو کچھ لکھا ہے خوشگو کی نقل ہے۔ آغا حسین قلی خاں عاشقی صاحب تذکرہ نشترِ عشق نے بھی دو تین سطریں لکھ دیں۔ علی ابراہیم خاں خلیل نے بھی الفت کو بالکل نظرانداز نہیں کیا لیکن نہ صرف ہم عصر بلکہ بعد کے آنے والے تذکرہ نگاروں نے جو کچھ لکھا مسکن عطش نہیں ہوسکتا۔ خوش قسمتی سے الفت کے باقیات الصالحات کا عظیم آباد میں بالکل فقدان نہیں ہوا اور ان کی فارسی استعداد اور تاریخی و ادبی خدمات کے جائزہ لینے کے مواقع حاصل ہیں۔ الفت کی ذریات ابھی فنا نہیں ہوئیں۔ اسی تاریخی شہر میں ماتفر کا نسخۂ طبقہ کے چند افراد اب بھی موجود ہیں جن کی زمانہ کے استداد و تغیرات کے باوجود فارسی اور اردو سے ہنوز دل بستگی قائم ہے۔ اکبر ثانی کے مشیر اور میر منشی، راجہ پیارے لال الفتی جنھیں دہلی چھوڑ کر پٹنہ میں مسکن گزیں ہونا پڑا اور جنھوں نے فارسی انشاپردازی اور شعروشاعری کا ایک علیحدہ اسکول قائم کرکے یہاں کی علمی رونق میں چار چاند لگائے اور عبرتی وحشی فرحتی محنتی وغیرہ جیسے باکمالوں کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کیا، انہی لالہ اجاگر الفت کی دخترِ نیک اختر کے نورِ نظر تھے۔ الفتی کے صاحبزادے کنور ہیرا لال کے ہاتھ کا زمانۂ طالب علمی میں نقل کردہ انشاء غریب جسے ان کے پرنانا نے ۱۱۵۱ھ میں مرتب کرنا شروع کیا، جیساکہ ان کے اپنے قطعۂ تاریخ کے آخری مصرعہ "گلستان معانی را بہارے" سے ثابت ہے، چند منتشر اوراق جو الفت کے چند ابتدائی خطوط اور ایک نادر غزل ریختہ پر مشتمل ہیں اور الفت کے ایک ناقص دیوان فارسی کا قلمی نسخہ راقم السطور کو مخطوطات کی تجسس و تلاش کے دوران دستیاب ہوا۔ سطور ذیل میں الفت کے سوانح حیات، معاصرین سے تعلقات، ان کے مکاتیب کی تاریخی اہمیت، ان کے نثر و نظم کی خصوصیات کے متعلق جو کچھ مواد ان کی مندرجہ بالا مصنفات سے حاصل ہوسکتے ہیں، اُسے اوّل بار منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جس وسعت کی ضرورت ہے اس مختصر مقالہ میں کہاں میسّر۔

فارسی دیوان الفت میں ایک تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الفت کے والد کا نام مہابلی تھا نہ ماتھر نوکلی کایستھ تھے۔ عاشقی لکھتے ہیں کہ الفت "از سکنہ عظیم آباد بود"

لیکن خوشگو جن کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے، فرماتے ہیں۔ "از مدّتے در عظیم آبادمی ماند" معلوم ہوتا ہے کہ الفت کا آبائی وطن پٹنہ نہیں کہیں اور شاید دہلی تھا۔ منتشر اوراق میں الفت کا ایک خط ہے جس میں اپنے ایک بھائی لالہ حکم چند کے شاہجہاں آباد سے بہار آنے کا ذکر کرتے ہیں۔ حکم چند کے نام انشاءِ غریب میں چند خطوط ہیں ایک سے پتہ چلتا ہے کہ بھائی کو کسی بیگم صاحبہ معظمہ کے مدرسہ میں داخل کر دیا تھا لیکن ان کے خیال پوچ یا در ہوا" سے سخت بیزار تھے۔ "غفیل کمال" اور "مجمع اوباشان مردود" سے احتراز کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ دوسرے خط میں یہ سن کر "از شربت ایام عطالت متألم متحیر بودہ ارادہائے دور از کار در دل دارند و از تلاش نوکری کہ شرط عقل است دل برداشتہ خانہ نشیں گردیدہ اند ہر وقت بزشت خوئی و خشم بے جا دل آزار۔۔۔۔ می باشند" نصیحت کرتے ہیں کہ "ایزد بے ہمتا وجود باسود الشاں را ہزیور جمیع استعداد متحلی و موصوف (گردانیدہ) تفضلات خداوند کارساز" پر صابر و شاکر رہ کے اور "متلاشی روزگار شوند"۔

ایک خط میں حکم چند کی "رنجوری" "مقالہ" اور وفات پر آٹھ آٹھ آنسو رو دیے ہیں اور "راضی بہ قضائے کردگار ہو کر مکتوب الیہ "خداوند فیض و افضال، صاحب امانی و امال" کو اطلاع دیتے ہیں کہ "برادر متوفی" کے اشیا و امتعہ کو بہ حفاظت رکھ دیا ہے۔

الفت کے خطوط میں گھوڑوں کی تجارت اور اس میں خسارہ کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"انشاء اللہ تعالیٰ اگر سال آئندہ قافلۂ اسپاں می رسد چند راس تز کی خرید کردہ برائے آں مہربان خواہد فرستاد" ایک جگہ ایک دوست کو گھوڑے بھیجتے ہیں اور ہنڈوی بھی واپس کرتے ہیں۔ شوکت جنگ یعنی سراج الدولہ کے ابن عم کے "اسپ خاصہ" کی تعریف میں ۶۶ سطور نثر میں اور ایک مثنوی لکھی جو "انشا الفت" میں موجود ہے اور جس کے علاوہ ان کی قادر الکلامی کے گھوڑوں سے شغف کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابتدائے عمر میں الفت باپ کے ساتھ پٹنہ آئے روزگار میں گھاٹا ہوا، نوکریاں کیں اور میر منشی اور پیشکاری کے فرائض انجام دیے لیکن فروغ نصیب نہیں ہوا۔ بیکاری و عطالت میں برسوں گذارے، معاش قلیل

پر قناعت کی پٹنہ کو ہمیشہ کے لیے وطن قرار دے دیا یہیں سورگباشی ہوئے۔

خوشگو نے جو کئی بار پٹنہ آئے اور بقول صاحب گلِ رعنا پٹنہ ہی ہیں "در عشرہ سابع بعد مائۃ والف پیکر عنصری گذاشت" شاید ۱۱۶۱ھ کے لگ بھگ الفت سے پٹنہ میں ملے اور انہیں "جوان دلچسپ و باکثیر خوبیہا موصوف" پایا۔ بالکند شہود کے متعلق خوشگو لکھتے ہیں "فقیر وقتیکہ در عظیم آباد بود مشارٌالیہ برفاقت برادر بزرگوار راجہ کیرت چند کہ بدیوانی نواب شہید ..... ہیبت جنگ ..... مقرر بود اقامت داشت" راجہ رام نرائن موزوں کے حال میں رقمطراز ہیں۔ "از مدتے بدیوانی صوبہ داری عظیم آباد امتیاز دارد فقیر اول مرتبہ کہ وارد آں دیار شد بتوجہ آں خریدار دلہا نفسے راست کرد" تاریخیں بتاتی ہیں کہ نواب ہیبت جنگ قدر سراج الدولہ ۱۱۶۱ھ میں افغانان دربھنگہ کے ہاتھوں دغا سے قتل ہوئے۔ راجہ کیرت چند کی دیوانی ختم ہوئی۔ موزوں ان کی جگہ عہدۂ دیوانی پر فائز ہوئے اور ۱۱۶۵ھ میں راجہ جانکی رام کے مرنے پر نائب ناظم بہار ہوئے۔

انشاء الفت میں چند خطوط خوشگو کے نام ہیں ایک تو "در اوائل تشریف آوردن بہ بلدۂ عظیم آباد طرازش یافت" تاریخ نہیں دی۔ بہرحال مسلّم ہے کہ ۱۱۶۱ھ کے قریب یا اس کے کچھ پہلے خوشگو الفت سے ملاقی ہوئے اور انھیں جوان دلچسپ پایا۔ منتشر اوراق میں الفت کی ایک تحریر ہے ۱۱۴۳ھ میں بروز ۲۵ شعبان نواب فخرالدولہ ناظم بہار (۱۱۲۸ - ۱۱۴۵) کے دریائے گنگا میں جشن چراغاں منانے کا تذکرہ ہے۔ انشا غریب کے دیباچے میں اجاگر چند لکھتے ہیں کہ "بہ حسب اشارت بعضی حلقہ بگوشانِ ذُرد و غُرد محبت و مضافات دمشہریان جواہر زواہر مودت موالات چندیں گہرہائے آبدار الفاظ و عبارات کہ بعمر شانزدہ سالگی از درہائے دل بساحل زبان رسیدہ بود در سلک تحریر و رشتۂ تسطیر منظم گردانیدہ کہ جعد عنبریں شاہد سخن را از دست فکرت تاب دادہ از میل قلم سرمہ در چشم مخدرۂ کلام کشیدہ بر منصۂ بیان جلوۂ نمایاں بخشید نام ایں نامہ نامی موسوم بہ انشاء الفت غریب نمودہ شد۔"

اگر فرض کرلیا جائے کہ ۱۱۴۰ھ کے قریب اُجاگر چند نے بعمر شانزدہ سالگی" میدان انشار پردازی میں گامزنی شروع کی تو ۱۱۶۱ھ میں یقیناً عالم شباب کے مراحل طے کر رہے تھے

جب خوشگو سے ملاقات ہوئی۔ منتشر اوراق اور انشاء غریب میں جس کا آغاز تالیف ۵۱ ۱۱ھ ہے، ان کی تحریریں ابتدائی مشق کی غمازی کرتی ہیں اور انشار غریب میں عبارت پختگی کہنہ مشقی اور سن کہولت کے آغاز کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انشار غریب میں چند ایسے خطوط بھی شامل ہیں جو یقیناً بعد کو اضافہ کیے گیے۔ اسی طرح انشار اُلفت سے میں چند تحریریں ایسی موجود ہیں جن میں ۵۴ ۱۱ھ کے قبل کے واقعات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جن کی مبارک باد کہ سال بستم جلوس محمد شاہ غازی حسب الایمار رام نرائن موزوں ہے۔ محمد شاہ کا سال جلوس ۱۱۳۱ھ ہے مگر بہ حیثیت مجموعی انشار غریب اور انشار الفت پر تقدم و تأخر کا حکم صادق آتا ہے۔

پہلے مجموعہ میں ان خطوط کی تعداد کافی ہے جنھیں الفت نے دوسروں کی طرف سے لکھا "عرضداشت از طرف غیاث الدین محمد خاں یکے از منشیان نواب سیف خاں فوجدار برنیہ بجانب نواب مستطاب نظام الملک ہنگامے کہ از دکن بہ شاہجہاں آباد تشریف آوردہ بودند، عرضداشت از طرف نواب مکرمت خاں بہ یکے از امرائے حضور، عرضداشت بجانب نواب احترام خاں دیوان خالصہ شریفہ از طرف مرزا شریف بیگ" سے ظاہر ہے کہ غریب نے کس کس کا اور کیا کیا کام انجام دیا لیکن انشار الفت میں بھی جس کی ضخامت زیادہ ہے (۹۲ اوراق) ایسے خطوط ("از طرف مکرمت خاں سود شد" "از زبان کرم فرمائے مخلصاں میر محمد مراد" "از زبان غیاث الدین محمد خاں" "مولوی محمد حسین لالہ جسونت رائے (۱) حسب الایمائے شیخ عبدالسبحان منشی نواب والا جناب ہیبت جنگ بہادر کی کمی نہیں انشار الفت تین قسموں پر منقسم ہے "بخشش مشتمل بر عرائض و مکاتیب مرسول بخدمت ایرایان سمو المکان قسم دوم ملاطفات شوق آیات بہ مخلصان یکدل و یکجان۔ قسم سوم بہ متفرقات مثل توصیف ہولی و دیوالی (دبسنت دسلونو) مبارک باد شادی عید رمضان وغیرہ۔ انشار الفت میں نہ کوئی ترتیب ہے نہ دیباچہ مجموعہ اول تاریخی اعتبار سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس میں غریب الفت کی نوکریوں کی کوشش کی طرف زیادہ اشارات پائے جاتے ہیں انشار الفت

میں بھی یہ چیز مفقود نہیں۔ لیکن "بیکاری، تنگ معاشی، گوشۂ عافیت" اور کنج خمول سے گرویدگی کا زیادہ ذکر ہے۔ مجموعۂ دوم میں آخری تاریخ ۱۱۶۷ھ ملتی ہے۔

انشاء عزیب میں ابتدائے عمر کے واقعات ہیں۔ اکثر مقامی مہموں میں شریک ہوئے۔ نواب علی وردی کے زمانہ نظامت بہار (۱۱۵۲ - ۱۱۴۶) کے اکثر چشم دید حالات دوستوں کے خط میں لکھے (اس کا ذکر آگے آئے گا) کبھی شریک لشکر ہونے سے انکار بھی کیا۔ ایک دفعہ "دیوان رگھونندن داس در شہر تشریف آوردند و بہ جہت رفتن لشکر ظفر پیکر تکلیف کردند بندہ عذر نقاہت بدن و کسالت بعضی اعضا از یں عزیمت باز آمد" ایک خط میں کسی "خداوند قدر دان فیض رساں" کو لکھتے ہیں "عامل سابق از وقوع بعضی تقصیر معزول شد و بندہ کہ بخدمت پیشکاری عامل معزول سرفرازی داشت از یں تغیر و تبدل پابند عطالت گشتہ از کثر عدم وصول وجہ ماہیانہ تصدیعات مالا یطاق میکشد...... توجہ در انجاح مطالب نیاز مند مبذول فرمایند و پروانہ تنخواہ مقرری بنام ناظم صوبہ عنایت نمایند" غیاث الدین محمد خاں کو لکھتے ہیں "از آنجا کہ فقیر جاگیر خان مسطور (فیض یاب خاں) را جاگیر خود میداند اگر بخاطر گرامی برسد از ابتدائے ۱۱۴۵ ف متعلق دو سندار...... سند بغرلیند کہ ہم بندوبست واقعی خواہد شد وہم بلا تکلف زر بصاحب جاگیر خواہد رسید۔"

مجموعۂ اول سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں نواب ہیبت جنگ کے کتبخانہ کے مہتمم بھی تھے اکبر نامہ اور جہانگیر نامہ کے نسخے "خان صاحب کو بھیجتے ہیں۔ انشاء الفتح میں ایک خط رائے اودیچند کے نام ہے جس میں ان کے سرکار سراج الدولہ کے دیوان مقرر ہونے پر مبارکباد عرض کی ہے۔ فرماتے ہیں "حقیقت احوال خود بموجب ارشاد صاحب بخدمت نواب صولت جنگ (عم سراج الدولہ) بہادر عرض کردہ بودم توجہے نیافت کہ خود را باعتصام رکاب ایشاں مستعد گرداند عبث تا ایں مدت تضیع اوقات نمود وفریب بوقلمونی روزگار خورد واراوہ داشت کہ بسعادت اندوزی رفاقت گرامی شرفیاب گردد لیکن بے سروسامانی عذر خواہ ایں مدعا بست بہر حال از آنجا کہ ان مشفق فیض رسان برادران را مربی قدردان خود تصور میکند و دلداد و گرم جوشی و حسن اخلاق سامی است چشم آں دارد کہ بعد رسیدن مرشد آباد صورت نوکری مناسب دیدہ

طلب خواہند فرمود کہ بہ ہر طور خود را بگرامی خدمت خواہد رسانید"۔

الفت نے نواب صولت جنگ کے پاس ایک زبردست قصیدہ تہنیت عید میں اور ۳۶ اشعار پر مشتمل بھیجا تھا لیکن کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوا۔ صولت جنگ فوجدار پرنیہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے الفت تلاش روزگار میں بنگالہ گئے مگر وہاں کی ہوا انھیں راس نہ آئی۔ دلدار خاں انھیں بنگالہ آنے کی پھر دعوت دیتے ہیں۔ جواب میں بنگال و ڈھاکہ کی ہجو کہہ ڈالی۔ چند فقرات ملاحظہ ہوں" مخلص نواز شہرے کہ آب ہوایش در ناگواری و ناسازی زبان زد خاص و عام باشد ویرانہ بیش نیست' دیوانہ کسے کہ ہوائے رفتن آنجا بہ سر بپیچد۔ و ملکے کہ کوچہ اش را آب بگیرد و رہرو تا کمر در گل فرو نشیند خرابہ زیادہ نے۔ گم کردہ خرد کہ روئے یک جرعہ آبے آں طرف کشد۔ آدم خوکران تماشائے حسن گندم گوں با زنانِ سیہ فام آنجا چہ تمنا۔ دلبران دراز موئے آنجا کہ اگرچہ در گرفتاری دل سر مو تقصیرے نمی کنند گرد سرکاکل کمندان بہاری اند"۔ اسی طرح وہاں کے بازار بیماریوں اور بلاہائے بنگالہ کی مذمت کی ہے۔ پانچ اشعار پر حسب معمول خط کو تمام کیا ہے۔ آخری شعر نہایت رکیک ہے ؎

بغیر گندگی ڈھاکہ اش نصیبے نیست   فتاد ہر کہ بہ بیت الخلاء بنگالہ

راجہ کیرت چند نے جن کے نام کئی خطوط ہیں اور جن کی کشتی چلانے کی تعریف میں اس وقت، جب وہ دیوان نواب عالی جناب شجاع الملک حسام الدولہ بہادر مہابت جنگ (دملی دریٰ مدظلہٗ تھے، نظم و نثر کے دریا بہائے ہیں۔ شاید انہیں بنگال آنے کی دعوت دی۔ آب و ہوائے بنگالہ کی خرابی کا ذکر کرکے منجملہ اور اشعار ایک شعر لکھتے ہیں ؎

"نہ شد کہ از سرِما فتنہ دست بردارد   بہ ہر دیار کہ رفتیم آسماں پیداست

"الفت کی خواہش تھی کہ بہار و پٹنہ میں انھیں کسب معاش کی کوئی مناسب صورت پیدا ہو جائے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ... " از مدت ممتد چوں نقش دیوار معطل بیکاری می ماند و ہر چند مساعی در تلاش روزگاری برد بجائے نمی رسد"... دوسرے میں فرماتے ہیں "ہرچند

بموجب ایں قول اَلعَبدُ یُدَبِّرُ وَاللہُ یُقَدِّرُ جہد جزیل در تحصیل وجہ معیشت بکاری برد، اصلاً وقطعاً اثر بروئے کار نمی آید وسعی لاینکم مطلق رہ بجائے نمی برد۔ درینصورت اگر آں قبلہ زماں نوازش فرمائے عالمیاں نظر بر توزیع احوال غربت نشاں بہ تفویض کار وخدمات معزز وممتاز فرمایند عین ذرہ پروری وفقیر نوازی ست ؎

سر ارادت ما خاک آستانۂ تست کجا رویم بفرما ازیں جناب کجا"

اپنے استاد میر محمد علیم تحقیق کو لکھتے ہیں "مدتے ست کہ در عطالت وبیکاری چوں سنبل حلقہ بند پیچ وتابم وازغایت تنگدلیہا غنچہ ساں در پردۂ دل سرگرم خوردن خوناب برنگ گل مجموعۂ اوراق ابتر پریشاں در بغل دارم ودریں فصل ناقدردانی ہا از داغہائے جگر در دل لالہ میکارم دریں اگر از گلستانِ توجہات القبلہ کرم فرما کہ فیض یک میوۂ آبدار ولطف یک ثمر لطیف نخلستان التفات اوست نسیمے بحالِ ایں غنچہ وا روز ویقین کہ بر سرکار عبد العلیخاں (خاں صاحب سیر المتاخرین) کہ تبازگی بخدمت بہار مقرر شدہ فائز گردیدہ از بہار کامیابی گل مراد چینید" اسی طرح شجاعت خاں دیوان مظفر علی راجہ کرکپوٹ (مونگیر) راجہ موزوں لال بلاس رائے رنگین وغیرہ کے نام متعدد خطوط میں اپنی عطالت وتنگ معاشی کا ذکر کیا ہے۔ رنگین کے ایک خط میں اپنی پریشانیوں کا حال لکھتے ہیں "دریں روز ہا سخت بہ تنگ آمدہ ام در دل یک طرف شدتِ خارش۔ خانہ آتش خراب۔ یکسو وفکر تقاضائے قرضخواہاں یک جانب۔ بے شغل وتنہائی طرفہ در قلق واضطراب مضمی خاطر محزون اندیشہائے دور از کار سرگرم مصاحبت دارد"۔ ایک خط میں ایک معمولی نوکری کی درخواست کرتے ہیں۔ "محاسبہ کاغذ ودیگر جواب وسوال بذمہ آنہا (شکار کارکن) باشد ایں جانب را بطریق مصاحان مقرر فرمانید مَہمَا اَمکَنَ درسیرِ انجام کار مقصر نخواہد بود"

حقیقت یہ ہے کہ لالہ اُجاگر چند ایک قابل منشی لیکن آزاد اور ایک رند مشرب شخص تھے۔ حساب کتاب سے بہت گھبراتے تھے۔ شباب کا عالم تھا۔ آمدنی وخرچ میں توازن کی ضرورت ان ایام میں بھنوں کو نہیں محسوس نہیں ہوتی۔ رنگین کو لکھتے ہیں "بفکر قرضداران خاطر

عبث مشوش ساختن بستم برضاجوئی کردگار و اُمید واری فضل پروردگار نمودن است اگر دانست بپرسند من ہم تجربہ کاری و کاوش ایں بلا صد ناخن بجگر شکستہ ام و غیر ازیں کہ در پردۂ دل مژگانے ترکنیم و چشم ازیں بپوشم فائدہ نمی بینم۔" زندہ دل اور یار باش تھے۔ رقص و سرود کے دلدادہ اور کھانے کھلانے میں پیش پیش۔ چوتھ چاندنی کی عیش افزا صحبت کی خبر دیتے ہیں۔" رنگین لباسانِ چمن زاد بنظارہ شاہدان بر فرش زمردین مرغزار خواہند نشست و سرو قدان پری تمثال و سہی سرو سامانِ یوسف مثال در باغ رامشگری آغاز خواہند کرد" مہربان محبان کو دعوت دیتے ہیں۔ "فردا بسوئے گلستان جنت نشان شیخ محمد جان میرویم۔ ایک محفل مینو فریب و مجلس بافزریب" میں لالا صاحب تشریف فرما ہیں۔" کنچنیاں نازک ادا سیمیں عذار و مطربان نغمہ سنج' مصروف 'رقاصی در مشگری' ہیں" تمامی لوازم عیش و نخواہ مہیا" ہیں۔" حریفان از تجرع بادہ گلگوں کہ گلگونہ کش مخدرہ انبساط است سرشار ہیں لیکن ان یار جانی و دوست روحانی 'گل گلشن سخندانی کلید الواب شادمانی ثمرۂ ریاض زندگانی' کی غیر موجودگی سارا مزہ کرکرا کئے دیتی ہے۔ لالہ بہاری لال کو لکھتے ہیں" امروز کہ ابر سایہ بر سر افگندہ است دل بے اختیاری خواہد۔ صرف دو شعر کافی ہیں ؎

وقت آں آمد کہ مینا نغمۂ قلقل زند　　چرخ ہمچوں نرگس معشوق جام گل زند
مطرب از سر کوک ساز نغمۂ در بوستاں　　موج گلہا جوش عشرت در دلِ بلبل زند

آخر میں لکھتے ہیں ؎

تا شمع رُخ تو مجلس آرا نہ شود　　ہنگامۂ ما گرم ز صہبا نہ شود
تا بوئے محبت تو بیروں نزود　　جوں غنچۂ تصویر دلم وا نہ شود

شراب کے بڑے دلدادہ تھے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں" بفضل الٰہی نغمہ سامان ضیافت مہیا است سوائے ساقی و ساغر و شیشہ لبالب از صہبا۔ اگرچہ درخواست چیزے دریں زمانہ باتکلف بیگانہ آبروئے اخلاص ریختن است لیکن طلب شراب از یارانِ جانی در کنش و مشرب محبت خالی از کیفیت ابرو نخواہد بود ؎

مریز آبِ رُخ خود مگر برائے شراب　　کہ درد و آتشہ بود سرے خوگدائے شراب

چند تنگ شیشہ کہ شب لبالب از بادہ فرنگ بود اگر از نشہ بہ دمادم سرکار باقی ماندہ باشد بفرستند وخود ہم جلد تشریف آرند" مثالیں متعدد ملتی ہیں کہاں تک درج کی جائیں۔

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ کسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر غریب سے الفت ہو گئے۔ خوشگو وجہ نہیں بتاتے اور عاشق کا جملہ کہ" بعد ازاں بدام الفت گرفتار گردید" سند نہیں رکھتا۔ اشعار میں درد ہے فرنگ و فرنگی کا اکثر ذکر کرتے ہیں مگر کسی بات کا کچھ قطعی ثبوت نہیں ملتا۔ آخر میں کنج خمول' اور گوشۂ تنہائی کے خوگر ہو گئے تھے۔ شغل شعر وشاعری جاری تھا لیکن طبیعت افسردہ اور خاطر پژمردہ تھی۔ ممکن ہے عسرت و تنگدستی اسکی ذمہ دار ہو۔ خوشگو اور ان کے تتبع میں دوسرے تذکرہ نگار لکھتے ہیں" خیلے ہموار وخلیق و بدلہا نزدیک' و در آشنائیہا پابرجا و بے تکلف بنظر آمد"۔ الفت بالطبع ایک لاابالی مرنج مرنجاں قسم کے آدمی تھے۔ بیشتر حصہ عمر کا رنگ رلیوں میں گذارا لیکن ذمہ داری اور فرائض کے احساس سے خالی نہ تھے۔ بھائی کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوستوں کو بھی اکثر زوردار الفاظ میں نصیحتیں کی ہیں' نوجوانوں کو تحصیل کسب کمال کی ترغیب دی ہے' بے راہ روی کی سختی سے خبر لی ہے ایک صاحب کو لکھتے ہیں "غزلے خواندن محض تحصیل حاصل است ... اے بے خبراں فرصتے کہ سواد و بیاض لیالی و ایام باہمار ہوشیار ورق میگرداند"۔ لالہ امر چند کو ان کے اطوار ناپسند پر الفت کا خامہ مواعظ طراز لکھتا ہے:

"از درشت خوئی وتخن گوئی انسان کہ بہ آشنا و بیگانہ را دلخوں نمودہ بجدا کہ سخت بجاں آمدہ ام۔ باوصف عقل وتمیز ایں چہ نادانی وطفل مزاجیست کہ ہر دم از شما سر میزند و خاطرہا می رنجاند و دلہا می شکند... ایں ہمہ ہرزہ لپسندی از نوجوانی ہاست وہنوز بوئے شیر از دہاں شما نرفتہ است وقت نصائح باد الد ماجد ناخوش شدن در گبے بنگالہ می روم و گاہے شاہجہاں آباد می ہیم بر زبان اور دن راجہ میگویدے

نامے از خویش در جہاں بگذار زندگانی برائے مردن نیست

حالا ہم ہیچ نہ رفتہ است و غیر از مردم خانہ بریں ماجرا کسے آگاہ نہ گشتہ ... نصیحت ما بشنوند و از کجروی باز گردند" الفت کا حسن خلق اور رقت قلب ان مکاتیب سے ظاہر ہے جن میں دوسروں کی پریشانیوں پر تاسف و ملال کرتے ہیں۔ نوکری کی بحالی میں جدوجہد اور سفارش

دریغ نہیں کرتے۔ غرض کہ الفت کے مکاتیب سے ان کے واقعات زندگی اور سیرت کے متعلق بہت سی باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں لیکن تنگ دامانی مانع تطویل اور مقتضی اختصار ہے اور ابھی تاریخی مواد اور ادبی خصوصیات پر نظر کرنا باقی ہے۔

منشآت غریب و الفت کی تاریخی اہمیت ایک علیحدہ مقالہ کی محتاج ہے۔ چند اشارات پر یہاں اکتفا کی جاتی ہے۔ انشاء الفت میں مندرجہ ذیل مکتوب الیہم کے نام ملتے ہیں، ان میں اکثر مشہور تاریخی ہستیاں ہیں راجہ رام نرائن موزوں (۲ خطوط) ملاسی رائے رنگین (۲۷) رائے دھیرج نرائن برادر خورد موزوں رائے لوازی رام، امن رائے بھروت دیوان مہابت جنگ، شجاعت خاں دیوان راجہ مظفر علی کرتپور، تلوک چند دیوان راجہ موزوں (۸ خطوط) راجہ کیرت چند امن رائے رایان عالی چند (۳) رامے اودے چند دیوان سرکار خاصہ سراج الدولہ، مانکچند دیوان راجہ بردوان (۴) عجائب سنگھ (۴) منوہر لال (۷) لالہ بہاری لال (۵) مہر چند (۲) خوشگو (۳) لالہ مولراج عشرت (۳) مولانا محمد علی (۲) لالہ موہن چند (۳) لالہ گوکھی لال (۲) میر محمد حسین ابن تحقیق (۳) خواجہ عاقبت محمود ناظم۔ بالمکند مشہور ابن عم راجہ کیرت چند۔ شیخ المتاخرین شیخ علی حزیں میاں چاند "نانسین زماں" گنگا رام مصور، بالبواسارام، لالہ سنگی لال، لالہ رنگ لال، میر ثناء اللہ (۲) میر اشرف، میر عبداللہ ابن میر غلام علی صفوی، لالہ بہادر سنگھ، لالہ خلونت رائے منشی خوب چند ذکا، ولی خاں، دیوان جنبیتا من داس منشی، بنگالی لال، جرأت خلف میر وحید، لالہ جیون رام، لالہ جواہر مل جواہر رقم۔ مکرمت خاں کی طرف سے ۴ خطوط، اُلفت نے لکھے شاید وہ ان کے منشی تھے۔ اس کے علاوہ متعدد اشنائے یکرنگ کو مکاتیب لکھے گئے۔

انشاء الفت کے خطوط میں کئی قابل قدر تاریخی معلومات بہم پہنچاتے ہیں، مثلاً حزیں کا بار دوم پٹنہ آنا، جائے قیام، قطعہ تاریخ تشریف آوری، (مقدم فیض افزا) اصلاح سخن موزوں، ان کے بھائی اور الفت سے حزیں کے تعلقات، خوشگو اور عشرت کا پٹنہ میں ورود حاکی صاحب سیر المتاخرین کا بہار میں تقرر، راجہ رام نرائن کی پٹنہ سے باہر امور حکومت

کی سرانجام دہی۔ تسخیر قلاع اور قید مفسدان تاریخ خطاب راجگی از خوشگو الفت کا قطعہ تاریخ وصال میر محمد علیم (تحقیق شدہ واصل حق)، تاریخ خلعت صوبہ داری موزون (خلعت زیبا آمد ۱۱۶۵)، تاریخ بنائے باغ میر افضل (عشرت افزا بنگلہ۔ ۱۱۶۶) تاریخ ولادت برادرزادہ موزوں (از تازہ گل گلشن آرام دمیدہ ۱۱۷۶)

پٹنہ میں دزدی کا زور، باشندگان و بازاران شہر کی سراسیمگی، کوتوال و حکیم کا عدم حزم و احتیاط، راجہ سندر سنگھ ٹکاری اور رامان کنشت (مرزاپور) کا تعذر و تمہل در ادائے یومیہ مقررہ خوشگو اور بہار رہنگامہ برگیاں نکہت آثار از قصبہ بہار مع قبائل و عشائر در شہر بہ سایہ دولت عالی رسیدہ الخ"۔ رنگین کو الفت مرہٹوں کے تیسرے پیشوا بالاجی باجی راؤ کی لشکر کشی لوگوں کے ہراس اور اپنی حالت کے متعلق لکھتے ہیں۔ "آنچہ از ارادہ بالاجی سرگردہ برگیاں اخراجی (۴) با فوج کثیر و جم غفیر بطرف پٹنہ و بنگال مصلحت دید از یں شہر بدر زدن ایں بے برگ گم کردہ اسباب سوختہ کالا رقم زدہ کلک رافت طراز شدہ بود ہر گاہ اثاث البیتے کہ داشتم بیشتر نذر آتش کردم و بتازگی چند پارچہ پوشاکے ہیمہ سوختہ باقی ماندہ را پیشکش آب نمودم۔ غمے از لشکر کشی ہا ندارم و چو متمولاں مایہ دار سر بر حاجی پور (ضلع ترہت) نمی کشم و بے مائگی خود را حصن حصین خود میدانم ع

کے خطر از آفت دنیا بود بے مایہ را

لالہ سوبہا چند کے خط میں لکھتے ہیں "از ہنگامہ برگیان بے برگ نکہت آثار کہ بنواحی صوبہ بہار رو دادہ چہ برطراز دکہ قصبۂ بہار و غیاث پور و منیر و قسم ام و دیگر قریات و قصبات اینجا بغارت و نہیب ایں مخذولان ذمیم العاقبۃ در فاہت۔ دشمنان سراسر آفت درآمدہ دیگ دانہ محصول در زراعتے جز خوشہ پروین نماندہ و کشتے جز مزرعہ سپہر فلک از پائمالی سلامت نہ شدہ و عالمے علف تیغ سفاک واکثرے قتیل و جریح و ہلاک گشتند۔ خبر است کہ دران ضلع ہم شورش نہادان بے باک رخت انتشار کشند۔ صاحب بطور سابق از دست و برد آنہا غافل نباشند۔" ہم عصر مورخوں نے ۱۷۴۲ء اور ۱۷۴۳ء میں بالاجی اور رگھوجی بھونسلہ کے حملات کا تذکرہ کیا ہے لیکن کسی نے نواب علی وردی کے عہد حکومت میں مرہٹوں کی مشرقی صوبجات ہند پر تاخت و تاز کی طرف

اشارہ بھی نہیں کیا۔ مرہٹہ مؤرخین بھی ساکت ہیں۔ انشاء غریب میں منجملہ اور تاریخی انکشافات کے باجی رائے نقاوت پیرائے سرگروہ دکھنیاں بدسگال اور نواب سعادت خاں برہان الملک" کی جھڑپوں" برگیاں بدکردار" کے ما ممصت بے شمار شہر مرزاپور میں وارد ہوئے" جوگراج راجہ مندمانسی" کے اسیر و دستگیر کیے جانے مرہٹوں کے مستعد و آمادہ شدن این صوب (گیارہ) شہر عظیم آباد میں غلغلہ قیامت نشان" ناظم بہار کی بنا بر حزم و احتیاط نگاہداشت سپاہ مرمت دیوار شہر جتنامن داس دیوان سرکار شاہ آباد کی مستعدی" کے اہم واقعات مندرج ہیں۔ علی وردی خاں کے زمانہ حکومت بہار میں سرکشوں کی سرکوبی مہم نگاری مہم میر موم کے واقعات کی تفصیلات کہیں اس قدر نظر نہیں آتیں جس طرح انشاء غریب میں۔

آئیے اب ہم الفت کے ادبی ماحول اور خصوصیات نثر و نظم پر غور کریں۔

الفت کا زمانہ فارسی اشاعت کا کئی اعتبار سے بے حد زریں قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندو اور مسلمان مصنفین شعرا اور انشاء پرداز بکثرت نظر آتے ہیں۔ تاریخ تذکرہ فن انشاء اور شاعری کا یہ خاص دور تھا۔ عظیم آباد میں اکثر باکمال اشخاص موجود تھے۔ الفت خاص طور پر چار یا پانچ افاضل کا بڑے احترام سے نام لیتے ہیں۔ ایک تو تحقیق ان کے استاد تھے، دوسرے قبلہ نکتہ سنجان مرجع متبحران زماں جامع کمالات صوری و معنوی مرزا الف بیگ" جن سے ایک شعر کے فک اضافت کے مسئلہ پر الفت اپنا اطمینان چاہتے ہیں۔ تیسرے "سرد بوستان ... مہر سپہر سخندانی ... ناظم شہر سخن، منظہر محامد و مکارم مرجع اعالی و اعاظم استادی خواجہ عاقبت محمود ناظم"۔ چوتھے "شناسائے رموز خفی و جلی مولوی محمد علی" پانچویں میر وحید راجہ موزوں اور راجہ کیرت چند کی فارسی دانی کے صاحب سیر المتاخرین بھی قائل ہیں اور الفت بھی اُن کی بزرگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ رنگین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں" برادر من خود داد انصاف دہند جائے کہ آفتاب اوج سخندانی پیر محمد علیم صاحب تحقیق و ماہ منیر آسمان معانی ... مرزا الفت بیگ صاحب و دُر برج نکتہ سنجی خواجہ عاقبت محمود ناظم مدظلہم العالی و دیگر اعیان نکتہ یاب مثل نواب بہادر

(ہیبت جنگ) و میر وحید صاحب پسند نمودہ باشند دخل دلخراش این تعصب دوستاں لطف دشمن لک ویک محض بیجا وخطاست بخدا کہ من طبع منغضے دارم اگر طفل خوانے حرف مناسب ومعقول گوید واللہ قبول دارم۔" بحث یہ تھی کہ تشبیہہ با دمار وبیہ خوب نیست" جو خود ہی ایک ماہر فارسی داں اور دقیقہ سنج شاعر تھے۔ اُن کی قابلیت مسلم اور معلومات وسیع تھیں مثلاً خطاطی کے متعلق "سرامد خوش نویسان روزگار مجمع مخترعات بے نظیر" آقا میر کے جواب میں لکھتے ہیں آخری الفاظ یہ ہیں "بتاریخ سیصد دہ ہلالی از خطِ معقلی وکوفی وغیر آن شش خطِ ثلث توقیع ومحقق ونسخ دریحان ورقاع نام اختراع نمودہ و بعضے از دوستان طراز ان سلف خط نسخ را مخترع یاقوت مستعصمی می شمارند" عربی سے الفت بے بہرہ نہ تھے ایک خط عربی اشعار سے جس کا پہلا شعر یہ ہے :

الا یا نسیم الصبح بلغ تحیتی   إلی من فداہ فوادی ومھجتی

شروع کرتے ہیں۔ اسلامی روایات اور قرآن وحدیث اور مسائل تصوف کا اظہار جگہ جگہ ان کی تحریر سے ہوتا ہے۔ انشار غریبہ کے دیباچہ کی عبارت قابل ذکر ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد لکھتے ہیں :۔

اے پُرگہر زنام تو درج مقالہا   سرشار نطق از مئے حمد زلالہا
چوں غنچہ سر بہ جیب تحیر کشیدہ اند   در گلشن ثنائے تو رنگیں خیالہا

زینت دیباچۂ سخن نگارش محامد جہاں ارائے است کہ شدیز صبا رفتار قلم بدائع نگار دفارسان مضمار معانی وکمیت برق رفتار کلک غرائب آثار شہسواران عرصہ سخندانی در بیدائے ناپیدائے حمد طرازی و فضائے لامنتہائے مدح پروازش دست وپا شکستہ وحمامہ نگاریں بال زبان سحر ترجمان نازنگران طلسم عنصوری وعنقائے بلند پرواز لسانِ اعجاز بیانی نکتہ طرازان عربی دوری براوج ثنائے لا انتہائش تشہیر پرواز لبستہ ؎

نہ ادراک درکنہ ذالتش رسد   نہ فکرت بغور صفاتش رسد
نہ بر اوج ذاتش پرد مرغ وہم   نہ در ذیل وصفش رسد دست فہم

پھر نعت کی باری آتی ہے "زینت محفل نطق نعت مرسلے ست کہ لی مع اللہ نکتہ ایست از صحیفہ جلیلہ جلالش وھو معکم حرفیست از طومار سلسلہ کمالش رباعی۔

جہاں را راہ حق بنمودہ اوست مکاں را لامکاں بنمودہ اوست

سروش از غاشیہ داران اندر رداق بے ستوں ایوان اندر

ادپس از محمدت ممدوح و مدحت محبوب حق "مدح دادر دوراں ... محمد شاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ وظلالہ" کی نوبت آتی ہے۔ حدیث لی مع اللہ وقتٌ لا یسع فیہ نبیٌ مُرسَلٌ ولا ملکٌ مقربٌ اور آیت قرآنی ھو معکم واین ما کنتم کو کس خوبی سے نباہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی کے جملے اور عربی فقرات کا برمحل تصرف الفت کی تحریر کے خصوصیات میں داخل ہے۔ ایک فقرہ ہے "ریاں و خورم و خنداں وارند" کیا اس سے قرآنی آیت وجوہٌ یومئذٍ ناظرۃٌ الی ربہا ناظرۃٌ" سے واقفیت ثابت نہیں ہوتی؟ یہ سب مثالیں انشاء غریبہ سے پیش کی گئیں جو مشق اولیں کا نتیجہ ہے غرابت ترکیب اور توالی اضافات جو سجع کی پابندی میں استعمال کیے جائیں، مستحسن نہیں قرار دیے جاتے۔ انشار الفت کی زبان بھی تکلف سے خالی نہیں۔ ابوالفضل و ظہوری اور واعظ کاشفی کے اثرات زائل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن انشار الفت کے خطوط کی عبارت اتنی مشکل نہیں۔ الفت کو زبان پر کافی قدرت تھی۔ کلام ناصاف اور ناشستہ نہیں۔ کافی روانی اور معنویت پائی جاتی ہے۔ استعارات و تشبیہات کی تکرار ہم قافیہ اور مشترک الفاظ کی رعایت مغلق تراکیب کا استعمال جس قدر بھی الفت کی بعد کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، ہمیں گراں گزرے گا۔ ہمیں الفت کے ماحول اور ان کے ہم عصر حضرات کے ذوق کو نظر انداز کرنا نہیں چاہئے۔ ایک خصوصیت الفت کی یہ ہے کہ ہر تحریر میں نثر کے ساتھ شاذ و نادر پہلے عموماً آخر میں اشعار بکثرت لاتے ہیں اور یہ اشعار بالکل برمحل اور زیادہ تر ان کے تراوشِ فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انشائے غریبہ سے کچھ اقتباس پیش کیا گیا۔ انشار الفت سے صرف ایک خط کی مکمل عبارت جو جناب تفضل مآب قبلۂ ارباب کمال و کعبہ اصحاب افضال مرجع ارطو فرقان متجرین مظہر تجلیات معانی مبنین

حضرت شیخ صاحب شیخ محمد علی حزیں مدظلال افضالہٗ ارسال یافتہ یہاں درج کی جاتی ہے۔ نثر و نظم دونوں موجود ہے :

سر بسجود عقیدت مستمند اوجاگر چند الفت بعد اقتباس انوار افاضت و افتخار از جبہہ افروزی سجدات آستان فخامت مدار عز عرض بندگان سترہ سینۂ فلک اقتدار میرساند کہ گلدستہ مباہات نامۂ گرامی پروانہ ملازمان عظام بہ شرف ورود مسعود سر لفقدان سائی علام معبودیت التیام گردید و برنگ فصل بہار نزول افتخار فرمودہ چمن نوازش را نضارت جاوید بخشید آداب و تسلیمات ایں عنایت عظمیٰ بجا می آرد و امید وار فضل و کرم عمیم است کہ مردمک دیدہ غلاماں خاکسار ہموارہ روشنی اندوز سرمہ سواد سطور فیض نمود را ذریعہ التفات عظامی بودہ شرف را بینائی آزمودہ مفاخرت شرف را ضیا اندوز باشد۔ غزل ناقصے کہ دریں ولا از خاطر فاتر سر بر زدہ احرام جناب افاضت مآب می بندد و بہ شرف اصلاح مشرف گردیدن تمنا دارد ؎

من از درد جدائی خاطر اندوہگیں دارم کہ دشمن در بغل ہمچوں دل خود دلنشیں دارم

تسلسل تا ابد تا در تکلم را نشود لازم نظر از بسکہ بہ زنجیر زلف عنبریں دارم

بجائے نالہ ام در سینہ و سر ناری امید زبس در دل خیال قامت آن نازنیں دارم

بخاک افتادہ خون من ز عالم بر نمی خیزد بسان نقش پا در کوئی او سر بر زمیں دارم

دلم از تنگیہا نقد ہمت در گرہ دارد نہ ہمچوں کاکل او عقدہ در خاطر حزیں دارم

بہ ہفت اقلیم گردد نام کفر عشق او روشن کہ اسم آں صنم نام خدا نقش نگیں دارم

مدام آوردنش صیاد من آسان نمی باشد دل دیوانہ آں چشم وحشت آفریں دارم

مبادا سیل اشک دیدۂ از سر نگیرد یارب ز راہ کوچۂ آں شوخ گردے بر جبیں دارم

بفوج غمزہ غارتگر شکار گشتہ مہمانم چہ سازم نذر او یارب نہ دل دارم نہ دیں دارم

ز شور گریۂ ہجراں خسارش چہ می پرسی صد آتش پارہ لخت جگر در آستیں دارم

تراود نکتہ ہائے آبدار از خامہ ام الفت کہ ہر ساعت نظر بر فیض اوستاد حزیں دارم"

نظم راقم السطور کے نزدیک نثر سے بہتر ہے۔ مگر اس خط کی نثر کو الفت کی نثری تحریر کا نمونہ سمجھنا غلط ہوگا۔ کاش الفت حزیں کے خطوط کی عبارت پر غور کرتے اور اسے اپنے لیے شمع ہدایت قرار دیتے۔ لیکن کہاں حزیں اور کہاں الفت۔ انشاء الفت اور انشاء غریب میں منتخب غزلیں جس میں اکثر دیوان کے دستیاب شدہ اجزا میں موجود ہیں لیکن مثنویاں، قصائد رباعیاں اس میں نہیں ملتیں گو دیوان کافی ضخیم ہے، اب شاعری کے متعلق چند باتیں عرض کی جاتی ہیں :-

دیوان فارسی کا نسخہ نہایت ناقص ہے، مشکل سے کوئی مکمل غزل نظر آتی ہے۔ پہلی دو غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

(۱) نماند نام حق روشن دل معنی خیالاں را
گل نور خدا باشد سخن صاحب کمالاں را

(۲) زباں فوارہ باغ معانی گردد از فیضش
دہاں سرچشمۂ کوثر شود عرفاں (شیریں) مقالاں را

(۳) خیالش در دل صافی سرشتاں جلوہ گر باشد
بایں آئینہ روئے دل بود صاحب جمالاں را

(۴) دل عشاق او در پردہ یارب یارے دارد
بود سر در گریباں غنچہ ساں خاموش نالاں را

(۵) کمن از شکوۂ زخم زباں دلریش مستاں را
زماں کے می نبود در اختیار خویش مستاں را

(۶) چو از حد بگذرد صہباکشی مے می گزد جاں را
زند موج مے گل رنگ بر دل نیش مستاں را

ؔ شعر بساں نقش ہائے رہرواں کوئے تمنا میں ؛ نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

پہلے شعر میں معنی خیالی کی طرف اشارہ ہے جو حزیں کے کلام کا نمایاں عنصر ہے۔ دیوان کا مطلع بتا رہا ہے کہ شاید حزیں کے تتبع میں معنی خیال کو الفت تو حسن کلام کا اساس قرار دیتے ہیں اور یہی ان کا مسلک سخن ہے اس مطلع سے اس معنی خیالی کا اہم موضوع بھی معلوم ہوتا ہے یعنی "معارف الٰہیہ" مگر دیوان کا تصفح بتاتا ہے کہ یہ معنی خیالی کبھی کبھی بلکہ اکثر معاملات عشق مجازی پر بھی صرف ہوئی ہے۔ کہیں کہیں اس معنی خیالی کے زور نے معاملہ بندی کو واقعیت کی حدود سے نکال کر تصوریت کی اقلیم میں جا پہنچایا ہے مگر جہاں یا یہی معنی خیالی معاملات حسن وعشق اور تجربات زندگی کے تجزیہ تک محدود رہی ہے' وہاں زندگی کی عکاسی و نقاشی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ حسن مطلع یعنی مطلع کے بعد کا شعر معنی خیالی کی مزید تصریح کر رہا ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے رجحانات صوفیانہ اور عارفانہ ہیں۔ پانچواں شعر بمقابلہ پہلی غزل کے اشعار کے لطف زبان رکھتا ہے خصوصاً دوسرا مصرعہ۔ یہ وہ کیفیت ہے جو حزیں کے کلام میں باستقلال ملتی ہے۔ آخری شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ شراب بہت پیتے تھے اور پھر زیادہ پی کر پچھتاتے تھے۔ اس شعر میں DIMINISHING REHARNS کی کیفیت کا احساس ہے۔ یہی حال اس کے بعد کے شعر کا بھی ہے یعنی ؎

تا آں فرط مے نوشی خجالت باشد اے الفت
کند می خوردن بسیار سردر پیش مستاں را

پہلی پوری غزل مجموعی حیثیت سے بجائے حزیں کے بیدل کے رنگ میں ہے۔ طرز بیدل کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ محاورہ شکنی پر زور، معنی خیالی، عجیب وغریب ترکیبیں اور تہ در تہ خیال بندی، اس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اب رہا طرز حزیں تو ان کے یہاں حسن فکر کے ساتھ لطف زبان یا معنی آفرینی کے ساتھ چاشنی زبان اور ندرت بیان بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ فکر حزیں کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ صبر، ایثار، قربانی، مصیبت، وفا، شہادت، بکا، فقر، کے مضامین حزیں کے تخیل کے امتیازی عنصر ہیں۔ اب الفت کے مندرجہ بالا اشعار پر غور کیجئے، معنی خیالی کے سیل تند نے محاورہ زبان کے بند توڑ دیئے ہیں۔ عجیب و

غریب قسم کی ترکیبیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ حزیں کے کلام میں سرکشی نہیں ہے، ندرت بیان ہے۔ جدت ترکیب ہے مگر محاورہ شکنی کہیں نہیں۔ وہ لطف زبان کو باوجود معنی خیالی کے کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کا توسن خیال بہت تیز دوڑتا ہے مگر گرد کبھی نہیں اڑاتا۔ لیکن الفت کم از کم اس غزل میں حزیں کے گرد یا فرماں بردار شاگرد نظر نہیں آتے۔ یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ حزیں سے پہلے ان پر بیدل کا اثر بھی پڑا اور یہ حقیقت غور طلب ہے کہ ان کے کلام میں عجیب و غریب قسم کی محاورہ شکنی یا کم از کم غیر مانوس ترکیبیں بیدل کے تتبع میں نہیں بلکہ حزیں کی جدت ترکیب کی ناکام تقلید سے پیدا ہوئی ہیں۔ یعنی وہ جدت ترکیب تو نہ پیدا کر سکے، غرابت پیدا ہو گئی۔ کیمیاگری کی کوشش میں سونا تو نہ بنا البتہ ملمع تیار ہو گیا۔

الفت سے حزیں کے تعلقات کی ابتدا ۱۱۶۱ھ کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ حزیں اسی سال بنارس پہونچے اور عظیم آباد میں شاید دوسرے سال وارد ہوئے۔ الفت نے مشرق سے مغرب کی جانب اپنے سفر کا ذکر نہیں کیا، ہو سکتا ہے شہرہ سنا ہو۔ دیوان الفت میں دو تین جگہ حزیں کا نام لائے ہیں۔ غزلوں پر غزلیں کہیں کہیں صائب کی غزل پر بھی غزل کہی۔ دو تین جگہ مقطع میں صائب کے مصرعے بھی استعمال کئے ہیں۔ تمثیل صائب کا رنگ الفت کے اس شعر سے[۵]

سیر روشن دل بطرز دیگر است ‏ ‏ ‏ ‏ کے صدا خیزد ز پائے آفتاب

ہویدا ہے۔ پھر یہ مقطع ملاحظہ ہو:-

الفت دلم ز مصرع صائب بہ حیرت است ‏ ‏ ‏ ‏ آئینہ از رخش گل خورشید چیدہ است

پھر یہ اشعار لیجئے:

تو دلا غرا ز تو دوستی فربہ شود الفت ‏ ‏ ‏ ‏ برآید برگ ایں مور از زنبور میگردد

الفت رساند و مصرع صائب داغ! ‏ ‏ ‏ ‏ خود را بہ یک پیالہ جہان دگر کنند

کسی جگہ نظیری کے رنگ کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے مثلاً:-

سبیہ مستانہ خوابے برلب کوثر تواں کردن ‏ ‏ ‏ ‏ چو خال لعل آں معشوق گرد دتختہ گاہ ما

می بود از سوختن تسکیں دل بیتاب را ‏ ‏ ‏ ‏ می برد از نسیمے کشتہ سیماب را

اگر پہلے شعر میں رعایت لفظی ہے تو دوسرے میں تمثیل نہایت خوب غالب کا مصرعہ —
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا یاد آجاتا ہے۔ ایک شعر ؎

چو آمد در بغل نہفت آں رخسار زیبا را بر ویش داغ دل تا داکند چشم تماشا را

کے دوسرے مصرعے میں جو نہایت خوب ہے۔ عُرفی کا رنگ آشکار ہے لیکن بیدل کی شہرت خاص کر عظیم آباد میں جہاں یہ مدتوں رہے، ان کا کلام بڑا مقبول تھا۔ الفت کی نظر سے یقیناً گذرا ہوگا۔ طرزِ بیدل کی چند مثالیں دیوان الفت سے پیش کی جائیں تو شاید یہ مسئلہ حل ہو سکے۔ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

(۱) زدست آں صنم مارا رہائی کے بود الفت کمند گردن جاں میکشد آں زلف پرخم را
(۲) عرض بیتابی نمی سازد بطبع نازکش دل چرا الفت نظر بادا از شکست رنگ شد
(۳) عجب نبود بایں آتش عنایت ہا کہ می آید سمندر را آشیاں بند دبچیں دامن نازش
(۴) سبک روخانہ حسرت نامہ بیتابی خود را بر آواز شکست رنگ وروئے زرد می بندم
(۵) بہ خلوت گاہ دل تا کرد جولاں نازک اندامے زموج نالہا سد لیے براہ گرد می بندم
(۶) زخون دل برنگ طفل اشک خویشتن ہر شب حنا بر پائے موج آہ غم پرور دمی بندم
(۷) نگاہ گرم ساقی آب کرد از بس ایاغ من بکف ساغر نمی آید برنگ جام گردانم

ان اشعار سے یہ بات مخفی نہیں رہتی کہ ہمارا شاعر بیدل سے کافی متاثر تھا۔ اب ہم الفت کے چیدہ اشعار سے ان کی خصوصیات شاعری کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حسن تخیل کی مثالیں :۔

(۱) در شبستانی کہ افروزد چراغ روئے او شمع آنجا دام می گیرد بہ پر پروانہ را
(۲) مدہ از کف صبوحی در خمی گر بادہ شد آخر ز برگ تاک در ساغر تواں پر کرد شبنم را

(کیا خوب بلند اور دلکش شعر ہے۔ یہ شعر شاعر کی عظمت کے لیے کافی ہے گو پُر کردن کا محاورہ محل نظر ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے :۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

نامور شعرا کے توارد خیال کا پتہ دیتا ہے)

(۳) لب جو گرگشد ز چہرہ نقاب — گل خورشید می دمد واز آب

(۴) چشم تو فگند از نظام عزتم ایں است — از کعبہ بروں آمدہ ام حرمتم ایں است

(مصرعہ ثانی خوب ہے)

(۵) لب پیکان او از دل نہ شد نم — چو اخگر آتش ایں جا خون نا بست

(۶) ان ست ناز گرم بے ناکہ دیدہ است — از دل چو تاک طرفہ شرابے کشیدہ است

(۷) اختراع ست ایں نگہ در دیدنت — کس متاع خویش خود دزدیدہ است

(۸) خونِ جگر ز پردہ چشم زحد گذشت — کلفت بہ سینہ ماندہ شراب از نمد گذشت

(۹) شد فصل گل ز دست نکردہ ست چاک دل — بر گردن ارچہ بار گریباں نگاہ داشت

(۱۰) در موج خیز آہ خیالی ترا دلم — ہم چوں چراغ در تہہ داماں نگاہ داشت

(۱۱) رقت نمی کند دل حیراں بدرد من — آئینہ کے مجال کسے چشم نم کند

(۱۲) مبادا سیلِ اشک دیدہ از سر بگذرد دیار — زراہ کوچہ آں شوخ گردے بر جبیں دارم

(فسقہ)

(۱۳) بجذبۂ کہ تو داری سوئے گرفتاراں — قفس بدوش رود عندلیب ما بہ چمن

(۱۴) ز دست آہ من ناتواں چہ می آید — مگر صبا شود از روے یار پردہ فگن

مذاق تصوف

(۱) حضور و غیب یکساں جلوہ دارد در دل روشن — تفاوت نیست چوں خورشید ایں جا پیش و پس ما را

(۲) الفتِ ما زیاد کم نہ شود — کے زوال است عشق کامل را

(۳) بیتابی است راہبر آوارۂ مرا — شد رنگ جستہ بدرقہ نظارۂ مرا

(۴) گشتم سُبک بہ عشق تو دورِ نمی زنم — ترسم ہوا برد دلِ بے چارہ مرا

(۵) دل راز باید یا ز دل کے تواں شناخت — رنگ دوئی مریز کہ ایں شیشہ خود بریست

(۶) نقا بخواب نیز تماشا نکردہ است — روز پریدنی کہ دلم را بریست

(۷) دل شکستۂ تر مرا بہ چشم کم منگر — بعید نازِ تو دورز پریدنی دگر است

(۸) بہ چشم خوبش تماشائی رُخش گشتم — ہنوز ایں دل من در تلاشش جہد است

(۹) ما اسیر لباس خویشتنم — حلقۂ دام چاک دامن ماست

(۱۰) دراں زماں کہ برانداختی زچہرہ نقاب — حجاب بین من و تو ہمیں دمن بود

(۱۱) بموسمے کہ خزاں پردہ بہار درید — نگاہ من زرخ یار گل بدامن بود

(۱۲) آنرا کہ بود سرے بجنے — با لالہ و گل چہ کار دارد

(۱۳) گو کم بدہد بادہ دگر بیش بزعم — پیشش گلہ از اندک و شمار ندارد

(۱۴) فردوس چیست بر رخ آں گل نظر کند — خود را بہ یک نظارہ بہشت دگر کند

(رعایت لفظی)

(۱) بیا کہ از غم ہجر تو گشت دل بیتاب — بیا کہ مرا در گلو گرہ شراب

(۲) زبس گریستم از سرد مہری احباب — زمین خانہ ما شد برنگ آئینہ آب

(۳) دلم پریدہ بکویش بزور گرمی عشق — پری طلب بکند در ہوا شدن سیماب

(۴) ز سرد مہری دوراں زبسکہ دل تنگم — بخانہ اَم چو گہر میشود گرہ مہتاب

(۵) زدہ است نشتر نوک نگاہ گلبدنے — کہ گشت صفحۂ آئینہ آبشار گلاب

(۶) ز موج نالہ ما عطر گل چکید ہر دم — کدام گلبدن امشب گذر نمود بخواب

(۷) چہ غم ز سختی دوراں چو آب گردد دل — خطر ز سنگ بنا شد بہ ساغر گرداب

آخری شعر خوب ہے۔

(۸) گرم تاثیر است از بس نالۂ بلبل بباغ — عطر گل از گوش می ریزد فغان عندلیب

(ہندی اسلوب غلط محاورہ)

(۱) غنچۂ داغ دل پُر خون عاشق دانہ شد — تا زچین زلف مشکینش ہوائے برنخاست

(ہوا کا غلط صرف)

(۲) مارا کہ در بساط دلے بود بردہٗ باقی چہ مدعائی بود مطلب تو ہست
(آخری مصرعہ کا پہلا فقرہ)

(۳) سراپا سوختم چوں سرمہ گردیدم ہوا گشتم نشان دیگر از چشم نزار من چہ می خواہی
(یہاں بھی ہوا کا صَرف غلط ہے)

الفت کے متعلق چند باتیں عرض کی گئیں لیکن ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ مختصر مقالہ گنجائش نہیں رکھتا۔ آخر میں لالہ اُجاگر چند کی غزل ریختہ کو جس کا علم آج تک کسی کو نہیں، نذر قارئین کیا جاتا ہے۔ یہ غزل منتشر اوراق میں دو خطوط کے درمیان میں دستیاب ہوئی۔ ایک خط میں ۱۲۴۳ھ ہجری کا واقعہ مندرج ہے۔ ہمارا شاعر ایک ایسے صاحب کو بنظر اصلاح ارسال کرتا ہے اور زبان کو ریختہ کہتا ہے۔

خلوت نشین غم کون تماشا سیں کام کیا مخمور جام عشق کون صہبا سیں کام کیا
دیوانہ محبت بے اختیار کون تکلیف حال صحبت دانا سیں کام کیا
مستِ مۓ الست کو ہے نشۂ دگر جام شراب کہنہ سو مینا سیں کام کیا
آباد باد ملک قناعت و مردمی ویرانہ خرابۂ دنیا سیں کام کیا
جس کو ہے زور ہمت بازوئے مردمی ارث پدر و خانہ بابا سیں کام کیا
آزا کہ ہستِ قفل خموشی نبات لب چھوان و چرائے تو ... ...
صاحب سخن کوں صحبت جاہل سیں کیا ہوئے سالک شہ و گوہر یکتا سیں کام کیا
پردہ آفتاب محبت کون روز حشر باغ نعیم و سایۂ طوبیٰ سیں کام کیا
جس کو ہے داغ شیشہ و آتش تمام دل سیر گل و تفرج لالہ سیں کام کیا
جس کو تپ جُدائی سیکا مرض دل موں ہے ناز طبیب و تاب مداوا سیں کام کیا
لیا متاع دل کا کف اختیار سوں سودائے عشق ہے سر و سودا سیں کام کیا
ترک وجود درس محبت کا ابتدا نے مسلہ ی اِدا م نہ حجت ملا سیں کام کیا

جائے کہ بوریائے نشیناں قدم نہند (؟) | فرش سمور و بستر دیبا سیں کام کیا
حاکم سما و ارض کے ہیں شاہ ملک دل | ملک شہ سکندر و دارا سیں کام کیا
یارب غریب ملک معانی کوں رہنما | شکل مہیب وصورت زیبا سیں کام کیا

علاوہ قدامت کے، صفائی زبان پختگی بندش کے اعتبار سے غریب کی غزل لائق اعتبار ہے۔

سیں۔سوں۔کوں۔کی جگہ موجودہ مترادف الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ غریب بارھویں صدی کے اُردو شاعر بھی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ برجستگی اور سلاست نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ سرکا۔ لیتا اور مقطع میں رہنمائی ترکیب قدامت کا ثبوت ہم پہونچاتی ہے تصوف کا اثر نمایاں ہے۔ قناعت پسندی، مذاق اور گوشہ نشینی کی طرح رجحان کا پتہ ملتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ غزل نوادر میں شمار کی جا سکتی ہے۔

(۲)

اُجاگر چند الفت وغریب تخلص کے حالات اب تک پردۂ خفا میں مستور ہیں" ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" کے مصنف ڈاکٹر سید عبداللہ اور تاریخ شعرائے بہار کے مصنف مولوی عزیزالدین بلخی مرحوم اُن کے بارے میں تین چار سطروں سے زیادہ حوالۂ قلم نہیں کرسکے۔ انھیں شاید کیا یقیناً خبر نہ تھی کہ الفت کے باقیات الصالحات کا پٹنہ میں فقدان نہیں ہوا اور ان کی فارسی دانی ادبی خدمات اور معاشرتی ماحول کا جائزہ لینے کے مواقع موجود ہیں۔ مگر یہ کام کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے اور فی الحال ان کی ایک "غزل ریختہ" جو کسی شخص کو سب کے ساتھ بہ نظر اصلاح بھیجی گئی تھی پیش کی جاتی ہے۔ یہ خط ان کے ایک مجموعہ مکاتیب میں ہے جس کے کچھ منتشر اوراق ملے ہیں۔ یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ اس خط کا زمانۂ کتابت کیا ہے لیکن ایک خط جو اس کے قریب ہے فخرالدولہ ناظم بہار کے نام ہے اور اس کی تاریخ کتابت ۲۵ شعبان ۱۲ جلوس مطابق ۱۱۴۳ھ ہجری ہے۔

خلوت نشین غم کون تماشا سیں کام کیا	مخمور جام عشق کو صہبا سیں کام کیا
دیوانۂ محبت بے اختیار کون	تکلیف حال صحبت دانا سیں کام کیا
مست مئے الست کو ہے تشنۂ دگر	جام شراب کہنۂ (؟) مینا سیں کام کیا

آباد باد ملک قناعت و مردی   ویرانۂ خرابی دنیا سین کام کیا
جس کو ہے زور ہمت بازوے مردی   ارث پدر رو و خانہ بابا سین کام کیا
آنرا کہ ہست قفل خموشی بہ باب لب   چون و چرای تو و دگرہا سین کام کیا
صاحب سخن سوں صحبت جاہل کیا ہوئی   سلک شبیہ و گوہر لیتا سین کام کیا
پروردہ آفتاب محبت کون روز حشر   باغ نعیم و سایۂ طوبیٰ سین کام کیا
جس کو ہے داغ سینہ و آتش تمام دل   سیر گل و تفرح لالہ سین کام کیا
لیا متاع دل کا کف اختیار سوں   سودائے عشق ہے سر و سودا سین کام کیا
جس کو تپ جدائی ہے کا مرض دل میں ہے   ناز طبیب و تاب مداوا سین کام کیا
ترک وجود درس محبت کا ابتدا   لے حصلہ نہ محبت ملا سین کام کیا
جائے کہ بوریائے نشینان قدم نہند   فرش سمور و بستر دیبا سین کام کیا
حاکم ہوا وہ جن شاد ملک دل   ملک شہ سکندر و دارا سین کام کیا
یارب غریب ملک معانی کو رہ نما   شکل مہیب و صورت زیبا سین کام کیا

الفت دراصل فارسی گو تھے اور ان کا اردو کلام اس غزل کے علاوہ نہیں ملتا۔ اس لیے یہ بالکل تعجب کی جگہ نہیں اگر اس غزل میں فارسیت کا غلبہ ہے بعض مصرعوں میں کاتب کا تصرف معلوم ہوتا ہے اور کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں کہ مقابلے سے تصحیح کی جا سکے۔

"نسخۂ دلکشا، احوال عالمگیر بادشاہ"
اور اس کا مصنف

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں تاریخی کتابیں نسبتاً کم تعداد میں لکھی گئیں لیکن اس جلیل القدر فرمانروا کے پنجاہ سالہ دورِ حکومت کے لئے تاریخی مواد کی کمی نہیں۔ شاہی حکم سے صرف ایک کتاب عالمگیر نامہ منشی محمد کاظم نے لکھنی شروع کی مگر شہنشاہ کی ممانعت کے باعث شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی۔ اس میں محض پہلے دس سال کے حالات بالتفصیل مندرج ہیں۔ شہنشاہ کی وفات سے تین سال بعد محمد ساقی مستعد خاں نے مآثر عالمگیری تالیف کی اور اس میں دہ سالہ واقعات کا خلاصہ عالمگیر نامہ سے لے کر بقیہ چالیس کے احوال اپنی اور امرائے شاہی کی یادداشت اور دفاتر کے کاغذات سے مرتب کر کے نہایت اختصار مگر کافی وضاحت سے قلم بند کر دیئے۔ یہ دونوں کتابیں جن کے قدیم قلمی نسخے وقف لائبریری کھجوہ ضلع سارن کی ملک اور راقم الحروف کے پیش نظر ہیں افراط تفریط کے باوجود (اس لئے کہ دہ سالہ تاریخ پنجاہ سالہ کی ضخامت سے قریب دو گنی ہے) سال بسال اور ماہ بماہ وقائع سلطنت ——— حکام، انتظامی تغیرات، نیز اشخاص و مقامات کی توضیح کے لئے نہایت کارآمد، مستند اور ——— سمجھی گئی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے مؤلفین دربار سے منسلک اور شہنشاہ کے جاں نثار ——— عالمگیر نامہ پر تو خود عالمگیر نے نظر ثانی بھی فرمائی تھی۔ مآثر عالمگیری کا مصنف جو عنایت اللہ ——— شاہی کا منشی تھا اپنے آقا کے ایما پر

اس کتاب کی تالیف پر آمادہ ہوا اور کتاب ——— بیٹے اور جانشیں شاہ عالم بہادر کی نظر سے گذری۔ ظاہر ہے کہ جو باتیں ناگواری طبع ——— اور امور مملکت کے خلاف سمجھی گئی ہوں گی انہیں درباری مورخ اپنی کتاب میں جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ تاہم یہ کتابیں نہ صرف آنے والے مورخوں کے لئے ضروری ثابت ہوئیں بلکہ ہمعصر اور باخبر مورخین نے بھی اُن سے کافی استفادہ کیا۔ صاحب مراۃ العالم نے صفحے کے صفحے خاص خاص مباحث کے لئے عالمگیر نامہ کے نذر کر دیئے۔ اسی طرح ایک اور نامور مورخ محمد ہاشم خان نے منتخب اللباب کا ماخذ علاوہ ابوالفضل خاں معموری کی تاریخ اورنگ زیب کے عالمگیر نامہ کو قرار دیا۔ لفٹننٹ پرکنس نے سرہنری ایلیٹ کے لئے ماثر عالمگیری کے تہل سالہ واقعات کو انگریزی کا جامہ پہنایا اور عالمگیر نامہ کا اعلیٰ مکمل نسخہ اگیارہ سو صفحات کا یورپ میں چھاپا گیا اور اس کا دہ ———
کے متعلق ہے مسٹر وانسی ٹاٹ کے لئے اٹھارہویں صدی میں انگریزی لباس سے آراستہ کیا گیا۔ لہٰذا ان کتابوں کی تاریخی اہمیت ایک امر مسلمہ ہے۔ کاش مستعد خاں کو تعجیل مد نظر نہ ہوتی اور حوصلہ شکن اجمال سے کام نہ لینا پڑتا تو شاید جہاں تک درباری نقطۂ نظر کی توضیح و تشریح، صحیح سن وار واقعات کی ترتیب اور چشم دید حالات کے انکشاف کا تعلق ہے شاید ہی کسی دوسری کتاب کی ضرورت ہوتی۔

غیر جانبدار مسلم مورخین کی فہرست میں متعدد اشخاص شامل ہیں۔ مرزا عسکری الملقب بہ عاقل خاں رازی کی کتاب ظفر نامۂ عالمگیری یا اورنگ نامہ بیجاپور کے حملہ سے شروع اور میر جملہ فاتح آسام کی وفات پر ختم ہوتی ہے۔ گو عاقل خاں ایک عہدہ دار تھا مگر آزادی رائے کا اظہار اور نامطبوع واقعات کی طرف اشارات اس کی کتاب کو ایک خاص اہمیت دیتے ہیں۔ تاریخ جنگ برادران مصنفہ محمد صادق انبالوی صحیفہ عبرت یا تاریخ آسام مصنفہ شہاب الدین طالش اور دوسری تاریخیں اوائل سلطنت اور خاص مباحث پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ اس فہرست میں سب سے زیادہ قدر و قیمت خافی خاں کی منتخب اللباب کی سمجھی گئی ہے بقول صاحب ماثر الامرا اس نامور اور معاصر مورخ نے عہد عالمگیر کے

مکمل حالات راست راست بغیر کسی آمیزش کے لکھنے کی قسم کھائی تھی۔ خافی خاں کی تنقیدی نظر، حقیقت نگاری اور غیر جانبداری کے یورپ کے مورخین بھی معترف ہیں ایلیٹ اور ڈاوسن نے تو اپنی مشہور عالم کتاب کی ساتویں جلد کے ——— تین سو سے زیادہ صفحات منتخب اللباب کے لئے وقف کر دئے ہیں خافی خاں نے عالمگیر نامہ ——— اپنی کتاب میں دئے مگر کہیں کہیں سخت اختلاف بھی کیا ہے ماثر عالمگیری کے ——— مشاہدات و معلومات سے کافی اضافہ کیا۔ خود بعض اوقات صفارت کے فرائض ——— اور مغلوں سے دوسرے لوگوں کے تعلقات کا بنظر غائر اور قریب سے مطالعہ کیا۔ دکن کے ——— شہنشاہ عالمگیر کے سوانح کا کماحقہٗ تذکرہ، محاسن و اوصاف کے ساتھ سیاسی لغزشوں کے متعلق ——— الفاظ میں تعریضی جملے۔ دشمنوں کے حرکات و افعال کی جائز نکتہ چینی لیکن خوبیوں کا اعتراف، اسباب سلطنت پر بے لاگ تبصرہ، معاشرتی حالات پر رائے زنی، معتبر اشخاص سے جو شریک واقعات اور ناظر سانحات تھے ضروری امور اور اہم مسائل پر تبادلۂ خیال میں کاوش، جذبۂ اخذ و اکتساب، تحقیق و تلاش۔ یہ سب باتیں خافی خاں کی تاریخ کی خصوصیات کو ظاہر کرتی اور اس کی کتاب کو ایک بلند سطح پر پہونچا دیتی ہیں۔ کہیں کہیں ادبی ذوق کی تسکین کے لئے غیر مصدق باتیں بھی معرض تحریر میں آگئی ہیں۔ اکثر جگہ لہجہ غیر مناسب حد تک درشت و تلخ ہو گیا ہے جو ایک غیر جانبدار مورخ کے شایانِ شان نہیں اور جس کے باعث ایک خاص جماعت خافی خاں کے مہیا کئے ہوئے بہت سے مواد کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی اور مصنف کی عصبیت کو اُچھالنا بہت ضروری جانتی ہے۔ معمور خاں کی قابل قدر کتاب کے بلا حوالہ اقتباسات بھی منتخب اللباب کے نقائص میں داخل کئے جا سکتے ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود ماننا ہی پڑے گا کہ اس کتاب کا پایہ بلند ہے اور موجودہ معیار تاریخ کو بہت حد تک پورا کرتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ عہد عالمگیر کے لئے اقتباسات دربار معلی، رقعات عالمگیر، رقائم کرائم، آداب عالمگیری، انشاء مادھورام، منتین الانشا، دستور العمل وغیرہ میں

بہت مواد پائے جاتے ہیں انہیں کی امداد سے عصر حاضر کے سب سے بڑے ہندوستانی مورخ سر جادو ناتھ سرکار نے اپنے ہیرو کی مکمل تاریخ پانچ ضخیم جلدوں میں لکھ ڈالی پھر ان کا خلاصہ ایک جلد میں اکٹھا کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹی چھوٹی کتابیں اور مضامین لکھے۔ ہمیں موصوف کی رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جتنی کدوکاوش متعدد ماخذوں سے استفادہ کرنے میں سر جادو ناتھ نے کی دوسرے کو بہت کم یہ بات نصیب ہوئی ہے۔ اطالوی فرانسیسی اور دوسرے یورپین ذرائع کا بھی موصوف نے مطالعہ کیا۔ تاجروں اور سیاحوں کی کتابوں اور مشاہدات کو میزان عقل پر تولا اور کام میں لائے۔ سترہویں صدی کی تاریخ ہندوستان پر ان یورپین سیاحوں کی یادداشت سے جو روشنی پڑتی ہے اس سے دوسروں کو بھی فیض یاب کیا اور یہ بھی بتایا کہ ان حضرات کی کتابوں میں معاشرتی، اقتصادی ———— بازاری گپوں اور بعید از قیاس واقعات کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

میں سب سے زیادہ اہمیت ہمعصر ہندو اہل قلم کو دی جا سکتی ہے "سات سمندر پار" سے آنے والے ———— کی معاشرت، مذہبی رجحانات اور ملکی تعلقات کو کبھی اس حد تک نہیں سمجھ سکتے تھے۔ خود ملک کے رہنے والے خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو واقف تھے۔ سچ پوچھئے تو مغلیہ تہذیب و تمدن سے ہندوؤں کی ایک خاصی جماعت اس قدر متاثر ہو گئی تھی کہ بعض اوقات مستشرقین یورپ کو دھوکا ہو جاتا ہے خلاصۃ التواریخ جسے سبحان سنگھ پٹیالوی نے، عالمگیر کے چالیسویں سال ختم کیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا مصنف بقول ڈاوسن ایک متعصب مسلمان کی طرح مسلمان اولیا و فقرا کے قصص و حکایات نقل کرتا ہے اور ان کے روضوں کا نہایت احترام سے ذکر کرتا ہے۔ غنیمت ہے کہ ایلیٹ اور بیورج اس خیال سے متفق نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مغل عہد کے ہندو اہل قلم مسلمانوں کا کافی تتبع کرتے ہیں۔ مگر ان کی مذہبیت اور قومیت چھپ نہیں سکتی۔ ماحول کا اثر ان کی تحریروں پر ضرور

پڑا لیکن ہندو سنین کا استعمال، پراچین کے تذکرے یا اشارات ان کی غمازی کرتے ہیں
البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ ہندو مورخین کی تحریروں کے کچھ امتیازی خصوصیات بھی ہیں۔ ان کے
قلم کی جولانیاں ایک محدود دائرہ میں مقید نہیں رہتیں۔ عام مسلمان مورخین سے علیحدہ مختلف
میدانوں میں ہم انہیں اکثر گامزن پاتے ہیں۔ بہت ایسی معلومات ان سے حاصل ہوجاتی
ہیں جو کسی دوسری جگہ ملنی مشکل ہیں۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ دقت تحریر انہیں شاہی
خطاب و عتاب سے چنداں واسطہ نہیں رہتا۔ انکی تیز بیں نگاہیں۔ معاملہ فہم دماغ اور
دور رس ذرائع واقعات کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ منشی کے فرائض اور مالی محکموں سے تعلق
انہیں اکثر اہم باتوں کی کنہیات تک پہونچنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ درباری عینک سے
سوانح و حالات پر اکثر نظر نہیں کرتے۔ ان کی تحریریں بہت حد تک غیر جانبداری کی حیثیت
رکھتی ہیں۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ اس لئے بھی ضرور بلکہ ناگزیر ہے کہ وہ لوگ جو موجودہ فضا
سے متاثر ہو کر نہ صرف تصویر کا دونوں رخ دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی مواد کی کمی
نہ رہے۔

عہد اورنگ زیب عالمگیر کے تین چار مورخین زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں رائے بند
رائے دانش کی لب التواریخ جس کا ایک ناقص نسخہ راقم السطور کے پیش نظر ہے اکثر جگہ
مل سکتی ہے مگر بجز اس کے کہ یہ دربار سے تعلق رکھتا تھا اور اکثر باتیں آنکھوں کی دیکھی تحریر
کردی ہیں کچھ زیادہ اس کی کتاب کی وقعت نہیں۔ ترک افغان و سلاطین دہلی سے لے کر
عہد اورنگ زیب تک ایک مختصر خاکہ تاریخ ہندوستان کا اس میں موجود ہے۔ سرجادوناتھ
نے دو نہایت قیمتی اور نادر الوجود قلمی نسخوں کا پتہ چلایا جس ——— عالمگیری مصنفہ ایشور
داس ناگوری کی تاریخی اہمیت اس کے مضامین کی مجمل فہرست اور ——— زندگی
سرجادوناتھ نے اپنے ایک مجموعہ مضامین مسمیٰ بہ مطالعات (اسٹڈیز) کے سولہویں
——— تحریر کرتے ہیں۔ مالوہ اور راجپوتانہ کے متعلق مصنف فتوحات نے جو
جودھپور اور راجپوتانہ میں امین ——— اور جسے خدمات کے صلہ میں دو سو پچاس سوار

کے منصب سے سرفراز کیا گیا تھا، اکثر نئے اور صحیح ـــــــ پہونچائے ہیں۔
اس کتاب کا صرف ایک نسخہ برٹش میوزیم میں پایا جاتا ہے۔ دریائے نربدا کے دکھن
جنوبی ہندوستان میں عالمگیری فتوحات حقائق و سانحات اور سترہویں صدی ہندوستان
پر ایک قیمتی معاصرانہ تبصرہ کے لئے ہم ایک دوسرے ذی علم ہندو اہل قلم کے ممنون احسان
ہیں۔ سرجادوناتھ سرکار نے جن شاندار الفاظ میں اپنی کتاب مطالعات کے پندرہویں
باب میں بھیم سین کایستھ برہانپوری کے نسخہ دلکشا کے حالات، شجرۂ مصنف خاندان اور
خصوصیات تحریر پر روشنی ڈالی ہے اور جتنے اقتباسات اسی مشہور عالم کتاب اورنگ زیب
کی تقریباً کل جلدوں میں اس نسخہ سے دیئے ہیں ان سے اس کی اہمیت کا ایک حد تک
اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک برطانوی کپتان اور مورخ جوناتھن اسکاٹ کی قدر شناس آنکھوں
نے نسخۂ دلکشا کو دیکھا اور ابھی اٹھارہویں صدی اختتام کو نہ پہونچی تھی کہ اس کے
قلم نے اس قابل قدر کتاب کے اکثر حصوں کو انگریزی لباس پہنانے کی کوشش کی اسکاٹ
کا ترجمہ ناقص و نامکمل تھا لیکن آنے والے مورخین نے اسی کو غنیمت سمجھا اور اپنی
کتابوں میں اس کے حوالے دینا شروع کر دئے حالانکہ اسکاٹ نے محض اپنے مطلب
کی باتیں دلکشا کے خاص خاص حصوں سے لے کر ضروری اضافہ و حواشی کے ساتھ
تاریخ دکن مرتب کر دی تھی۔ سرجادوناتھ کا ذوق تجسس و تحقیق بھلا اس نادرست اور
ناقص نسخہ کا کب شرمندہ احسان رہ سکتا تھا۔ برٹش میوزیم کے نسخہ کی فوٹو گرافک نقل
منگا کر رہے۔ دو اور نسخوں کا پتہ چلایا جن میں سے پیرس کا نسخہ تو مکمل مگر انڈیا آفس
لندن کا نسخہ نہایت ناقص و نامکمل نظر آیا۔ ۱۹۳۰ء تک مورخ موصوف کو صرف انہیں
دو ڈھائی نسخوں کا علم تھا مگر جب اسی سال کی پٹنہ کی تاریخی نمائش میں ایک مکمل اور
نہایت قدیم نسخہ نظر پڑا تو اپنی کتاب کی تازہ ترین اشاعت میں اس بہار کے نسخہ کا
بھی تذکرہ کر دیا۔ سطور ذیل میں اسی نسخہ کے متعلق جو تھجوہ ضلع سارن کے موقوفہ کتبخانہ کی
زینت اور راقم کے سامنے ہے کچھ عرض کرنا ہے۔

پیش نظر نسخے کے پہلے صفحے کے حاشئے پر جس جگہ " دلکشا۔ احوال عالمگیر بادشاہ"
مندرج ہے۔ اسی کے قریب دیوان سید ناصر علی مرحوم کھجوی کی مہر اور اس پر ۱۲۱۳ (۱۷۹۹)
کی تاریخ ثبت ہے۔ ریو نے برٹش میوزیم کی فہرست کتب میں وہاں کے نسخہ نمبر ۲۳ کی
تعداد اوراق ۱۷۴ سطریں ۱۵ اور سائز ——— درج کی ہے کجھوہ کے نسخہ میں
۱۶۱ اوراق ۱۸ سطریں اور لمبائی چوڑائی ½۸ اور ½۵ ——— مکمل ہے آخر
کے چند اوراق خستہ اور قدرے کرم خوردہ ہیں۔ جلد بند نے اوراق کی ترتیب الٹ پلٹ کر دی
لیکن راقم سطور نے سرخ پنسل سے صفحات کے نمبر دیدئے ہیں اگرچہ ترک کی غیر موجودگی
میں کافی ——— کرنا پڑا۔ خط صاف اور شکستہ آمیز نستعلیق۔ مختلف صفحات میں تقریباً
۶۵ مقامات پر سُرخ ——— خود مصنف کی نسخہ کی ترتیب دی ہوئی فہرست مضامین
ہے۔ بعض بعض جگہ " مقدمات دیگر" " بعضے روداد" "کوائف و احوال" "" واقعات وحشت
پژوہ" " کج بازی فلک غدار" کی تحت میں اکثر بڑے کام کی باتیں موجود ہیں۔ واقعات و
سانحات تو کئی جگہ تحریری شکل میں مل سکتے ہیں لیکن ان پر تبصرہ، اسباب و نتائج، علت و
معلول پر رائے، ملک و اہل ملک کے چشم دید حالات، اقتصادی، معاشرتی مذہبی اشارات،
شہر و عمارات کی تصویرکشی، ایک عہد سے دوسرے عہد کا تقابل۔ یہ باتیں عام فارسی تاریخوں
میں مفقود نہیں تو عسیر الحصول ضرور ہیں۔ بھیم سین کی کتاب ان مخصوصات کی بہت حد تک
حامل ہے۔

اور صبر کرنے کی ہدایت کی۔ بھیم سین کو بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تو کہئے کہ گنگا رام زناردار گجراتی نے جو اس کی سفارش سے رائے مکرند کے ہاں ملازم ہو گیا تھا اور رائے مکرند اور شیخ معین الدین اور میر محمد رضا پسر محمد شریف وغیرہ نے اس آڑے وقت میں جب ملازمت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی بھیم سین کا بہت ہاتھ بٹایا۔ جب "ایام عسرت بہ امتداد کشید ۔ ۔ ۔ ۔ مردم قدیم از سوار و پیادہ بسیار ہمراہ بودند و دست از رفاقت بر نمی داشتند" اس نے سراسیمگی کے عالم میں گجرات پہنچ کر مہاراجہ کی خدمت میں داخل ہونے کی ٹھانی لیکن اُس کے دوستوں نے "از راہ دور اندیشی مصلحت ندیدند و نگذاشتند کہ بہ ہنگام سختی مشو نا امید۔ کز ابر سیہ آید آب سپید۔" خرچ کے لئے کچھ روپے بھی بھیجے ناچار بھیم سین تلاش خدمت میں مصروف رہا (۲۶/ب — ۲۳/۱)

خدا کا کرنا کہ بہادر خاں کی رنگ رلیاں طشت از بام ہوئیں۔ مغلیہ افواج کا یہ سپہ سالار پالکی میں بیٹھا ہوا عیش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ہر ہفتہ کسی نہ کسی امیر کے یہاں زبردستی کی ضیافت کو بندوبست کیا جاتا تھا "لولی ہا و کنچنیاں کابل و لاہور قریب چہار صد اسامی در لشکر خاں مرقوم ہمراہ بودند و ہموارہ با انعام و رعایات فایز می شدند" اس پر طرہ یہ کہ "بعرض اقدس و اعلی رسید کہ بہادر خان با شیوا اتفاق دارد و بہ تنبیہہ او واقعی نمی پردازد" حضور میں طلبی ہوئی بہادر خاں کو کلتاش اس کی جگہ سپہ سالار مقرر ہوا۔ بھیم سین کی بھی بن آئی۔ رائے مکرند اور نئے داروغہ داغ و تصحیحہ میر محمد رضا کی سفارش اور شاہی احکام نے بڑا کام کیا۔ بھیم سین کی خدمت مشرفی پر بحیثیت بحالی ہوئی۔ چونکہ میر موصوف "فراغت شعار اور عیش طلب تھا"۔ تمام اختیار خدمت اُس نے بھیم سین پر چھوڑ دئے۔ اب تو اُس کی چین سے کٹنے لگی۔ یہ حال چند سال تک قائم رہا۔ خود کہتا ہے "بہ خدمت استقلال تمام یافتہ بہرۂ فراواں اندوختہ و بہ عیش و عشرت مشغول می ماند و بہ آشنا نوع سلوک مدارا و رعایتہا می کرد کہ امرائے عظیم الشان را میسر نبود" (۲۷/ب - ۵۵/۱) سمبت ۱۷۴۱ مطابق سنہ ۲۱ جلوس میں تو "مشرفی فوج عالی" اسی کے سپرد کر دی گئی۔

نلدرگ میں گوشہ نشینی:

اسی سال بیجاپور اور حیدرآباد گولکنڈہ کی تسخیر پر افواج شاہی کی تعیناتی اور "خدیو دوراں"

(شہنشاہ عالمگیر) شولاپور میں خیمہ زن ہوئی دکن کے حالات میں بہت کچھ کایا پلٹ ہوئی۔ خود بھیم سین کی زندگی نے بھی پلٹا کھایا۔ نلدرگ میں گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی۔ لکھتا ہے "خیرخواہ خلائق را از متفرق شدن افواج فکرے بہم رسید کہ در اردوے معلی رفتن و با مردم دربار بسر بردن دشوار است گماشتہ راجہ جہت اجرائے کار در فوج گذاشتہ بہ قلعۂ نلدرگ کہ در تعلقہ خدمت بندہ است روانہ شد" (۹۳/ب - ۹۲/ب) حالت یہ تھی کہ "اکثر امرائے رکاب سعادت بہ سبب پریشانی جاگیرات در صوبجات دکن تنخواہ یافتند و متصدیان و اہل دفاتر کہ سوائے نوکت بضاعت نداشتند باوجود تاکید بادشاہ عادل و عالم دست رشوت دراز کردند از بندہ نیز مبلغی در مہمانسازی بیجا خرچ گردید" (۹۴/ا) مزید وضاحت ملاحظہ ہو "ترقی معکوس بنظر آوردہ...... در حضور رفتن و متابعت اہل دفاتر کردن مبلغ کلی برائے آنہا منودن...... و زر خطیر برائے آن سامان ساختن از بسکہ در بضاعت خود سوائے بے سرانجامی چیزے دیگر نداشت گرانی کرد و سماجت کردن خوش نیامد ازیں جہت... گوشۂ عزلت کشیدن پا بدامان قناعت خاطر را تسکین داد (۹۹/ا)

ملازمت کی فکر۔ راؤ دلپت سے تعلق کا آغاز:

چار برس تک بھیم سین نلدرگ میں گوشہ نشیں رہا۔ لیکن جب اس کے دوستوں نے سمجھایا کہ ایسے وقت میں 'عزلت' دوربینی کے خلاف ہے۔ "بہ حضور رفتہ طلب و تلاش خدمت نماید" تو "گرچہ احتقر برفتن" حضور رغبتی و دیدہ و دادیدہ مردم اردو متنفر خاطر بود" لاچار نلدرگ سے روانہ ہوا اور برنیدا سے ۱۴ کوس پر اردوئے معلی میں پہنچ کر روح اللہ خاں بخشی سے ملاقی ہوا (۹۵/ب ۹۶/ا) میر بخشی کی سفارش پر شہنشاہ نے "چند محال ضمیمہ خدمت سابق مقرر ساخت" (۹۶/ا) جس وقت میر بخشی قلعہ رائچور کو روانہ ہوا بھیم سین کو ہمراہ لیتا گیا لیکن اس اثنا میں دیال داس اس کے پسر ابن عم نے اپنی جان عزیز شراب کی نذر کردی اس لیے یہ میر بخشی سے رخصت ہو کر نلدرگ واپس گیا (۹۶/ب) دوسرے سال یعنی ۱۱۰۳ھ میں جب راؤ دلپت راؤ بندیلہ (بانی ریاست دتیا) قلعہ داری و فوج داری امتیاز گڈھ عرف ادونی سے ہٹا کر اورنگ آباد اور بیجاپور کی راہداری پر متعین ہوا تاکہ مرہٹوں کی تاخت

کورو کے تو بھیم سین نلدرگ سے روانہ ہو کر شولا پور پہنچا اور پرگنہ بیٹی میں راؤ سے ملاقات کی دلپت راؤ نے اُسے اپنی ملازمت میں لے لیا اور بارہ ہزار سالانہ کی جاگیر (شاید بندیلکھنڈ میں) وجہ تنخواہ کے طور پر اُسے بخش دی اور اس طرح بھیم سین کو متصدیوں اور محرروں کی کشمکش سے نجات دی اور فارغ البال کر دیا (۹۹/۱ب)

راؤ دلپت کی ملازمت :

راؤ دلپت کی ملازمت کا سلسلہ اٹھارہ سال تک قائم رہا۔ راؤ موصوف جملۃ الملک اسد خاں وزیر اعظم کے نامور بیٹے اور سپہ سالار اعظم ذوالفقار خاں نصرت جنگ کی فوج میں تھا۔ راؤ کے ساتھ بھیم سین جنجی، بندواسی (واندی واش) اور متعدد مقامات میں شریک تھا۔ کبھی مورچال میں اس کی تعیناتی ہوئی۔ بسا اوقات راؤ دلپت اُسے "بہ جہت بعضے امور بہ اردوئے معلیٰ فرستاد" (۱۰۴/۱ تا ۱۰۳/ب)، واندی واش میں راؤ مذکور بہت سخت بیمار پڑا۔ بھیم سین اسے دریائے شور کے بندر کلاں (مدراس) پر جہاں حکمائے فرنگ موجود تھے بغرض علاج لے گیا۔ لیکن ان کے بنائے کچھ نہ بنی۔ مفت زیر باری ہوئی۔ آخر اردوئے معلیٰ کے حکیموں کی ادویہ نے کام کیا (۱۰۶/ب تا ۱۰۷/۱) ایک موقع پر راؤ دلپت نے بھیم سین کو "برائے تلاش اضافہ بحضور والا فرستاد۔ چوں تردد وسعی او بہ عرض معلیٰ نہ رسیدہ بود پیش نرفت" (۱۰۹/ب) دوسرے موقع پر بھیم سین کی معرفت ذوالفقار خاں نے راؤ دلپت کو قلعہ داری جنجی کے فرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرنے کی بے فائدہ کوشش کی۔ سمبت ۱۷۵۶ مطابق ۱۱۴۱ھ میں راؤ دلپت کے دشمنوں نے "تہمت چند بعرض مقدس رسانند" اس مرتبہ راؤ دلپت نے بھیم سین کو شمالی ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر کرائی اور ہمارے لیے نہایت دلچسپ چشم دید حالات کا ذخیرہ مہیا ہو جانے کا موقع بہم پہنچایا۔ (۱۱۸/ب - ۱۲۱/ب) لکھتا ہے "بندہ برائے اصلاح آں مطلب بہ حضور آمدہ حکم تحقیقات بنام ناظم اکبر آباد (آگرہ) گرفتہ روانہ آں سمت شد۔" بھیم سین نے سرونج، گوالیار، دھولپور، اکبر آباد متھرا، بندرابن، اجین وغیرہ مقامات کی خاک چھانی۔ وسطی اور شمالی ہندوستان کے کئی شہروں کی سیر کی۔ ہر جگہ کا حال لکھا مشہور شہروں اور ان کے معابد

مناظر کی تصویر کھینچی اور وہاں کے معاشرتی اور اقتصادی حالات جو تقریباً ڈھائی سو برس قبل بھیم سین نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہمارے لیے چھوڑ گیا۔

آخری ایامِ زندگی :

بھیم سین کی واپسی کے قبل راؤ دلپت اپنے منصب پر بحال کیا جا چکا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات سے ایک سال قبل مصنف دلکشا نے اپنے عیال کو دکھن کی گرانی غلہ۔ ویرانی اور عام بدامنی کے باعث پہلے اورنگ آباد پھر راؤ دلپت کے وطن دتیا میں جہاں اُسے جاگیر ملی تھی۔ بھیج دیا تھا۔ (۱۳۹/۱) جنگ جاجاؤ میں شاہزادہ اعظم کی معیت میں راؤ دلپت جو اب پنج ہزاری کے منصب پر فائز تھا اور جس کی سفارش سے بھیم سین کو بھی پانصدی کا منصب عطا ہوا تھا اور آیندہ اضافہ کی توقعات تھیں مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا۔ بھیم سین بھی بری طرح زخمی ہوا (۱۵۰/۱ - ۱۵۲/۱) دتیا میں دلپت کے بیٹوں کی خانہ جنگی کے باعث قیام مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس لیے بھیم سین گوالیار میں مع اہل و عیال چلا گیا (۱۵۷/ب ۱۶۱/ب)۔ عدم ملازمت اور گرانی غلہ سے پریشان ہو کر نئے شاہنشاہ شاہ عالم بہادر شاہ کے دربار میں پہنچنے کی کوشش کی جو کارگر نہ ہوئی البتہ رائے گوجرمل نے مہربانی کی اس کی سفارش سے بھیم سین کے حقیقی بیٹے سنبھوناتھ سگے بھتیجے اور منہ بولے بیٹے برجھوکن کو شاہزادہ خجستہ اختر جہان شاہ کے یہاں ملازمت مل گئی۔ بھیم سین نے گوشہ قناعت اختیار کیا اور "بندگی معبود" میں بقیہ ایام زندگی گذارنے لگا۔ انہیں ایام میں اس نے نسخہ دلکشا کو "باختتام آورد" (۱۶۰/ب - ۱۶۱/ب)

تاریخ و سببِ تالیف نسخۂ دلکشا :

سمبت ۱۷۵۶ مطابق ۱۱۱۲ھ (۱۱/ب ۱۱/ا) میں جب شاہی فوج قلعہ پرنالہ (سمت مرتضیٰ آباد عرف میراج) کا محاصرہ کئے ہوئے تھی اور آب دریا کی طغیانی اور موسم برشگال کی دقتوں نے تعطل پیدا کر دیا تھا اس وقت بھیم سین کو جو راؤ دلپت ہراول نواب ذوالفقار خاں نصرت جنگ کے ساتھ تھا اس نسخہ کی تالیف کا خیال پیدا ہوا لکھتا ہے "بہ سبب نشستن پائے قلعہ پرنالہ فی الجملہ

از سواری و تاخت فراغت حاصل شد۔ کارے بہ میان نبود و شغلے نداشتم۔ بہ تصنیف این تاریخ ساعی گشتم" (۱۳۶/اب) یوں تو اس نسخہ کا آغاز ہوا لیکن اس کی تکمیل اس وقت ہوئی جب بھیم سین ۱۱۲۳ھ/۰۹-۱۷۱۰ء میں نوکری سے دل برداشتہ ہو کر گوالیار میں گوشہ قناعت اختیار کر چکا تھا اور جب بقول خود "دست از دنیا برداشتم واز صحبت اہل دول یکسو شدم و ترک خدمت و منصب بادشاہی نمودہ خواستم کہ گوشۂ عزلت گزینم (۲/ب) آگے چل کر پھر لکھتا ہے "چوں پابند اسباب دنیا نبودم شغل نداشتم۔ سرگذشت خود را از بدو ظہور شعور دیدہ و شنیدہ بے کم و کاست بہ تحریر آوردہ شغل چندمی بہم رسانیدم" ؎

سرگذشت خودم بلا کم و کاست — از مداد قلم بہ صفحہ نگاشت

از سر فکر منشی علام — نسخۂ دلکشا خطابے یافت

نسخہ کے آخر میں یوں رقم طراز ہے :

فکر کردم ز بہر تاریخش — داد ہاتف ندا کہ ایں برجاست

یکصد و بست بر الف ایزاد — یوم اماں بما دمے پیداست

راست کردم ہر آنچہ روشن گشت — گفتہ ام آنچہ در زمانہ گذشت

ہر کسے را چنانکہ روئے نمود — وز بد و نیک گفتگوئے نمود

ہمدریں دلکشا نوشتم باز — تا بداند اہل دل ایں راز

ختم کردیم ایں صحیفہ نغز — کہ بماند دریں جہاں سرسبز (۱۶۱/ا)

مصنّف کی سیرت اور کتاب کی خصوصیات پر ایک اجمالی نظر :

مندرجہ بالا اشعار اور ساری کتاب کی ادبی خصوصیات اور طرز تحریر کے متعلق خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے جو شخص نسخۂ دلکشا کا ایک سرسری مطالعہ بھی کرے گا، اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ تاریخی پایہ اس کا بہت بلند ہے۔ مصنف کا قلم رواں ہے۔ عبارت شگفتہ لیکن بے جا لفاظی سے مبرّا اور مناسب اشعار سے مملو (جو اساتذہ کے کلام سے ماخوذ ہیں کہیں کہیں بے ساختہ طبع زاد اشعار بھی ٹپک پڑے ہیں۔ چند رباعیاں شہنشاہ ہمایوں کی خاص کر جاذب نظر ہیں) تصنع سے دور اور ایک

تاریخی کتاب کے لئے موزوں ہے ۔ اگر یہ سچ ہے کہ طرز تحریر اور مواد کتاب سے محرر و مصنف کے کردار و خصائل کا اندازہ ہو سکتا ہے تو یہ بات نسخہ دلکشا میں بدرجہ اتم موجود ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھیم سین ایک سیدھا سادا خوش مزاج مرنجاں مرنج انسان تھا اور بے تکلف و پر خلوص دوست ۔ اسکی کتاب سے اس کی حساس طبیعت مذہبی خوش اعتقادی بلکہ کسی حد تک توہم پرستی کا بین ثبوت ملتا ہے ۔ راسخ العقیدہ ہندو ہونے کے باوجود مذہبی عصبیت اور ہٹ دھرمی سے کوسوں دور تھا ۔ ہندو معابد و منادر ۔ اوتار ۔ پرستش گاہ حقائق کوہ بھیمن وغیرہ کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ یکساں خلوص و احترام سے مسلمان صوفیوں اور بزرگان دین کے روضوں اور خانقاہوں کا بھی ذکر کرتا ہے ۔ "حضرت مخدوم دین و دنیا سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ" کی درگاہ کی زیارت کرتا ہے روضہ عالی کی عمارات کا دلچسپ بیان' نذر و نیاز ۔ مختصر تاریخ ' سال وصال اور دوسرے بزرگان سلف' جو گلبرگہ' برہان نگر' گوالیار اور متعدد دوسرے مقامات پر ہمیشہ کے لئے آرام فرما ہیں ۔ ان کے روضوں کے تذکرے بھیم سین کی رواداری' وسعت قلب اور حقیقت نگاری کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں ۔ بھیم سین کا ہاتھ ہمیشہ کشادہ رہتا تھا ۔ جب تک روپیہ پاس میں رہتا ہے سیر و تماشا' ضیافت و شکار پر بے دریغ صرف کرتا ہے ۔ نئے نئے باغات' نئی نئی حویلیاں بنواتا ہے پانی کی نہریں جاری کرتا ہے اور جب تہی دست ہو جاتا ہے تو قسمت پر راضی و شاکر نظر آتا ہے ۔ بچوں سے اس کو خاص شغف تھا ۔ عرصہ تک کوئی اولاد نہیں ہوئی ایک برادر زادہ کو گود لیا ۔ قدرت نے کچھ دن بعد اس کی گود بھی خالی نہ رہنے دی ۔ ایک موقعہ پر لکھتا ہے "چوں تعلق خاطر بازی طفلان بسیار بود سری جھگوان بخانہ سیتل داس برادر خود احقر فرزند عطا گردانیدہ بفرزندی خود برداشتہ جشن عالی آراست تا چہل روز ہنگامہ شادی و ضیافت امرا و عزیزان گرم بود ۔ طوائف ہر قسم حاضر بودند ۔ مبلغ کلی بخرچ درآمد" (۳۳ ا) طبیعت رومان سے بھی خالی نہ تھی ۔ حضرت کے ایک مرہٹی دوست ایک لولی پر جو "خالی از ملاحت نبود" لٹو تھے ۔ کہاں تو آپ "بہ ترتیب او مشکو شدیم" ایک شب ایک پیکر جمیل خواب میں نظر آیا تو فرماتے ہیں "بعد بیداری کہ خواب ازاں بہتر بود حالتے روداد و عکس جمال در آئینہ لبریز نگاہ بود" (۳۵ ا ب)

نسخہ دلکشا کی نوعیت کئی حیثیت سے منفرد و ممتاز نظر آتی ہے ۔ جس قدر اس کی کتاب

میں اشیائے خوردنی اور غلّوں کے نرخ۔ لوگوں کے سامانِ تفریح۔ راستوں اور شاہراہوں کی حالت۔ اہلکاروں اور حکام کے معاشرتی اور اخلاقی حالات۔ دکن کی لڑائیوں کی جزوی تفصیلات۔ مسلمان و ہنود کے خوشگوار تعلقات۔ سانحات و واقعات کے اسباب و نتائج پر پُر مغز تبصرہ دیا پایا جاتا ہے۔ کسی دوسری جگہ مشکل سے یہ سب باتیں یکجا مل سکتی ہیں علاوہ اس کے بھیم سین مغل ہوں یا افغان، سکھ ہوں یا راجپوت اور ان کی متعدد شاخیں، سلاطین دکن ہوں یا مرہٹے، نہ صرف ان کے ایک دوسرے سے تعلقات اور کوائف و احوال کا نہایت وضاحت سے اور دلچسپ طور پر تذکرہ کرتا ہے۔ بلکہ ہر ایک مختصر تاریخ شجرہ خاندان۔ قلعجات، عمارت، قصص، حکایات بھی حوالہ قلم کرتا جاتا ہے۔ متعدد اشخاص خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان۔ امرا ہوں یا سلاطین۔ پیشہ ور ہوں یا اہلکار سرکار جن سے بھی اس کو سابقہ پڑا اور جسے بھی اسے نظرِ غائر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے کردار و خصائل عادات و خصوصیات کے متعلق اپنی رائے مختصر لفظوں میں پیش کر دیتا ہے اور ماننا پڑے گا کہ اس کا تبصرہ بے لاگ اور بہت حد تک حقیقت پر مبنی اور پُر معنی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم صرف اورنگ زیب عالمگیر اور شیواجی بانی سلطنت مرہٹہ کو پیش کرتے ہیں۔ اوّل الذکر کی "خدا پرستی و حق شناسی" "عدل و انصاف" "آبادی ملک میں جد و جہد" "تہور و کرم" (کہ در طینت آں حضرت بود دیگر از سلاطین سابق و لاحق را کجا میسر) "حلم و خلق" "عفو و بخشش" "دور اندیشی" "دفع شر" "رعایت حقوق" "شجاعت" "غیرت"۔ سیاست، فراست، عبادت، امانت و دیانت کی تعریف میں ہمارا کایستھ مصنف رطب اللسان ہے۔ لکھتا ہے :"

"آنچہ صفات سلطنت باید در ذات عالی درجات آں بادشاہ جنت آرام گاہ موصوف بود"

حتیٰ کہ یہ ہندو مصنف بہ نام اورنگ زیب کے متعلق یہ بھی کہہ ڈالتا ہے کہ "چوں آں بادشاہ پاک اعتقاد بود ہر دعا کہ در حق خود و رعیت کند بشرف اجابت مقرون شود (۱۴۷) یہ ملحوظ رہے کہ بڈھے گوشہ نشین بھیم سین نے یہ سطور کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھے۔ شاہنشاہ عالمگیر کا اس کے آقا دلپت راؤ سے سلوک اُسے ایک آن نہ بھاتا تھا۔ جا بجا تعریفی جملے اس کے دلی خیالات اور احساسات کی غمازی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں "صاحب قرآن ثانی اور حضرت اعلیٰ (عالمگیر) کے زمانوں کا ایک مجمل تقابل قابل ملاحظہ ہے :- "دراں وقت ایں ملک چہ آبادی و فراوانی داشت"۔۔۔ حالا بایں قرب و جوار کہ از احمد نگر

و دریائے کشنا چنداں مسافت ندارد رسد غلبہ نمی تواند رسید ہماں زماں یک مہم پیش آمدہ .... دریں وقت تمام عمر در مہم می گذرد .... صاحبقران ثانی در ہر ہفتہ یک روز عدالت می فرمودند واز بس حق ترسی وخدا شناسی متنفسے محتاج استغاثہ نبود۔ الحال حضرت ہر روز دو مرتبہ زیب افزائے مسند عدالت می شوند و ہجوم مستغثیان بیشتر نمی شود (۱۴۶/۱) اب آئیے "شیواجی مقہور" کے خصائل ملاحظہ کیجئے۔ "مرشے بود صالح وسپاہی بے نظیر از رویۂ راج نیت ہشیار لشکریاں درست اعتقاد را دوست داشتے و تدبیر نیک پنداشتے و بہ عمل آوردے۔ در ہر مہم صلاح از ہر یکے پرسیدے آنچہ موافق مصلحت خوب دانستے بعمل آوردے۔ زیبائے عمارت واحداث قلعہ نمودے مصالحہ خزانۂ غیبی نصیبہ او شدے الخ" اس کے ساتھ مندرجہ ذیل فقرات بھی ملاحظہ ہوں۔ "پیشۂ عیاری خوب یاد گرفتہ۔ جماعت او ہر جا بتاراج ملک می رفت۔ دفینۂ ہر خانہ را گویا خود نگاہ داشتہ" (۳۴/۱) اس کے بعد نظم سلطنت و تربیت افواج کا ذکر ہے جسے ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ شیواجی اور افضل خاں کے مابہ النزاع واقعہ کی روداد اس ہندو برہانپوری مصنف کی زبانی سنئے اور سر جا دو ناتھ اور مرہٹہ مورخین کی زبردستی کی موشگافیوں کی داد دیجئے (۹/۱)

نسخۂ مفید الانشا اور اسکی تاریخی اہمیت *

(مسلسل)

"عرضداشت دوہیم" کی حسب ذیل عبارت قابل ملاحظہ ہے" میرساند کہ کیفیت معزول شدن خود از خدمت فوجداری سرکار کوچ بہار و رفتن بہ رکاب عالی شاہزادۂ والا مقدار بصوبۂ بہار[۵] پیش ازیں مکرر عرضداشت نمودہ بغرض اشرف و اعلیٰ و اقدس رسیدہ باشد۔ درینولا صاحب عالم و عالمیان کمترین خانہ زادان را بدستور سابق بریں خدمت بحال نمودند و قریب دو ماہ است کہ دریں جا رسیدہ بسر انجام اموری پردازد۔ چند روزے بسبب عزل و نصب در نظم و نسق ایں چکلا فی الجملہ قصورے یافت۔ انشاءاللہ تعالیٰ بیمن اقبال بے زوال بعد انقضائے ایام برشکال گوشمال و استیصال مفسدہ بد مآل بقیۃ السیف یارسال باسرع الحال صورت پابدا مابیدون قائم کردن تھانہ۔ در قلعہ بہار[۶] کہ مسکن و ماوائے اہل کفار آں دیار ست ضبط و

---

* مقالہ کی پہلی قسط سے متعلق معاصر بابت اپریل ۱۹۴۱ نایاب ہے۔ مرتب

۵ مکتوب یازدہم سے معلوم ہوتا ہے کہ معزول فوجدار شاہزادہ کے ساتھ صوبہ بہار میں آیا تھا" بالفعل در بلدۂ پٹنہ بہ رکاب سعادت انتساب قیام دارد۔" پٹنہ کا اور تین جگہ بھی نام آیا ہے۔ انگریزی کاغذات و ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ عظیم الشان ۱۷۰۳ء = ۱۱۱۵ھ کے اوائل میں بہار آگیا تھا۔ اور پٹنہ میں مقیم تھا۔

۶ دریائے تورسا کے مشرق کنارے پر قدیم سے ایک جگہ گرجا ہاٹی کے نام سے قائم تھی۔ یہ مقام بہار کے نام سے مشہور ہوا اور راجگان کوچ بہار کا مسکن و جائے پناہ قرار پایا۔ قدیم قلعے سے ہٹ کر ایک نیا قلعہ ان راجوں نے تعمیر کیا تھا (راجہ پاکہاں از جادو ناتھ گھوش۔ ترجمہ انگریزی باب ۱۱ صفحہ ۶۴)

تسخیر این ملک از قرار واقع دشوار می نماید۔ چون شش ہفت ماہ کامل حوالی آن حصار آب میگردد و راہ آمد و شد مردم بے سفینہ مسدود میگردد و برائے سر انجام این کار آذوقہ و مصالح حرب و بیگار و جمعیت معتد بہ می باید...... اگر ہشتاد لک دام انعام بدستور فوجداران پیش تنخواہ یابد تسخیر بہار و دیگر امکنہ مضافہ این سرکار بآئین گزین صورت میگردد یا آنکہ سند التمغائے بہار مرحمت شود کہ بعد از تسخیر و معمور شدن آن مکان ہر چہ از آنجا بہم رسد بہ مصارف جمعیت و مصالح استحکام مذکورہ بکار بردہ در ضبط دیگر اماکن مضافہ بہار امکن و مقدور بپردازد.........

"عرضداشت پنجم" میں مرقوم ہے:" فراسیاب[1] نائب فدوی با جمعیت شائستہ برائے تنبیہ و قمع مفسدان شقاوت شعار در قلعہ کوچ بہار قیام دارد۔ چون شنید کہ سپاہان آن پر مکر و فن در جنگلستان کوہ دامن تمکن ورزیدہ خیال باطل ۔

در سر دارند و ارادہ شبخون کردن بر فوج اسلام ورزیدند در ذیقعدہ بر این جماعت فسدہ تاخت آوردہ۔ آن گروہ خذلان پژوہ بغرور وفور جمعیت حربہ آزادہ پیش آمدند تا یک پہر ہنگامہ جدال و قتال از طرفین گرم بود۔ درین زد و برد جمعے ازان طبقہ ازآنہ مقتول و مجروح شدند و چندے از ملازمان فدوی بکار آمدند و زخمی گردیدند۔ دیگران بہ معاینہ این حال تاب مقاومت نیاوردہ ہزیمت را غنیمت انگاشتہ پناہ بہ جنگل و جبال صعب المسالک بردند و یک زنجیر فیل از مفسدان بدست آمد ۔ در اواخر شہر مذکور نیز جمعے از شقاوت کیشان در بیگوں کوڑی نام مکانے کہ این طرف ہفت کروہ از قلعہ بہار واقع است متحصن شدہ بودند جمعیت ہمراہی خود را برائے استیصال آن متمردان تعین نمودہ و محاربہ عظیم تا یک شبانہ

---

[1] نواب میر جملہ خان خاناں کا ایک سپہ سالار جس نے کوچ بہار میں بڑی ناموری حاصل کی اسفندیار بیگ نام تھا۔ معلوم نہیں افراسیاب بیگ سے جس کے کارہائے نمایاں سے مفید الانشاء کے اکثر خطوط پُر ہیں اس کا کوئی تعلق تھا یا نہیں۔

روز برمیان آمد۔ برادر زادہ بگت[1] نرائن جہنمی ددھرنی نامی نا سرداران با جمعے کثیر از رفقائے منافقان بہ تیغ بیدریغ غازیان فوج اسلام مقتول و مخذول العاقبتہ گشتہ بدارالبوا شتافتند و بقیتہ السیف قافیہ برخود تنگ دیدہ آوارۂ دشت ادبار گردیدند و فتح و نصرت نصیب بندہ ہائے بادشاہی شد و دریں جنگ نیز چندے از تابعان فدوی بکار آمدند و مجروح گشتند۔ لحال آں جماعتہ بدمآل در اطراف و اکناف جنگل و جبال متواری ہستند و خیالات فاسد در سر دارند تا آنکہ ایام برشگال برسد تردد و تلاش استیصال مفسدان درمیان است و فدوی خود در تقدیم کار بادشاہی تا حال دریغ ندشتہ و ندارد۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہ یمن اقبال عدو مال جماعتہ کفرہ فجرہ مستاصل می شوند"۔

"عرضداشت ہفتم" میں نہ صرف روداد مذکورہ بالا کا حوالہ ہے بلکہ اواخر ذی قعدہ میں ایک دوسری جنگ کا بھی ذکر ہے جو مغلوں کے مقابلے میں اندغنہ اور کوچ قوم کے اتحاد عمل کا نتیجہ تھی سال گذشتہ کے واقعات کی طرف بھی ایک اشارہ اس میں موجود ہے لکھتا ہے "کیفیت فتوحاتے کہ در ماہ ذی قعدہ رو دادہ بہ جناب دولت عالی معروضداشتہ .... دریںولا این است کہ چوں نائب فدوی بہ جہت قلع قمع مفسدان بقیتہ السیف پارسال و ارادہ تسخیر بہار تردد و تلاش داشت رسول افغان برادر سلیمان جہنمی مقتول سال گذشتہ با جمعیت کثیر از راہ بورنیہ بہ کمک مفسدان آمدہ قلعہ بودا[2] را

---

[1] باسدیونرائن راجہ کوچ بہار کا وزیر جیتر ناظر اور سپہ سالار بھی نرائن تھا اس کے چار بیٹوں میں جگت نرائن بہت مشہور ہوا۔ اسی کا بیٹا روپ نرائن ۱۱۰۱ بنگلہ سال مطابق ۱۶۹۴ء میں کوچ بہار کا راجہ ہوا اور ۱۷۱۴ء تک حکمراں رہا۔ (راجوپاکھیاں۔ ہنٹر کا بنگال بھی ملاحظہ ہو۔)

[2] بودا اور پاٹگادوں دریائے کاراتویا کے دو جانب دامنِ کوہ بھوٹان کے جنوب اور بنگال کے شمال مغربی سرحد پر واقع ہے۔ ضلع بودا کا کچھ حصہ آج بنگال کے ضلع جلپائی گوڑی میں شامل ہے۔

تصرف نمودہ پئے مرلشکر را گرفتہ راہ رسد و غلہ و آذوقہ مسدود ساخت ۔ فدوی چوں دید کہ مفسدان از ہر دو طرف افواج اسلام را درمیان گرفتہ اند بہ نائب مذکور نوشت کہ اول فکر استیصال آں افغان بدنہاد کہ دریں معنی دشمن خانگی است کردہ بعد ازاں بہ تدبیر گوشمال دیگر مفسدان آں ضلع بپردازد ۔ چوں دریائے عمیق درمیانہ حائل بود و سفائن کمیاب ہمیں کہ نائب مذکور تعلیلے جمعیت را از دریا گذرانید رسول مجہول قابوئے وقت یافتہ با چہار صد یا انصد سوار و قریب ہزار نفر پیادہ بداں جماعت بخت و از طرفین فرصت جنگ کہ جز از جمدہر و شمشیر نہ شد ۔ باوجود قلت جمعیت اسلام و کثرت افاغنہ نکوہیدہ انجام باقبال بے زوال رسول مخذول العاقبت با جمع کثیر مقتول و بہ جہنم موصول گشت و لبقیۃ السیف تاب مقاومت نیاوردہ رو بفرار گذاشتند و کلاں جہنمی بہ حضور فیض گنجور مرسول نمودہ دریں جنگ بسیارے از نائباں فدوی بکار آمدند و زخمی گردیدند و فتح و نصرت نصیب اولیائے دولت ابد مدت شد ۔ امید کہ بہ جناب دولت مآب فرخندہ و مبارکباد ......

کوپانڈور کے ایک دوسرے مسلمان رفیق کار اور معاملہ قدم رسولؐ کے متعلق عرضداشت چہارم نئی روشنی ڈالتا ہے :" میرساند کہ دو سال قبل ازیں حسب الامر فیض القدر دربارہ ارسال نقش قدمؐ مبارک حضرت رسالت پناہ بہ مہر لشکر خاں مرحوم بنام فدوی عقیدت رسوم شرف در ود یافتہ بود ۔ چوں اوّل نقش قدم مبارک نزد علی میواتی بودہ و بعد کشتہ شدن او بہ سلیمان افغان رسیدہ چوں آں مخذول نیز بہ جہنم موصول گردید بہ دست غافل بوچ افتادہ دراں وقت ہر چند تلاش نمودہ بدست نیامدہ ۔ درینولا کمترین خانہ زادان در ہر مکان تھانہ جات مستحکم قائم نمودہ در ہر جا جمعیت معتد بہ نگاہ داشت و ایں معنی موجب انسداد مسالک و منافذ آمد و شد آذوقہ و غیرہ ...... برجماعہ مفسدان لبقیۃ السیف کہ در جنگلستان و کوہ دامان مخفی و پنہان

---

[۱] دریائے کاویری کی جانب غالباً اشارہ ہے ۔

[۲] اگر کشنگ کی عمارت اور اس قدم رسول سے کچھ تعلق ہے تو ہمیں اس کی خبر نہیں ۔ البتہ ایک نئی انکشاف شجاع الدین کے کتبہ سے ہوتا ہے ۔ ممکن ہے اس کے متعلق علیحدہ مضمون قلمبند کیا جائے ۔

گردیدہ قابوئے وقت یافتہ باعث اضرار واز ارخلائق می شدند ۔ عاقل غافل کہ رفیق طریق آں فریق بود بہ معائنہ ایں حال تاب استقلال رفاقت آں گروہ بدمال نیاوردہ استدعائے قول و قرار برائے آمدنی خود نمود۔ نظر بر تفرقہ رفقائے آں گروہ عاقل مذکور را بہ عہد و پیمان طلب داشتہ نقش قدم مبارک ازو گرفتہ مرسول حضور فیض گنجور نمود۔ ظل ظلیل آفتاب تفضیل بر مفارق خانہ زادان عقیدت بنیاد ابدالآباد مخلد و مبسوط باد ...... مکتوب نہم میں بھی "عاقل بلوچ کہ رفیق مفسدان طبقہ قوم کوچ بود" کا ذکر ہے ۔

"عرضداشت دہم" میں اوائل ذی قعدہ کے محاربہ و مجادلہ کی زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ برادرزادہ جگت نرائن کا دوسرے سرداروں کے ساتھ مقتول ہونا سرہائے جھنبھیاں سے کلہ مینار کا بنایا جانا "برائے عبرت دیگراں" انا عنہ طاعنہ بالخصوص رسول افغان بے ایمان کا جماعت کثیر کے ساتھ قلعہ بود و بالکاوں پر تصرف دو جفت نقارہ چند نشان فوج "یک مادہ فیل" کا مال غنیمت تو جدار کو ملنا اور ہر دو جنگ کا حال" وساطت گرامی" سے "جناب دولتمآب" میں عرض کرنا مذکور ہے ۔ ایک نئی بات حسب ذیل فقرات سے ظاہر ہے" دریں ملک ہمیشہ با مفسدان جنگ و جدال درمیان می باشد اما چہ تواں کرد۔ یکے آنکہ حقیقت وفور جمعیت آنہا پوشیدہ نیست دوم بسے زمینداران گرد و پیرامون از قسم پران ناتھ وغیرہ کمک ایں جماعہ فسدہ می کنند و رسد غلہ می فرستند روزے نیست کہ از شورش افساد ایں گروہ بد نہاد مطمئن خاطر تواں بود ۔ مکتوب ہفتم میں مزید وضاحت پائی جاتی ہے "چوں تحقیق شد کہ نوکران پران ناتھ زمیندار سرکار رنچیرہ و کہانڈی وغیرہ راہ دادہ ایں تصرف آوردہ بود ۔"

بعد از قتل شدن اداو ولیا نام ناسردار طبقہ فسدہ با ہفت نفر بہ موجب فرد علحدہ اوادہ دشت اد بار شد با نقد و جنس بسیارے بہ ہماں راہ اماکن زمینداری پران ناتھ مذکور میخواستند بدر آئند ۔ کہاتی وغیرہ نوکران پران ناتھ مذکور چوں دیدند کہ ایں جماعہ شکستہ بال بادر میرود و نائب دوست دار تعاقب دارد بفکر مآل خود افتاد کہ اگر اینہا را راہ بدہند اختلاط و اعانت باطنی ظاہر می گردد و قوت طامع اینہا نیز بہ حرکت آمد و ایں جماعہ را از راہ تملق و منصوبہ بازی بہ تقریب

ضیافت نگاہ داشتہ مقید ساختند و احوال و اسباب را بہ تصرف در آوردند ۔ نائب محب بہ ملاحظہ آنکہ این محال بہ خالصہ شریفہ تعلق دارد در آنجا مداخلت نکردہ خطے بہ طلب آن جماعت بزمیندار مسطور نوشتہ است اگر چنانچہ حوالہ می کند بہتر و الا امید آنست کہ بہ موجب اظہار وکیل از حضور فیض گنجور سزاولے تعیین شود کہ اینہا را حوالہ کسان دوست دار گرداند کہ محب بعد از تحقیق و تفتیش بعضے مراتب مصحوب جمعیت خود بحضور برساند ...... اگر بفرمائید ہمیں جا بانعدام این جماعہ فتنہ انگیز بپردازد کہ آنہا را بحضور فیض گنجور ابلاغ دارد کہ ملک از لوث وجود این طاعین شورش انگیز پاک شود و این معنی موجب عبرت دیگران گردد ۔ چوں پران ناتخہ مذکور ہمیشہ مفسدان را در محال زمینداری خود جائے می دہد و انہا بہ تقویت و اعانت او ۔

مصدر شوخی و ادا ہائے خارج می شوند از حضور لامع   تاکید و تہدید ے باو بشود کہ من بعد بہ مدد و معونت مفسدان نپردازد و احدے ازیں جماعت را در اماکن زمینداری خود راہ نہ دہند ۔

"عرضداشت نہم" در مکتوب چہارم ۔ پانزدہم و ہفتدہم میں " مقدمہ برہم زدن سکہ مروجہ زمینداران این ملک و ترویج سکۂ مقدسہ عالمگیری دریں دیار بحسبُ الامر رفیع القدر" کا نہایت اہم بیان مذکور ہے ۔ مندرجہ اقتباسات خالی از دلچسپی نہیں "حسب الامر بہ مہر شریف مشتمل براین معنی کہ ترویج سکہ مقدسہ عالمگیری مستحسن افتاد و فرستادن سوار و پیادہ با لفعل متعذر

ہ   یہ زمیندار جو راجہ کے خطاب سے بھی مشہور رہے موجودہ دیناج پور   کے راج کا بانی تھا ۔ ملاحظہ ہو ــــــ ہنٹر کا جنگال ــــ ۲ ــ بوکانن کا سفر نامہ ــــ
۳ ــ راجو یا کھیان ــــ

ہ   میر محمد سعید المشہور بہ نواب میر جملہ ایک ایرانی تاجر تھا جو سلطان گولکنڈہ کا وزیر فاتح کرناٹک شہنشاہ عالمگیر کا سپہ سالار اعظم صوبہ دار جنگال اور فاتح کوچ بہار و اسام ثابت ہوا ...... ۲ رمضان ۱۰۷۳ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۶۶۳ء کو یہ نامور شخص بقول شاعر مسند آرائے بہشت ہوا ۔

راست اگر میعاد معین نوشتہ بدہ ہشتاد لک دام انعام تنخواہ خواہد شد چہرہ وصول افروخت بر طبق امر جلیل القدر کارخانہ دارالضرب جاری ساختہ در ترویج سکہ اعلیٰ جد و کد تمام می برد۔ انشاء اللہ تعالیٰ در معدود الایام اثرے از سکہ مطروحہ زمینداران ایں ملک نمی ماند و سکہ مقدسہ عالمگیری دریں دیار رائج می شود (۱۲) .... برائے ایں کار معظم خان[1] خانان و دیگر خوانین عالیشان در زمان سابق تلاش بسیار می کردند و نتوانستند رواج کرد الحال بافضال ایزد متعال و اقبال بادشاہ دریا نوال ایں خیر سگال امیدوار است کہ دریں ملک سکۂ مقدسہ عالمگیری ترویج یابد...... الخ اس کے بعد کے فقرے بھی قابل ذکر ہیں" مہربان من کیفیت مفسدان ایں سرکار و سعی و کوشش کہ امرائے عظام باایں ہمہ جمعیت مصالح و توپخانہ وغیرہ در استیصال آں جماعت بدمآل از آغاز جلوس میمنت مانوس تا حال بکار بردہ اند روشن و ہویدا است و دریں مدت سہ سال نجومی کہ مخلص در ضبط و ربط ایں ملک پرداختہ و می پردازد بر ضمیر منیر پوشیدہ و پنہاں نیست۔

مذکورہ بالا اقتباسات بطور نمونہ از مشتے از خروارے پیش کئے گئے۔ مفید الانشا میں متعدد خطوط ہیں جن کی تاریخی اہمیت منظر عام پہ لائی جا سکتی ہے لیکن ہم اس مقالے کو

---

[1] عرضداشت نہم میں حسب ذیل عبارت اس ضمن میں قابل ملاحظہ ہے" فدوی بہ سبب نگاہداشتن جمعیت زیادہ از ضابطہ معذور و زبوں از طلب مردم سپاہ احوال بغایت پریشان دارد۔ اگر جمعیت پانصد سوار و ہمیں قدر پیادہ از حضور فیض گنجور تعیین شود یا نکہ ہشتاد لک دام انعام کہ بہ فوجداران پیشیں تنخواہ بود بہ فدوی مرحمت گردد ...... چوں سرکار کوچ بہار از رہ گذر شور و فساد و تمرد بیشگان خراب و ویران است۔ دامہائے مذکورہ سوائے ایں سرکار در محال بنگ (بنگالہ) عنایت شود کہ مصارف سپاہ وغیرہ و تہیہ اسلحہ حرب و پیکار بردہ باطمینان خاطر در تقدیم ایں کار بپردازد و عدد مال البقیۃ السیف را بہ سزائے کردار برساند و بہار را تصرف اولیائے دولت درآرد

جس کی طوالت اندازہ سے بہت زیادہ ہوگئی ۔ مکتوب سوم کے چند جملوں پر ختم کر دیتے ہیں
"نمیقہ اینقدر کہ برطبق حکم قضا شیم در بارہ امتناع مسکرات تعمل می آمد و ارسال مچلکائے عدم رواج آں مرقوم رقم گردیدہ بود بحیرہ وصول افروخت ۔ در سال گذشتہ نیز صحیفہ شریفہ مطابق یرلیغ قدر تبلیغ دریں مادہ رسیدہ بود دریں ضلع تفحص بکار بردہ ۔ غیر از چند درخت کہ در پرگنہ کونڈی متعلق بتول وکلائے سرکار عالی واقع است جائے دیگر ظاہر نہ شد و مسکرات دیگر ہم دراں مکان بعمل نہ می آید ۔ بہر حال در محال دیگر انچہ لازمہ تہدید و تاکید است بکار می برد ۔ اما تا آنکہ از پرگنہ مرقوم قلع منہیات بواقعی نمی گردد ۔ حکم امتناع ارتکاب آں از سگنہ امکنہ حوالی و حواشی آں مکان چنانچہ می باید نمی تواند شد ......"

ہندی فنون لطیفہ اور چند اَئِن کی چند تصاویر

حُسن و جمال کی کشش اور جستجو، سندرتا کی کھوج، تزئین و آرائش، نمود و نمائش کی فطری خواہش، مذہبی جذبات و تصورات کا غلبہ، روایات اور دیومالا سے خوش اعتقادی، یادِ رفتگان، وارداتِ قلب و جگر اور ان کے ماحول کے اثرات فنون لطیفہ کے محرکات اور بنیادی وجوہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ مذہبی تخئیل کی کار فرمائی ان سب میں اہم ہے۔ مسلمانوں میں فنونِ لطیفہ کو مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسلام نے کچھ پابندیاں عاید کر رکھی ہیں۔ قرآن مجید میں تصویر کشی، نقاشی، ناچ، گانے کے لئے صریحی امتناعی احکام شاید ملیں یا نہ ملیں لیکن حدیث کے اشارات تو صاف اور غیر مبہم ہیں۔ اصنام پرستی کے خطرات کے پیش نظر ان تمام حرکات، مراسم و ذرائع پرستش کے لئے تہدیدی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن میں شرک و بُت پرستی کا شائبہ بھی پایا جائے۔ ذی روح یا جاندار اشیا کی تصویروں اور رقص و غنا کی حُرمت و ممانعت تو متعدد حدیثوں سے واضح ہے۔ خدا کی یکتائی، عظمت و کبریائی اور اخلاقی بلندی کا جو معیار اسلام نے قائم کیا۔ اس میں کسی سمجھوتے کی گنجائش نہ تھی۔ اسلامی تمدن کی یہ خصوصیت دوسرے تمدنوں سے اسے

ؕ معاصر حصہ ۱۷۔ جولائی ۱۹۶۰ء

جدا رکھتی ہے دوسرے مذاہب میں خدا پرستی کا یہ غلو نہیں پایا جاتا۔ اہلِ ہند کو تو ان کے دھرم نے نہ صرف پوری آزادی اور چھوٹ دے رکھی تھی بلکہ ایسے معمولات جیسے چٹانوں کو کاٹ کر مندریں اور معبدگاہیں بنانا، دھاتوں کی ڈھلائی یا سنگ تراشی سے مجسمے اور مورتیاں تیار کرنا، تعمیرات و موسیقی، رقص و سرود، شاعری، نقاشی، مصوری، ناٹک یا اداکاری میں ان کے شغف کو کارِ ثواب اور ثمرۂ آخرت کے حصول کا ذریعہ بھی بنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کے سارے اقسام میں مسلمانوں کے ہندوستان میں ورود سے صدیوں ہزاروں سال پہلے بودھ، جین اور ہندو فنکاروں نے ایسے شاہکار تخلیق کئے جو آج بھی باوجود ان خرابیوں اور نقصانات کے جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ان میں آگئی ہیں قدردانوں اور اس قسم کی چیزوں کے حسن و قبح کے جانچنے اور پرکھنے والوں سے خراجِ عقیدت وصول کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر آج بھی فن کاروں کی دنیا محوِ حیرت ہے۔ ہندوستان کے آرٹ بالخصوص مجسمہ سازی، بُت تراشی، رقص (نرت کلا)، نقاشی، مصوری (چتر کلا) کے پس منظر کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ تقدس اور روحانی بیداری ان کی محرک تھی۔ مادیت کی آلودگی اور کسی چیز کی خواہ انسان ہو یا دیوتا، چرند ہو یا پرند ہو بہو نقل اور عکاسی سے زیادہ ان کے تمثیلی اور تخیلی تصورات پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ہندوستانی کلا اور ہندوستانی دھرم کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا اثر اہلِ ہند کے ہر شعبۂ زندگی میں ہمیشہ جاری و ساری رہا۔ ہر چیز میں مذہبی جذبہ کارفرما رہا ہے۔ مذہبیت کے معنی یہ نہ تھے کہ دنیا سے بیزار اور قطعی کنارہ کشی ہو جائے۔ چتر کلا، وستو کلا (تعمیرات) وغیرہ میں ان کے کمالات کا ظہور ہی نہ ہوتا، اگر تپسیا اور سنیاس ہی ان کی زندگی کا مقصد ہوتا۔ زندگی کا مدعا ہندوؤں کے نزدیک چار چیزوں دھرم یعنی نیکی اور فرائض کی ادائیگی، ارتھ یعنی حصول زر و اسبابِ معیشت کی جستجو، کام یعنی لذت و سرور اور مُکتی یعنی نجاتِ دائمی میں مضمر تھا۔ دنیا میں رہ کر کنول اور پانی کی طرح اس سے آلودہ نہ ہونا ہی اہلِ ہند کا مطمحِ نظر تھا اور یہ باتیں ہندوستان کے فنونِ لطیفہ پر اثر انداز ہوئیں۔ ہندوستانی کلا میں معنویت ہی نہیں تھی، افادیت بھی تھی۔

کلا کے لئے کلا کے ہندو فنکار قائل نہ تھے۔ شخصی کمالات سے بحث نہ تھی۔ موکش کے حصول پر نظر تھی۔ مورت روپ میں وہ حقیقت کے متلاشی تھے۔ رقص و موسیقی پرستش کے طریقے تھے۔ مورتیاں اور مجسمے حقیقت کے مظہر اور ذرائع و وسیلے سمجھے جاتے تھے۔ ہندی کلا علاماتی یا سیمبولیکل (SYMBOLICAL.) یا معنی نما یا ایکس پریسو (EXPRESSIVE.) نمائشی یا رسمی طریقوں کی پابندی کرنے والی یا فورمل نمائندہ شبیہی تماثیلی یا ریپریزنٹیٹیو (REPRESENTATIVE.) نہ تھی۔

ہندوستان کے فنون لطیفہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس نے کئی تاریخی مراحل طے کئے ہیں اور اس کی تخلیق و ترقی میں کئی قوموں کا ہاتھ تھا۔ مختلف ادوار میں طبائع و مذاق کے اختلافات، مقامی حالات، اخلاقی اور ثقافتی تبرکات کے اقتضا مذہبی رجحانات کی نئی نئی تحریکات اور بیرونی عناصر کی آمیزش کی وجہ سے ہندی فنون نے نئے نئے روپ دھارن کئے۔ نئی نئی شکلیں اختیار کیں۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے مختلف حصص و قطعات کے فنون میں کچھ تو باتیں یکساں اور بنیادی تھیں اور کچھ ما بہ الامتیاز۔ چٹانوں سے کاٹے ہوئے غار، مندر، ستون، مورتی مجسمے، گوتم بدھ کے سمادھی کی حالت ہیں۔ مجسمے ترّی مورتی اور نٹ راج کی سنگی یا فلزئی تراشی یا ڈھالی ہوئی مورتیاں اور شبیہیں قریب قریب ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ دیواری تصاویر یا تاڑ کے پتوں پر چترکاری نرت (رقص) سنگیت (موسیقی) کاویہ (شاعری) کا ہر جگہ چرچا تھا۔ لیکن طرز و ترتیب، ساخت اور طور طریقے ہر جگہ اور ہر دور میں یکساں نہ تھے۔ ہندوستان کے آرٹ پر مختلف قوموں، ڈراویڈی، آریائی، پارتھین، یونانی، ہرن، کشان، شاکا، ترک، منگول، ایران سب کی چھاپ پڑی۔ آریائی و غیر آریائی سب کی باتیں اس میں داخل ہوتی گئیں۔ یہ کہنا کہ ہر چیز خالص ہندی نژاد تہذیب کا نمونہ ہے شاید صحیح نہ ہو لیکن ہر چیز پر ہندیت کی مہر تھی۔ اہل ہند نے بہت سی چیزیں دوسروں سے لیں لیکن اپنا لیا اور ایک ایسی منفرد اور مستقل روایت قائم ہو گئی جو آج بھی باوجود اتنی ترقیات کے زائل و مفقود نہیں ہو سکیں۔ سندھ گھاٹی کے موہنجوڈارو، پنجاب (منٹگمری) کے ہڑپا

کاٹھیاوارا کے لوتھل اور ان کے ہمسایہ علاقوں میں کسی زمانے میں جو آریاؤں کے ورود سے پہلے اور آج سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال قبل تھا دراوڈی تہذیب برسرِ عروج تھی اس کا کچھ لگاؤ فرات و دجلہ کی وادیوں اور ایلم کے سومیری اور بیبولونیئی تہذیب و تمدن سے معلوم ہوتا ہے۔ اُس زمانے کی مہروں، تختیوں، برتنوں پر جو جانوروں کی تصویریں ملتی ہیں، لوگوں کی تہذیب و تمدن، معاشرت اور طرزِ زندگی کی جو جھلکیاں پائی جاتی ہیں ان کا لگاؤ بعد کی تہذیبی آثار میں پایا جاتا ہے۔ کوہان اور بے کوہان کے بیل، ہاتھی، گھوڑے، پیپل کے درخت کے علاوہ ایک کثیر الاعضا مورتی، دوسری آسنی (آسن) نشست کی حالت میں جس کے دونوں طرف دو پجاری ہیں۔ ایک میں سات آدمیوں کا جلوس دکھائی دیتا ہے۔ آنے والے زمانوں کے ملبوسات کی نشاندہی، عورت و مرد کے سر کی مختلف نوع کی پوششوں مرزئی نما بلوری آستین کے کرتے، گھٹنوں سے اوپر دھوتی نما کپڑے، کمر بند، ٹپکہ اور بائیں جانب سے کندھے کے اوپر دائیں بازو کے نیچے لپیٹی ہوئی چادر سے ملتی ہے۔ سر کا بال فیتے سے پیچھے کی طرف بندھا ہوا ہے۔ موبانی کا یہ طریقہ قدرے فرق سے آج بھی جاری ہے۔ ان کی شکلیں بھدی اور سپاٹ دکھائی دیتی ہیں لیکن ایک مرد کے اوپر کے دھڑ کے مجسمے سے جو سُرخ چٹانی پتھر کا بنا ہوا ہے، موریائی عہد کا خیال آجاتا ہے۔ دونوں زمانوں میں قریب دو ہزار برس کا بُعد تھا۔ موریا اور سنگ عہد (۳۲۲ ق م ۲۰۷ بعد م) کے باقیات متھورا، دیدار گنج (پٹنہ)، رام پور، بودھ گیا، سارناتھ، سانچی، بھرہوت، امراوتی، ناسک وغیرہ میں آج تک موجود ہیں۔ موریوں کے مشہور آئینہ نما چکنے تراشے ہوئے یک سنگی ستونوں کی، جن کے بالائی حصوں یا سرستون پر شیر اور دوسرے جانوروں اور دھرم چکر کی بنی ہوئی شکلیں ہیں، چمکیلی پالش کا راز آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس میں اور ایران کے پرسی پولس کے ستونوں میں بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور اس سے دونوں تمدنوں کے باہمی تعلق کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ پرشکوہ، بلند بالا، شاندار، متناسب الاعضا یکشاؤں کے خوبصورت سنگی مجسمے آج بھی پٹنہ میں موجود ہیں۔ موریہ اور سنگ خاندان آریائی تھے لیکن آریائیت قدیم ہندی تمدن و ثقافت کو بالکل مٹا

نہ سکی۔ ہندویت کے بعض اہم اور بنیادی عناصر غیر آریا تھے۔ تری مورتی بالخصوص شیو کا تخیل، درخت اور سانپ کی پرستش، آواگون کا عقیدہ رِگ وید کی نہیں۔ بے شمار دیویوں دیوتاؤں کی تصویریں اور مورتیاں جو اس زمانے کی عمارتوں، مندروں اور غاروں میں پائی جاتی ہیں۔ ان سے فنکاروں کی صناعی کمالات کا اظہار ہوتا ہے۔ چونکہ گوتم بدھ مورتی پوجا کے خلاف تھے اس سبب سے بھروت، سانچی یا متھورا کے قدیم کلا میں بدھ کی مورتی نہیں ملتی۔

بدھ کی مورتی پہلی صدی عیسوی میں کسی یونانی فنکار کی بنائی ہوئی وہیں پائی گئی ہے جہاں یونانیوں کی کسی زمانے میں حکومت تھی۔ بدھ مت کی مہایان شاخ کے زیر اثر کشان اور کنشک کے زمانے میں ایسی مورتیوں کی بہتات نظر آتی ہے۔ فنی اعتبار سے یہ عہد بڑا اہم عہد سمجھا جاتا ہے۔ کشان عہد گندھارا آرٹ کے لئے بہت مشہور ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہندوکش سے متھورا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اہم مراکز شمالی مغربی ہندوستان، پشاور اور ٹیکشیلا (متھورا) تھے۔ مجسمہ سازی (مورتی کلا)، تعمیرات (وستو کلا) کا پایہ بہت بلند تھا۔ سنگ تراشوں نے نہایت عمدہ نقاشی کے نمونے پیش کئے۔ موریوں اور گپتاؤں کے زمانے میں ہندوستان کی روایتی پوشاک دھوتی، کمر بند، پٹکہ، ساری، چادر، پیچدار اور دوسری قسم کی پگڑیاں ہیں۔ لیکن گندھارا آرٹ میں لباس کی آرائش خاص کر جاذب نظر ہے۔ دھوتیاں اور دوپٹے گردن سے لپیٹے ہوئے، کمر بند اور پٹکے، عورتوں کی ساڑیاں مہین ململ کی جس سے مورتی کے اعضا کی خوبصورتی پھوٹی پڑتی ہے، چولیاں اور گھاگرا نما لباس اور چادر جو بائیں کندھے پر پڑی ہوئی ہے، ٹوپی اور مختلف قسم کی پوشاک سر دکھائی دیتی ہیں۔ گندھارا دبستانِ فن میں دو قسم کے لباس نظر آتے ہیں۔ ایک پر یونانی، رومن اور وسط ایشیا کی چھاپ تھی۔ دوسرا خالص ہندی نژاد ہے۔ کشانوں کے علاوہ شاکاؤں نے بھی ہندوستان میں اپنے کچھ اثر چھوڑے۔ سندھ، ٹیکشیلا، متھورا، مالوہ، اجین، مہاراشٹر میں یہ صدیوں جمے رہے۔ علوم و فنون کی بھی سرپرستی کی۔ وراہمیر مشہور منجم شاکا ہی تھا۔ شاکا تقویم آج تک مقبول ہے۔ آفتاب پرستی اور سورج کی پوجا بھی شاید انھیں کی دین ہیں۔ گرنار میں ۱۵۰ء

کاروورومن کا کتبہ سنسکرت کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ شاکا کشان لباس لبادہ، چغہ، لمبے گھٹنوں تک پاپوش، اچکن اور چُست پائجامے اس زمانے کے مجسموں میں پائے جاتے ہیں۔ اس شاکائی اچکن اور پائجامے نے بہت بعد مغلوں کے کچھ پہلے اور بعد میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ گپت راجاؤں کا عہد زرین (۳۵۰ سے ۶۵۰) ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ اقتصادی خوش حالی تھی، امن و امان تھا، علمی اور ذہنی ترقی کا دور تھا، فنون لطیفہ میں بھی چار چاند لگائے گئے۔ اورنگ آباد کے اجنتا کے غاروں، گوالیار کے باگھ کے چٹانی غاری معبدوں میں فن نقاشی اور تصویر کشی کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن پر ہندوستان بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ بعد از مسیح کی سات صدیاں فنی اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اجنتا، ایلورا، الیفنٹا، باگھ، بدامی، امراوتی کے صناعوں نے ایسے انمول فنی جواہر پارے شبیہہ کشی، بُت تراشی، مصوری، نقاشی کے پیش کئے جو آج بھی سب کو محو حیرت کر دیتے ہیں۔ اجنتا کی دیواری تصویروں اور باگھ کے نقوش میں جو اجنتا کا چربہ معلوم ہوتا ہے طرح طرح کے لوگ، طرح طرح کی پوشاک میں ملبوس نظر آتے ہیں، ساسانی، ایرانی اثرات عمامہ نما پگڑی، ڈھیلے کوٹ، چست پائجامے اور لمبے پاپوش سے نمایاں ہیں۔ دھوتی، لنگوٹ، دوپٹہ، چادر، کمر بند، پٹکہ، چولی، سینہ بند، سر سے چپکی ہوئی ٹوپی اور ایک جگہ کلاہ دار پگڑی بھی نظر آتی ہے۔ فنی اور تمدنی ارتقا کی کڑیاں دسویں صدی کے کھجوراہو (بندیل کھنڈ)، ابو پہاڑی کے ڈیلوارا، جین مندر اور بعد کے اڑیسہ کے بھوبنیشور، جگن ناتھ پوری، کونارک اور اس سے پہلے کوسمبھی (الہ آباد) وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ دسویں سے تیرھویں صدی کی نقاشی میں عریانیت "تانترک مت کی دین ہے۔ اس زمانہ میں جنسیاتی جذبہ کا زور تھا۔ عشق انگیز شہوانی صورتوں کی موجودگی کی جا ہے جو بھی تاویل کی جائے اور فنی اعتبار سے ان کی خوبیوں کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے ذوق سلیم پر یہ چیز بہت گراں گذرتی ہے۔

فنی نقاشی، مصوری، بُت سازی، مجسمہ سازی (مورت کلا) سے بھی زیادہ لطیف

اور اہم ہے۔ رقص و موسیقی و اداکاری سے اس کا خاص تعلق تھا۔ خدوخال سے ذہنی کیفیات کا مطالعہ کردار کا ادراک اور لباس و اسباب، آرائش اور عقبی مناظر سے عصری معاشرت و ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ صناع کے کمالِ فن کی جانچ کی جاسکتی ہے۔ تصویر کشی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پراچین زمانے میں، جس کی تاریخ مرتب نہیں ہوئی، شروع میں ٹیڑھی میڑھی لکیروں سے کسی واقعہ کا اظہار کیا جاتا تھا۔ مثلاً جنگلی جانوروں کا شکار اور ان سے لڑائی سنگھن پور اور مرزا پور کے قدیم غاروں میں شکار کے جانوروں کی ابتدائی طرز کی تصویریں ملتی ہیں۔ تاریخی دور میں سندھ گھاٹی کے موہنجوڈارو اور مدھیہ پردیش کے جوگی مارا غاروں اور مشہورِ عالم اجنتا کی دیواری تصاویر اس قدیم اور لطیف فن سے فطری ذوق کی شاہد ہیں۔ دتسیاتا (۳ صدی) کے کام ستر میں کامیاب مصور کے ۶ آئین یا اجزا (سدرنگ) بتائے گئے ہیں صورت یا روپ کی معرفت، ناپ اور ساخت کا ادراک بھاؤ یا جذبات و تاثرات کی عکاسی طرائی و جمالیاتی نمود و نمائش تطبیق و تجنیس یہ چھ عناصر اجنتا کی تصویروں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حسن و عشق، پیار و محبت، مے نوشی کے مناظر، جذبات، محبت، حیا، غصہ، رشک و حسد، فکر کی عکاسی کی گئی ہے۔ اجنتا کے تصویر خانے میں ہندوستانی صناعوں کے قریب ۶ یا ۷ سو برس کے کمالاتِ فن کا ظہور ہوا ہے۔ ابتدائی تصاویر جو پہلی صدی عیسوی کے نویں دسویں غار میں پائی گئی ہیں کافی ترقی یافتہ تکنیک کا ثبوت دیتی ہیں۔ گپت زمانے میں جو غار کھودے گئے ان کی تصویریں زیادہ مکمل اور کامیاب نمونہ ہیں۔ خطوط کی آرائش، بزرگی، حسن ادا اور کیفیات کی عکاسی کے اعتبار سے مواد کی کمی کی وجہ سے بعضوں کا کہنا ہے کہ مابعد کا دور (ساتویں سے سولہویں صدی) نقاشی اور تصاویر کا ایک تاریک دور تھا۔ مسلمانوں کے دورِ اقتدار اور انکی توڑپھوڑ کی کارروائیوں کو بڑی حد تک اس کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ فنی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے اجنتا کے بعد حقیقی مصوری کا عروج کچھ لوگوں کو مغل راجپوت دبستان فن میں نظر آتا ہے۔ ابوالفضل کے اس جملے سے کہ "ہندو راچہ گویم کہ تصور ایں معنی (فن مصوری) بر صفحۂ خیال نکردہ بود ہمانا از اقلیم جہاں کمتر نشاں دہند" مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں

فنِ مصوری، شبیہہ کشی، طراحی کا زیادہ خیال نہ تھا۔ لیکن (اب اکبر کے فیوض سے) دنیا میں بہت کم اس کے حریف اور مدمقابل نظر آئیں گے۔ ابوالفضل کو تو ہر چیز میں اکبر کے کارناموں کو اُچھالنا اور اُجاگر کرنا تھا۔ لیکن حقیقت سے ان مفروضات کا کیا تعلق ہے، اسے بھی جان لینا چاہئے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کے عقائد و مذہب کو فنونِ لطیفہ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بجز اس کے کہ مسجدیں اور عبادت گاہیں بنائیں۔ بُت پرستی اور جاندار اشیا کی تصویر کشی کے خلاف تھے۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ مندروں اور مورتیوں کو ان کی تخریبی کارروائیوں سے نقصان پہنچا۔ ذہنی ماحول اور ذہنی رجحانات سے مجبور تھے۔ مورت سازی اور مجسمہ تراشی کو مشرکانہ عمل اور باطل طلبی سمجھتے تھے۔ لیکن جمالیاتی ذوق تعمیر و تزئین کا شوق ان میں بھی تھا۔ داعیاتِ نفس اور انسانی فطرت کی کارفرمائی سے یہ بھی نہ بچ سکے۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ ڈیمانڈ کی کتاب "اے ہینڈ بک آف محمڈن ڈیکوریٹو آرٹس"[1] میں تزئینی آرائشی فنون میں مسلمانوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایران کے ادبی، جمالی، ثقافتی عناصر سے متاثر ہو کر نہ صرف تعمیرات اور ادبی تخلیقات بلکہ مصوری، نقاشی، موسیقی کی طرف بھی جھک پڑے۔ نقش و نگار کے ایک نئے طرز یعنی خوشنویسی، خطاطی، طغرائی شکل کی گلکاری کی انھوں نے بنیاد ڈالی، جس کا فنونِ لطیفہ میں اپنی پختگی، جاذبیت اور انفرادیت کی وجہ سے ایک خاص اور اہم مقام ہے۔ عربی خط اقلیدس، ہندسی متناسب لکیروں کے ذریعے ایسے نقش و نگار، بیل بوٹے مرتب کرسکتا ہے اور زرافشانی سے اس میں ایسا حُسن پیدا ہوجاتا ہے جو آج بھی نظر نواز ہے۔ ہندوؤں، جینیوں، بودھوں کی مقدس کتابوں میں بزرگ ہستیوں کے افسانوی واقعات زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ لیکن **قرآن مجید** میں یہ ممکن نہ تھا۔ ایرانی ثقافت میں کاغذی مصوری، شبیہہ نگاری، دربار و محل، اشخاص و احوال کی تصویر کشی کا رواج تھا۔ کاغذ کی نعمت مسلمان ہندوستان میں ساتھ لائے۔ جامی و نظامی کی مثنویات فردوسی کے شاہنامے

---

[1] A HAND BOOK OF MOHAMMADAN DECORATIVE ARTS
BY S.M. DIMAND

مصور کئے گئے۔ خود قرآن مجید کے نسخے مطلاّ و مذہب کئے گئے مغلوں کے پہلے ایرانی اثرات ہندوستان میں جاری وساری ہو چکے تھے۔ ایرانی بیل بوٹے مناظر کی عکاسی نقش و نگار لباس کی آرائش اصلیت پرستی بعض نسخوں میں جو مغلوں سے تعلق نہیں رکھتے پائی جاتی ہے۔ **چند ایسی** جن چند تصاویر کا آیندہ ذکر کیا جائے گا اس کا بھی شمار انہیں میں ہے۔

یہ کہنا کہ اجنتا کے بعد سیکڑوں سال تک نقاشی اور تصویر کشی کا باب بند رہا قطعی غلط ہے۔ یہ بھی بالکل صحیح نہیں کہ زمانہ قدیم کے فنی روایات کا وسطی زمانے کے اوائل یا اواخر میں برقرار اور قائم رہنا ممکن نہ تھا۔ ڈاکٹر موتی چند نے اپنی کتاب **مغربی ہندوستان کی جینی مختصر تصاویر** میں واضح کر دیا ہے کہ اجنتا کی بودھی تصاویر کے بعد دیواری تصاویر کا دور ختم ہوا۔ ساتویں سے گیارہویں صدی کے برہمی مت کے سلسلہ کی غاریں مندر کی تصاویر آٹھویں صدی کے کیلاش ناتھ کے مندر کے نقوش آٹھویں سے دسویں صدی تک کی جینی اندر سبھا نامی نقاشی سے قدیم نقاشی کا سلسلہ اور باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ دسویں اور گیارہویں صدی میں دکھنی دیواری تصاویر نقاشی کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ فنی نقاشی کی ٹیکنیک یا طرز ادا اور طریقہ کار میں کچھ فرق ضرور آ گیا لیکن اجنتا کے اثرات و روایات بالکل مفقود نہیں ہوئے۔ بھگتی کی عوامی مذہبی تحریک، کرشن لیلا کی کشش اور رام بھگتی کے جذبے نے اس فن کو بڑی ترقی دی۔ بیرونی ایرانی عناصر کو اپنے میں سمو کر آئندہ کی راجستھانی یا راجپوتی نقاشی کی داغ بیل ڈالی لیکن بودھ اور جین فنون کے اثرات ہنوز ختم نہیں ہوئے تھے۔

بنگال اور نیپال کے بودھی تاڑ کے پتوں پر تصاویر دگمبر اور سوئتمبر جینیوں کی نقاشی اور تصویر کشی جو پہلے تاڑ کے پتوں پر لکڑی کے کتاب پوشوں سوتی کپڑوں اور بعد میں کاغذی اوراق کے باعث آرائش ہوئیں اپنی اپنی انفرادی خصوصیات کے لئے مشہور ہیں۔ بنگال کے پال طرز کی بودھی نقاشی کا دور نویں سے بارھویں صدی تک کے آخر تک بتایا جاتا ہے اور مغربی گجراتی جینی تصاویر کے دو مختلف دور ڈاکٹر موتی چند نے بتائے ہیں۔ ایک تاڑ کے پتوں اور چوبی کتاب پوشوں کی نقاشی کا دور جو سنہ ۱۱۰۰ سے سنہ ۱۴۰۰ تک رہا۔ پھر کاغذی

کتابی تصاویر کا دور شروع ہوا جو سترھویں صدی کے اوائل میں راجپوت مغل فن میں ضم ہو گیا۔ چند اُن کی جن تصاویر کا ذکر کرنا ہے وہ عبوری دور کی ہیں۔ وسطی زمانے کے مختلف اسالیب فن کی چند نمایاں خصوصیات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

رائے کرشن داس نے مغربی جینی سو تمبر اسکول کا نام اپ بھرنشں شیلی یا بگڑا ہوا طرز دار رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح سنسکرت شاعری کے بعد اپ بھرنشں ادب بے جان اور سپاٹ تھا۔ اسی طرح عصری فن نقاشی میں بھی انحطاط نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر موتی چندر اسے نہیں مانتے "تاڑ پتر والے دور ۔۔۔ یا کاغذی دور کے گجراتی دستاویزوں کی مغربی جینی تصاویر میں اجنتائی آرٹ کا لوچ ہے نہ نرمی نہ خدوخال میں وہ موزونیت و نفاست ہے نہ تنوع نہ جذبات بلند کا وہ اظہار ہے اور نہ ذہنی کردار کی کیفیات کا وہ انعکاس۔ بارھویں اور مابعد کی نقاشی میں اجنتا اور باگھ کی شاندار پُرشکوہ فطرت پرستی اور رسمی پابندیوں سے بے پروائی نہیں پائی جاتی۔ اس کی جگہ گھٹے ہوئے مضبوط جسم بھدے مسخ شدہ حلیے، چوڑے کندھے پتلی کمر بھرے بھرے اور ابھرے مدوّر سینے ایک رخی چہرے جس کا ایک چوتھائی حصہ چھپا ہوا ہے۔ لمبی نوکیلی ناک نوکیلی ٹھوڑی بڑی بڑی گھورتی ہوئی آنکھیں جس میں ایک آنکھ ناک کے آگے حلقۂ چشم کے باہر نکلی ہوئی ہے۔ یہ عمومی خصوصیات ہیں اس مغربی جینی یا گجراتی اسلوب فن عمومی جس کا دائرہ وسیع ہمہ گیر اور بجز بہار و بنگال و نیپال کے ہر جگہ بارھویں صدی سے سولھویں صدی تک پھیلا ہوا تھا۔ شکلوں میں یکسانیت ہے۔ بھدا پن ہے۔ چہرے جذبات سے خالی ہیں۔ موضوع بھی محدود۔ جینی تیرتھنکروں، دیوی دیوتاؤں، راہبوں، سربیوں سے متعلق ہے۔ قدرتی مناظر تعمیری لوازم و ماحول کی بھی کمی پائی جاتی ہے۔ گو کہیں کہیں کچھ روایتی طرز کے جانور اور درخت نظر آتے ہیں۔ ۱۳۵۰ء سے ۱۴۵۰ء کے تاڑ کے پتوں کے مختصر مصور نسخوں میں جمالیاتی طرز ادا زیادہ ترقی یافتہ دکھائی دیتا ہے۔ رنگوں میں پہلے پہل ایرانی اثر کے تحت سونے کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ پتوں کی جگہ جب چودھویں صدی کے اوائل میں جینی کلپ سوتر انسخوں نے کاغذی پیراہن اختیار کیا تو نمایاں تبدیلیاں

ظاہر ہوئیں۔ نقاشی تصویر کشی کے لئے وسیع تر میدان ملا۔ خوشحال دولت مند جینی مسلمانوں اور ایرانیوں سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے۔ اور یہ مصوروں کے مربی تھے۔ روپیہ پانی کی طرح بہاتے تھے۔ جین بھنڈار علم و فن کے احیاء و بقا کے لئے قائم کئے گئے۔ ۱۳۹۴ء کی ایک کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے لاکھوں اشرفیاں کلپ سوترا اور کالکا چاریہ کتھا کے مصور نسخوں کے تیار کرنے کے لئے دیں۔ اس لئے مغربی گجراتی مصوری کے لاتعداد نمونے منظر عام پر آئے۔ اس دور کی نقاشی میں زیادہ نفاست بھی ہے۔ وسعت و تنوع بھی ہے انسانی پیکروں اور چہروں میں پچھلے دور کی تصاویر کی طرح روایتی یک رخی آ گئے باہر نکلی ہوئی ایک آنکھ سکڑی مڑی ہوئی شکل نوکیلی ٹھوڑی اور ناک نظر آتی ہے۔ جس کا اولین خاکہ ۹ ویں صدی کے ایلورا کے کیلاش ناتھ مندر اور مدنپور ضلع للت پور کے وشنو مندر میں دکھائی دیتا ہے لیکن یہ تصویریں اتنی بھونڈی ہیبت ناک اور مضحکہ خیز نہیں ہیں جیسی اوائل کے تاریخ کی تھیں ان میں جان ہے، گہرائی ہے دلکشی ہے کسی جگہ ایرانی جنگجو اپنی پگڑیوں اور کوٹ کے ساتھ ہیں۔ کہیں ایرانی طرز کے بیل بوٹے حاشیہ کے نقش و نگار اور اسلامی مساجد و محلات کے رنگین ٹائلوں کے نمونہ کے تزئینی خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ یہ طرز جینیوں کا مخصوص اسلوب تھا اور ۱۴۰۰ء کے کچھ بعد تک باقی رہا۔ اس کا خاص مرکز گجرات تھا گجراتی جینی تاریخ کی پہنچ دور دور تک تھی۔ غیر جین دین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ گجراتی مغربی ہندی جینی طرز پوتی، راجستھانی اور دکنی اور مغربی بنگال کی نقاشی پر کافی اثر انداز ہوا۔ بوسٹن میوزیم میں ایک مرقع چھوٹی چھوٹی تصاویر کا ہے جسے پروفیسر نورمن براؤن ۱۵ ویں صدی کے اواسط کا سمجھتے ہیں اور لکھتے ہیں " ان میں کلپ سوترا اور کالکا چاریہ کتھا کے نسخوں کی بہ نسبت چند نادر عناصر تصویر کے مختلف حصوں کی ترتیب و درستگی، پتوں پنکھڑیوں کی تزئین و آرائش چرند و پرند کی کثرت عمارتی لوازم گھر بار اور دوسری طرح کے مناظر کی صورت میں ملتے ہیں۔ نقوش زیادہ نفیس لطیف اور سبک ہیں۔ بناوٹ و ترکیب زیادہ پیچیدہ اور نئے جسمانی انداز (Pose) نظر آتے ہیں۔ اوترا دھیان سوترا کے چار پانچ مصور نسخوں میں جو احمد آباد بروڈہ وغیرہ میں پائے گئے اور جنھیں

نورمن براؤن ۱۵ویں صدی کے اواخر یا ۱۶ویں صدی کے اوائل کا بتاتے ہیں اور جن میں سے ایک پر ۱۵۹۱ء کی تاریخ بھی ثبت ہے ٹکسالی جینی خصوصیات کے علاوہ چند ایسے مزید عناصر پائے جاتے ہیں جو بدیہی طور پر ایرانی اثرات کی غمازی کرتے ہیں۔ ایک میں تو کلاہ دار پگڑی بھی موجود ہے۔ بیل بوٹے اور طغرائی گلکاری ہے مقابلتہً اصلیت پرستی کی طرف کچھ زیادہ رجحان بھی ہے۔ بال گوپال ستت دینتو کا موضوع کرشن بھگتی ہے یہی حال بیشتر بالعموم بنگال کے بارہویں صدی کے جے دیو کی لاثانی سنسکرت نظم گیتا گووند کا ہے اس کے مصور نسخوں میں کئی چھوٹی چھوٹی تصاویر ہیں جو جینی طرز کی ہیں۔ لیکن قدرے اختلاف کے ساتھ انسانی پیکروں میں زندگی کی لہریں زیادہ رواں دواں ہیں۔ کافی خوداعتمادی کے ساتھ مصور ایک واقعہ کا تصور اپنے موئے قلم سے پیدا کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور تصویر کی ساری فضا نظر کے سامنے آتی جاتی ہے۔ ہر ایک تصویر جداری تصویر کی جگہ آسانی سے لے سکتی ہے۔ ان سبھی مہتا انہیں ۱۵ویں یا ۱۶ویں صدی کے اوائل کی بتاتے ہیں لیکن ڈاکٹر موتی چند بعد کی سمجھتے ہیں اس بنا پر کہ اس میں باہر نکلی ہوئی خلا میں دکھائی دینے والی آنکھیں نہیں ہیں۔ نہ وہ غایت قسم کی زاویہ داری اور دُبلا پن جو مغربی ہند کے اسلوب فن کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ مردوں کے لباس میں مغلوں کے چاکدار جامہ کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے وہ اسے ۱۵۷۵ء کے لگ بھگ کا سمجھتے ہیں۔

۱۵ویں ۱۶ویں صدی کے چند اور مصور نسخوں کی طرف کچھ اشارات چند اُن کی تصاویر کے تذکرہ سے پہلے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ مانڈو (مالوہ) کے ۱۴۳۹ء اور جونپور کے ۱۴۱۵ء کے نسخے جینی کلپ سوتروں کے نمونہ پر تیار ہوئے لیکن معیاری روایتی طرز سے ان میں کچھ انحراف و تجاوز برتا گیا ہے۔ ڈیبو جی۔ آرچر لکھتے ہیں مانڈو والے نسخے کے اشخاص میں تیزی، بھر تیلا پن اور چھبیلا پن ہے۔ ترتیب اور ترکیب میں جاذبیت بڑھا دی گئی ہے اور ایک ٹکسالی چیز لہراتی آسمانی فضا شامل ہے۔ جونپور والے نسخہ میں سر زیادہ چوکور یا مربع نما ہے۔ خدوخال کی خاکہ کشی میں بجائے ہچکچاہٹ کے تروتازگی موزونیت کی ایک نئی فضا ہے۔ تجاوز و انحراف مقامی حالات کے سبب ہو سکتا ہے۔ حالانکہ خود گجرات میں ایرانی مصور نسخوں کے اثر سے حاشیوں کی آرائش و زیبائش

شروع ہو چکی تھی۔ جونپور کا نسخہ حسین شاہ شرقی کے دور میں تیار ہوا۔ ۸۶ صفحات ۵۸ چھوٹی تصویریں اور ۴۷ حاشیے ہیں۔ ان میں بھی ناک اور ٹھڈی نوکیلی ہے۔ ایک آنکھ باہر چہرے سے پرے دکھائی گئی ہے لیکن عورتوں کی مزین شکلیں زیادہ صاف اور دلآویز مغلوں جیسی ہیں۔ جسم کا سکوڑ و مروڑ جو مغربی اسلوب میں پایا جاتا ہے ان میں نہیں ہے مالوہ کے دو نسخے فارسی کے بھی قابل ذکر ہیں۔ ۱۴۳۶ء میں محمود خلجی نے مالوہ پر قبضہ کیا۔ راجستھان اور دکن پر چڑھ دوڑا۔ لیکن بقول فرشتہ ہندو مسلمان اس کے عہد میں خوش تھے۔ اور علوم و فنون کا یہ قدرداں تھا۔ ۱۴۶۷ء میں بخارا کے تیموری حکمراں کی سفارت اس کے دربار میں پہنچی اور بیرونی اثرات بھی ساتھ لائی۔ اس کا بیٹا اور جانشین غیاث الدین خلجی ۱۴۶۹ میں حوصلہ طلب حکمراں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پندرہ ہزار عورتیں اس کے محل میں تھیں۔ جن میں فنکار بھی ہوں گی۔ ایران و بخارا سے ثقافتی تعلقات قائم تھے۔ اس کے مرنے پر اس کا بیٹا نصیر الدین محمود تخت نشین ہوا۔ ۱۵۰۳ میں سعدی کی بوستان شہسوار خطاط نے لکھا اور حاجی محمود نے اسے مصور کیا۔ ان کی ۱۳ تصاویر میں بخارا کی چھاپ ہے۔ لیکن اس کی ایک ٹکسالی چیز مستطیل نما پٹیاں جو بیل بوٹے نقش و نگار سے معمور تھیں' مالوہ کی نقاشی کا مستقل جزو بن گئیں۔ دوسری اور اہم کتاب نعمت نامہ ہے جو اسی زمانہ میں لکھی گئی ہے اور جس میں پچاس تصاویر ہیں۔ شیرازی طرز اس پر اثر انداز ہے لیکن بنیادی طور پر یہ ہندی تصویریں کہی جاسکتی ہیں۔ لباس اور بدن کے ساتھ غلام لڑکوں کی جگہ کنیزیں' اشجار کی بہتات ہندیت کی علامت ہیں لیکن جونپور کے ۱۴۶۵ کے مصور نسخوں کی طرح اس پر بھی چینی تصویروں کا گہرا اثر ہے۔

تاریخ کی طرح فنون میں بھی تسلسل و تواتر پایا جاتا ہے۔ پچھلے سلسلے کو آگے بڑھانے والے کچھ تو روایتی طرز کے حامی لکیر کے فقیر ہوتے ہیں اور کچھ روایتی معیار سے آگے بڑھے زوائد و تبدیلی کے درپے دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان کے فنون لطیفہ بالخصوص نقاشی و مصوری میں اجنتائی اور مغل و راجپوت فنون کے درمیان عبوری دور میں مکمل خلا کا نظریہ صحیح نہیں ہندوستان کا کلاسیکی (ٹکسالی) طرز دکن کے مختلف حصوں میں باقی رہا۔ اور شمالی و مغربی ہندوستان میں بھی ماضی و مستقبل کی کڑیاں بالکل مفقود نہیں ہوئیں۔ مختصر تصویر سازی کا گجراتی جینی اسلوب نارتھ کے

پتوں، چوبی کتاب پوشوں، سوتی کپڑوں وغیرہ پر گیارہویں صدی کے اواسط سے شروع ہوا پھر کاغذی مصور مخطوطات کا دور آیا جو سولہویں صدی کے اواخر قریب پانچ سو برس تک قائم رہا۔ بعد ازاں اس کی جگہ راجستھانی مغل طرز اسلوب نے لے لی۔ سوتی کپڑوں کی نقاشی بارھویں صدی میں چین سے ہندوستان پہونچی اور گجرات میں اسے کافی فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ منقش سوتی کپڑے مصر تک جا پہنچے اور فسطاط میں دکھائی دیے۔ مغربی ہند یا گجراتی جینی تصاویر کی خاص قسم کی صورت گری آنکھ، ناک، ٹھوڑی کی مخصوص ساخت جسم پر بجائے گداز پن کے چپٹا پن، خد و خال کا نوکیلا پن، رنگوں کی کثرت، یک رخی چہرہ کی ایک آنکھ کا باہر نکلا ہوا ہونا، روایتی محدود موضوع، یکسانیت حسن ادا اور تاثر کی کمی کی طرف کچھ اشارات کئے جا چکے ہیں لیکن یہ گجراتی اسلوب ہمہ گیر تھا۔ اور بنگال و بہار و نیپال کے علاوہ ہر جگہ اس کی چھاپ تھی۔ اسی طرز کے سانچے میں ڈھل کر بعد میں مانڈوی، مالوی، راجستھانی، جونپوری طرز منظر عام پر آئے۔

مرگاوتی ایک اودھی زبان کی منظوم کتھا ہے جسے شیخ قطبن نے حسین شاہ جونپور کے آخری شرقی سلطان کے عہد میں تصنیف کی۔ اس کے بعد ایک مصور نسخہ کے چند اجزا کلا بھون بنارس میں موجود ہیں اس میں اور دلی میں پائے گئے مہا پوران کے ایک مصور نسخے میں جو ۱۵۴۰ء کا ہے۔ جینی مصور نسخوں سے بہت باتوں میں انحراف پایا جاتا ہے۔ باہر نکلی ہوئی آنکھیں دکھائی نہیں دیتیں لیکن جونپور کے ۱۴۵۹ء والے نسخے میں چہرے اور آنکھ کی روایتی ساخت موجود ہے۔ اگر اس میں بھی کچھ معنی خیز روایت اور تبدیلیاں مثلاً ایرانی بیل بوٹے فضا میں پیچیدہ بادل نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عناصر کی آمیزش ۱۵ ویں صدی میں خاص طور پر شروع ہو چکی تھی۔ دیوسن پد کلپ سوتر (تقریباً ۱۴۷۵ء) مانڈو کے ۱۴۳۹ء کے کلپ سوتر میں مقامی اور بیرونی اثرات نمایاں ہیں۔ ایک فرد کے سر پر کلاہ دار پگڑی بھی نمودار ہے اور یہ باتیں باعث استعجاب نہیں اس لئے کہ مسلمانوں سے جینیوں کے خوشگوار تعلقات تھے۔ جینی تجار کاروبار کے سلسلے کی بدولت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے فارسی مصور نسخوں کی ہندوستان میں کمی نہ تھی اور ان کی نگاہوں کے سامنے آنا غیر ممکن نہ تھا۔ راجگیر (بہار) میں ایک جین نے مندر بنوایا تھا جس میں ایک سنسکرت زبان کا کتبہ تھا۔ اس میں بنام فیروز شاہ تغلق ملک ابراہیم عرف ملک بیّو مقطع بہار اور ملک نصیر الدین شحنہ راجگیر کا جن الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے اس سے جینیوں اور مسلمانوں کے

تعلقات پر روشنی پڑتی ہے ۔ گجرات میں مغلوں سے سیکڑوں سال پہلے ایک اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی ۔ مانڈو اور جونپور کے سلاطین علوم و فنون کے قدرداں تھے ۔ انھیں مسلمان سلاطین کے اثر سے ایک نئے طرز کی عکاسی، نقاشی اور مصوری کی داغ بیل پڑی جس میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کا نہایت دلآویز امتزاج و اتصال دکھائی دیتا ہے ۔ یہ طرز مغلوں کے طرز سے مختلف اور یقیناً اکبر سے پہلے کا ہے ۔ اس طرز میں آنکھیں باہر نکلی دکھائی نہیں دیتیں ۔ چہرہ کی ساخت میں زیادہ نفاست ہے ۔ گو بھدا پن اور بھونڈا پن اب بھی موجود ہے ۔ مردوں کے لباس میں کلاہ دار پگڑی ۔ گھٹنوں سے نیچے تک کا جامہ کمربند اور لٹکا ہوا ٹپکہ ہے نہ مغلوں کے چاکدار جامے ہیں نہ اٹ پٹی پگڑی نہ دھوتی ہے نہ پائجامہ اور دھوتی کی آمیزش عورتیں تنگ چولی گھاگرا اوڑھنی میں ملبوس ہیں ۔ پھولوں سے بھری چھوٹی چھوٹی پھیلی ہوئی ٹہنیاں اور ایرانی طرز کے درخت اور بیل بوٹے ہیں ۔ فضا میں چھیدار ابر اور تعمیراتی عناصر میں مزید خوشگوار تبدیلیاں ہیں یہ باتیں کسی خصوصی طرز کا پتہ دیتی ہیں ۔ مانڈو کے نعمت نامہ میں یہ طرز زیادہ نمایاں ہے اور اسی طرز کے نمونے مقامی حالات سے متاثر ہو کر کچھ تبدیلیوں کے ساتھ ہمیں ان دس تصاویر میں بھی ملتے ہیں، جو ملا داؤد کی مشہور اودھی پریم کتھا چنداین (لور چندا) کے نسخے میں دیکھنے میں آئی ہیں جو لاہور سے شملہ بعد میں چنڈی گڑھ میں لائی گئیں ۔ بھوپال کے چنداین کے نسخے کی تصاویر ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہیں ۔ شاید ڈاکٹر موتی چند اور کارل کھنڈل والا صاحب جو ماہر فن ہیں اس کے متعلق سیر حاصل مقالہ پیش کریں ۔

چنداین ۷۸۹ھ میں فیروز شاہ تغلق کے وزیر جونا شہ ملقب بہ خان جہاں کو معنون کی گئی ملا داؤد شاید یو ۔ پی کے ڈلمؤ شہر کے رہنے والے تھے ۔ اپنی نظم ملک نتھن کو سنائی تھی ۔ شاید انھیں کے اشارے پر انھوں نے ہندوستان کے پست اقوام کے ایک متداول روایاتی قصہ کو جو آج بھی بہار، یو پی، مدھیہ پردیش کے عوام میں راسخ ہیں اسی زمانہ کی بولی میں منظوم کیا ہے "برس سات سے ہوئے اوناسی ۔ تہھیا یہ کبی سر سے بھاسی ۔ شاہ پھیروج دلی سُرطانا ۔ جونا شاہ ادجیر بکھانا ۔ ولمؤ نگر بسے لورنگا ۔ اوپر کوٹ تھے بہے گنگا" ملا داؤد نے

تین جگہ اپنا اور خاں جہاں اور سراج الدین کا نام لیا ہے۔ ” داؤد دکب جو چاند اگائی۔ جین رُسنا سوکا مرجھائی۔ سراج دین سو کمنڈ داؤد دکھے سنوار۔ تبھی جو بجھ جس داؤد گا وا۔ مک نخعن سن بول ہماری۔ منیر شریف کے نسخے میں ۴۴ اوراق اور ۴۶ بند ہیں۔ اتنے ہی بند بھوپال کے مصور نسخے میں ہیں۔ ان کے علاوہ قریب ۲۵-۲۶ متفرق بند لاہور، چنڈی گڑھ اور بنارس کے کلا بتون کے پاس ان اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان سب میں قریب سات بند تو مشترک ہیں لیکن مجموعی تعداد اصل کتاب کی ضخامت سے بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ منیر کے نسخے کا پہلا ورق ۴۴۱ ہے۔ بھوپال کے نسخے میں کوئی ترتیب ترک اور صفحات کے تعداد نہیں ملتے۔ قصہ تو پوری کتاب کی دریافت کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ موٹی موٹی باتیں یہ ہیں کہ گوونگر کا ایک اہیر ذات کا سورما لورک میناں رانی اپنی بیاہتا بی بی کی موجودگی میں سہدیو مہر کی خوبصورت بیٹی چاندا پر جس کی شادی باون سے ہو چکی تھی۔ فریفتہ ہو کر گھر سے نکل پڑتا ہے۔ بہت لوگوں کے ساتھ جنگ کرنی پڑتی ہے سب پر غالب آتا ہے۔ چاندا کو سانپ ڈس لیتا ہے۔ مگر اوجھا کا منتر اسے پھر زندگی بخشتا ہے۔ ایک پنچایتی سبھا میں لورک سے پوچھا جاتا ہے ”کون لوگ گھر کہوان تورا کہوان ایسی تیری نین پائی۔ کا کر رہی ہے۔ کہوان جائی“ لورک جواب دیتا ہے ” جات اہیر ہم لورک ناؤن گوور نگر ہمار۔ پورتھا لوزن۔ سہدیو مہر کی چاندا دھیا۔ لہر بیاہ باون سون کیا۔ باون گبیر ہارے آیون۔ چاندا تیری سر دھیہ پائیون۔ بالآخر“ بار بیاہی میناں ”کی وفاپرستی رنگ لائی۔ لورک کو پچھتاوا ہوا کہنے لگا۔ تجھا قریون باپ“ بھائی ” مہتاری۔ تجیون بیاہی میناں رانی۔ لوگ کٹنب گھر بار سب رہیون۔ دیس تیا ڈیر دیس سدھاریون۔ گاؤں ٹھاؤں موئے ہتواں دھاؤں۔ بسکیم اوجار گئی کہہ پاؤن۔ ”تقدیر کے مون کھنون۔ چاند سنیہہ دلنیتہ لینھوں“ اس طرف برہ ستائی میناں بھی ماہی بے آب کی طرح بسمل تھی۔ ” نینی دکھ سنیہی رودے بھائے۔ جس مچھری بن نیر مر جھائے :“ جب لوگوں نے دیوالی اور پرب کی یاد دلائی کہنے لگی ” موہی لیکھے سب جگ اندھیارا لے گئی چاندا موراُ دھیارا۔ کہون دیوار کی دیکھنوں آئی۔ او تم پرب تو کھیلاہی گائی۔ اس کے پیغام بر سرجن کہاٹ نے جب فراق زدہ میناں کا حال لورک سے کہا تو اس کا دل پگھلا کہنے لگا۔“ کھے پائین

تورباہمن اپنے سیس چڑھاؤں ۔ مائی بھائی میناں کمر کھیم کو سر جو پاؤں" چاندا کو یہ بات کب بھا سکتی تھی ۔ جب دونوں ایک دوسرے سے ملیں تو چاندا اور میناں میں جھڑپ ہوگئی ۔ ملاّ داؤد نے بارہ ماسہ بھی چند اثن میں شامل کیا اور شاید ہندی زبان میں یہ پہلا بارہ ماسہ ہے ۔ سال کے بارہ مہینوں کی خصوصیات کا اس میں ذکر آتا ہے ۔ تصاویر میں اس کی عکاسی کی جاتی ہے ۔ قصہ کی کچھ خاص خاص چیزوں پر بھی مصور نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہوگی ۔ بپیش نظر دنلس تصاویر کی خصوصیات پر مجھ جیسے عامیانہ شخص کا تبصرہ شاید درخور اعتنا ہوجائے ۔ اس لئے کچھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں ۔

ہر تصویر کے ایک گوشے میں چند اثن کے مصنف ملا داؤد کی شبیہہ کھڑے یا بیٹھی حالت میں دکھائی گئی ہے ۔ ایک قدرے سانولے ضعیف ریشائیل ۔ بزرگ ہاتھوں یا کمر میں تسبیح لٹکائے سر پر کلاہ دار پگڑی اوڑھے پوری چُست آستینوں والی تکمہ دار صدری یا مرزائی یا دوہرے بیس کا کوٹ یا شلوار نما پائجامہ پہنے نظر آتے ہیں ۔ ایک تصویر میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں ۔ صدری یا کوٹ یا چُست پائجامہ کے اوپر مہین جھلمل کپڑے کا ایک لمبا قدموں تک کا نیچا جامہ ہے ۔ جس کے سامنے نیچے کے دو کنارے کٹے ہوئے ہیں ۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی نشانی سبحہ گردانی اور تلاوت قرآن مجید ہے ۔ تقریباً ہر تصویر میں اس ضعیف العمر بڑی بڑی آنکھوں والے بزرگ کے سامنے رحل پر ایک مقدس کتاب دکھائی گئی ہے ۔ جس میں عربی خط نسخ میں کچھ عبارت بھونڈے طرز سے تحریر کی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ ہر جگہ مالیقرا نہیں ۔ لیکن ہر ایک میں اللہ کا نام صاف طور پر موجود ہے ۔ ہر تصویر کئی پٹیوں میں منقسم ہے ۔ تصویر نمبر ۲ کے اوپری تختے کے دائیں خانے میں ملا داؤد بیٹھے ہوئے پڑھ رہے ہیں ۔ سامنے رحل پر کتاب ہے ۔ ہاتھ میں بھی اسی کتاب کا جزء ہے ۔ بیچ میں ایک لوٹا ہے ۔ رحل پر عبارت کا دوسرا ٹکڑا ہے ۔ مصور نے غالباً جو مندو تھا ۔ دی ہوئی عبارت قرآن "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ" کو کسی طرح لکھ دیا ۔ کوئی مسلمان مصور آیات قرآنی کو مسخ ہونے نہیں دیتا اور تسبیح کو بائیں ہاتھ میں نہیں دیتا ۔ یا کمر سے لٹکا یا نہیں دکھاتا ۔ احترام مانع تھا ۔ اس تصویر میں یہ بزرگ جس جگہ بیٹھے

دکھائی دیتے ہیں وہ کشادہ کمرہ یا سائبان ہے جو ستونوں پر کھڑا ہوا ہے۔ بائیں طرف چار خوشنما تین لٹوؤں والے پایوں پر ایک نہایت عمدہ بنا ہوا تخت رکھا ہوا ہے۔ اس میں پھول پتے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے نیچے کی نسبتاً زیادہ چوڑی پٹی میں دو گنوری قسم کی عورتیں کھانا پکانے میں مشغول ہیں۔ چولھا پر ہنڈیا یا کڑاہ چڑھا ہوا ہے۔ ایک دستہ دار ہے۔ دونوں کے ہاتھ میں کرچھل یا کفگیر ہے۔ دو برتن بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پایہ دار ہے۔ دوسرا انسلا دیوار سے لگا ہوا ہے۔ دونوں عورتیں جن میں ایک سیاہ دکھائی گئی ہے۔ گھاگرہ پوری آستین کی بدن سے سٹی ہوئی چولی یا کوئی ہار یا کنگن پہنے ہوئی ہیں۔ سیاہ عورت کے سر پر تکونی شکل کا جوڑا ہے۔ دوسری عورت کے بال گردن تک لٹکے ہوئے اور موباف سے بندھے ہوئے ہیں۔ آخری خانہ میں جو ایک منقش پھولوں سے آراستہ پٹی کے نیچے ہے۔ تین چار برتن ہیں۔ بیچ میں گھڑا اور ادھر اُدھر قاب یا بڑے پیالے دکھائی دیتے ہیں۔ باورچی عورتوں کا چہرہ دھندا آنکھ بڑی اور پیر ننگے ہیں۔

تصویر نمبر ا کے بالائی خانے میں دائیں جانب ملّا داؤد ایک ستون دار کمرے یا سائبان میں کھڑے ہیں۔ بائیں طرف ایک لمبے دستے کا ٹونٹی دار پانی پینے کا برتن ہے اور اس کے آگے رحل ہے۔ جس پر کوئی چیز رکھی ہوئی ہے۔ دوسرے خانہ میں ایک عمارت کا وسیع قبہ دار بالائی حصہ ہے۔ جس کا خوبصورت کلس پانچ حصّوں میں منقسم ہے اور اس کے دائیں بائیں ساری عمارت کے اوپر پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں۔ نیچے غالباً مندر کا بڑا کمرہ دکھائی دیتا ہے جس کا بالائی حصہ منقش پردہ سے آراستہ ہے۔ داہنے طرف ایک عورت اوڑھنی نیم آستین چولی گھاگرا میں ملبوس ہست پھول مانگ ٹیکا کنگن سے آراستہ شیولنگ پر پھول گرا رہی ہے۔ اس کے سر کی چوٹی کمر سے نیچے تک لٹکی ہوئی ہے بائیں طرف کی عورت اسی وضع قطع کی ہے۔ پوشاک و زیورات پہنے ہوئے۔ بیچ کی دو عورتوں کی جو میناں اور چاندا ہیں لڑائی چھڑانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ غالباً یہی وہ موقع ہے جن کا اظہار ملّا داؤد کے اس بیت سے ہوتا ہے۔ "بھر کے چاندا جو جھ اوپادا ؛؛ بھئی جو جھ جس داؤد گا دا" میناں

اپنے غصہ کو جس کی غمازی اس کی بڑی قہر آلود آنکھیں کر رہی ہیں۔ ضبط نہ کر سکی اپنا ہاتھ اپنی سوت کے بالوں پر پہونچا دیا۔ چاندا بھونچک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے لباس کافی قیمتی ہیں۔ مینساں کی چولی تنگ بدن سے سٹی ہوئی پیٹھ پر خالی فیتے سے بندھی ہوئی ہے۔

چار خانوں والی تصویر نمبر ۳ سب سے زیادہ کٹھن اور کئی اعتبار سے بہت اہم ہے سب سے نچلے حصے میں داہنی طرف ایک خوبصورت محراب دار عمارت ہے جس میں ملا داؤد اور ان کے سامنے ایک نوجوان بھی کلاہ دار پگڑی اور سادے لباس یعنی بدن سے سٹی ہوئی آستین دار صدری کشادہ شلوار نما پائجامہ میں ملبوس دکھائی دیتے ہیں۔ بیچ میں رحل ہے کتاب کی عبارت اعلم بشکر اللہ ان اللہ شاید قرآن کی آیت واعلموا ان اللہ شکوراً حلیما کا مسخ کردہ جزو ہے۔ ملا کے داہنے ہاتھ میں تسبیح لٹک رہی ہے اور وہ چھڑی کندھے پر رکھے ہوئے مخاطب کی طرف گھور رہے ہیں نوجوان جس کی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ شاید ملا کا کوئی شاگرد ہو سکتا ہے جس جگہ بیٹھے ہوئے ہیں اس کا بالائی حصہ اور زیریں حصہ اور داہنے طرف کی دیوار بیل بوٹوں سے منقش ہے پتھر کے سادے لیکن سڈول ستونوں پر اسلامی طرز کے تیتیا یا سہ گوشہ ستونوں اور محرابوں کا اوپری حصہ چھجہ دار ہے۔ اس خانہ کا دوسرا حصہ کھلا ہوا میدانی ہے جس کے سرے پر پرانی طرز کے پیچیدہ بادل آسمانی فضا کی دلالت کرتے ہیں۔ اس کشادہ میدان میں ایک درجن آدمیوں کی تصویریں ہیں جو عوام سے تعلق رکھنے والے مذہبی قسم کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں پانچ سیاہ فام ریش و بروت سے معرا ہیں ان میں سے تین اور اسی وضع قطع کے ایک سفید فام شخص کے منہ میں نفیری یا قرنا ہے۔ ایک معمر شخص جس کی داڑھی کا بال سفید لیکن ننگے سر کے بال کالے ہیں۔ پلتھی مار کر آسنی طریقہ سے بیٹھے ہوئے اور ایک ہاتھ کو جس میں مالا لپٹی ہوئی ہے۔ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایک شخص جس کی لمبی گھنی سیاہ مونچھیں اور داڑھی اور بڑی گھورتی ہوئی آنکھ سے ہیبت ٹپکتی ہے۔ چپٹی پگڑی سیاہ صدری اور جانگھیہ میں ملبوس آگے کی طرف قدم زن ہے۔ تیسرا ریشائل محض پٹی دار چپٹی پگڑی اور دوہرے پیش کی بدن سے سٹی ہوئی پورے آستینوں والی صدری جس کا دامن داہنی طرف کندھے کے نیچے بندھا ہوا ہے پہنے

ہوئے آسنی طریقے سے بیٹھا ہوا ہے اور دونوں ہاتھوں کو زاویہ بنائے ہوئے وجد کی کیفیت کا اظہار کر رہا ہے۔ ایک بھونکتے ہوئے پالتو کتے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے اوپر کے خانے میں دو قبہ دار گول لال باری (خشتی یا ستونی) یا کمرائی عمارت سنگی یا خشتی ستونوں پر قائم ہیں۔ سامنے کی خانہ دار دیوار منقش ہے۔ ان کے درمیان ایک نہایت خوبصورت متناسب الاشکال خشتی یا ستونی سیڑھی دار پانچ قطاروں کی ایک اہرامی عمارت ہے۔ اس کے اندر مثلثی طرز کے خلا میں جو سیاہ رنگ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ایک تکونی جگہ شاید بیدی پاٹ یا قربان گاہ کی ہے۔ یہ عمارتی حصہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی صحیح اہمیت، نوعیت معنی و مفہوم حل طلب ہے۔ تیسری اوپری پٹی کے بیچ میں اینٹ یا پتھر اور گچ سے بنا ہوا ایک تالاب ہے جس میں کنول اُگے ہوئے ہیں۔ اور مچھلی اور بط تیر رہی ہے۔ دونوں طرف ستونی محراب دار کمرے ہیں جن میں ایک سیاہ فام اور دو سفید فام اشخاص دو زانو بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ غالباً یہ پجاری ہیں ایک کے بغل میں توشہ دان بندھا ہے سب سے اوپر کے خانے کے وسط میں ایک ستونی چھجہ دار عمارت ہے جس کے بیچ شاید ایک گول دائرہ نما کھڑکی ہے۔ داہنی طرف ایک چھوٹی پختہ قبہ دار بے دروازہ کی مندر ہے۔ بائیں جانب ایک زیادہ خوبصورت ستونی سقفی دالان ہے جس میں ایک ننگے سر پریشان شخص مالا لئے ہوئے کھڑا ہے اور اس کے باہر داہنی طرف ایک پجارن ہاتھ میں مالا لئے ہوئے بیٹھی ہے۔

تین خانوں کی ایک تصویر میں تین عورتیں اور ملا داؤد کو ملا کر سات مرد ہیں اوپر داہنی طرف ملا داؤد ایک بڑے کمرے میں جس کی ایک دیوار اور چھجہ دار سقف منقش ہے، داہنے ہاتھ میں تسبیح لٹکائے رحل پر کسی کتاب کی طرف متوجہ ہیں ان کے لباس میں ایک نئے طرز کا دھاری دار پٹکا ہے جو حالت نشست میں دونوں پیروں سے نیچے لٹکا ہوا ہے۔ رحل کی کتاب کی عبارت نسبتاً زیادہ واضح ہے لیکن اگر اسے نستکر اللہ محمد و تیمراللہ پڑھا جائے تو کوئی مطلب و مفہوم نہیں نکلتا۔ معلوم ہوتا ہے یہاں بھی مصور نے کسی شخص کے عنایت کردہ برکت والے فقرہ کو غلط طور پر تحریر کر دیا ہے۔ بائیں طرف کے کمرے میں جو طویل ستونوں پر قائم سب

ستونوں کے ٹھیک اوپر اور گنبد کے نیچے کا حصہ سادہ لیکن درمیانی حصہ نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ کمرہ کا فرش عمدہ پچی کاری کا نمونہ پیش کرتا ہے اس میں غالباً لورک اور چاندا بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ یک رُخی شبیہیں خوبصورت ہیں وجیہہ الصورت لورک کلاہ دار پگڑی پورے آستینوں والی دوہرے دامن کی صدری جو بائیں طرف بغل کے نیچے تکموں سے بندھی ہوئی ہے۔ شلوار نما پائجامہ اور ٹپکہ میں ملبوس ہے۔ زانو پر پھندنا لگی ہوئی چھڑی ہے۔ چاندا کی مہین اوڑھنی تنگ چولی جو سینہ پر آکر ختم ہو جاتی ہے گھاگرا اور بچھ پھول اور نیچے لٹکی ہوئی گُندھی بالوں کی چوٹی نمایاں ہے۔ دوسرے خانے میں ایک وسیع مسقف ہال دکھایا گیا ہے جس میں بجائے بیچ کے دائیں طرف گنبد دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک تعمیراتی خامی ہے۔ چھت کے نیچے ایک نہایت منقش جھالردار شامیانہ ٹنگا ہوا ہے۔ داہنی طرف دو شخص بیٹھے باتیں کر رہے ہیں کلاہ دار پگڑی سب کے سر پر ہے۔ لیکن صدری قدرے مختلف ہے۔ ایک کی صدری میں دونوں طرف متعدد تکمے ہیں۔ بیچ کا شخص بائیں ہاتھ میں تلوار لئے ہوا ہے۔ چست پائجامہ اور لٹکتا ہوا پٹکا ہے۔ وہ عجیب انداز سے کھڑے ہو کر ایک امیر شخص سے جس کے گلے میں ہار ہے اور جو ایک مسند پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کے زانو پر پھندنے دار چھڑی ہے سرگرم گفتگو ہے۔ اس امیر کے پیچھے ایک ملازم کلاہ دار پگڑی چست پائجامہ اور ٹپکہ میں ملبوس کھڑا ہوا اپنے آقا پر مورچھل جھل رہا ہے۔ نیچے کے خانے میں دو کمرے ہیں جس کی چھت اور دیواریں منقش ہیں داہنے طرف کے کمرے میں دو عورتیں ہیں جن میں ایک اپنی زیبائش و آرائش کی وجہ سے مالکن معلوم ہوتی ہے۔ آپس میں بات چیت کر رہی ہیں۔ پوشاک دونوں کی ایک سی ہے لیکن ایک کے چہرے پر سیاہی دوسرے کا خد و خال گورا دکھایا گیا ہے۔ خادمہ یا سہیلی کے کان میں بڑا مدور بالا ہے۔ بایاں کمرہ جس کی چھت اور ستونوں میں زاویہ نما منقش پردہ لگا ہوا ہے خالی ہے ایک پلنگ تکیہ اور منقش بستر سے ڈھکا ہوا رکھا ہے۔

دو تصویریں بارہ ماسہ کی عکاسی اور پوس اور پھاگن کے مہینوں کی فضا کی منظر کشی کرتی ہیں۔ پوس کے متعلق چار خانوں کی تصویر کے نیچے حصے میں مسقف کمرے ہیں۔ داہنے طرف کا

کمرہ جس کے چھت اور ستونوں میں زاویہ نما منقش پردہ اور شاید جلتی ہوئی شمع دکھائی گئی ہے۔
افراد سے خالی ہے ایک تخت یا پلنگ نہایت خوبصورت منقش بستر۔ دو لمبے اور ایک گول تکیہ
سے آراستہ ہے اور بائیں طرف کے کمرہ میں جس کی چھت میں جھالردار پردہ ہے، شاید
لورک اور چاندا اپنے اس وقت کے استعمالی لباس میں ملبوس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ عورت
کا دایاں مرد کا بایاں ہاتھ اٹھا ہوا ہے اس کے اوپری بغل میں دو خالی کمرے ہیں
جن میں دو خالی پایہ دار پلنگ یا تخت منقش قالینوں یا دوسرے قسم کے بستروں تکیوں
اور مسند سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ایک کی چھت پر جھالردار پردہ ہے۔ دوسرے کمرہ کی چھت
منحنی دار بنگلہ نما ہے۔ اوپر کے دو کمروں میں جس میں ایک منقش پردہ سے آراستہ ہے۔ دوسرے
کے ستون اور تبتیا یا سہ گوشہ محراب خاص کر جاذب نظر ہے۔ ان دونوں میں گوری چٹی سندر
چاندا اپنی سہیلیوں اور خادموں کے ساتھ ہاتھ میں آئینہ لئے ہوئے بیٹھی ہوئی ہے آئینہ بائیں ہاتھ
میں دوسرا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا دوسرے میں آئینہ داہنے ہاتھ میں دکھایا گیا ہے۔ چوتاری چھینٹ
کے کپڑے کا گھاگرا، سینہ تک تنگ چولی اور براق ململ کی اوڑھنی ہے جس سے جسم کی سندرتا
پھوٹی پڑتی ہے۔ ہاتھ میں چوڑیاں اور ہتھ پھول، کان میں بالا گلے میں ہار ہے اور گھاگرے
کی بندش سیاہ گھنڈیوں والے کمر زیب سے ہے۔ لمبی گندھی ہوئی چوٹی کمر سے لٹک رہی
ہے۔ سہیلیوں اور خادماؤں کا لباس اور آرائش کم دیدہ زیب نہیں ہے۔ ایک کھڑی ہوئی ہے
دوسری جو بیٹھی ہوئی ہے اس کی تنگ چولی تنگ دوہرے پلّوں کی ہے۔ سب سے اوپر والے
حصہ میں ملّا داؤد مع تسبیح و رحل کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کتاب کی عبارت مایقرأ نہیں ہے۔
لیکن برکت والا لفظ تین جگہ اللہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ شاید بسم اللہ جیسی اللہ لاالہ الا اللہ ہو۔
دوسرے ایک محرابی کمرے میں شاید چاندا اور اس کی سہیلی کی شبیہہ کشی کی گئی ہے۔ دوسری
تصویر جس میں ہندی خط میں پھاگن لکھا ہوا ہے۔ تین خانوں کی ہے۔ جن کا داہنا حصہ
پھٹا ہوا ہے۔ زیریں حصے کے داہنی
طرف کے کمرے میں جس کی چھت کے سامنے کا رُخ ہندی شکلوں کے نقش و نگار سے آراستہ

ہے اور جوزاویہ نما منقش پیرایے سے مزین کیا گیا ہے۔ ایک خوبصورت عورت اپنے مروجہ لباس اور اسباب و آرائش کے ساتھ کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ بائیں طرف شاید چاندا ایک کپڑے سے سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی بیٹھی غسل کر رہی ہے۔ خادمہ جس کے لباس و زیورات اور آرائش سے امارت ٹپکتی ہے گھڑے سے پانی اپنے مالکن کے جسم پر انڈیل رہی ہے۔ سامنے ایک پایہ دار آفتابہ رکھا ہوا ہے۔ اس کمرے کی چھت کا ایک کونہ منقش ہے۔ بیچ والے خانہ میں داہنی طرف ایک اونچی زمین پر جس میں گھاس یا پودے اُگے ہوئے ہیں۔ ایک درخت کی پتلی پتلی ٹہنیاں مع پتوں کے دکھائی گئی ہیں۔ بائیں طرف کے کمرے میں جس کے اوپر پھولدار پردہ لٹکا ہوا ہے۔ چاندا سنگار میں مشغول ہے۔ بالائی خانے میں داہنی طرف ملا داؤد رحل کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں لیکن تصویر میں چہرہ و پیر غائب ہوگیا ہے۔ کتاب کا انداز تحریر کہتا ہے کہ "لمن یشکر اللہ" کے آگے کے کچھ الفاظ ہوں۔ اللہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ مصور کے قلم سے صحیح طور پر نہ نکلے۔ بائیں طرف ایک ڈالیوں اور پتوں سے بھرا ٹرا چھتنار درخت دکھایا گیا ہے۔

چارخانوں والی ایک تصویر کے اوپری اور نچلے حصوں میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اوپر داہنی طرف ملا داؤد حسب معمول رحل و تسبیح کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بائیں طرف شاید چاندا اور لورک بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ چاندا کی مہین براق ململ کے کپڑے کی اوڑھنی سر سے ہو کر نیچے مثلثی شکل میں لٹکی ہوئی ہے اور لمبے بالوں کی چوٹی بھی لٹک رہی ہے۔ گھاگھرا چارخانہ دار کپڑے کا ہے۔ لورک ایک شطرنجی طرز کے فرش تکیہ، مسند سے آراستہ پایہ دار پلنگ یا تخت سے پیٹھ ٹکائے ایک خاص طریقے سے بیٹھا ہوا ہے۔ پھندنا دار چھڑی سامنے بائیں زانو پر ہے۔ پورے آستینوں والی صدری بائیں طرف زیر بغل تکموں سے بندھی ہوئی ہے۔ سب سے نچلے خانے کے دائیں طرف ایک خشتی یا سنگی عمارت ہے جس کے دو پلّوں والا دروازہ بند ہے۔ بائیں طرف شش شاخہ خوبصورت درخت ہے جس کے خوش نما پھول اور ٹہنیاں ایرانی طرز کی ہیں۔ بیچ کے دو خانے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ان میں ساز و یراق سے آراستہ پیراستہ گھوڑوں پر تین اشخاص اپنے مروجہ یا روایتی لباس میں ملبوس سوار ہیں اور ان کے پیچھے دو خادم ہیں جن میں

ایک کے بائیں ہاتھ میں ڈھال اور دائیں میں لمبا گدا یا گرز دکھائی دیتا ہے۔ ایک گھوڑے کا جس کی پیٹھ خالی ہے لیکن جو پورے ساز و سامان زین، لگام اور دوسرے لوازمات سے آراستہ ہے۔ لگام پکڑے ہوئے سائیس روایتی لباس کلاہ دار پگڑی، پورے آستینوں والی دوہرے بٹنوں کی صدری، چست پاجامہ، پٹکہ میں ملبوس اسے آگے بڑھا رہا ہے۔ خادموں اور سپاہیوں کے پیر ننگے ہیں۔ سواروں کے بھی پاپوش دکھائی نہیں دیتے۔

بقیہ تین تصاویر میں ایک کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شیوجی لمبا ترشول لئے بازو بند اور ہرن یا شیر کی کھال کی لنگوٹی پہنے ایک عجیب کینڈے کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔ بال کندھے تک پہنچا ہوا ہے۔ اور کندھے پر ایک سانپ پھن اٹھائے ہوئے بیٹھا ہے۔ ان کے بائیں ایک درخت مع ٹہنیوں اور پھولوں کے دکھائی دیتا ہے۔ ان کے پیروں کے نیچے ایک گنبد دار خشتی یا ستونی خالی عمارت ہے جس کے اوپر منقش پردہ لٹکا ہوا ہے۔ کمرے کے اندر ایک زینہ کا چبوترہ ہے۔ بائیں طرف چار عورتیں جن کے گھاگھر شطرنجی چارخانہ دار کپڑوں کے ہیں اور جس میں دو خادمائیں ملبوس دکھائی دیتی ہیں۔ یہ عورتیں شاید میناں اور چاندا ہیں جو آپس میں ہاتھا پائی کر رہی ہیں۔ چاندا کے پیچھے کی عورت کھڑی ہوئی بائیں ہاتھ میں ایک پیالہ لئے ہوئے ہے اور دائیں ہاتھ سے بیچ بچاؤ کی کوشش کر رہی ہے۔ میناں کے پیچھے ایک عورت کھڑی شاید ہاں ہاں کہہ رہی ہے۔ سب سے اوپر کے خانے میں داہنی طرف ایک درخت کا تنا، شاخیں اور پھول ہیں اور دو گھڑے ایک دوسرے پر رکھے ہیں اور ایک آہنی یا فلزی سرپوش سے ڈھکا ہوا ہے۔ بائیں طرف حسب معمول ملا داؤد ایک پیر دوسرے پر رکھے ہوئے رحل کے سامنے بائیں ہاتھ میں تسبیح لئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ کتاب کی عبارت ناقابل پڑھ نہیں ہے۔ یہی حال ایک دوسری تصویر کی عبارت کا ہے۔ اس میں ملا داؤد کا سر نظر نہیں آتا۔ رحل و تسبیح جو خیمے میں کھونسی ہوئی ہے موجود ہیں۔ بائیں طرف ایک خشتی یا سنگی چبوترہ ہے جس پر ایک صراحی اور ایک دستے دار ٹونٹی دار پانی کا قرابہ ہے۔ اس کے نیچے دو کمرے ہیں۔ بائیں طرف کا خالی کمرہ نہایت خوبصورت پردوں اور نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ چھت کے اوپر گنبد ہے مسند و تکیہ اور

منقش بستر سے آراستہ پلنگ رکھا ہوا ہے۔ شاید یہ کمرہ اور پلنگ ان دونوں عورتوں میں سے ایک کا ہے جو آمنے سامنے بیٹھی ہوئی سرگرم گفتگو ہیں۔ وضع قطع، خدوخال، لباس و سامانِ آرائش وہی ہے جو ہر تصویر میں جزوی اختلاف سے دکھایا گیا ہے۔ نچلے حصے میں شاید لورک اپنے معمول کے استعمالی لباس میں ملبوس ہاتھ میں پھندنے دار چھڑی لئے ہوئے سنگھاسن پر بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کے سر پر پیچھے کھڑا ہوا خادم جس کے کلاہ دار پگڑی کے نیچے زلفی اور داڑھی، مونچھ کے بال، دوہرے پلّوں کی تکمہ دار صدری، کمر بند، ٹپکہ اور چست پائجامہ کے اوپر ململ براقی جامہ جو بیرون تک لٹک رہا ہے لائق توجہ ہیں۔ اپنے آقا کے سر پر چوڑی یا مورچھل ہلا رہا ہے۔ تخت کے عقبی پایہ کے اوپر ایک شاندار جھالردار چھوٹا شامیانہ ہے تخت نشیں شخص کے سامنے ایک کالا سہما ہوا شخص پیچھے کی طرف دبکا ہوا دوزانو بیٹھا ہے۔ آخری تصویر میں بھی تین خانے ہیں۔ نیچے ایک شاندار کمرہ پھولوں اور تصویر کے ہار اور تین عمدہ روشن دیوں سے آراستہ دکھایا گیا ہے۔ چار خوب صورت پایوں پر ایک پلنگ گدے دار فرش اور تکیوں سے مرصع ہے۔ اس پر روٹھی ہوئی چاندا ہاتھوں پر سر رکھے ہوئی ہے۔ سر اور اوپری دھڑ بقیہ حصہ بدن سے بہت اونچا ہے۔ سامنے لورک بایاں ہاتھ سر پر اور دایاں ہاتھ سینہ پر رکھے ہوئے کھڑا ہے اور منانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں پر پیر کے جوتے صاف دکھائی پڑتے ہیں۔ چست پائجامہ کے اوپر گھٹنوں تک ایک لنگی لپیٹ رکھی ہے۔ سامنے ٹپکہ لٹک رہا ہے اور کمر کے ارد گرد ایک اور منقش کپڑوں کا ایردل جیسا ملبوس ہے۔ بدن میں پورے آستینوں والی صدری اور ہاتھوں میں کڑے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بیچ کے خانے کے دائیں طرف ایک چھوٹی گنبد دار چھجہ دار کوٹھری ہے۔ جو خالی پڑی ہے اس کے بائیں جانب ایک زیادہ شاندار مسقف گنبد دار عمارت ہے جس کی بیشتر دیواریں بیل بوٹوں سے آراستہ ہیں۔ دیوار سے لگے ہوئے دو جلتے ہوئے دیئے ہیں۔ بیچ میں ایک لٹو کی شکل کی چیز لٹکی ہوئی ہے۔ سب سے اوپر کے خانے کے داہنی جانب ملا داؤد ہیں۔ دو تسبیحیں شلوار کے نیفہ سے لٹک رہی ہیں۔ ٹپکہ نیچے لٹک رہا ہے۔ رحل کی کتاب کے

الفاظ و حروف کی شکل اس قدر بگڑی ہوئی ہے کہ سوائے اللہ کے بابرکت لفظ کے کچھ پڑھا نہیں جاتا ۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر سرفدار نے اپنے ایک بنگلہ مقالہ میں چند تصویریں دی ہیں ان میں سے ایک بیل گرے کی راجپوت نقاشی سے نقل کی گئی ہے ۔ یہ تصویر بھی لاہور کے مصور مخطوطہ کی ہے اس لئے اس پر نگاہ ڈالنی ضروری ہے ۔ یہ بھی بارہ ماسہ سلسلہ کی چیز ہے اور ساون کی فضا کو سامنے لاتی ہے ۔ تین تختوں کی اس تصویر کا سب سے نچلا حصہ ایک نہایت شاندار ہال کا نقشہ پیش کرتا ہے ۔ دیواریں اور زمین ایرانی طرز کے بیل بوٹوں سے مزین ہیں چھت بھی منقش ہے اور اوپر خوب صورت پھندنے دار جھالروں کی لڑی دکھائی دیتی ہے ۔ دو طاق ہیں جن میں سے ایک تین پایہ دار ٹونٹی دار بدھنا مع سرپوش کے نظر آتا ہے دوسرے میں سنگار دان یا عطر دان جیسی کوئی چیز رکھی ہوئی ہے ۔ تین عورتیں ایک وضع لیکن مختلف رنگوں کے لباس میں ملبوس بیٹھی ہوئی ہیں ۔ بیچ کی گوری چٹی عورت غالباً چاندا ہے ۔ وہ ایک منقش مسند پر پلتھی مارے بیٹھی ہوئی سامنے کی عورت سے مخاطب ہے ۔ بڑی آنکھیں بڑی گھورتی ہوئی ' ناک نوکیلی کمر پتلی ' ابرو کمانی ۔ سر چہرا قدرے چپٹا ہے ۔ بالوں کی لمبی چوٹیاں ' ہاتھوں میں چوڑیاں ' انگوٹھی ' ہتھ پھول ' پیشانی پر مانگ ٹیکا ' کان میں گول بالا بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ اس کے اوپر داہنی طرف دو بنگلہ نما طرز کی تختہ دار قبہ دار کوٹھریاں ہیں جو منقش ستونوں پر قائم ہیں ۔ سامنے کی دیواریں بھی نقش و نگار سے آراستہ ہیں ۔ بائیں طرف دو حسین عورتیں ہیں جنہیں ایک چاندا معلوم ہوتی ہے ۔ ساون کی پہلی جھڑی سے لطف اندوز ہو رہی ہے چاندا ایک درخت کے نیچے جس کی پتی ٹہنیاں سرخ و سبز ہیں اور جن پر چار چڑیاں بیٹھی یا در پئے پرواز ہیں ۔ کھڑی ہوئی دونوں ہاتھ اٹھائے پانی کے قطروں کو اپنے جسم پر لے رہی ہے ۔ عقبی منظر نیلے پانی والے تالاب کا ہے ۔ خادمہ کا لمبا بال کھلا ہوا ہے ۔ لیکن مالکن کی لمبی ' آراستہ ' پھولوں سے مزین چوٹی کے نیچے موباف لگا ہوا ہے اوپر داہنی جانب ایک بڑے شاندار مسقف منقش کمرے میں ملا داؤد اپنے معمولی لباس میں رحل کے سامنے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں ۔ بائیں

ہاتھ میں تسبیح ہے کتاب کی عبارت کا انداز کہتا ہے کہ مصور کو قولوا لا الہٰ الا اللہ کا مسلم کلمہ ثبت کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔

اگر ان تصاویر پر ایک مجموعی حیثیت سے نگاہ ڈالی جائے تو ماننا پڑے گا کہ جسمانی ساخت وضع قطع، پوشاک اور لباس کی نوعیت و ترتیب، بیل بوٹوں، پھول پتیوں، ماحول و مناظر، طرز تعمیر یا عمارتی لوازم کے اعتبار سے یہ ایک ایسے طرز فکر اور اسلوبِ فن سے تعلق رکھتی ہیں جو باوجود مغربی جینی یا گجراتی یا اولین راجستھانی اور مغل دبستانوں سے کئی باتوں میں مماثلت و مشابہت رکھنے کے اپنا ایک مخصوص انفرادی مقام رکھتا ہے۔ ہندوستانی اپنی قوت آخذہ، جذب پذیری، انتخابیت، تصریف اور وسیع الخیالی کے لئے مشہور ہیں مختلف عناصر کے مناسب ربط و امتزاج کے باعث ہندی تمدن و تہذیب کو وسعت و جامعیت حاصل ہوئی **چندائن** کی تصاویر میں بھی جینی، راجستھانی، ایرانی اثرات نمایاں ہیں۔ ہندوئیت و اسلام کے عقائد و روایات کی جھلکیاں ہیں۔ ملکی یا غیر ملکی عناصر کا شمول یا ملاوٹ ہے۔ اس طرز کے زمان و مکان اور قلمکار کی شخصیت کے مسائل ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔ رائے کرشن داس اسے جینی (مغربی ہند کی اپ بھرنش شیلی (اسلوب) کا ترقی یافتہ جونپوری طرز اور سولھویں صدی کے اواسط کا قرار دیتے ہیں۔ کارل کھنڈل والا صاحب بھی اسے گجراتی اسکول کی جونپوری شکل کہنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس پر مصر ہیں کہ **چوراپنچ شیکا** سلسلہ کی تصاویر کی طرح یہ بھی مغلوں کے دور کی چیز ہیں اور ۱۵۴۰ء اور ۱۶۳۰ء کے درمیانی زمانے کی تیار کردہ ہیں وہ اسے الگ قلمکاری کا اسلوب ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مقامی اثرات کے تحت اگر لباس اور وضع و قطع میں کچھ تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں تو یہ کوئی دلیل ایک نئے فکر و اسلوب فن کی قرار نہیں دی جا سکتیں۔ باہری آنکھ کی غیر موجودگی اور کلاہ دار پگڑی، جامہ، چست پائجامہ اور ایرانی طرز کے نقش و نگار اور عمارتی لوازمات کا ہر تصویر میں پایا جانا شاید اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا جتنا ایک رخی چہروں میں بڑی بڑی گھورتی ہوئی آنکھیں، نوکیلی ناک، عورتوں کے چپٹے سر اور روایتی ڈھنگ کے لباس اور جسمانی آرائش کی چیزیں جو جینی طرز کی خصوصیات ہیں۔

مغلوں کے پہلے ایرانی اثرات مسٹر کھنڈل والا کو ہندوستانی تصویروں میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ وہ تو اسے بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ مغلوں کے پہلے گجراتی اسکول اور اس کی مقامی مانڈوی جونپوری وغیرہ شاخوں کے علاوہ کوئی الگ راجستھانی اسکول تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی راجستھانی اسکول مغل اور گجراتی اسالیب فن کی آمیزش کا نتیجہ تھا اور ۱۵۸۳ء کے قبل اس کا وجود ثابت نہیں ہے ڈبوجی آرچر کو بلہانا کے ۴۰ہ ہندی کی سنسکرتی پریم کتھا چورا پنچ شیکا اودھی اور چندا (چندائن) مانڈو کے مصور سنگیتی نسخہ بھیروی راگنی اور مانڈو کے فارسی نسخہ نعمت خانہ کو ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں اور جونپور طرز کی ترقی یافتہ صورتیں بتاتے ہیں۔ سب کی سب تقریباً سولھویں صدی کے وسط یا اس سے لگ بھگ کی تخلیق سمجھی جاتی ہیں۔ مسٹر ان سی مہتہ کا مملوکہ گیت گووند کا مصور نسخہ اور کالاہون بنارس کے مرگاوتی کے مصور اجزا بھی اسی زمرے میں شامل کئے گئے ہیں۔ چورا پنچ شیکا اور چندائن کی ہر تصاویر میں مصنف یا شاعر خود موجود ہیں۔ مرقعوں کے ان سب مجموعوں میں چند باتیں مشترک ہیں اور انہیں جینی اپ بھرنش یا مغربی ہندی گجراتی تصاویر سے ممیز و منفرد کرتی ہیں۔ باہر آنکھیں غائب ہیں۔ کلاہ دار پگڑی، گھٹنوں کے نیچے تک جامہ، چست پائجامہ، صدری، پٹکہ، غبارہ نما اوڑھنی، ایرانی طرز کے بیل بوٹے، نقش و نگار، ایک رخی چہرے سب میں پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ان سب کو ابتدائی راجستھانی اسلوب کے مختلف نمونے بتاتے ہیں لیکن ان میں عمدگی و نفاست، قدامت پرستی یا صحت مندا قدام کا فرق ہے۔

ناچیز راقم السطور کا خیال ہے کہ ان سب میں چندائن کی پیش نظر تصاویر جونپوری اسلوب کا بہترین اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ نمونہ ہم پہنچاتی ہیں اور ان کا خالق کوئی ہندو قلمکار تھا جس کا موئے قلم فطرتاً روایتی طرز کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا۔ لیکن ماحول کے اثرات سے بیحد متاثر تھا۔ موضوع میں تنگی، قیود و پابندی نہ تھی اور وہ ایک افسانوی زندگی کی مرقع کشی میں حقیقت نگاری سے اپنے فن کو چار چاند لگا سکتا تھا۔ مرد و عورت کی صورت گری

شبیہ سازی میں مغل آرٹ کی اصلیت اور عصری خد وخال کی کیفیت کے اظہار میں بجائے روایتی اثرات کے کوئی چیز اسے مانع نہ تھی۔ شیوجی اور شیولنگ کی موجودگی راجپوتی اثر کی شاہد ہے۔ کرشن لیلا یا رام بھگتی نے بعد کو راجپوتوں میں زور پکڑا۔ ان تصاویر میں کچھ بھی وشنو بھگتی کا شائبہ نہیں ملتا۔ حسن وعشق، پیار ومحبت، رشک وحسد، غصہ وکشمکش، پوجا پاٹ، تزئین و آرائش، موسمی کیفیات سے لطف اندوزی، امیرانہ ٹھاٹ باٹ۔ گھریلو زندگی کے واقعات اور لوازمات کے نقوش ان تصاویر میں موجود ہیں۔ عمارتی عناصر مثلاً نوکدار تیپتیا یا کئی نوکوں والی محرابیں، گنبد، ایرانی نقش ونگار، جھالردار پردے، رحلیں، قرآن مجید کی آیتیں یا عربی خط نسخ کی بگڑی ہوئی عبارتیں، داڑھی مونچھ کے انداز، زلفی کی کچھ جھلک، برتن، فرش فروش وغیرہ سے اسلامی اثرات کی غمازی ہوتی ہے۔ اسلامی اثر کا جیتا جاگتا ثبوت ملا داؤد کی ہر جائی تصویر ہے۔ لیکن مغل طرز کے خلاف ان کی صدری کا پلہ بائیں طرف بغل کے نیچے تکموں سے بندھا ہوا ہے۔ ہندو مصور نے تسبیح اور عربی عبارت کے ساتھ نادانستہ طور پر تصرف کیا ہے لیکن مغل آرٹ کی خصوصیات ان تصاویر میں نہیں ملتے۔ چہرے سب یک رخی ہیں۔ کسی عورت کی ناک میں کوئی زیور۔ نتھ، نتھنی، بیسر۔ کی قسم سے نہیں دیکھی جاتی۔ چاکدار جامہ کا رواج مغلوں سے مخصوص نہیں ہے۔ عمارتی ترتیب میں بھی مغلوں کی نفاست وتکمیل فن نہیں ہے۔ یہ یقیناً اکبر کے عہد کے پہلے کی ہیں اور جونپوری طرز کی ہیں جس کو باوجود جینی اسلوب فن کے روایتی اثرات کی موجودگی کے الگ انفرادی حیثیت حاصل ہے۔

پندرہویں صدی کے ایک بہاری صوفی بزرگ

۱۸۱۱-۱۲ء میں فرانسس بوکانن کو گیا ضلع کے "داؤد نگر ڈویزن" میں "تقریباً پانچ سو پیرزادے ملے" جن میں سے اکثر محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی متوفی ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء مدفون بغداد کے احفاد تھے۔ طریقۂ صوفیہ قادریہ کے اس مشہور ربانی کے گیارہ فرزندوں میں سے ایک عبدالقادر (رزاق) "حضرت محمد قادری کے برادر امت اسلاف میں سے تھے۔ حضرت محمد قادری کے بارے میں بوکانن کا بیان ہے کہ انہوں نے بہار کو کافروں سے پاک کیا اور امجا (امجھر) میں مدفون ہوئے جہاں ان کے احفاد تین مستحکم جاگیروں کے مالک ہیں۔ گیا ضلع میں داؤد نگر سے شمال مشرقی جانب دس میل کے فاصلے پر ایسٹ انڈیا ریلوے کے پامر گنج اسٹیشن سے لگ بھگ پچیس میل کے فاصلے پر امجھر ایک گاؤں ہے۔ جہاں اب تک ایک خانقاہ موجود ہے۔ اس خانقاہ کی بنیاد پندرہویں صدی کے وسط میں حضرت سید محمد قادری نے ڈالی تھی۔ اور بوکانن کے عہد میں اس کے بڑے پیرزادہ اور گدی نشیں "شاہ منزلت علی تھے جنہوں نے اغلباً شیخ کے تین فرزندوں میں سے ایک کے طریقہ کو اختیار کیا۔ شیخ کے احفاد بہرحال بوکانن کے عہد میں کئی خاندانوں میں بٹ گئے تھے اور اس وقت گیا، پٹنہ اور شاہ آباد کے اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس بڑے ہی قیمتی مخطوطات اور وثائق ہیں۔ لیکن ان میں صرف مولوی سید احمد عروج قادری کے ذریعہ چند دستاویزات جو ان کی ملکیت ہیں، مطالعہ کئے جا سکتے ہیں۔ مولوی سید احمد عروج قادری، سلیمان قادری کے سلسلے میں ایک فرد ہیں۔ حضرت سید محمد قادری کے پوتے اور پسر کلاں جلال الدین متولد ۸۴۹ھ کے بیٹے تھے اور ان کا نام قاضی و نائب قاضی کے طویل سلسلہ میں سب سے پہلے آتا ہے۔ سید سلیمان کی تاریخ ولادت ۸۸۹ھ بتائی گئی ہے۔ یہ

(فٹ نوٹ اس مضمون کے آخری صفحہ پر ملاحظہ ہو)

سلسلہ اکبر کے عہد سے ایسٹ انڈیا کمپنی تک رہا۔ ان دستاویزات میں چند اسناد اور فرامین کے علاوہ جن میں خاندان کے افراد کے نام کچھ جاگیروں کے عطا کئے جانے کا ذکر ہے۔ دوسرے وثائق بھی ہیں جو بطور ثبوت دار القضا میں ان لوگوں کے حوالہ کئے گئے ہوں گے۔ اکیاون اوراق پر مشتمل ایک قیمتی فارسی مخطوطہ موسوم بہ مناقب محمدی پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں بھی موجود ہے جس میں خانقاہ مجھر کے بانی ان کے تین فرزندوں پوتوں اور رہبروں کا حال درج ہے۔ اس کے مولف علی شیر شیرازی ہیں، جو بانی خانقاہ کے خاص ساتھیوں میں سے تھے اور اس کی تالیف ان کی وفات کے صرف چھ سال بعد ۹۳۲ھ میں ہوئی ہے۔ جیسا کہ نسخہ کے آخر میں مندرج ایک منظوم قطعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ شیرازی نے شیخ کے حالات زندگی کے لئے عربی میں تاریخ حسینی مولفہ کریم الدین حسین مکی کا حوالہ دیا ہے جو بدقسمتی سے اب دستیاب نہیں ہے یہی حال وثائق الحقائق، تہذیب القرآن یا حزب الادعیہ مولفہ شیخ یعنی بانی مجھر اور ان کی اولاد اور مغلیہ عہد کے قاضی امیر مسعود قادری کی فتاوی مسعودی کا بھی ہے۔ بہرحال شیرازی کی اس تالیف میں جہاں شیخ کے خارق عادات وکرامات اور عقیدت آفریں امور کے بارے میں بہت سارے حوالے ہیں وہاں تہذیبی وتمدنی اور تاریخی دلچسپی کی بھی بہت سی باتیں ہیں۔

دس باب کے مخطوطہ میں شیخ کی ابتدائی زندگی، ہندوستان سے باہر ان کے مساعی اور ان کی تعلیم وتربیت، کے مختلف دور کے بارے میں بہت سارے معلومات ہیں۔ مثلاً یہ کہ انہوں نے کون سا نصاب تعلیم اختیار کیا۔ کن اداروں میں اور کن علماء کی نگرانی میں تعلیم پائی۔ ان کے عادات وخصائل، ان کی جسمانی شکل وصورت اور پوشاک کی نوعیت کیا تھی۔ اسلام سے انہیں کس درجہ والہیت اور گرویدگی تھی اور دوسرے لوگوں کا اور ملکوں کی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا کتنا شوق تھا اور وہ کون لوگ تھے جن سے عراق سے ہندوستان کے سفر کے دوران وہ متعارف ہوئے اور استفادہ وافادہ کیا۔ چونکہ یہ چیزیں تاریخ وتمدن کے متعلم کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں، اس لئے ضیق وقت اور تعداد اوراق کے محدود اصرافیہ کے پیش نظر مضمون نگار مجبور ہے کہ شیخ کے محض چند ایسے واقعات کے تذکرہ پر اکتفا کرے، جن کا تعلق ان کی زندگی کے اس دور سے ہے، جو ہندوستان میں گذرا۔

پہلی چیز جو کسی کی توجہ مخطوطہ کی طرف مبذول کرتی ہے وہ ہے اتنا پہلے چھوٹا ناگپور کی سرحد پر گیا کے ان علاقوں میں، جو ہنٹر[13] HUNTER کے عہد تک "پہاڑیوں اور جنگلوں پر مشتمل تھے اور جن میں جنگلی جانور بھرے ہوئے تھے"۔ اسلام کی پُر امن اشاعت اور مسلم نو آبادیات سے متعلق ٹھیک ٹھیک حوالہ۔ مخطوطہ تین راتوں میں بمقام کٹھما مکمل ہوا جیسا کہ "آئین" میں درج ہے۔ یہ ایک مقامی باشندہ حکیم منور کے حسب فرمائش لکھا گیا۔ انہوں نے شیخ کا استقبال کیا تھا، پھر ان کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ "افلاطون وقت اور ارسطوئے زمانہ" کے خطاب سے انہیں یاد کیا گیا۔ مؤلف کو شیخ کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ کٹھما کے علاقوں میں اپنا کام جاری رکھیں اور جیسا کہ ہم دوسرے ذرائع[15] سے جانتے ہیں وہ وہیں مدفون ہوئے۔ مسلمانوں سے آباد کچھ دوسری بستیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے ان میں ہسپورہ شامل ہے جس کے سردار ملک فاون ابتداء میں شیخ کے مخالف تھے پھر بعد میں نرم پڑ گئے اور مہوا کے ایک پیڑ کے گرد مہولی نام کا ایک گاؤں بسایا جہاں شیخ احمد کی خانقاہ واقع ہے۔ شیخ محمد کے ایک حلقہ بگوش اور پیروکار سید سلیمان مشہدی "خدا کی راہ میں شہید ہو کر" فوت ہو گئے۔ ان کا مزار نوانواں پرگنہ اکل میں ہے۔ جو گیا ضلع کے جہان آباد سب[16] ڈویژن میں واقع ہے۔

یہ محض اسلام کی خاطر تھا کہ حضرت سید محمد نے ہندوستان کا دشوار گذار سفر اختیار کیا۔ وہ داستان الم جس کو موجودہ اورنگ آباد سب[17] ڈویژن کے ایک مہاجر "خدا پرست و دعویٰ اقامت" شیخ محمد علی نے بیان کیا ہے، بڑی ہی جگر سوز ہے۔ انہیں خواب میں حکم مہاجرت ملا تھا۔ جیسا کہ تذکرہ نویس کو یقین دلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضرت سید محمد کے والد سید درویش نے انہیں ہدایت کی کہ وہ ہندوستانیوں کی شکایات سنیں اور ان پر ظلم[18] ڈھانے والوں سے ان کی دادرسی کی خواہش کریں اور ظالم کو ایمان کے دائرے میں لانے کی کوشش کریں۔ جس میں اگر ناکامی ہو تو اس کی تباہی و بربادی کے لئے دست بدعا ہوں۔ وہ اس سرزمین میں اقامت کریں تا وقتیکہ وہاں کے لوگ ان کی ہدایت سے راہ حق کو پالیں۔ انہیں اس بات کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ وہ ایک بہتر نسب اور بالخصوص سید حمزہ قادری سے ملاقات کریں جو قبل ہی ہندوستان منتقل ہو چکے تھے۔ شیخ نے اپنے چالیس رفقاء کے ساتھ ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء میں گھوڑوں اور اونٹوں کی سواری پر پہاڑ اور وادی، صحرا اور چٹیل میدان سے بھرا ہوا بغداد سے بہار تک کا پورا

راستہ سات ماہ گیارہ دنوں میں طے کیا۔ سفر کے دوران وہ قندھار[17] اور ملتان سے ہو کر گذرے اور
دو ہفتہ کے لئے شہر ہرپور (یوپی) میں بھی ٹھہرے، جہاں انہوں نے بی بی پیارن سے شادی کی۔ آخر وہ جیون
نامی ایک ظالم راجہ کے ایک علاقہ میں پہونچے، جہاں شیخ محمد علی کے خاندان پر ظلم و ستم کیا گیا تھا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ چھوٹا ناگپور کے کول اور سنتھال، منڈا، اوراؤں، چیرو اور کھروار کسی وقت
بہار کے مختلف حصوں پر برسر اقتدار اور حکومت کرنے والے قبیلے تھے۔ بوکانن کی منضبط کردہ روایتوں
کے مطابق کول راجوں کی عملداری کسی وقت بیجناتھ دھام سے لے کر بنارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور
انگریز ماہرین آثار قدیمہ کننگھم وغیرہ نے لکھا ہے کہ جنوبی بہار میں بہت سے قریئے" ناہموار قلعوں کے ساتھ یہاں
وہاں نقطوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے جن کی علاقائی روایتیں متوسط ہند کے کول یا جنگلی قوموں کی طرف منسوب
تھیں۔" ان ماہرین نے کول سرداروں کے تین بڑے بڑے قلعوں کے نشانات کابر، کنجیا، رام گڑھ اور شاہ آباد
میں پائے۔ اس سلسلے میں علی شیر شیرازی نے بھی ہماری معلومات میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے
کہ وہ جگہ جہاں شیخ وارد ہوئے اور جو بعد میں نربنا کہلائی، ایک نشیبی زمین تھی، جس کے نزدیک ایک ندی (رود)
بہتی تھی اور یہ جنگلی جانوروں اور حشرات الارض کی آماجگاہ تھی۔ سرحد پر واقع ایک خام قلعہ بند جگہ کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ محمد علی چلا اٹھے۔ "یہی اس ظالم کا قلعہ ہے جس نے ہم لوگوں پر ظلم ڈھایا اور ہمارے
بھائیوں کو اہل و عیال سمیت شہید کیا کیونکہ ہمارا ایک رشتہ دار یہاں تک آگے بڑھ گیا تھا کہ اس نے
اس ظالم سے مباحثہ کیا اور اعلان کر دیا کہ بت اور بت پرستی مہمل اور لغو باتیں ہیں۔ اس پر قلعہ کے مالک
نے ہمارے تمام رشتہ داروں کو ہلاک کر دیا۔ میں نے بہر حال جنگ جاری رکھنے کا انتظام کیا اور ہر شخص کے
سامنے اپنا المیہ دہرایا مگر کوئی بھی میری مدد کے لئے تیار نہیں ہوا۔"

شیخ اس ظالم کے پاس پہنچے" جس کا نام جیون تھا اور جو اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جس کو
ہندوستان میں کھولیا کہتے ہیں۔" انہوں نے فرمایا" تم نے مسلمانوں کو کیوں قتل کیا؟ کیا تم خدا سے نہیں
ڈرتے؟ جو بہت بڑا منتقم ہے۔ تمہارے لئے بہتر ہے کہ امن کا رستہ (اسلام) اختیار کر لو، ورنہ تمہیں سزا
بھگتنی پڑے گی۔" کھولیا سردار نے غصہ میں آپے سے باہر ہو کر کہا" تم کو اس سے کیا کام؟ چلے جاؤ۔" شیخ
نربنا کے ویرانے میں آئے اور عذاب کے لئے خدا سے دعا کی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ موسلا دھار بارش کی وجہ

قلعہ کی دیواریں ڈھ گئیں اور جیون اپنے خاندان سمیت ملبے میں دب کر مر گیا۔ جیون کولھیا کا بھائی کرمون کولھیا جس کا وہاں سے ایک کوس دور ڈمرا پر زبردست اقتدار تھا، شیخ کے درپے آزار ہوا، مگر ان کا کوئی نشان نہ پا کر تعاقب سے باز آیا۔

شیخ نے ریاضت کا سلسلہ جنگل اور کوہ دہ علاقوں میں جاری رکھا جہاں بہت سے خوارق عادات دیکھنے میں آئے جس وقت وہ جنگل میں تھے تو ایک گوالا مسلمان ہوا۔ اس کو مذہبی تعلیم بھی دی گئی اور اس کا نام صادق رکھا گیا۔ وہ شیخ اور ان کے پیرزادوں کو دودھ مہیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے حاجی خاں اور حامی خاں دونوں بھائیوں کو بری حالت میں دریا کے کنارے اپنی قسمت پر آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ان لوگوں کا حال معلوم کیا کہ وہ "دریا خاں حاکم بہار نوحانی کے کارندے ہیں جس نے انہیں سمبھرام بھیجا تھا تاکہ وہاں کے ایک تاجر سے اس کے لئے ایک گھوڑا خرید لائیں۔ گھوڑا جس وقت ندی پار کر رہا تھا تو اتفاقاً وہ ڈوب کر مر گیا۔ وہ اپنے آقا اور مالک دریا خاں سے بہت زیادہ خوف زدہ ہوئے جس کے بارے میں ان کا بیان تھا کہ وہ بے رحم اور مزاج کا بہت سخت آدمی ہے۔" وہ دونوں شیخ کے پاس لائے گئے، جنہوں نے ان پر رحم کھا کر گھوڑے کی بازیابی کے لئے کامیابی کے ساتھ خدا سے دعا کی لیکن شیخ نے انہیں تاکید کر دی کہ اس واقعہ کا ذکر والی بہار سے نہ کریں ورنہ گھوڑا پھر غائب ہو جا سکتا ہے۔ مگر کسی طرح وہ اس تاکید کا لحاظ نہیں کر سکے جس کے نتیجے میں پیشگوئی کے مطابق دستیاب شدہ گھوڑا اچانک مر گیا۔ لیکن بہار کا حاکم تمام واقعات سے مطلع ہو کر شیخ کی کراماتی طاقت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے طرح طرح کے تحائف بھیجے جو قبول کئے گئے۔ واضح ہو کہ اس دریا خاں نوحانی [illegible] نے جو سکندر لودی کی طرف سے پٹنہ و بہار کا حاکم مقرر ہوا تھا اور جس نے ابراہیم لودی کے زمانے میں ایک مطلق العنان آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی اور جس کے بیٹے نے سلطان محمد کا خطاب اختیار کیا اور خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا۔ شیخ محمد علی کی مصیبتوں پر کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اس لئے کہ اسے اپنے صوبے کے انتظام سے غرض تھی۔ مذہبی جھگڑوں میں پڑنا دوسرے حاکموں کی طرح اسے مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا تھا لیکن مسلمان تھا۔ اس لئے شیخ کی بزرگی کا حال سن کر آپ کی طرف متوجہ ہوا جس جگہ یہ واقعہ رونما ہوا تھا، وہاں پر اس نے ایک مسجد، ایک خانقاہ اور ایک محل (کوشک) بنانے کا حکم دیا۔

شیخ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ خاص کر اس کے بعد جبکہ بہار کے طاقتور حاکم کی توجہ ان پر مبذول ہوئی۔ لوگ جوق در جوق ان کے پاس آنے لگے۔ اس لئے انہوں نے اپنے پیروکاروں کو وہ جگہ چھوڑ کر ایسے ویرانہ میں چلنے کی ہدایت کی، جو لوگوں کی رسائی سے دور ہو۔ صادق اس فیصلہ کو سنکر متحیر ہوا اور اس نے ان سے سوال کیا۔ خواجہ! آپ ایک ایسے آراستہ مسکن کو چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟ آپنے صعوبت کا زمانہ تو یہاں گذارا اور جب کچھ آرام کی صورت پیدا ہوئی تو بہتر مقامات میں جانے کا مقصد فرما رہے ہیں۔" وہ ایک ہندی نژاد اور کم سواد تھا۔ اتنا ذہین و تیز فہم نہیں تھا کہ امور کی حقیقت کو سمجھ پائے۔ حضرت شیخ نے اس کو ہندوی ہی میں جواب دیا۔ "نہ مانا جیو اینہا نہ رہنا ہوا (میرا دل یہاں رہنے کو نہیں چاہتا)۔ اسی وقت سے وہ جنگل جھرنا سمیت نرہنا کہلانے لگا۔ افسوس یہ ہے کہ آج اس کو سب لوگ فراموش کر چکے ہیں۔

کچھ مہینے بعد شیخ موصوف انجھر تشریف لائے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ ایک دن کرمو کولھیا کے کانوں میں موذن کی اذان کی آواز پہنچی تو اس نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کو بتایا گیا کہ وہی شیخ ہیں جن کا تعاقب اس نے بالخصوص دریا خاں حاکم بہار کے ڈر سے چھوڑ دیا تھا، ہو سکتا ہے کہ عنقریب ایسے حالات پیدا ہو جائیں، جن کا نتیجہ آخر کار اس کی جنگلی علاقوں کی سرداری کے لئے نقصان کی صورت میں برآمد ہو۔" یہ سُن کر اس نے کفار کی ایک جماعت کو شیخ اور ان کے پیروؤں کی ہلاکت کا حکم دے کر بھیجا۔ لیکن وہ لوگ یا تو برق و باد کی زد میں آ گئے یا منتشر ہو کر رہ گئے۔ تب اس نے اپنے بیٹے جہیتر کو بھیجا جس کے حکم سے شیخ پر ٹھیک اس وقت پتھر پھینکے گئے جبکہ وہ عبادت میں مشغول تھے، ان کی پیشانی کو بری طرح چوٹ آئی۔ اس واقعہ نے شیخ محمد مجذوب کو اتنا مشتعل کر دیا کہ انہوں نے جہیتر کو ہلاک کر دیا اور اسے حجرے کے نزدیک دفن کر دیا۔ اس کے ساتھی جو ہمت ہار چکے تھے، بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس واقعہ نے خود کو کرموں کولھیا کو بھی میدان میں لا کھڑا کر دیا۔ کرموں اور شیخ حسن کے درمیان کچھ سوال و جواب کے بعد جب کول سردار نے شیخ کو مارنے کے لئے تلوار کھینچی تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ اپنے ہی ہتھیار سے آپ ہلاک ہو گیا۔

ان کے علاوہ کچھ دوسرے واقعات بھی مندرج ہیں۔ مثلاً شیخ احمد کی دعوت پر شیخ کا سہسپورہ تشریف لانا، شروع میں ملک قاذن کی طرف سے ناقدری اور سوئے ادبی کا مظاہرہ اور آخر کار اس کا

اظہار تاسف وندامت وغیرہ شیخ کے زیر بنا آنے کے سال بھر کے اندر ہی رونما ہوئے۔ شیخ حسن کا جن کی ذات کو ان تمام امور میں بہت دخل تھا اور جو ۸۴۲ھ میں شیخ کی منکوحہ (بی بی پیارن) کو لانے کے لئے سرہرپور یو۔ پی بھیجے گئے تھے، سرہرپور میں انتقال ہوگیا، اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ بی بی پیارن اپنے بھائی سید حسین کے آدمیوں کی نگرانی میں اجمیر پہنچیں۔ ایک مرتبہ شیخ کے دل میں خیال گذرا کہ "میں جتنا بھی عزلت کی زندگی گذارنا اور ہجوم سے دور رہنا چاہتا ہوں اپنے آپ کو خدا کے سامنے مجبور پاتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی مرضی کچھ اور ہے۔ بنگال کے ایک مرید شیخ مسعود نے طلائی مہروں کی ایک تھیلی بھیجی جس کو فوراً ان کے پیروکاروں میں کپڑے لتے اور دیگر اخراجات کے لئے تقسیم کر دیا گیا۔ حیرت انگیز واقعات کا سلسلہ یونہی جاری رہا۔ مثلاً عثمان خاں اور میاں خاں کا جبکہ وہ شیخپورہ سے کشتی پر آ رہے تھے، پانی میں ڈوبنے سے حیرت انگیز طور پر بچ جانا اور بہار شریف کے ایک تعلیم یافتہ شخص بھیکن بہاری کو خواب میں یہ ہدایت ملنا کہ وہ شیخ کی طرف رجوع کریں اور ان کے دو لڑکے جلال الدین اور معین الدین کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہوں۔ یہ دونوں لڑکے سلسلہ وار ۸۴۹ھ اور ۸۶۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے نظام کی صرف ایک دختر تھیں۔ جن کے بیٹے سید قتال کی تاریخ پیدائش ۹۰۲ ہے معین الدین کے بیٹے سید مظفر تھے اور ان کے بیٹے سید محمد ... تھے جن کا سال ... ۹۶۰ھ ہے ... اور سید حسب ابن سید مظفر ۹۰۹ھ اور ... میں پیدا ہوئے۔ جلال الدین کے ... بیٹے ... چھوٹے بیٹے سید سلیمان ... میں تولد ہوئے۔

عہد وسطیٰ توہم پرستی کا زمانہ تھا۔ تمام غیر ممکن اور غیر فطری چیزوں پر لوگ اعتقاد رکھتے تھے۔ اس لئے اگر مخطوطہ میں ہم ... دیکھتے ہیں تو ... حیرت کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ہمارا قابل اعتبار چیزوں سے قطع نظر دیئے ہوئے تفصیلی جائزے میں ... مسلمانوں کی سرگرمی سے متعلق بہت ہی قیمتی معلومات بھی ہیں، یعنی یہ کہ انہوں نے کس طرح جنگلوں ... سے بھرے ... اجنبی مقامات میں کول بھیل قدیم اقوام (جنہوں نے مورچہ بندی کی تھی اور ... جنگلوں ... دخول علاقوں کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا) کے نیم ہندو سرداروں کے درمیان اپنے اعتقادات کی اشاعت کی۔ جیون کرموں اور جھیتر کو ... سرداروں کے نام ... کے ... اپنے

ہم مذہبوں سے پہنچی ہوئی بدسلوکی کے معاملہ میں مقامی مسلم حاکموں نے کس طرح غیر جانبداری کا ثبوت دیا اور آخر میں مزید بہت ساری باتوں میں سے ایک اہم بات یہ کہ ان باشندوں کو سمجھنے اور ان کے دل میں اتر جانے کے لئے ان کی زبان [کو] سیکھ کر ان ہی کی بولی میں اپنے خیالات اور اعتقادات کو ان تک پہنچانے کا جو طریقہ باکمال صوفی مبلغوں اور پرچارکوں نے اختیار کیا وہ کتنا موثر تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا شیخ کا ہندی بولی میں لفظ اینہاشے کا استعمال کرنا جو بہار کے دیہی علاقوں میں اب تک مستعمل ہے، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لسانی اعتبار سے ہندوستانیوں کی فوقیت کے سلسلہ میں شیخ نے اپنے سوانح نگار کے ایک سوال کا جو جواب دیا ہے اس کا پڑھنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان کے اس قول سے کوئی اتفاق نہیں کرے گا کہ آدم جو سب زبان جانتے تھے جنت سے لنکا (سرندیپ) بھیجے گئے تھے جو ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ کہ صحف آدم کا بھی ہندوی زبان میں نزول ہوا تھا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ ایک ایسی روایت ہے، جس کو ان کے علاوہ دوسروں نے بھی نقل کیا۔ امیر خسرو اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں کہتے ہیں "ہندوی لوگ جس زبان کو چاہیں آسانی سے سیکھ سکتے ہیں اور اس پر عبور حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی مادری زبان ہوگی۔ لیکن دوسرے جو ہندوی سیکھنا چاہیں تو ان کے ساتھ یہ قصہ نہیں" کچھ ایسے ہی خیالات شیخ احمد کے بھی تھے، جس کا اظہار علی شیر کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا۔ مذکورہ تین کول سرداروں اور دریا خاں والی حاکم بہار سے متعلق جو باتیں مان لی گئیں وہ بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

مناقب کے مؤلف نے شیخ احمد کی طرح طویل زندگی پائی اور شیخ کے ساتھ آٹھ مرتبہ طواف بعد کیا۔ انہیں کے ساتھ ہندوستان آئے اور ان کے بعد تک زندہ رہے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ ان کی روحانی ہدایت سے ہم کو روشناس کراتے ہیں، بلکہ ان کے لڑکوں، لڑکیوں، پھر ان کی اولاد کے متعلق اور بہت سارے احباب وارشد متبعین مثلاً شیخ حسن مدنی القریشی، شیخ محمد مجذوب، سید علاء الدین تبریزی ملک تاج الدین (جو عرف عام میں کھنڈا شیر کہلاتے تھے۔ کیونکہ وہ تلوار کی طرح زبان کے تیز تھے)۔ سید سلیمان مشہدی، سید علی مانچوری، سید شمس الدین حسینی وغیرہ کے بارے میں بھی بہت سے معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

(مترجمہ محمد یونس ریسرچ اسکالر)

(فٹ نوٹ ہندرہویں صدی الخ) ۱؎ یہ نام فارسی مخطوطہ رسالہ جوادیہ میں نہیں ہے۔ اس رسالہ میں کچھ اہم واقعات کے ساتھ ساتھ شجروں کے نقشے ہیں۔ غالباً مؤلف نے اس کے لوکانن سے پہلے لکھا ہے۔ ۲؎ عالمگیر اول کا ایک فرمان مورخہ ۲ ذی الحجہ چہاردہم سال جلوس کی رو سے سید عبدالرسول کے فرزندوں، ماتحتوں، مریدوں اور ان سے وابستہ محتاجوں اور مسافروں کے لئے پرگنہ دنوا سرکار شاہ آباد کے گاؤں محمود نگر عرف گیا میں رسول پور کی دخلی کے ساتھ ایک جاگیر بطور مدد معاش منظور ہوئی۔ سید عبدالرسول محبوب سبحانی کی اولاد اور شیخ امجھ کے بڑے صاحبزادے کے شاید ایک پوتے عبداللہ کے لڑکے تھے۔ ۳؎ ان کا دلچسپ حال رسالہ جوادیہ میں دیکھیے۔ کلکتہ آفس کے مہر شدہ محضر نامہ ۱۸۳۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکبر کی طرف سے گیا ضلع کے اورنگ آباد سب ڈویژن میں پرگنہ انچھ اور کنورہ کے قاضی نیابت کبرسنی میں مقرر ہوئے تھے۔ راقم السطور کو ایک سند مورخہ ۲۰ محرم ۹۸۶ھ ملی جس میں تین مہریں تھیں ایک تو نہایت واضح ہے دوما لقیر اتھیں۔ ان مہروں کے اوپر حاشیہ کی عبارت بڑی اہم ہے۔ (۱) اللہ اکبر۔ بموجب تصدیق تصحیح مرحومی قاضی یعقوب قضا و حکایت و اراضی مدد معاش بہ مشارٌ الیہ (میران سید سلیمان اہل علم اولاد حضرت غوث الثقلین امیر سید محی الدین) و فرزندان مقرر و مسلم دانند" (۲) مامالک الملک موجب تصحیح و تصدیق مرحومی قاضی یعقوب بہ مخدوم زادہ . . . . قضا و خطابت پرگنات مذکور (پرگنہ انچھ و پرگنہ کنورہ من اعمال سرکار صوبہ بہار) . . . . . . و وجہ مدد معاش مع فرزندان موافق حکم جہاں مطاع مقرر دانستہ بتصرف آرند (۳) مالک الملک نوشتہ میر حیدر جہاں عمل نمایند قاضی یعقوب اور میر حیدر جہاں کی وضیع شخصیت پر ابوالفضل اور عبدالقادر یعنی شہنشاہ اکبر کے مورخوں کے بیانات سے روشنی پڑتی ہے۔ حاجی پور کے ماموں بھانجہ کے روضہ کے مجاور شیخ حسن کے نام مہاراجہ مان سنگھ کچھوا صوبیدار بہار نے ۹۹۹ھ میں ایک سند عطا کی تھی جس میں بھی بموجب اسناد حکام سابق اور بہ تصدیق و تصحیح مرحومی صدارت پناہ قاضی یعقوب" کی عبارت مندرج ہے۔ ۔ سند کا عکس بنگال ریاست اڈیرنرنٹ کلکتہ میں راقم السطور کے ایک مقالہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ قاضی یعقوب قاضی فضیلت کے صاحبزادے تھے اور قاضی فضیلت کڑہ مانک پور کے رہنے والے تھے۔ جنہیں شیر شاہ نے بنگال و بہار کا کچھ دنوں کے لئے حاکم مقرر کیا تھا۔ ان کی سختی اور شرعی موشگافیوں کی بدولت لوگوں نے انہیں قاضی فضیحت کہنا شروع

کیا گیا۔ ۴؎ رسالہ جوادیہ کے نسخہ میں خاندان کے ایسے بہت سے افراد کی ایک فہرست ہے جو قاضی القضاۃ اور نائب قاضی کے عہدوں پر مامور ہوئے۔ ۵؎ قاضی کے جس عہدے پر وہ مامور ہوتے تھے اس کی رو سے وہ اس قسم کے دستاویزات پایا کرتے تھے اور شاید ان میں سے کچھ واپس نہیں کئے جاتے تھے۔ ان دستاویزات میں (۱) شاہ جہاں کا ایک فرمان ۱۰۴۳ھ کا ہے جو سرکار بہار کے بلیا پرگنہ میں بی بی ماہ کوچ، محمد عاصم وغیرہ کو مدد معاش بطور جاگیر دینے کے سلسلہ میں ہے (۲) شاہ جہاں کا ایک فرمان مرقومہ ۲۹ سال جلوس یا ۱۰۶۵ھ ہے جو راجہ جسونت سنگھ کے نام اس کے بھائیوں کے ساتھ ایک قطعہ زمین کے لئے باہمی مناقشہ کے سلسلے میں ہے (۳-۴) محمد شاہ (۳۰ جلوس) اور عالمگیر دوم (سال ششم) کی طرف سے بہار کے شاہجہاں پور پرگنہ میں قاضی مقرر کرنے کے سلسلہ میں دو سندیں ہیں۔ ۶؎ یہاں سطور یہ ہیں: ع گر گرفتم قلم را بستم دو لب :: نوشتم مناقب ہم اندر سہ شب۔ تو از حرف غافل و حرف زماں :: بجو سال تاریخ گفتن عیاں۔ لفظ شب تین بار کی عددی قیمت ۹۰۶ بشمول ۴۰ "م" کے عدد میں ۹۴۶ ہوتی ہے۔ حرف زماں "غافل" سے مل کر سال تاریخ بنا ہے۔ مناقب محمدی کے چھ صفحات کی تحریر شیخ کی خود نوشت جو مخدوش ہے قانون گو جنید حسن کے یہاں بطور ذخیرہ محفوظ ہے۔ ۷؎ ملاحظہ ہو رسالہ جوادیہ۔ ۸؎ ملاحظہ ہو تذکرۃ المجدد۔ ۹؎ کہا جاتا ہے کہ خاندان کے ایک فرد کے پاس یہ نایاب چیز موجود ہے لیکن وہ کسی کو دیکھنے کا موقعہ نہیں دیتے۔ خاص خاص موقع پر اپنے معتقدین کو زیارت سے شرفیاب فرماتے ہیں۔ ناچیز کا خیال ہے کہ اس کے مطالعہ سے کام کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ ۱۰؎ بغداد ۸۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ محض ۲۲ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اور ایک جید عالم ہو گئے۔ ۴۰ برس کے تھے کہ دعوت خلق اللہ پر مامور ہوئے۔ کافی ریاضت و مجاہدہ کے بعد رشد و ہدایت کی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ ۱۱؎ مصاحب و خواست با ضعفا و علماء و فقراء و مساکین و بیماران داشتے اگر توانگرے بر بیدے۔ ذرہ التفات نفرمودے لاکن بکم توجہی۔ نذر و ہدیہ کہ کسے آوردے بغربا و مساکین دادے و موافق احتیاج برائے اتباع خود نیز ازاں برگرفتے فعل غیبت روا نہ داشتے۔ کم گفتار۔ کلام و الفاظ لغات عربی و فارسی سخن گفتے۔ در حیات و سفر ہر کجا کہ رفتے فی الحال در کلام مثل مردمان آں دیار در آمدے چوں بہ سرحد نہ رسید ما مشائخان سندو ماں و افغان رفت و تلفظ از کما ینبغی نہ کرد۔ جسیم البدن ہموار بلند بالا پیوستہ شکم، فراخ پیشانی، باریک کشادہ ابرو، بلند بینی کشادہ چشمے، عریض و دراز محاسن سفید، جس میں انتقال کے وقت خال خال سیاہ بال ملے ہوئے تھے،

عریض الصدر (چوڑا سینہ)، ہاتھوں کی انگلیاں لمبی، آنکھیں اور کان متوسط اور صاف چہرہ۔ ؎۱ چوتھا باب
ایک، لمبی ٹوپی پہنتے تھے جو سر میں چپکی رہتی تھی۔ اور جس کا رنگ سفید یا سبز ہوا کرتا تھا۔ کلاہ ناشرہ کا زیادہ
بلند تر باشد سے متنفر تھا، اس لئے کہ اسے کافروں کا پہناوا سمجھتے تھے۔ اسی طرح سرخ رنگ سے بھی متنفر تھا۔ قندھار
میں ایک شخص نے جو سرخ دستار باندھے پر ایک سفید عمامہ جس میں گرہیں پڑی رہتی تھیں اور جو شکل میں گول تھا
جسم کے گرد ایک سفید پیرہن، یا لمبا چغا کرتے کے ساتھ اور اس پر کالے اون کا ایک کمبل موسم سرما میں استعمال
کرتے تھے۔ ؎۲ چوتھا باب گفتگو اور زبان پر اپنے سفر کے دوران جہاں کہیں بھی وہ گئے، انہوں نے علاقائی
بات چیت کو اپنایا، وقت ضائع نہیں کیا ...... ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں وہ اس قابل تھے
کہ ہندی مشائخ (مقدس لوگ) سے ان کی زبان میں صحیح تلفظ کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔ ؎۳

؎۱۔۳ HUNTER W.W. A STATISTICAL ACCOUNT OF BENGAL B P & P جلد ۱۲ صفحہ ۱۹

؎۴ رسالہ جو اردو میں امیرالہ حکیم محمد شعیب صاحب قبلہ پھلواری کی وساطت سے ۔ شیخ قندھار ہو کر پہلے
ہی سید نصیر الدین تبریزی کی زبانی شیخ کی شہرت سن چکا تھا۔ وہ اور وہاں کے جید عالم شیخ منصور نے ان
کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ؎۵ مخدوم سید انکی سراج الملک والدین کے واسطے سے شریف کہلایا۔ مخدوم کے
تین فرزندوں میں سے ایک سلیمان شہیدی نے شیخ کے سفر ہندوستان میں ساتھ دیا۔ شیخ سکندر لودی اور اس
کے لڑکے اور جانشین کا ہمعصر بہار کا دریا خاں نوحانی خاص جس کو نام شیر شاہ کے ساتھ بلسے کے گنبد نما
مزار کے کتبہ میں موجود ہے۔ یہ مزار حضرت جمال الدین جمن جتی مرید خاص حضرت بدیع الدین مدار قدس سرہما العزیز
کا ہے، جن کے متعلق B P & P کلکتہ میں راقم السطور کا ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ دریا خاں نوحانی
کا ایک دوسرا اہم اور نادر کتبہ بہار شریف کے محلہ دائرہ میں حضرت شمس تت گوشائیں کے مزار کے شمالی دیوار میں
سید حسن رضا صاحب دائروی اور راقم السطور نے موٹے پلستر کو صاف کر کے نکالا۔ اب عبارت تو پڑھی جاتی
کا پتھر ٹوٹا اور بڑا نمایاں صاف ہے لیکن ضیاء الدین دیسنانی صاحب مرحوم سے کچھ کام کی بات معلوم ہوئی۔ اس کتبہ
سے پتہ چلتا ہے ۹۰۰ھ میں حاجی خاں نے "درسرق" کی بنیاد ڈالی۔ یہی حاجی خاں بنام مریدوں کے مزار کی
فہرست میں ملتا ہے "ہوا درست" تو "کی عبارت جب پڑھی جائے گی تو سب سے پڑھ کر یہ شعر ہے:-
"در زمین عصر دین آنکہ دریا خاں فرید :: سپہر ملک، وقت را زنوحانی بود محور" مرحلہ ہو یا چیز مقالہ

بہار لودی سلاطین دہلی کے عہد میں، (جرنل بہار ریسرچ سوسائٹی پٹنہ) شلہ اس سے پہلے کہ شیخ المجہر نے ہندوستان کو اپنا گھر اور مستقل جائے سکونت قرار دیا اور ملکی لوگوں کی زبان سے اس قدر آشنائی حاصل کی کہ وہ خیالات اور مذہبی اعتقادات کے تبادلے کا ذریعہ بنے۔ اردو یا ہندوستانی زبان کی ملی جلی شکل کو آگے بڑھانے میں بہاری صوفی مشائخ کے کارناموں کی قدرے جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بہار شریف کے مشہور و معروف بزرگ مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہ العزیز کو ہم اس طرح کے فقرے استعمال کرتے ہوئے دیکھتے ہیں "باٹ بھلی پر سانکری۔ دیس بھلا پر دور۔" یہ فقرہ ان کے ملفوظ معدن المعانی میں ہے جسے ان کے مشہور خادم شیخ بدر زین عربی نے ۷۴۷ھ یا ۷۵۱ھ میں ترتیب دیا ہے۔ آپ کے خلیفہ جلیل و جانشین مولانا مظفر شمس بلخی کے مکتوبات میں تو متعدد ہندی دوہے آگئے ہیں۔ ان کا مقولہ "آمین رات بھیا لا۔ جن کارن دکھیا بھایان" مونس القلوب مؤلفہ حضرت حمد دریا بلخی میں مندرج ہے۔ مکتوبات صدی کے عصری نسخہ کے حاشیہ پر بھی حضرت مولانا مظفر بلخی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہندی فقرہ قابل زیارت ہے۔ یہ نادر و معتبر نسخہ خانقاہ فتوحہ میں موجود ہے شاہ مخطوطات میں اس قسم کے ہندی الفاظ کی موجودگی نمایاں ہے۔ مولف ملا تیر شیرازی دیسی زبان کو سیکھنے میں دقت محسوس کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے روحانی پیشوا سے عرض کیا "تمام زبانوں میں ہندوستانی الفاظ کے حروف تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ یہی غیر ہندوستانی ان کے حروف یا تلفظ ان کی ادا نہیں کر سکتے۔ ہم کوشش بسیار کے باوجود اس میں خوش کلامی کی معراج کو نہیں پہنچ سکتے۔ کیا نہیں ہوتے، اس کا سبب کیا ہے؟" سوال سے زیادہ دلچسپ جواب ہے جو انہیں ملا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور ان کا ہندی کلام

ہندوستان کے صوفیائے کرام اور مشائخ عظام میں خواجگان چشت کو ہمیشہ بڑی اہمیت اور شہرت حاصل رہی۔ چشتی سلسلہ خواجہ ابو عبدال چشتی م ۹۶۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور ہندوستان میں اس کا شیوع خواجہ معین الدین چشتی سیستانی مرید خواجہ عثمان ہارونی سے ہوا۔ وہ ۱۱۹۲ء میں لاہور ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ ۵۲ سال کی عمر میں اجمیر کو مستقل قیام گاہ قرار دیا اور ۱۲۳۶ء میں فوت ہوئے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی م ۱۲۳۶ء، بابا فرید شکر گنج پاک پٹن م ۱۲۶۵ء، حضرت نظام الدین اولیاء م ۱۳۲۵ء اور علاء الدین علی احمد صابر م ۱۲۹۱ء سے چشتی سلسلہ تقریباً سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی، حضرت عبدالحق ردولوی، ان کے بیٹے عارف صاحب اور پوتے محمد صاحب اور ان کے پیر جلال الدین پانی پتی مرید شمس الدین پانی پتی کے ذریعہ پیر کلیر (نزد رڑکی) مخدوم علی احمد صابر کے سلسلہ کے بزرگ اور چشتی صوفیوں کے اعمال و افکار کے بہترین نمائندوں میں ہیں۔ دنیا اور اہل دنیا کے درمیان رہ کر دنیاداری سے اجتناب ان کا شعار تھا۔ گوشہ نشینی، رغبت اور صاحبان ثروت و امارت سے حتی الوسع علیحدگی کی خواہش کے باوجود امرا و سلاطین کی والہانہ عقیدت مندی ان بزرگوں کو سب سے زیادہ حاصل تھی۔ اتباع سنت اور پابندی شریعت میں غلو کے باوجود ویدانتی، جوگیوں، جوگیوں، سدھوں (سنتو واصلان حق) کے خیالات سے بہت حد تک ہم آہنگ تھے۔ تفکر، ریاضت نفس، مجاہدہ، مراقبہ، مکاشفہ، ذکر و اشغال، حبس دم، وجد و استغراق کے علاوہ ان کے نظریہ وحدت الوجود اور خیالات کے ارتقا میں ہندوؤں کے اعمال و عقائد کی بہت حد تک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ تشابہ و اشتراک کے گوشے اور

امکانات نظر آتے ہیں۔ ادویت اور احدیت، ایکم ادو یتم اور ہمہ اوست میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ خداپرست صوفی کبھی تو ذات باری ہی کے وجود کو وجود حقیقی سمجھتا ہے اور تمام موجودات کو عارضی و بے ثبات اور ایک ہی واحد مطلق قائم بالذات کے نور کا پرتو مانتا ہے۔ اگر شنکراچارج کے مایا اور نرگون برہمن (وجود مطلق مبرا از صفات) سے قطع نظر بھی کیا جائے تو رامانج کے دیشسٹ آدویت کے نظریہ جس میں ذات وصفات کا تخیل موجود ہے اور مادہوچارج کی دوویت (اثنیت) میں جس میں خالق ومخلوق کا امتیاز باقی رکھا گیا ہے چشتیوں کے لئے دعوت فکر کی گنجائش نکلتی ہے۔ تصوف کے نشوونما میں ہندوستان کا کافی حصہ ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ اسلامی تصوف کس حد تک ہندوؤں کی تعلیمات سے متاثر ہوا یا یہ کہ ہندو مصلحین کس حد تک اسلامی تخیلات سے دانستہ یا نادانستہ طور پر متاثر ہوئے تو یہ متنازع فیہ ہے۔ اتنا تو بہر حال ماننا ہی پڑے گا کہ ہندوستان کی سرزمین تصوف کے لئے سب مقامات سے زیادہ سازگار ثابت ہوئی۔ یہاں کے لوگ عزلت و رہبانیت، ترک خودی، نفس کشی، حب اللہ، وصل الی اللہ، فنا فی اللہ، سماع (موسیقی) وجد و رقص، عشق و فلسفہ کے خوگر تھے۔ مذہبیت ساری فضا میں رچی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تقریباً دو تہائی آبادی اہل تصوف پر مشتمل تھی اور شاید ہی اتنی بڑی تعداد کسی ایک ملک میں ایسی پائی جائے صوفیوں میں چشتیہ سلسلہ کا دائرہ سب سے وسیع ہو گیا۔ چشتیہ صوفیہ سب وجودی ہیں ہندوستانیت ان میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ثقافتی اعتبار سے بہ نسبت اور سلاسل کے بزرگوں کے اکابر چشتیہ ہندو طریق عمل اور ہندو خیالات سے قریب تر ہیں۔ بجائے کفر و اسلام کے امتیازات ومغائرت پر زور دینے کے ان کے شاعر کہتے ہیں ؎ در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چراست۔ از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است ؛؛ ملک محمد جائسی مصنف پدماوت اپنی کتاب اکھراوٹ میں لکھتے ہیں ؎ بدھنا کے مارگ ہیں تیتے ۔ سرگ نکھت ر دواں جیتے ؛؛ (جس طرح آسمان میں ستارے یا بدن پر انگنت ہیں اسی طرح خدا تک پہنچنے کے راستے بھی لاتعدّ و لاتحصیٰ ہیں) صائب اسی کو اپنے لفظوں میں کہتا ہے ؎ گفتگوئے کفر و دیں آخر بہ یکجا میکشد۔ خواب یک خواب است اما مختلف تعبیر ہا ؛؛ یہی تعلیم تو ہندوؤں کی متبرک کتاب گیتا نے بھی دی ہے۔ حضرت نظام الدین کا ترجمہ

مصرع "ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے" بھی اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی بھی یہی فرماتے ہیں "راہ ہائے خدائے تعالیٰ ابعد دانفاس خلائق است۔"

چشتیہ سلسلہ کے بزرگان بڑے وسیع القلب اور روادار تھے۔ خواص سے زیادہ عوام سے ان کا واسطہ تھا۔ عربی ان کی دینی و علمی اور فارسی مادری زبان تھی لیکن ملکی اور عوامی بھاشاؤں سے بھی ان کا گہرا سروکار تھا۔ ہندوستانی زبانوں کو اپنانا لوگوں کی مقامی معیاری بولی کا استعمال تبلیغ و اشاعت کے لئے بہت ضروری سمجھتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کے بنیادی اصول کی حقیقت کے اعتراف کے باوجود انہیں اپنا مذہب اسلام بہت عزیز تھا۔ قرآن و سنت کی تعلیمات پر چلنا جزو ایمان قرار دیتے تھے اور ان کی پیروی دنیا و آخرت کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ ملت ابراہیمی اور دین محمدی کو سب سے زیادہ سیدھا آسان اور منزل مقصود تک جلد سے جلد پہنچا دینے والا راستہ بتاتے تھے۔ وحدت وجود کے قائل ہونے کے باوجود مسلمان تھے اس لئے خالق و مخلوق کا فرق ان کے لئے ناگزیر تھا۔ کائنات و موجودات عالم کو ذات مطلق کا مخلوق و مظہر سمجھنے پر مجبور تھے۔ خدا ہی ہے اور وہی سب کچھ ہے اور کچھ نہیں۔ وحدت ہی کا کثرت میں ظہور ہے۔ پرتو عکس و اظلال کا حقیقی وجود نہیں ہوتا "کن فیکون" میں حکم خداوندی اپنی ذات کی طرف ہوا اور وہی ذات تعینات میں آگئی جس سے کائنات کی تعبیر کی گئی۔ جمیع عالم مظاہر صفات حق ہیں۔ ذات و صفات میں ان بزرگوں کو امتیاز گوارا تھا۔ مخلوق خدا کی خدمت کو بھی عبادت سمجھتے تھے۔ لوگوں کے اخلاقی و روحانی اقدار کی بہتری اور اصلاح اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ تعلیم و تعلم پر خاص نظر رکھتے تھے۔ علم ظاہری پر شغل باطنی کو ترجیح دیتے تھے لیکن درس و افادہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا حصول علم کی برابر تاکید کیا کرتے تھے۔ اپنے اخلاق حسنہ اور برتر کردار معالجہ جسمانی و روحانی، دعا و تعویذ کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو مسخر و گرویدہ کرتے تھے۔ مکتوبات و ملفوظات کے ذریعہ تعلیمات دور و نزدیک رہنے والوں تک پہنچاتے تھے۔ تعلیم و تلقین کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ ان کی خانقاہوں میں اجتماع خلائق ان کی ہر دلعزیزی کا ثبوت تھا۔ فیوض و برکات اور توہم پرستوں کے لئے کشف و کرامات بڑی اہم باتیں تھیں۔ مرجع علمائے ظاہر و باطن اور مطبوع خلائق تھے

خود تو فقر و فاقہ، اوراد و وظائف، ذکر و اشغال میں منہمک رہتے لیکن کمزوروں، دکھی لوگوں حاجت مندوں، علماء و مشائخ، ضعفاء و فقراء کی حاجتوں، وجہ معاش اور ضروریات دنیوی کے لئے سفارشات کے لئے ہمیشہ تیار رہتے اور حقیقت یہ ہے کہ امراء و رؤسا اور سلاطین سے جو کچھ تھوڑا بہت انھیں واسطہ تھا محض ان لوگوں کی دادرسی اور حاجت روائی کے لئے ہی ہوتا تھا۔ دین اسلام کی توسیع تبلیغ و اشاعت میں اور مختلف ملل و فرق کے افراد کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے میں جتنا حصہ صوفیوں خصوصاً خواجگان چشت نے لیا وہ دوسرے ذرائع سے ممکن نہ تھا۔ ان بزرگوں نے اپنے بڑھتے ہوئے اثرات و رسوخ سے کبھی کوئی ذاتی منفعت حاصل نہ کی۔ اولی الامر کی اطاعت کو ضروری سمجھتے تھے لیکن انھیں ان کے فرائض مذہبی و دنیاوی سے آگاہ کر دینا بھی لازمی سمجھتے تھے۔ سیاست سے علیحدگی کے باوجود جب دیکھتے کہ صاحبان اقتدار اور سلاطین جادہ شرع پر نہیں چلتے تو انہیں ٹوکتے اور اپنی دانست میں صحیح راستہ بتانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔

یہ ساری باتیں حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے حالات زندگی، تصانیف و تعلیمات کے مطالعہ سے واضح ہو جاتی ہیں۔ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے اکابر شیوخ میں ان کی شخصیت بہت وقیع اور ان کا پایہ بہت بلند تھا اور ان کی تعلیمات، کلام اور علمی و ثقافتی اثرات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھیں صاحب اخبار الاصفیا (عبدالصمد خواہر زادہ علامی ابوالفضل) نے مجتہد وقت اور مقتدائے زماں کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ ان کے پوتے شیخ عبدالنبی م ۹۹۱ھ ابن شیخ احمد م ۹۶۲ھ اکبر اعظم کے صدر الصدور تھے اور اسے بقول عبدالقادر بدایونی ایک وقت "چناں اعتقاد پیدا شدہ بود کہ کفش پیش پائے نہادند" لیکن حب جاہ و زر پیدا ہو جائے تو بزرگی اور شرعی امور کی تلقین کا اثر باقی نہیں رہتا۔ ایک برہمن کے قتل کے واقعہ نے انھیں نظر سے گرا دیا۔ حضرت عبدالقدوس ہمیشہ صوفیوں بالخصوص چشتیوں کے قدیم اصول پر گامزن رہے اور حکومت وقت سے علیحدہ رہ کر بعض امور پر اپنے رد عمل کا بغرض اصلاح اظہار کرتے رہے۔ صاحب مراۃ الاسرار لکھتے ہیں۔ " زندگانی دراز یافتہ از وقت سلطنت بہلول لودی تا زمان سلطنت نصیر الدین محمد ہمایوں

بادشاہ بر مسند ارشاد مستقیم بود و سلاطین وقت بخدمت وے اخلاص و نیازمندی تمام داشتند چنانچہ مکتوبات کہ باسم ہر یک سلاطین وقت خود نوشتہ نقل آں ہنوز موجود است" مکتوبات قدسیہ میں دو خطوط ہمایوں کے نام ہیں۔ ایک طویل خط جو بابر کو لکھا گیا اور دوسرا طویل مکتوب جو سلطان سکندر لودی کے نام ہے لائق مطالعہ و توجہ ہیں۔ ابوالفضل تذکرۂ اولیا میں لکھتے ہیں:۔ "نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ در علم حقائق و معارف با حضرت شیخ عبدالقدوس حنفی صحبت می داشت کہ در آں فن ممتاز بود" آئین اکبری میں یہ بھی لکھا ہے: "جنت آشیانی (ہمایوں) با برخے کار آگہاں بزادیہ او در شدے" بحث و مباحثہ کی بھی شاید نوبت آجاتی تھی کیونکہ بقول علامی "گرمی پذیرفتے" تلخی ہونا لازمی تھی۔ اس لئے کہ شیخ مذہبی معاملات اور تسنن میں بہت متشدد تھے اور بادشاہ یہاں تک آزاد خیال تھا کہ کچھ لوگوں نے رفض سے بھی اسے متہم کر دیا۔ شیخ و بادشاہ کے بعض امور کے متعلق تباین خیالات پر ایک واقعے سے روشنی پڑتی ہے جسے صاحب زبدۃ المقامات نے لکھا ہے۔ "یکبار شیخ بدہلی آمدہ بود۔ شیخ حاجی عبدالوہاب بخاری کہ اولاد سید جلال الدین بخاری بود و صاحب علم و حال تفسیرے نوشتہ بود نزد شیخ فرستاد چوں آیۂ تطہیر اہل بیت سرور کائنات علیہ و علیہم الصلوٰۃ و التحیات برآمد شیخ عبدالوہاب در یں مقام نوشتہ بودند کہ بنی فاطمہ مامون الخاتمہ اند و عاقبت شاں علی الیقین بالخیر۔ شیخ عبدالقدوس بر کنار آں نوشت کہ ہذا خلاف مذہب اہل سنت و الجماعت و کتاب را باز فرستاد ایں سخن میان علمائے آں بلدہ بمذاکرات بوقوع پیوست بالآخر مقرر آں شد کہ شیخ عبدالقدوس گفتہ" ہمایوں کو علیؓ و اولادِ علیؓ کی ولا میں جو غلو تھا اس کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے ؎ ما ہم زجان بندہ اولاد علی مستیم ہمیشہ شاد بیاد علی۔ شیعہ ماں اور ایرانی امداد ہی کا اثر نہ تھا اور ایران کے سفر کے پہلے یہ ملاقاتیں اور بات چیت ہوئی۔ باوجود اس فروعی امر میں اختلاف کے دونوں ایک دوسرے کی قدر و منزلت سے آگاہ تھے۔ شیخ "جواں بخت خدا ترس ضعیف پرور عدل گستر" بادشاہ کے صفات حمیدہ و کمال علم و جمال عمل" کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور "قدر ارباب علم و معرفت بکمال شناختہ" کا اعتراف کرتے ہیں اور دوسرے مکتوب میں جو چندیری کی مہم سے واپسی پر لکھا گیا فرماتے ہیں "مراجعت میمون بالفتح مبارکباد...... الحمد للہ العظمۃ شانہ کہ ہمت آں عزیز دارین بر احسان خلائق

لاسیما طائفہ علماء و فقراء مصروفست و سعادت کونین و دولت دارین ہمدرین موعوداست تا باد چنیں باد و بل من مزید باد۔" دین دار بادشاہ بھی ان کی عظمت و علو شان کا قائل تھا۔ جب آپ کا تقریباً ۸۴ برس کے سن میں ۲۳ جمادی الآخر $\frac{944}{1537}$ کو وصال ہوا جس کی تاریخ صاحب زبدۃ المقامات نے "شیخ اجل سے نکالی ہے تو ہمایوں بادشاہ نے سہارنپور سے ۲۳ میل جنوب تحصیل نکوڑ کے ایک دیہات گنگوہ میں جہاں آپ آخری ایام زندگی میں مسکن گزیں تھے آپ کا مقبرہ تعمیر کرا دیا۔ مغلوں کی شاندار عمارتی روایات کا یہ روضہ تو حامل نہیں لیکن ایک چھوٹی خوب صورت عمارت ضرور کہی جا سکتی تھی۔

حضرت عبدالقدوس کا سلسلہ نسب امام اعظم ابو حنیفہ کوفی سے جو کہ نارنگ پر اور نوشیروان عادل کسریٰ بادشاہ فارس کی اولاد میں تھے ملتا ہے۔ وہ اپنے خطوط میں خود کو "عبدالقدوس اسمٰعیل صفی الحنفی الغزنوی" لکھتے ہیں۔ ان کے دادا شیخ صفی الدین حنفی جن کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ "باعتبار علم و تقاوت و کمالات معنوی ثانی ابو حنیفہ بودہ است۔" یوپی کے قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی میں توطن گزیں تھے۔ مکتوب ۱۲۴ میں حضرت عبدالقدوس "پیغمبران بر جملہ ملائک فضل دارند" و "فرشتہ دل ندارد" پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ایں روایت در معدن الغرائب شرح شاشی تصنیف جدی صفی الملۃ والدین رودولوی رحمۃ اللہ صریح است در بحث و فی تحقیق جنس الانسان" صاحب زبدۃ المقامات شیخ صفی کے بارے میں لکھتے ہیں "در اصول و فروع علوم از فحول محققین بود و صاحب تصانیف مفیدہ" صاحب لطائف قدسی انھیں "مخدوم قاضی صفی الدین" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مسند قضا پر فائز تھے۔ آپ نے تعلیم جونپور میں پائی۔ جب حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ العزیز رودولی پہنچے اور ۴۰ روز تک وہاں قیام کیا تو آپ ان کے حلقۂ ارادت میں آ گئے۔ اس وقت شیخ اسمٰعیل ابن شیخ صفی الدین شیر خوار تھے بچے کو پیر کے قدموں میں ڈال دیا اور دعا و بشارت سے فیض یاب ہوئے۔ الغرض قاضی شیخ محمد صفی الدین کہ "با صاحب کمال بود سالہا ارشاد نمودہ حضرت اسمٰعیل را بر جائے خود تمام کردہ بعالم بقا نقل فرمودہ بہ قصبہ رودولی مدفون گشت۔" جب مخدوم احمد عبدالحق رودولی تشریف لائے و بر مسند ارشاد متمکن گشت، تو حضرت شیخ اسمٰعیل آپ کی خدمت میں پہنچے "بخدمت آنحضرت تولیٰ نمودہ" آپ نے فرمایا۔ "تربیت دار ارشاد شیخ صفی الدین حنفی در حق تو کافی است" حضرت عبدالقدوس

کی ولادت بقول صاحب اذکار الابرار $\frac{\text{۸۶۰ھ}}{\text{۱۴۵۶ء}}$ میں ۲۳ سال بعد از وفات مخدوم حضرت شیخ احمد عبد الحق (د ۸۳۷) رودولی۔ جب سن تمیز کو پہنچے تو شیخ عارف بن مخدوم احمد کے ہمعصر تھے اس لئے ان پر ان کا اعتقاد ممتاز تھا "خمیر طینت او بہ محبت حضرت عبد الحق واقع شدہ بود" مخدوم رودولوی کے روضہ کی خدمت جاروب کشی اپنے ذمہ لے لی۔ بفیض ولایت معنوی آنحضرت تربیت و پرورش یافت و ظاہر صحبت در حقائق و معارف با حضرت شیخ پیارہ می داشت۔ یہ شیخ پیارہ از خلفاء محرم اسرار حضرت شیخ عارف بود از ان حضرت تربیت و ارشاد نیز یافتہ بود۔ انھیں کی صحبت سے حضرت عبد القدوس نے زیادہ تر فیضان حاصل کیا۔ شروعات یوں ہوئی کہ ایک روز شیخ پیارہ دیوان مسعود بک کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جب حضرت قدوس کو آتے دیکھا تو دیوان را بپیچیدہ و مناسب ندید کہ در حضورش دیوان مسعود بک خواندہ شود چرا کہ آبا و اجداد آنحضرت علمائے شرع و مفتی وقت بودند آنحضرت بفراست دریافتہ گفت کہ طالب ہمیں توحید آمدہ ام از ماچرا مخفی میکنید۔ پھر تو اختلاط او صحبت محرمانہ واقع شدہ۔ واضح ہو کہ خواجہ مسعود بک کا اصلی نام شیر خاں تھا وہ از بائے سلطان فیروز شاہ بادشاہ دہلی بود مدتے در لباس اغنیا و اہل دولت گذرانند ناگاہ از مواہبات الہی جذبہ حق در کار شد شیخ رکن الدین کے مرید ہوئے۔ صاحب مراۃ الاسرار یہ فرماتے ہیں ——

"میان این طائفہ در جمیع کمالات ممتاز گشت و بے انتہایت حالت سکر داشت و سخن امستانہ گفت در سلسلہ چشتیہ ہیچ کس این چنیں اسرار حقیقت را فاش نگفتہ و مستی نکردہ در علم توحید و تصوف مصنفات بسیار دارد و تصنیفے دارد مسمیٰ بہ تمہید بر طبق تمہیدات عین القضات ہمدانی و دیوان اشعار دارد کہ بموجب اجازت حضرت شیخ نصیر الدین اودھی نوشتہ است۔ وازہر اقسام سخن لطیف در آن مندرج ساختہ است و تصنیفے دیگر دارد مسمیٰ بہ مراۃ العارفین سے مانسخہ محمد مرسل فتادہ ایم۔ زیرا کہ ہر ولسیت در این نسخہ نبی —

؎ رفت از مسعود بک جملہ صفات بشر چونکہ ہمان ذات شد . . . .

آخر او را حالے پدید آمدہ کہ بے اختیار خود بر آمدہ اسرار الہی فاش گردانید۔ در آخر سلطنت سلطان فیروز شاہ علمائے ظاہر متفق شدہ در زیر قلعہ فیروز آباد بر لب جون پارچہ پارچہ کردہ اعضاء ظاہر او را در آب مظہر انداختند۔

حضرت عبدالقدوس کا ابتدائی زمانہ ردولی میں خانقاہ و روضہ مخدوم احمد عبدالحق کی خدمت گذاری میں بسر ہوا۔ فیض روحی و ارشاد معنوی از روح شیخ عبدالحق بود چنانکہ خواجہ اویس قرنی را از حضرت رسالت پناہ صلعم فیض روحی و باطنی بود ہر چہ از سلوک ایں راہ مشکل بود از حضرت شیخ عبدالحق حل میشد در ظاہر در صحبت شیخ پیارہ خادم شیخ عارف میبودند و دست بیعت و ارادت از حضرت شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ عبدالحق بود۔ شیخ گنگوہ اپنے پیر و مرشد کا ایک ہندی دوہے میں یوں ذکر کرتے ہیں: "محمد محمد جگ کہے چینھے نا ہی کوئے۔ احمد میم گنوائیا کہہ کیوں دوجا ہوئے :: محمد پھول اماد (احمد) کا پھل ہی آپن سوئے (ان ہی کا پھل ہے)۔ سو کیوں جانے با پرا دیے چارہ) جنہہ نہ چینھا ہوئے :: محمد عارف ہور (اور) ہے عارف احمد سوئے۔ الکھ کتھا بیدلدھن (دونت شیخ محمد شیخ لاؤ) کی برلا (بہت کم) بوجھے کوئے :: محمد میں تین ات نیرا اسلیے میرا کنت (محبوب) تن من جوبن دیکھ میں بھی آپ اکینت (مرشد نامہ)۔ الغرض آپ نے شیخ محمد سے سلسلہ چشتیہ صابرہ کا خرقہ خلافت حاصل کیا اور مرید ہوئے۔ دوسرا سلسلہ شیخ درویش بن قاسم اودھی سے پہنچا۔ یہ قادری تھے جامہ خلافت دادہ بودند اما سر ارادت و خلافت اصل از جانب شیخ محمد بن شیخ عارف بود۔ شیخ گنگوہ نے میاں شیخ بن حکیم اودھی اور مخدوم شیخ خواجگی سدھوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ موخر الذکر مخدوم شیخ صدر با خلیفہ حضرت شیخ شمس الدین اودھی مرید میر سید اشرف جہانگیر کے ممتاز خلفا میں تھے۔

روحانیت حضرت احمد عبدالحق حضرت عبدالقدوس کے دل میں اس قدر جاگزیں ہو گئی تھی کہ مرتے دم تک قائم رہی۔ ایک شب کتاب کا نیہ ہاتھ میں لیے روضہ میں داخل ہوئے۔ کسی جانب سے حق حق کی صدا سنی بے خود ہو گئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ایک شب برادر ہمراہ واجب والد کے ساتھ "چہار پائی" پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صدائے حق حق نے از خود رفتہ کر دیا۔ ماں سے اجازت لے کر گھر سے چل پڑے۔ تعلیم کو خیر باد کہا۔ ماں نے اپنے بھائی قاضی دانیال پر زور دیا کہ سمجھائیں۔ دوران گفتگو میں "عورات مغنیہ" پر نظر پڑی جو "دف زنان و سرود گویاں" ایک طرف سے گذر رہی تھیں۔ عالم مستی میں جھومنے لگے۔ یہ دیکھ کر کوشش ترک کر دی گئی

اب شیخ خواجگی سدھوری خلیفہ شیخ سدھا کے پاس سدھورہ پہنچے۔ کم علمی کا اعتراف کیا تو دھار رسے
بندھا آئی گئی۔ چند مجذوبوں سے جن میں یونس دیوانہ، میاں تاجن، میاں بھکیا کا نام آتا ہے سمت افزا
کلمات زبان پر لائے "ہمہ تن یاد حق"، ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ روضہ کی جاروب کشی اور پیر طریقت
کی خدمت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شیخ عارف کی زوجہ محترمہ ام کلثوم نے اپنی دوسری لڑکی کی ایک خواب
کی بشارت پر نسبت پیش کی جب آپ حسب معمول بروز جمعہ شیخ محمد بن شیخ عارف کے کپڑوں کو دھو کر ان
کے اذن امید و پسر کے کان میں بانگ اذان کا فریضہ ادا کرنے کے لئے بلائے گئے تو کنیز نے نسبت کی خبر
دی۔ آپ نے سکوت اختیار کیا۔ ابھی جاروب زنی اور آب کشی میں مصروف ہی تھے کہ شادی کے کپڑے
آئے۔ غسل کے بعد اسے پہنایا گیا۔ عقد نکاح کا سامان ہوا۔ آپ گھر کے اندر لے جائے گئے۔ "جلوہ در رسم
ولایت است آغاز نمودند" عورات مغنیہ نے گانا شروع کیا۔ ہندی گیت: "گھونگھٹ رائے کھول
دیکھیاس نہ دیکھا تورے اس گھونگھٹ رے کارنے ست باندھ مروڑے" سننا تھا کہ آپ پر وجد
و حال کی کیفیت طاری ہوئی، تخت عروسی سے گر پڑے۔ جامہائے نوشہی را پارہ پارہ ساخت
لوگوں نے بی بی ام کلثوم پر فقرہ کسا "دختر خود را بدالنستگی چرا بدیوانہ می سپاری" جواب دیا بخشش
ازل یہی تھا۔

پیر و مرید سالے بہنوئی میں بڑی محبت تھی۔ مرید گلکاری میں مصروف رہتا اور پیر اپنے
ہاتھ سے اس کے منہ میں نوالہ ڈالتا جاتا۔ پیر کے گھر کی آب کشی، ہیزم تراشی، گلکاری، جاروب زنی اور
دوسرے چھوٹے چھوٹے امور کو انجام دیتے تھے۔ ترک دنیا و خلق سے کشیدگی کا جذبہ غالب تھا۔ فقر و فاقہ
مرغوب تھا۔ ان کے بڑے بیٹے شیخ حمید الدین انھیں ایام میں تولد ہوئے۔ حالت طفلی میں جب
گرسنگی سے رو کر کوئی بچہ ماں کے پاس آتا، کھانا طلب کرتا۔ کہتیں باپ سے کیوں نہیں مانگتے؟ وہاں سے
جواب ملتا بہشت کی نعمات کا انتظار کرو۔ ماں سے آکر سمجھ بچہ پوچھتا بہشت کیا ہے؟ کہاں ہے؟ ہم
وہاں کب جائیں گے؟ روتیں کہتیں آج تو ہمارا نصیبہ یہ ہے کل کیا معلوم کیا ہوگا۔ نہ کھانے کی فکر تھی
نہ کپڑوں کا خیال۔ ایک مرتبہ ان کے بڑے بھائی شیخ عبد الملک عرف میاں شیخ نے آپ کو زردوزی
کا جامہ پیشواز پہنا دیا۔ پیر کی ناراضگی کا احساس ہوا اسے اتار پھینکا۔ شیخ رکن الدین ان کے دوسرے

بیٹے اور جانشین لکھتے ہیں کہ ان کی ولادت کے قبل تک خرقہ مرقعہ (گدڑی)، ازار (پاجامہ) اور کلاہ میں آپ ملبوس رہتے تھے۔ وظائف وعبادات ذکر واوراد میں انہماک تھا۔ اگر پرانے کپڑے مل جاتے تو انھیں خود ہی اپنے مرقعہ میں سی کر شامل کر لیتے۔ ایک روز بشیخ خواجگی سدھوری نے بعض مرقعہ کی برائی بیان کی کہ اس سے نفسانیت وریا کا شبہ ہوتا ہے اسے چھوڑ دیا۔ کچھ دوستوں نے دس گز کپڑا خرید کر کے پیش کر دیا جس سے پیراہن تیار ہوا۔ نماز تسبیح، نماز نوافل، نماز معکوس میں بمتابعت خواجگان چشت اس قدر غلو رکھتے تھے اور اتنی نمازیں پڑھتے تھے کہ جامہ جبہ وازار کہ مقابل زانوئے مبارک وے بود بکثرت استعمال زود پارہ پارہ شدے در ایام سرما برف می افتاد پا یہا وساقہا مبارکش می ترقید وے قدس سرہ بہمان حال ایستادہ نماز میگذارد در عبادت چنان مستغرق می بودے کہ خبر سرما وگرما نبود ہمیشہ شغل باطن کا دور آتا ذکر خفی وذکر جہر میں رات بسر کر دیتے۔ ریاضت ومجاہدہ میں اس قدر استغراق رہتا کہ جس حجرہ میں آپ رہتے تھے اس میں ماران مسکن داشتند لیکن نہ ان سانپوں کی آپ کو فکر تھی نہ ان سے آپ کو کبھی گزند ہی پہنچا۔ نماز معکوس راتوں کو ادا کرتے۔ خود را آویزان ساخت، وقت صبح می کشاد۔ بابا فرید شکر گنج نے اوچہ شریف میں "چلہ معکوس" کیا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیا ان کے مرید بھی ان پر عامل تھے۔ خواجہ ابو محمد چشتی۔ شیخ ابو سعید ابوالخیر بھی نماز معکوس پڑھا کرتے تھے۔ سعدی شیرازی نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎ سعدیا کنگرہ عشق بلند است بلند۔ تا تو سر باز کنی دست تو آنجا نرسد۔ حضرت عبدالقدوس نے ایک ہندی دوہے میں اس کا ذکر کیا ہے جو کدارہ راگ کی طرز پر ہے۔ ؎ لاگ۔ پی پریت لاگ رہی۔ جبہر مت کھیلو آج سنہیری لاگ رہی :: بہر کی ستیاں ھیبنت بنہیں سنگ لاگ رہی۔ کھیل آج کی رات سنہیری لاگ رہی :: سیھا ابہرن کی موئی سنگ لاگ رہی۔ کنت نہ پوچھے بات سنہیری لاگ رہی :: الکھداس (عبدالقدوس) آکھے بنتی لاگ رہی کر دہا تھ) جڑ سر دھر پاؤ سنہیری لاگ رہی :: بہر کی ستیناں ببیٹ سنگ لاگ رہی۔ تجہ کنت کی جابن سنہیری لاگ رہی ::

ان کے غائت تجرید وتفرید کے کئی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ آپ کی اہل خانہ

نے چند تولہ کا طوق زریں اپنے فرزند ارجمند حمید الدین کے لیے بنوایا تھا اور جو کچھ جوڑ جوڑ کر
جمع کیا تھا اس میں صرف کر دیا تھا مگر اس ڈر سے کہ کہیں شیخ کی نظر اس پر پڑ نہ جائے اور وہ اسے
کسی کو بخش دیں اسے چھپا کر رکھتی تھیں۔ کبھی بچہ کو پہنانے کی نوبت آئی۔ آپ کو پتہ چل گیا۔ روزے
از یں حال پیش خواجگی سد عوری اظہار کرد وگفت ما میخواہم کہ این مقدار زر ہم نگاہ ندارم اما مادر حمید الدین
راضی نمیشود۔ شیخ خواجگی نے جواب دیا این خیال از خاطر دور کنید و آن ضعیفہ را بفہمانید کہ شما را
بآن زر ہیچ تعلق نیست و تجرید و تفرید در حق خود است نہ در حق دیگرے۔ ان کے اتقا کا یہ حال
تھا کہ بے نمازی قصابوں سے گوشت ذبیحہ بھی نہیں لیتے تھے۔ مکتوب ۱۳۵ میں احکام و ارکان
ذبیحہ بیان کیے گئے ہیں مشکوک طعام و لباس سے احتراز کلی تھا۔ وضو و غسل کے لیے دور سے
تالاب کا پانی لاتے اور آب چاہ پر اسے ترجیح دیتے۔ اگر کسی سے کچھ بھی تجاوز شرع کا ارتکاب
ہو جاتا تو اس سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔ اپنے پاس اسے پھٹکنے نہ دیتے۔ ایک روز ردولی میں
شغل باطن میں مشغول تھے کہ ایک امیر نظام الملک نامی بہر ملاقات آپ کے پاس پہنچا ——
غم آخرت و خوف خاتمت پر گفتگو شروع ہوئی۔ امیر نے کہا ایمان عطاء باری تعالیٰ ست اگر لطیمے
عطا می کند باز نمی گیرد خداوند تعالیٰ کریم است چگونہ عطاء خود باز گیرد پس خوف خاتمت نباشد۔
آپ نے فرمایا اے عزیز غم آخرت فرض است یا نہ۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ کہنے لگے پس
بگیر یہ آخر اثر ہوا رقت طاری ہوئی سینہ رونے کے سبب سنگدلی از خوف خاتمت و غم آخرت خالی
بود ہمان ساعت نرم شد۔ ایک مرتبہ قاضی محمود تھانیسری جو دار وغہ ردولی بھی تھے ملاقات کی غرض
سے حاضر ہوئے آپ چپکے سے نکل کر ایک ویرانہ کی طرف چل پڑے چہ ویرا تبری از اہل دنیا بکمال بود
اختلاط با انسان زہر قاتل می دانست و می فرمود کہ از ینہا بوئے گریہ می آید لاچار می گریزم۔ کچھ
دنوں بعد آپ نے ایک مرتبہ فرمایا "مرا قصد کلی بود کہ درمیان خلق نخواہم ماند و باقی عمر در کوہ و بیابان
خواہم گذرانید اما چون مشائخ کبار کہ در آن وقت در صدد حیات بودند جامہائے خلافت
دادند و کوشش کردند تا فقیر بر سجادہ نشیند و خلق را دست بیعت دہد چارہ نماند" ابتدائی ایام
میں جب آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو کوہ و بیاباں کی طرف نکل پڑتے تھے معتقدین

پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیتے۔ دو تین روز جب حالت مستی میں کمی ہوتی تو گھر واپس لاتے۔ اواخر عمر تک ذوق سرود و سماع و جد و محویت کا عالم برقرار رہا۔ شیخ عبدالرحمٰن شاہ آبادی کو مکتوب ۱۴۹ میں لکھتے ہیں۔ "روزے بہ شنیدن سرود اضطراب پیدا شد چندانکہ تمام تن در لرزہ آمد و کار بسیار شد بتکلیف میداشتم تا آنکہ ہر دو دست بر روئی داشتم تا ساعتے ماندم ناگاہ غلبہ گریہ شد نعرہ بآواز بلند بیرون آمد در حرکت شدم چپ و راست دویدم و بر سر دو دست سرا چندان کوفتم کہ بیخود شدم و دم بستہ شد گویا کہ در آب شنا میکردم و لذت آن وقت در تکلم نمی آمد۔ آپ کے پیر روحانی کے متعلق مشہور تھا کہ چھ مہینہ تک ایک قبر میں خلوت گزیں رہے۔ آپ نے ان کی متابعت میں چھ مہینے تک قصبہ رودولی کے ایک درخت املی کے کھوہ میں گوشہ تنہائی اختیار کیا۔ وہاں آپ کا حجرہ بنوا دیا گیا۔ صاحب مراۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ آپ کی بڑی خواہش تھی کہ وہاں خلوت گزیں ہوں۔

آپ کے مزاج میں انکسار تھا، طبیعت فقر و فاقہ کی خوگر تھی۔ مصائب و آلام پر صبر و شکر کرتے اور دوسروں کو اسی کی تلقین کرتے۔ بعض خطوط میں شیخ گنگوہی نے جو برابر اپنے کو فقیر بے نوا مد بر روزگار، عاصی کمعاصی کردگار۔ اسیر نفس شریر، خادم درویشاں بلکہ تراب اقدام ایشان اور اسی قسم کے الفاظ سے متعارف کراتے ہیں اپنے حالات و کیفیات و مصنفات پر کچھ روشنی ڈالی ہے اپنے مرید خاص حضرت جلال الدین تھانیسری کو ایک طویل مکتوب ۱۰۵ میں لکھتے ہیں " این درویش و ارش سالہا رنج این راہ و ذل این درگاہ چندان کشیدہ کہ بیان احاطہ ان ندارد گوش طاقت سمع آن نیارد سالہا در آتش گرسنگی و تشنگی سوختہ و چہل سال در آتش فقر در ہوا عشق این دیگ پوختہ و بہ تجرید معائنہ و مشاہدہ این بیت شدہ ؎ تا نسوزی بر نیاید بوئی عود۔ پختہ داند این سخن بر خام نیست۔ خیال داشت و بہ ہیچ حبہ از دنیا گرہ نداشت و ہیچ سوال نبود، و ہیچ دشوارہ نمود و در لتہ کہنہ سالہا گذرانیدہ و در مسکن ماران و موشان مسکن داشتے و بہ ہیچ مخلوق التفات نداشتے، در خدمت سالہا گل کشی و آب کشی و ہیزم تراشی و جاروب زنی و جز آن بسر برد و جان و تن را بخشکی سپردہ اما او بار و این نگداشت و جز افلاس ہیچ نیافت۔ روز و شب در نالہا و زاریست و سالہا است کہ در بی خواریست اما ہر چند چنین است بندہ و بردہ مردان راہ خدا ست و در طلب حق سبحانہ و تعالےٰ

سوزان وحیران وسرگردان ست وتا زندہ است ودمی جنیدہ است ہمبرین زندہ است وہمبرین جنیدہ است وتا ہمبرین پیوندست انشاء اللہ تعالیٰ" شیخ المشائخ شیخ درویش قاسم اودھی کو ۳۰ ویں مکتوب کے آخر میں جو تعزیت نامہ ہے اور ان کی اہلیہ جنھیں "بندگی خدمت والدہ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے کی وفات کے بعد لکھا گیا اپنے متعلق لکھتے ہیں :

"این بندہ توفیق یافت شب وروز مشقت خود را قرار نداشت تا حفظ کلام ربانی بر قرأۃ امام ابی عمر رضی اللہ عنہ میان چندماہ تمام کرد" مکتوب ۶۲ بھی تعزیت نامہ ہے جو خان اعظم دلاور خان کو ان کے جلیل القدر والد محترم مسند عالی میاں بہوہ وزیر اعظم سلطان سکندر لودی کی وفات پر ارسال کیا گیا لکھتے ہیں : "مصیبت مسند عالی مرحوم و مغفور کہ یکے از دوستان خدا دوست گوئی محبت با دوستان حق می باخت وہر چہ داشت ہمیشہ با دوستان حق معروف میداشت بکیت السموات والارض نشان مصیبت او می دہد لاجرم مصیبتش سوز درد نہاد وزخم بر جانہا مخصوص عزیزان و دوستان کہ سبب تشتت وقت شان است لاسیما کہ این فقرا کہ ماندن درین ولایت بواسطہ شفقت مسند عالی مرحوم بودہ است الحال تمام رسیدہ" میاں بہوہ مصنف معدن الشفاء طب سکندری ابراہیم لودی کے ظلم و ستم کے شکار ہوئے تھے کئی خطوط میں اپنی عمر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ متن میں ۴۰ سال کا ذکر ہے (۵۶ — ۱۰۵ — ۱۵۹) این مدبر سیاہ روی دہد خوی باز عمرش در چہل گذشتہ اعضا ضعیف وسست گشتہ ترک سفر آخرت در پیش است۔ دو خطوط (۱۰۱ — ۱۱۰) میں لکھتے ہیں عمر از پنجاہ گذشتہ یا قریب پنجاہ بر آمدہ وموئے سپید شدہ۔ کئی خطوط میں عمر از ہفتاد گذشتہ۔ ہفتاد وچند سال کی طرف اشارہ ہے (۲۵ — ۱۴۷ — ۱۵۱ — ۱۵۴ — ۱۵۵ — ۱۵۰ — ۱۶۱) آخری خطوط اسی برس کی عمر میں لکھے گئے۔ عمر بہ ہشتاد رسید قوت اعضا نماند چشم خیرہ شد ضعف مستولی گشت تا دم واپسیں چہ پیش آید (۱۴۲ — ۱۵۸ — ۱۷۳) تصنیفات کا بھی کہیں کہیں ذکر کیا ہے۔ یک نسخہ سلوک از نسخہا ئے این فقر (۴۳) رسالہ اسرار الاخیار (۶۱) شرح عوارف المعارف ملفوظ این فقر کہ جامع او خدمت اخوی شیخ خضر بدہن جونپوری

عرف شیخ میاں خان است (۸۲ — ۱۲۲) مکتوب ۱۱۶ میں جو محویت دل از غیر حق و تقدیم شغل بہ حق بر شغل تدریس کے متعلق ہے لکھتے: "از زبان شیخ خود شیخ الاسلام عالم ربانی شیخ ابن حکیم اودہی شنیدہ ام کہ سید بافے اسمہ سدھی در نماز بود از نماز خبر نداشت چنانکہ مصلیان فارغ شدند وے ایستادہ ماند چوں خبر کردند گفت در فکر بودم کہ خدا ایرابی دیدیم ما خبر نیست الخ ......" اپنے متعلق فرماتے ہیں "وآنچہ بر بندہ بود کہ وقت فکر بریں ست کہ چند سال تدریس علم بوقتے معین مشغول شوم و امانت استادان بہ مستحقان و طالب علمان برسانم کہ بعض طالب علمان ہوشیار اند۔ باندک مدت بکمال علم برسند۔ بعدہ یکسوئی شدہ درین کار مستغرق گردیم و وقتے فکر بریں ست کہ چند سال چناں مشغول بحق گردد کہ حجرہ بجز حاجت ضروری نکشائند۔

آپ کی زندگی میں ترک وطن رودولی سے شاہ آباد اور وہاں سے گنگوہ جانے اور قیام پذیر ہونے کے واقعات بھی بہت اہم ہیں۔ صاحب لطائف قدسی لکھتے ہیں کہ جس وقت باپ دادا اور پیران طریقت کے مسکن و مدفن کو چھوڑنا پڑا: "ایں طرف ہندوستان غلبہ کافران بود در پرگنہ رودولی عمل کافران شد شعار اسلام مندرس شدند در بازار گوشت خوک فروختنی شد دست قطعی دیگر شدہ بیرون آمدند" مؤلف انتباس الانوار کا بیان ہے: "در ۸۹۶ ست وتسعین ثمانمایۃ در ابتدائے سلطنت سکندر بن سلطان بہلول لودی بموجب درخواست عمر خان کاسی (سروانی) کہ از اعاظم امرائے سلطان سکندر بود و بخدمت آنحضرت اعتقاد تمام داشت مع فرزندان از رودولی انتقال نمودہ در قصبہ شاہ آباد کہ بنواحی دہلی بود در آنجا سکونت نمود و مدت سی سال تا ایام سلطنت سلطان سکندر در شاہ آباد بر مسند ارشاد اقامت داشت چون در ۹۳۲/۱۵۲۶ ظہیر الدین محمد بابر شاہ در ملک ہندوستان در آمد و سلطان ابراہیم لودی را در پانی پت مقتول ساخت بہ سبب کثرت سکونت قوم افاغنہ قصبہ شاہ آباد ویران ساخت در آں وقت حضرت قطب العالم شیخ عبد القدوس حنفی از قصبہ مذکور با عیال و اطفال بر آمدہ در قصبہ متبرک گنگوہ متوطن گشت" یہاں تیس سال محل نظر ہے۔ سکندر نے ۲۹ برس (۱۴۸۹ - ۱۵۱۸) اور ابراہیم نے ۹ برس (۱۵۱۷ — ۲۶) تک حکومت کی۔ مؤلف لطائف قدسی کا بیان ہے:

"چون حضرت قطب العالم در شاہ آباد اقامت گرفت برادر کلان شیخ حمید الدین دہ یازدہ سالہ بود۔ بعد از یک سال از اقامت در قصبۂ مذکور پنجم ماہ جمادی الاول سنہ ۸۹۷ سبع وتسعین وثمانمایہ تولد این فقیر رکن الدین واقع شد"۔ معلوم ہوا کہ ۱۴۹۰ / ۸۹۶ میں ترک وطن کی نوبت آئی "شور" اور "غارت مغلان" کی طرف اشارہ ہے۔ مکتوب ۱۱۰ میں برادر دینی عبد الرحمٰن کو تحمل ایذا وخلق وحسن خلق با انسان کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں " مغلان تاختند وچندین ہزار خون ریختند وچندین ہزار ولی مومن را زیر تیغ آوردند ہنوز تا چہ زاید۔ در کلبۂ خود در آئی وخود بینی نمائی۔ با خود آئی وخود را از خود برہانی"۔
الفاظ وانداز بیان افغانوں اور ہندی مسلمانوں سے ہمدردی کی غمازی کرتے ہیں۔ اس کے بعد خط میں لکھتے ہیں۔" چون در شہر دہلی رسیدیم بعد نماز عشاء در نوافل مشغول بودیم" ۸۴ برس کی عمر کے اولین ۴۶ سال رودولی میں گذارنے کے بعد جس طرح آپ بوجوہ شاہ آباد میں جا کر مقیم ہوئے تھے اسی طرح وہاں سے بھی تقریباً اتنی ہی مدت بسر کرنے کے بعد اٹھنا پڑا اور گنگوہ ضلع سہارنپور آخری مامن ومسکن قرار پایا۔ وہیں سنہ ۹۴۴ میں رحلت کی اور مدفون ہوئے۔ یہاں صاحب سیر الاقطاب کی روایت قابل ذکر ہے کہ سنہ ۹۳۲ میں ابراہیم لودی کی جنگ پانی پت میں شکست وقتل کے بعد "قتت عظیم بحال لشکریان ابراہیم راہ یافت اکثر مشائخ واکابر وفضلا خواص وعوام بدست مغلان اسیر گشتہ بودند از انجملہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی را دیدم کہ ربنا۔ قضا مشیت الٰہی چوں سائر عرفا۔ بدست یکے مغلان مواخذ گشتہ وآن مغل بدبخت بار عظیم بر سر آنجناب نہادہ پیش اسپ خود کردہ می برد بخاطرم گذشت زہے مشیخت کہ در وقت فراغ دعوی ہمسری کلان متقدمین میکرد۔ اکنوں قدرت مخلصی خود ندارد۔ ہمدرین اثنا حضرت قطب العالم بر خطرہ ام مشرف شدہ جانب من باز نگریست وگفت پیرزادہ من با خدا امانت رسیدہ است من بیچارہ کیستم" آپ کے فرزند دوم وخلیفہ شیخ رکن الدین لطائف قدسی میں لکھتے ہیں:۔ " آنحضرت یک سال از پیشتر از ہزیمت سلطان ابراہیم از شاہ آباد در گنگوہ آمدہ اقامت گرفت ہمراہ ایشان یاران ومعتقدان ومریدان اہل دول نیز آمدند" صاحب لطائف قدسی کی ایک اور روایت بھی قابل توجہ ہے۔ اپنی والدہ کے متعلق لکھتے ہیں " از اولیا خدائے تعالیٰ بود وسی پارہ تلاوت کلام اللہ وظیفہ داشتند۔ نسخہائے مسائل شرعیہ خواندہ بودند وہمیشہ مطالعہ کردند۔ نماز اشراق

وچاشت وفی الزوال وتہجد ہیچگاہ فوت نشدہ بود در وقت وضو ساختن سخن دنیا نمی گفتند تا تمامی نماز فرض وسنت ونوافل ادا می نمودند۔ وصاحب شغل باطن وکشف بودند آنچہ کہ در خواب می دیدند بے تفاوت ظاہر میشد۔ شبے در شاہ آباد بعد از ادائے نماز تہجد بر سر مصلا نشستہ بودند کہ کشف حجاب شد در عین بیداری دیدند کہ از خراسان آتش سوزان می آید خشک وتر ہمہ میسوزد۔ علی الصباح باہمہ فرزندان ایں معاملہ گفتند وفرمودند کہ استعداد فرار بکنید چیزے بلا نازل خواہد شد عاقبۃ الامر آمدن مغلان وتاخت ایشان شروع شد۔" اس روایت سے جہاں عورتوں کی علمی ومذہبی حالت پر کچھ روشنی پڑتی ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنگ پانی پت کے کچھ قبل ہی ان کا خاندان گنگوہ میں منتقل ہو چکا تھا۔

حضرت عبدالقدوس کا آخری جائے قیام تو گنگوہ تھا لیکن دہلی اور دوسری جگہوں میں آنا جانا بھی ہوتا رہا۔ مکتوبات قدوسیہ میں پہلا اور واحد خط شیخ عبدالکریم سہارنپوری پسر کلاں قدوۃ ابراہیم خواجہ سالار کے نام ہے جو تمام علوم وفنون میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ حافظ کلام اللہ تھے۔ ہمیشہ افادہ طلبہ و ارشاد طلاب میں مشغول رہے۔ خلیفہ وجانشین مولانا اسحاق تھے۔ سلطان بہلول لودی ان کا بہت معتقد تھا۔ وارشاد دربارہ مواضعات سرکار سہارنپور و دیوبند آپ کی خدمت میں بطور وقف بذریعہ فرمان پیش کئے گئے تھے۔ ایک مہینہ تک آپ کے پاس شیخ گنگوہ کا سہارنپور میں قیام رہا اور وحدت الوجود پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ سلطان بہاری نے جو حضرت عبدالقدوس کے گہرے دوستوں اور خلفا میں تھے لطائف قدسی میں لکھا ہے کہ ایک روز دہلی کی غیاث پورہ مسجد میں بعد نماز جمعہ حضرت عبدالکریم نے موعظہ فرمایا جس میں علاوہ حضرت عبدالقدوس کے قریب ستر مشائخ نے شرکت کی۔ حضرت عبدالکریم کا بروز دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۹۰۹ھ وصال ہوا۔ دہلی، کرنال، تھانیسر میں بھی اکثر حضرت عبدالقدوس جایا کرتے تھے۔ سدھورہ بھی جاتے تھے۔ آپ کے صاحبزادے دہلی میں تعلیم پا رہے تھے۔ جب وہ گھر آنا چاہتے تھے تو باوجود کبر سنی کے یہ خود دہلی کا قصد کرتے تاکہ تعلیم میں حرج واقع نہ ہو۔

آپ کی تصانیف میں جس کی تعداد خاصی ہے مکتوبات قدوسیہ بہت مشہور اور اہم ہے

۲۰ برس کی عمر میں اپنے پیر روحانی شیخ احمد عبدالحق فاروقی رودولوی کے حالات کشف و کرامات کو ان کے وصال (۱۴۳۴ء) کے ۵۰ برس بعد جس مختصر کتاب میں منضبط کیا وہ انوارالعیون ہے اس میں اور "رشد نامہ" میں بھی جو ابتدائے حال کی تصنیف ہے جس تبحر علم، وسعت مطالعہ و عمق و بلندیٔ نظر کا اندازہ مکتوبات قدوسیہ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی ہوتا ہے، مفقود ہے۔ مکتوب ۱۲۰ میں اپنے فاضل مرید شیخ جلال تھانیسری کو لکھتے ہیں "باید کہ شرح لمعات (عراقی) پیش دارند تا بعز ازاں اسرار و برازاں ذوق و شوق در کار دارند و ہرچند مختصر است بحر عمیق است۔ شرح جمیعت نوریت عوق و کتابہائے دیگر کہ ایں فقیر از سر سوختگی و دو ختگی وقت در تحریر آوردہ است ہرچند ابتدا است دفتر است۔ رمز دیوانگان و رندان دانند" عراقی کے لمعات کی شرح جس کا نام شرح قدوسی ہے معارف شرح عوارف اسرار الاخیار، غرائب الفوائد وغیرہ غیر الحصول ہیں۔ موخرالذکر ایک چھوٹی سی کتاب تھی جو چھپ چکی ہے۔ اس میں آپ نے اشعار متصوفہ اور دیگر رموز تصوف کا حل کیا ہے اور معانی و مطالب واضح کئے ہیں۔ اس وقت انوارالعیون فی سر المکنون مطبوعہ گلزار محمدی لکھنؤ، رشد نامہ مطبوعہ مسلم پریس جھجر اور مکتوبات قدوسیہ پیش نظر ہیں۔ اول الذکر کے دیباچہ میں فرماتے ہیں "چون مدتے در خانقاہ متبرک و روضہ مطہرہ حضرت شیخ العالم شیخ احمد عبدالحق بہ مجاہدات شدیدہ و ریاضیات مدیدہ بگداختم و گرسنگی و تشنگی سوختم و در ساختم چنانچہ مدارج محویت برآمد خواستم تا بعضے از حقائق و دقائق عارفان دین و مقامات و حالات واصلان این درگاہ بر زبان حال در حیطہ مقام بہ بیان آرم و در سلک رسالہ منسلک گردانم" پھر اپنے پیر روحانی کے بعض حالات اور خاص خاص واقعات زندگی اور کشف و کرامات کے متعلق غایت عقیدت مندی میں بہت سی ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جسے عقل سلیم قبول کرنے سے عاجز ہے۔ مثلاً ایک عزیز مرید مخلص نامی دنیا سے کنارہ کرنے کی اجازت اپنے پیر حضرت احمد عبدالحق سے طلب کرتا ہے۔ کہتے ہیں چند روز صبر کرو ہم ساتھ جائیں گے۔ وہ ایک وصیت کرکے چادر اوڑھ کر ہمیشہ کے لئے سو جاتا ہے۔ آپ کا جنازہ مخلص پر پہنچ کر ردا منہ سے اٹھاتے ہیں۔ کان کے پاس مخلص مخلص کہہ کر پکارتے ہیں "جان او باز در قالب در آمد و برخاست سر در قدم آنحضرت در آورد۔" اسے حیات جدید بخش کر آپ خانقاہ واپس جاتے ہیں

مخلص اپنے بیٹوں پر ناراض ہوتا ہے کہ دفن کے پہلے کیوں خبر کی۔ بہرام کو بھیجتا ہے عاجزی کے ساتھ اجازت مرگ چاہتا ہے۔ دریں عالم نمی توانیم ماند پھر جواب ملتا ہے "بگو تا چند روز دیگر باشد باہم همراه در پرده خواہیم شد" پھر بہرام بھیجا جاتا ہے۔ اصرار سے مجبور ہو جاتے ہیں اجازت ملتی ہے تو وہ دنیا سے رحلت کرتا ہے۔ حالت صحو و سکر کی تاویل بھی شاید اس قدر انی امر میں ناکافی ہو۔ صوفیا کے ملفوظ میں خارق عادات کشف و کرامات کی بہت سی باتیں ملتی ہیں جو توہم پرستوں کے لئے تو شاید درخور اعتبار ہوں لیکن موجودہ دور میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ حضرت عبدالقدوس ایسے متشرع اور باخدا بزرگ کے قلم سے ایسی باتوں کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ سنی سنائی باتوں کا درج قلم کرنا ان کے شایان شان نہ تھا۔

لیکن تاریخ کے طالب علم کے لئے آپ کی ابتدائی زمانہ کی تصانیف میں بھی کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جونپور (۸۴۴ ـــ ۸۰۴) اس کے وزیر اعظم میر صدر جہاں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی فیروز خان مقطع[1] اودھ قاضی رفیع امیر خطہ رودولی قاضی محمد رودولی تاتار خان مقطع رودولی خواجہ شیخن متصرف[2] رودولی قاضی سلیمان، ملک خدا کوتوال جونپور ملک ذکو کوتوال رودولی قاضی ثمن کا تذکرہ در کنار محض نام اور عہدے بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ بعض مشہور مشائخ کرام کے نام بھی آتے ہیں۔ جیسے شیخ کو جلال الدین پانی پتی پیر حضرت عبدالحق شیخ فتح اللہ اودھی۔ شیخ سماء الدین۔ شیخ جمال گوجر[3]۔ موخر الذکر کو شیخ ادیبا بھی کہتے تھے۔ یہ خلیفہ شیخ مظفر شمس بلخی بہاری م ۸۰۳ تھے۔ شیخ جمال کو فیض صحبت حضرت مخدوم احمد عبدالحق

---

[1] مقطع: جاگیر دار اور حاکم خطہ یا قطعہ کو کہتے تھے۔ بڑے بڑے مقطع والی امیر اور مغلوں کے صوبہ دار کی حیثیت رکھتے تھے ـــــ [2] مالی امور کی نگرانی جانچ پڑتال کے لئے خاص خاص لوگوں میں اس عہدہ دار کو متعین کیا جاتا تھا۔ حضرت مخدوم الملک منیری کے ملفوظ و مکاتیب میں ملک محمود خیونش متصرف خطہ بہار کا بہت جگہ ذکر آتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے یہ بھیجے ہوئے تھے۔ انھیں بہار میں اکاؤنٹنٹ جنرل یا آڈیٹر اور اکاؤنٹس کا رتبہ حاصل تھا۔ ـــ [3] اس بزرگ کا تذکرہ بہت ملتا ہے لیکن حتمہ

(بقیہ دوسرے صفحے پر)

اپنے پیر جلال پانی پتی ہم عصر سلطان محمود بن فیروز شاہ تغلق م ۸۱۰ھ کے وصال کے بعد پنڈوہ پہنچے کوتوال شہر کے یہاں قیام فرمایا سلطان وقت بھیس بدل کر "بطریق شکستہ کاران" گشت کیا کرتا تھا۔ ایک جگہ پہنچا جہاں مسلمان قلندروں کی ایک جماعت مشغول اکل و شرب تھی، قلندران را گفتند اے فقیر دور شو در طعام ما نظر میکنی۔ آگے چل کر ایک جگہ پہنچا جہاں کچھ جوگی آپس میں اپنا طعام تقسیم کر رہے تھے۔ ایک اجنبی کو دیکھ کر انہوں نے ایک حصہ سلطان کو بھی پیش کیا۔ سلطان گفت کہ ما از شمار بیگانہ ئیم مرا ایں بخش برا بچگونہ ہم باشد جوگیاں گفتند "اے بابو" مرا رسم است اگر سگ باشد ما سگ را

مظفر شمس بلخی سے ان کے تعلقات کو بہت کم لوگ جانتے تھے۔ کبیر داس مشہور بھگتی شاعر اور مصلح کی نسبت بھی لائق توجہ ہے۔ صاحب مرآۃ الاسرار دعفری نسخہ کتب خانہ وقفی دیوان نامہ علی کھجوہ ضلع سارن لکھتے ہیں "شیخ کبیر جالاہک ملامتی از خلفائے شیخ بھیکہ مدفون بہ بھری چارگوس از اودھ۔ ابو شیخ بھیکہ از کل خلفائے شیخ جمال گو جربود کہ از خانوادہ کبرویہ فردوسیہ است و خلیفہ شیخ مظفر بلخی بودہ" یہ بھی لکھا ہے "کبیر جالاہک اول ارادہ بخدمت مخدوم شیخ تقی بن شیخ رمضان جالاہک سہروردی داشت مدفون بہ قصبہ جھونسی متصل الہ آباد۔ بعد از ان در صحبت را مانند بیراگی افتاد و ریاضات و مجاہدات بسیار کشید۔ مشرب توحید بروئے غلبہ کرد۔ رعایت ارباب ظاہر از نظر بصیرت از مطلق بر افتاد و سخن بے پردہ گفتن گرفت مردم ظاہر بین او را منسوب بہ کفر کردند۔ اما عرفا اہل باطن او را موحد بے ریا می دانند مشرب رندانہ ملامتیہ داشت۔ آخر خرقہ سلسلہ فردوسیہ از دست مخدوم شیخ بھیکہ پوشید و بطریق صلح کل تسکین یافت۔ کبیر اگرچہ نساج بود و یرا در توحید اشعار بسیار است بزبان ہندوی مسلمانان و یرا مسلمان دانستند و ہندوان کافر و بے از ہر دو مبرا بود۔ صحیح آنست کہ کبیر از اہل اسلام بود و فاتش در قصبہ مگھر سرکار گورکھپور دفن کردند رحمۃ اللہ علیہ شیخ کمال بن شیخ کبیر ملامتی از پدر خود تربیت یافتہ او ہم مشرب ملامتیہ داشت بلکہ از پدر بے باک تر بود۔ بعد از وفات پدر بہ ولایت گجرات رفت۔ آنجا حضرت شاہ محبوب عالم م ۹۸۸ احترام او بجا آورد۔

ہم قسمت برابر دیم توکر آدمی ہستی تراچہ اندہم۔ دوسرے روز سلطان نے قلندروں کو شہر بدر کردیا "رندان وبے خبران" پر کڑی نگاہ رکھی۔ پھر حضرت نور قطب عالم پنڈوی م ۸۱۸ھ سے ملاقات کا تذکرہ ہے۔ کچھ افسردہ خاطر جانب وطن لوٹے "چوں در شہر بہار رسید آنجا با دو مجذوب صاحب ولایت ملاقات شد یکے را سلطان علاءالدین می گفتند برہنہ ماندے دیگرے را لنگوٹی نامیدند۔ لنگوٹی پیش داشتے" دونوں مردان حق نے بشارت دی کہ "مقصود مطلق خود می رسند" پچاس برس بعد پھر وطن واپس آئے اور ہمیشہ کے لیے رودولی میں رہ پڑے۔ لکھتے ہیں کہ اس قدر مستغرق الاحوال اور دائم الحال رہتے کہ اقربا، ہمسایہ، شناسا کوئی ملنے آتا تو پوچھتے "تو کیستی" "ہر ژندہ (گودڑی) و جامہائے تنگ و سفید پوشیدند" اہل ثروت سلاطین امرا سے کنارہ کش رہتے۔ جب سلطان ابراہیم شرقی پرگنہ رسولی سے گذر رہا تھا تو قاضی رضی حاکم اودھ نے آپ کے کمالات کا ذکر کیا سلطان نے "مبلغ نقد و چہار مواضع اور پرگنہ رودولی و ہزار بیگہ زمین در سواد قصبہ جہت خرچ خانقاہ بدست قاضی مذکور نوشتہ فرستاد و انواع نیازمندیہا اظہار نمود۔ آنحضرت اعراض کرد و اصلا چیزے قبول نمود۔ با قاضی رضی گفت مگر ابراہیم رزاقی میکند رزاق مطلق اوست جل جلالہ، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے ذریعہ کوشش کی گئی کہ شیخ العالم را با سلطان ملاقات دہانند۔ شیخ نے قاضی سے کہا "تو بیچارہ بہریا ہستی" ایک مرتبہ آپ کے داماد میاں شبہ نے محمد خاں مقطع رودولی سے موضع کلوہ میں سات سو بیگہ زمین کا پروانہ خرچ خانقاہ کے لیے حاصل کیا حاکم نے عہدہ داروں کو حکم دیا "پیمودہ محدود کردہ مزرعہ بستہ آبادان کردہ بدہند" آپ کو خبر ہوئی۔ خادم خاص بہرام کو خواجہ شیخن متصرف رودولی کے پاس بھیج کر پروانہ منگوالیا اسے پارہ پارہ کردیا۔ محمد خان کو کہلایا درویشوں کو کیوں رنج پہنچاتے ہو اس نے جواب دیا "ہرچہ فرمان شیخ العالم حکم بر جان ماست۔ اس پر آپ لکھتے ہیں۔ "از نقل شیخ العالم پنجاہ سال گذشتہ است (۸۸۷) و سیوم کرسی است۔ استقامتے آنچناں نہ شدہ است کہ اوقات گذارسی تمام باشد الی یومنا اسم شیخ العالم و اسم فرزندان حضرت بہ دفاتر بادشاہان دنیا مرقوم نہ شدہ است و بیشتر معلوم نیست" ہندی الفاظ فقرے دوہے بھی اس کتاب میں ملتے ہیں جو خالی از دلچسپی نہیں۔ بسنام میں ایک بیوہ عورت

پارسا کہ دامنے بر سر مردان انداختے آپ کا بہت خیال رکھتی تھی بیچاری دکھیا کسب سپید بانی میکردیوں مشغول بحق یافتے بزبان ہندوی گفتے " ٹھیا احمد آپ گرم موجود است " یہ وقت تھا جب فتنۂ مغلان روداد تیمور نے ہندوستان میں اودھم مچا رکھا تھا "کچہری" وگیدان میں چھوڑ کر بڈھیا اور سب کو بھاگنا پڑا۔ ایک برجستہ ہندی شعر بھی آپ نے پیر کا نقل کیا ہے — کنوا ہوے تو پاتوں سمندر پاٹن جائے۔ بارا ہوے تو برجون جیبیں گے۔ برجن جائے۔

مرشد نامہ پر آگے چل کر نظر ڈالی جائے گی۔ مکتوبات قدوسیہ جو دہلی وحیدر آباد سے عرصہ ہوا شائع ہوئی اور اب کمیاب ہے۔ ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سو ننانوی[۱۹۹] مکاتیب ہیں۔ اس کے جامع شیخ بڈھن بن رکن جونپوری المشہور بہ میاں خان بن قوام الملک تھے۔ شاہ آباد پہنچے اور حضرت عبدالقدوس کے اذن و ارشاد سے ریاضت و مجاہدہ و مشغل باطن میں چند سال منہمک رہے پھر کچھ لوگوں کے کہنے سننے سے دل میں وسوسہ سمایا کہ بزرگان جہان را باید دید۔ باجازت پیر سیر و سیاحت کے لئے روانہ ہو گئے۔ حج و زیارت کے بعد گجرات واپس آئے۔ با سید محمد مہدی[۱] کہ برادر خالائی وے بود

---

[۱] بانی فرقہ مہدویہ جن کا ذکر ملک محمد جائسی نے پدماوت اور اکھراوٹ میں اپنے پیران طریقت کے سلسلے میں کیا ہے — پایا گرو مہدی گرمیٹھا۔ ملا پنیت مرذو رشن دیٹھا۔ وا وا وحگ سدہ نو بلا۔ سید محمد کے وے چیلا۔ سید محمد مہدی سانچا۔ دانیال ونیہی سدہ باچا — صاحب مراۃ الاسرار تاریخ کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

" در زمان سلطنت حسین شاہ شرقی شیخ دانیال خضری در جونپور رسید۔ اکثر مردم شہر معتقد او شدند۔ از آنجملہ دو سید زادہ سید احمد و سید محمد ترک تجرید نمودہ مرید او شدند و تربیت یافتند۔ سید احمد در جونپور استقامت اختیار کرد و سید محمد بعد از تکمیل بہ نیت زیارت حرمین الشریفین برآمدہ در وقت سلطان مظفر ثانی در احمد آباد گجرات رسید۔ دعویٰ مہدویت نمود پس شہرت بسیار یافت و خلق بے شمار در حلقہ ارادت درآمدہ یک مرتبہ شاہ عالم محبوب عالم قدس سرہ نیز بدیدن سید محمد مہدی رفت تا چند ساعت در خلوت با وے داشت و بجائے خود آمدہ اینقدر فرمود کہ سید محمد مرد عارف است اما در کشف غلطی واقع شدہ است۔ بعد ازاں سید محمد بطرف حرمین الشریفین

ملاقات افتاد سید محمد گفت کہ چہ میگردید و عمر ضائع میکنید باید کہ بہ شغل باطن مشغول شوید شیخ خاں درخواست شغل کرد سید محمد مہدی پاس انفاس فرمود۔ شیخ خان کہ پیش قطب العالم بکشف و اسرار رسیدہ بود در جواب گفت کہ این شغل بچگان است۔ کار مردان بلند تر ازین است۔ سید محمد مہدی در سنہ ۹۱۰ اثرے نمود در نظر نیامد۔ پھر آستانہ پیر پر پہنچے کلمات و تصانیف و صحیفہ و مکاتیب شیخ گنگوہ کے جمع و تالیف میں منہمک ہو گئے۔ ان کے نام دس مکاتیب ہیں۔ کہیں احکام ذکر، کہیں سکون مع اللہ و تحمل فقر و صبر پر بلا کی تلقین کی کسی میں حالات و واردات کی طرف اشارے ہیں، کہیں بیان راہ حق کہیں شوق و وجدان کہیں انکسار نفس و تالیف حال پر اظہار خیال ہے۔ سب سے زیادہ مکاتیب جن کی تعداد اکتالیس ہے شیخ حافظ جلال الدین محمود الفاروقی التھانیسری خلیفہ اول و اعظم کے نام ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۰ کا) رفت و سیر عراق و خراسان نمود آخر در قریب فرہ گشتہ شد۔ متابعان او تا چندے در ہر جا بودند و شہرت داشتند و سید محمد را مہدی آخر الزمان میگفتند الحال (اوائل عہد شاہجہانی) ازان اثرے دیدہ نمی شود۔

۱؎ مشاہیر صوفیہ ہند میں ہے ۹۱۶ھ میں جلت کی اقبال نامہ جہانگیری کے حوالہ سے صاحب اقتباس الانوار لکھتے ہیں کہ جب اکبر حکیم مرزا کی مہم سر کرنے جا رہا تھا تو خانقاہ شیخ جلال میں پہنچا۔ وحدت و کثرت کے مسئلہ پر گفتگو رہی۔ شیخ کی تقریر کا نچوڑ اس رباعی میں تھا سے آفتابے در ہزاراں آبگینہ تافتہ۔ پس بر نگے ہر یکے تاب عیاں انداختہ ۔ جملہ یک نور است اما رنگہائے مختلف۔ اختلافے در میان این و آں انداختہ۔ فرمود چوں مخلوق را این قدرت ثابت است کہ با وجود ظہور وے در مظاہر کثیرہ در وحدت ذاتش ہیچ اختلاف و تغیرے راہ نمی یابد قدرت خالق ازان قوی تر خواہد بود۔ ابو الفضل نے پوچھا "چارہ در طلب چیست و راہ نزدیک بہ منزل کجاست"۔ حضرت گریہ درآمد این بیت خواند سے از استغنا دلبر آہ آہ۔ گر تعظم نیست بر کونین آہ۔ بادشاہ بہت متاثر ہوا کہنے لگا کہ بادشاہت سے فقیری بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا "اول مثل خویش بجائے خود نشانید بعد ازاں درین کار در آئید۔ و نیز فرمود کہ عدل یک ساعت شما بہتر از عبادت ہزار عابد و درویش است۔ درویشی شما ہمیں است کہ عدل و انصاف ورزند

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۸۲ پر)

جنھیں علم باطن میں جنید و شبلی وقت بتایا گیا ہے۔ از اکابرین تھانیسری و اجلہ فضلائے آنجا بود و مدرس و افادہ طالبان علوم صوریہ اشتغال تمام داشت۔ بڑے متشرع تھے۔ از سماع و سرود نفرتے بہ کمال داشت۔ حاکمان قصبہ تھانیسر جو شیخ گنگوہ کے مرید تھے جب حسب معمول نماز جماعت کے لیے حاضر ہوئے تو شیخ تھانیسری نے کہا شنیدہ ام کہ پیر شما آمدہ است و رقص و سماع کہ از بدعات قبیحہ بلکہ از محرکات قطعیہ است بسیار مشغوف و مشغول است می خواہم کہ بوے ملاقی شدہ وجہ ارتکاب ایں امور منہیہ بپرسم چوں شما پیش پیر رقاص خواہند رفت سلام من بگویند۔ شیخ گنگوہ نے سلام کے بعد کہلا بھیجا بگوئید آں پیر رقاص چنانکہ خود می رقصد دیگراں را می رقصاند۔ ایک روز آپ شیخ جلال کے مدرسہ میں پہنچے دید کہ طالب علمان بسیار گرد وے حلقہ زدہ در آں مدرسہ نشستہ اند و تودہ کتب پیش وے نہادہ شدہ است و بدرس و افادہ آنہا اشتغال دارد۔ آپ سلام کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ جب شیخ جلال تدریس و تدریس سے فارغ ہوئے شیخ کی طرف رخ کیا۔ پرسید میاں فقیر شما از کجا یید۔ جواب داد ما ہماں پیر رقاصم۔ پہلی ہی ملاقات کے بعد تبدیلی رونما ہوئی دست ارادت بدامن وے محکم زد و لوازم بیعت صوری و معنوی بجا آورد۔ آنحضرت

(بقیہ حاشیہ صـــــ) و خلق خدا را نفع رسانند و در یاد خدا ہم مشغول باشند کہ سلطانیت از ذکر حق مانع نیست ملک الشعرا فیضی بھی آپ کی خانقاہ میں وارد ہوا آپ کو محافہ سے اترتے دیکھ کر تعریضاً کہا کہ خدا نے حیوانات کو سواری کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر آدمیوں کو آپ باوجود کمال اتقا و فضیلت کے محافہ کو گھوڑے کی سواری پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ جواب ملا۔" تو با وجود چندیں علم و فضیلت کے ہنوز ایں سخن نہ فہمیدہ کہ بعضے آدمیاں مانند چہارپایاں اند بلکہ از ایشاں ہم بدتر اولٰئک کالانعام بل ہم اضل" یہ امیر جب آپ کے پاس پہنچا تو آپ نے چنداں التفات نہ کیا اور نہ آؤ بھگت کی۔ اس کے برعکس جب وہ خوث گوالیاری شطاری سے ملنے گیا تو بڑی عزت سے اس کا استقبال کیا گیا جب حضرت غوث سے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا برادرم شیخ جلال بکمال شہود ذاتی رسیدہ است دنیا و اہل آں در نظرش ہیچ قدرے نماندہ است۔ بادشاہ و گدا از پیش یکے گشتہ است و در دل ما ہنوز بعضے از تعلقات دنیا باقی ماندہ بنا برآں پیش شما بتوقیر و تعظیم سلوک می نمائیم" فیضی اس جواب سے بہت خوش اور مطمئن ہو گفت انصاف است کہ فرمودند۔

کلاہ چہار ترکی از سر مبارک خویش فرد آوردہ بر سرش گذاشتہ شغل نفی و اثبات مخصوص خویش بطریق خفی و جلی و حبس و بدون وے تلقین نمودہ بخلوت تام و مجاہدہ دوام اشارہ کرد۔ با قاعدہ خلافت بعد کو جانچ کے بعد تفویض ہوئی۔ درسا با دا خانہ حضرت قطب العالم بریاضت و مجاہدہ گذرانند۔ شیخ کی اہلیہ نے کہا شیخ جلال در آتش ریاضت و مجاہدہ خود را بسیار سوختہ است آپ نے فرمایا ہنوز از وے بوئے انانیت نرفتہ است۔ آزمایا گیا آنحضرت بکناسہ (مہتر) فرمود کہ امروز سبد نجاست بر سر جوائے کہ بر سا باط ما می ماند باندا زخود با اہل خانہ خود جائے مخفی شدہ بایستاد۔ چون کناسہ سبد را بر حضرت شیخ جلال بریخت نظر بجانبش کردہ گفت اگر خانہ پیر نبودے با تو فہمیدے۔ شیخ گنگوہ نے اہلیہ سے کہا شخصے کہ چندیں خود نمائی داشتہ باشد لائق سپردن امانت پیران کے بود۔ آخر بیخ ہستی شیخ جلال بہ شہود نور جمال بالکلیہ کندیدہ شد پھر جو غلیظ آپ کے سر پر پھینکا تو در آن ہنگام چنان غرق انوار ذات بود کہ خبر از سبد وغیرہ نداشت (اقتباس الانوار) حضرت جلال کے نام خطوط میں ان میں دفع شبہ حل شکوک وشبہات بیان اسرار توحید، ستر اسرار، اجتناب از دنیا۔ شوق و ذوق سماع جاری کردن اعراس پیران بر سنت ایشاں در روا تبھاں اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ہیں۔

شیخ جلال ہندی کے اچھے شاعر تھے ذکر و فکر مشاہدہ و مراقبہ پر ایک چھوٹا رسالہ ارشاد الطالبین شائع ہو چکا ہے لیکن ہندی کلام کا مجموعہ بد قسمتی سے اب مفقود ہے۔ پیر نے اپنے مرید کے خطوط میں جا بجا ہندی دوہے اور فقرے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً مکتوب ۱۰۰ میں ہے (۱) " وہ کھیل نہ جانی کھیل توں۔ سر دیہہ بنا وہ میل کوں۔ کھیں تو کھیلنا نہیں جانتا جب سر دے خدا کو پائے گا یعنی تا جان نبازی بحق نرسی (۲) " جے نیہہ ہماں سوں لورئی۔ تب پریت سبھاں سوں توری۔ جو مجھ سے پریم کرتا ہے اسے سب سے پریت توڑ لینی چاہئے یعنی تا انقطاع کلی نبود اتصال کلی نباشد (۳) آیوں گسیناں پیو سنگ لاکھو رہی۔ کرجوڑ سر دھر پائے سینیرالاکھوری" یعنی اسی طرح سیناں کا سنگ لاکھو بارپائے گا جب تو پریم سے ہاتھ جوڑ کر سر پر پاؤں رکھ کر ریاضت کرے گا۔ اشارت بہ فتمنوا الموت ان کنتم صادقین (۴) " اکین چھاڑ چنا رنگ نہ ہوئی۔ چہ رنگ ہوی ادت مر سوئی " ایک کو چھوڑ کر ایک دوسرے سے میرا رنگ یعنی عشق کہاں ہو سکتا ہے چاروں طرف ہم لوگوں سے عشق کرنے لگیں تو

ہماری موت ہی موت ہے۔ اشارہ ہے کہ در محبت و عشق او جان باید گداخت۔ اس کے بعد کے مکتوب
۱۰۱ میں ۱۵ ویں صدی کے شیخ گنگوہ نے ۱۴ ویں صدی عیسوی کے مولانا داؤد کی مشہور لیکن نادر الوجود ہندی
منظوم کتاب چنداین کی یہ بیت لکھی ہے: "بن کریا را ماجھی، ڈولت ناوا نیکسنیار دیکسو نیر،
کنت نہ آوا" یعنی ملاح کے بغیر میری کشتی ڈوبنے والی ہے۔ میرا محبوب نہ سنتا ہے نہ آتا ہے۔
ایک اور بیت چنداین کا مکتوب ۱۲۰ میں ہے "چنداین تو بیر جوا تو ی پارس۔ مرگ بیر جو جرہت سنہائیں
او چنداین آگے جو موت کرتا ہے وہ پارس ہوتا ہے سوزش عشق سے جلتا ہے اس کے لئے بہشت
کیا چیز ہے۔ مکتوب ۱۱۰ میں اپنے استاد کا ایک دوہرہ نقل کرتے ہیں: "یہ جگ وہ جگ دیووں تس
جن ار تہہ بہناٹا ر۔ سائیں کہ رو سیس کا جو دکھراوی بار" میں اس کے لئے یہ اور دوسری دنیا مال و دولت
سب دینے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ مجھے مالک کے سر کا بال ہی دکھا دیا جائے۔ بہائی کب سر موہیت
دو عالم میں ید سامان مکتوب ۱۰۶ میں لکھتے ہیں: "بنگر کجا تی جے سلونی موتی سر پر لیوں۔ اگر
چھوڑوں ایتی اوکر چیہہ ملیوں" میں میری میٹھی باتوں کو سن کر انھیں اپنے اوپر لینے کو تیار ہوں
اپنے آغوش کو کھول کر محبوب سے ملنے کی تمنا ہے۔ اس کے بعد کے مکتوب میں یہ دوہے آئے ہیں:
(۱) ہو سکی گوئی دیو مردو جیسے من کی آس۔ ہوں بھی سیس کتر باکر بیٹھوں سائیں پاس" کوئی بھی مندر
ہو کنند ہوں یہ سر جھکا کر خدا کا دہیان کرو رضا سے دل پوری ہو جائے گی (۲) "تو دو وقال کیا سو یہ جگ
جگ تہا کا میں اجینو ہے مندر کا شاید مفہوم یہ ہو کہ میرا جی دنیا سے عاجز ہو گیا ہے۔ (۳) نفوہ بار بار جائیں
متہرا کار باژن سائیں جن کو بیوں نے سب کچھ تیاگ دیا تھا شور جانے گئیں کہ متوالے سائیں
کرشن جی تو چلے گئے۔ (۴) "سوال دا و کنت گھر دیکھے۔ چھپا کچھے من مان کے" جس بار بھی درخبیب
پر جانا پڑے تو جاؤ وہاں پہنچ کر من مانی کرو۔ مکتوب ۳۰ میں لکھتے ہیں "ات بد ہو نسک پوتھا باد
پران۔ پڑند بنا کہا بجے بھاگتے دومد۔ بھیلیا بجا۔ اور" آتش علق جلق جل گئی جل بہی او نہی آگ۔ کاس
پکاروں کس کھوں جیہند ہی لگی آگ۔" آتش عشق پوری طرح بھڑک اٹھی۔ کس کو پکاروں کس سے
کہوں بدن جیسی سر چیز بھی جل کر خاکستر ہو گئی۔

مکتوبات سے شیخ کی شخصیت تعلیمات اور اصلاحی کوششوں سے متعلق کئی باتیں اخذ کی جا سکتی

ہیں۔ ہر طبقہ کے لوگوں سے واسطہ تھا۔ مشائخ و علما امرا، و سلاطین سادات و شیوخ نو مسلم۔ اور ایک عورت شیخ ابراہیم تھانیسری "نو مسلم" کو مکتوب ۱۲۲ میں لکھتے ہیں۔ "اے عزیز حق تعالیٰ بفضل و کرم ترا از اسلام تبول و عزیز گردانیدہ اند باید کہ این مہمان غیبی را عزیزداری و صدہزار دولت دوجہانی و سعادت جاودانی بر خود شماری۔ بدر العلما، صدر العلما، قاضی حسین بنگلوری کو مکتوب ۱۲۳ میں لکھتے ہیں کہ مردان خدا کی شان یہ ہے کہ "ہم با خلق بوندو با حق۔ درمیان خلق بفرمان حق تعالیٰ می آیند و خلق را دعوت سوی حق میکنند" امیر تردی[1] بیگ مغل کو لکھتے ہیں "اعظم امور در دین تیمار داری و غمخواری ضعیف و فقرا و محبت علما ست (۱۱۹) ایک دوسرے خط میں فرماتے ہیں" الشکر للہ کہ بدین دولت امروز آن عزیز محفوظ است و بادشاہ اہل اسلام و ایوان و ارکان دولت سلطنت وے مکرمان و محسنان اند توقع تام است کہ دریں روزگار رونق اسلام و عزت علما، و مشائخ برنعت شتابد و ظالمان و مفسدان مخذول و مردود گردند و ملک بعدل و انصاف آراستہ گردد و بارام و قرار پیراستہ شود (۱۲۱) مسند عالی ہیبت[2] خان سروانی کو طاعت حق کے ساتھ تلقین کرتے ہیں "از درہم و دنیا راز قدرت و کردار خود دل شکستہ و جان گستہ بدست باید آورد" (۱۰۱) ۵۱ ویں اور ۵۹ ویں خطوط میں یاتو تیمار کی زلبا کی تلقین ہے یا شوق تھا ۱۱۷ ویں میں جونسبتاً طویل ہے اسی خان معظم و خاقان اعظم کو لکھتے ہیں" از حال صغر الی یومنا ہذا کہ قریب پنجاہ بر آمدہ و موے سپید شدہ خاک برسر میکند و جبین در سجدہ بر زمین می نالد و سودہ میکند ہیچ پاکی روے نہ نمودہ" مسئلہ خواب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "از زبان و دربار قطب روزگار شیخ خواجگی مدہوری شنیدہ ام و ایشان از زبان شیخ المشائخ علامۃ الورٰی قدوۃ المتقی شیخ بدھن شنیدہ اند و حضرت ایشان از زبان شیخ خود قطب الاقطاب حجت الحق علی الخلق شیخ محمد عیسیٰ قدس سرہٗ شنیدہ ند کہ تعبیر خواب بحضرت مخدوم جہان قطب زمان شیخ شرف الدین والدین منیری قدس سرہٗ ختم شد"۔ دوسرے افغان امیر کبیر مسند عالی ابراہیم

---

[1] تردی محمد مشہور مغل امیر و سردار فوج جسے ہمایوں نے چمپانیر کی مہم سپرد کی تھی۔ اکبر کی جانشینی کا اسی نے اعلان کیا تھا ایک غلطی سے موقع پاکر بیرم نے اسے قتل کروا دیا [2] ہیبت خاں سروانی اور عمر خاں جونپور میں باربک شاہ ابن بہلول لودی کی نگرانی کے لیے متعین کیے گئے تھے۔ نامی امیر تھے۔

خان سروانی کو خیرات و مبرات دستگیری و اعانت مساکین و ضعفا و خدمت مشائخ و علما کی ترغیب دیتے ہیں (۱۱) "خدا پرست جوان بخت محب العلما و الصلحا معین الضعفا و الفقرا مسند عالی خواص[1] خان موعظت و عبادت کا مسئلہ سمجھاتے ہیں اشتیاق ملاقات کا اظہار کرتے ہیں۔ (۳۰) التعظیم الامر اللہ و الشفقۃ علی خلق اللہ پر زور دیتے ہیں اور اعمال بالنیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں "زبان در ذکر تر دارند جوارح در عبادت بکار دارند دل در حضور سر در مشاہدہ دارند صادق و مخلص باید بود" اور آخر میں لکھتے ہیں "آن ماہ رونق و آن خوشخوئے امروز مطلع آفتاب این دولت است" (۴۷۔ ۴۹) ۸ د وین خدا میں ہدایت کرتے ہیں "اکنون جنگ بدامن پاکی مہیا اکنون باید از نامرضیات نامشروعات تبرّی و اجتناب باید کرد و معرفت مولیٰ حاصل باید کرد و پاکی نفس در آنست خدمت شفقت بر خلائق مخصوص صحبت مشائخ و دوام طاعت و مدام ذکر پر زور دیتے ہیں۔ دیگر افغانی امرا خان اعظم سعید[2] خان سروانی مسند عالی شیخ زادہ عماد فرمولی[3] پسر خان خانان محمد فرمولی عرف کالا پہاڑ مسند عالی میاں نصر اللہ کے ملک شادی کے نام بھی خطوط ہیں جن میں فنا دولت دنیا و ترک دنیا بطریق اصعب و اسہل یعنی تجرید از مال و منال و تعزیط از عوائق و قطع تعلقات و انفاق مال پر تبصرہ کیا ہے۔

امرا، علما، و مشائخ اعزا و اقربا و برادران دینی کی فہرست بہت طویل ہے جنھیں خطوط لکھے گئے۔ اپنے بیٹوں اور مریدوں کو حصول علم کی بہت تاکید کرتے ہیں" در خواندن علم دولت و سعادت دو جہانی شمارند و در خواندن علم ہیچ تقصیر نکنند و از مطالعہ کتب سلوک خالی نباشد۔ بے چراغ نور نبود و بے نور ہرگز حضور نبود کہ بے نور دو جہان ظلمت است پس از علم چارہ نیست بے علم ہیچ کار نیست

---

[1] مچھیوارہ کا جو دریائے ستلج پر ہے حاکم مقرر ہوا تھا جب ہمایوں ایران سے واپس لوٹا اس وقت یہ حاکم دہلی تھا

[2] لاہور سے سنبل آیا تھا۔ چونکہ سلطان سکندر لودی کے خلاف سازش میں یہ بھی شریک تھا اسے عملداری سے بدر کیا گیا۔ [3] بہلول لودی کے ۵۲ امرا کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل ہے۔ سکندر لودی نے اس کی جاگیر اس کے بھائی خواجہ احمد کو دیدی [4] امرائے بہلول لودی میں اس کا نام بھی ہے۔

وہرگز بازنیست (۶۵) اپنے فرزند ثانی شیخ رکن الدین کو لکھتے ہیں باید کہ آن فرزند مشغول بعلم و عمل باشد وخود را ہم خوری ہلاک نکنند کہ ترقی این کار تعلق بحضور دارد قریب الایام آمدن این فقیر خواہد شد باید کہ آن فرزند در تعلیم علم کوشش بلیغ نمائند کہ بغیر علم خبر اسلام و دین خوب نمی شود (۶۶) اخلاقی تعلیمات کی بھی کمی نہیں "باید کہ در متابعت سید کونین اقامت شرع بر قدر طاقت کنند و صدق معاملہ با خدا و خلق خدا پیش رو دو از جہت خود باکسی نہ ستیزد و انصاف خود بر دیگری نہ طلبد و با خلق نرم باشد چنانکہ کسی بآزاری قول و فعل و در جمیع حرکات و سکنات از وے نہ ترسد۔ (۶۷) بدانکہ صفا عبارت از پاکی است اول پاکی لقمہ و جامہ است بر حکم شرع و آن پاکی تن است دوم پاکی جوارح است از معاصی سوم پاکی دل است از صفات ذمیمہ کہ آن کبر و بخل و کینہ و گلہ و حقد و حرص و دروغ و جز آنست چون این ہر سہ پاکی حاصل آید واستقامت یابد۔۔۔۔۔

پاکی چہارم پاکی سر است از ما سوا اللہ کہ آن حقیقت اسلام است (۶۸) اگر تو آنی جوارح را از معصیت پاک دارد و دل از صفات ذمیمہ مصفا کن کہ آن ہمہ صفات بہائم و سبائع است و آن ہمہ حب دنیا و حب جاہ و مال و حرص و حقد و کینہ و بغض و بخل و عجب و ریا و کبر و نفاق و مکر و حیلہ و دغا و کذب وگردانیدن زبان و جز آن است تا آنکہ ازین بلا پاکی حاصل نشود و جمال اسلام روی ننماند (۶۹) عجز و انکسار، صدق و اخلاص، صبر و استقامت، شکر و رضا۔ توکل و قناعت۔ نفقہ و فاقہ۔ تواضع و مذمت اعتدال در اکل ادب و نگونساری۔ منت و رعایت مستحقان شفقت بر خلائق۔ تیمار دلہا۔ تاسف بر پیش بزرگان۔ علو ہمت ورع و تقوی تحمل برایذا خلق و حسن خلق با آنہا۔ استقامت شرع عملاً و اعتقاداً تحصیل و تدریس علم ترک رقص و بدعت و منلات وغیرہ کی تلقینات سے مکتوبات مملو ہیں اور صوفیائے کرام کے ملافیظ و مکاتیب میں یہ تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ مگر شیخ گنگوہی نے بڑے شرح و بسط سے ان امور پر روشنی ڈالی ہے۔ جمہور صوفیہ چشتیہ کی طرح یہ بھی وجودی تھے اور ابن عربی و عین القضاۃ غزالی وغیرہ کے ہم نوا ہیں۔ وحدت الوجود۔ وحدت و کثرت۔ قدر و اختیار فنا و بقا خدا بینی و خود بینی، تجرید و تفرید و تفریق۔ تجلیات تنزلات ترقیات تلونات اعیان ثابتہ شوق و وجدان نفس روح معیت، رویت معرفت وغیرہ کے مخصوص مباحث پر اپنے مخصوص انداز سے روشنی ڈالی

ہے لیکن کچھ اور کئی باتیں ہیں جو شیخ گنگوہ کی تحریر سے ہی صاف اور واضح ہو جاتی ہیں۔

صوفیائے کرام کے نزدیک عورتوں کا کیا درجہ تھا اس کے متعلق مکتوب ۶۶ بجانب بوبو اسلام خاتون "در بیان عدم جواز خلافت بر زنان اگرچہ بکمال مرداں رسند" کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ زاہدہ بی بی آپ کے مرید عمر خاں سروانی کی دختر نیک اختر اور سعید خاں وہیبت خاں سروانی کی بہن تھیں۔ آپ انھیں "خواہر سیدہ عفیفہ ساجدہ راکعہ فخر النساء والعالمین بوبو اسلام خاتون" کے شاندار الفاظ سے تخاطب کرتے ہیں" باید کہ درین جہان غم آخرت بخورد و خود را در رہ گذارے داند و حیوۃ در عبادت و ذکر ظاہر و باطن و شوق و ذوق مولی صرف کند و انفاس نفس بشری را غنیمت شمارد ... ہر یک نفس کہ میرود از عمر گوہر است۔ کاز خراج ملک دو عالم بہا بود اسماء و صفات با ذکر ذات و واسطہ حضور شیخ باشد و مدد و محنت چنان کند کہ غیر خدا را در دل جائے نماند و دل مستغرق گردد" پھر لکھتے ہیں "مراسلات جاری دارد تا موجب تسلی بود۔ اس کے بعد کی عبارت بہت اہم ہے "آن خواہر ہمت میان مردان حق تعالی قدم زدہ است لائق است چشمۂ پیران روان کند اما چوں این کار دعوۃ است و از عورات نیامدہ است جامۂ پیراں فرستادہ نشد و لباس خرقہ مشائخ حوالت کردہ نشد و مجاز گردانیدہ نشد اما باید کہ چوں صادقے از عورات التماس ارادت کند عورات بحضور و غیبت و مرد را بغیبت کلاہ و دامنے بوکالت پیر خود بدہد و شجرہ پیر خود نویسانیدہ بدہد و مرید پیر خود گرداند و این دولت را دولتے عظیم داند عاقبت محمود باد"۔ صاحب اقتباس الانوار لکھتے ہیں بی بی اسلام خاتون اشغال شغل باطن بسیار داشت و ذکر نیز بروے مستولی شدہ بود و می گفت از جمیع اعضا من آواز اللہ می آید حتی کہ از پائے نیز آواز می آید بزمین نہادن نمی توانم۔ ان کے اس شغف سے ان کے بھائیوں کے دل میں کدورت پیدا ہوئی۔ شیخ گنگوہ کی طرف سے کبھی منزجر خاطر ہوئے۔ سلطان سکندر لودی کے ساتھ جونپور میں تھے۔ ارادہ کیا کہ شاہ آباد سے کبھی انھیں نہ بلایا جائے لیکن تھوڑے دنوں بعد سلطان سکندر بر سروانیاں غضب کردہ از ولایت خود اخراج نمود در گجرات رفتند اسلام خاتون می گفت برادران مارا آلت پیر ما افتادہ و زدہ پیر با خراب می شوند ۹۰۵ھ میں بقول صاحب طبقات اکبری ۲۲ امرائے سکندر کے خلاف سازش

کی تھی اور اس کے سوتیلے بھائی فتح خاں کو تخت نشین کرنا چاہتے تھے لیکن راز افشا ہو گیا اور ان کا اخراج عمل میں آیا۔

مکاتیب میں دو خط جو سکندر لودی اور بابر کو لکھے گئے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ دونوں کا آغاز حمد خدا اور اس معنی خیز فقرہ سے ہوتا ہے وله الحکم والیه ترجعون جس سے اسلامی نظریۂ اقتدار اعلیٰ پر روشنی پڑتی ہے۔ الفاظ و عبارت مفہوم و مطالب میں بھی بہت کچھ توافق پایا جاتا ہے۔ مگر چند چیزیں مابہ الامتیاز بھی ہیں۔ سکندر لودی کو لکھتے ہیں۔ "ما ناکہ در نیو تت مگر کہ از شامت سوء افعال خویش ائمۂ تام بسبب منع شدن استقامتہا و طائفہا عموم در بحر عمیق غموم غریق شدہ و بہلاک پیوستہ چنانکہ ہیچ راہ نجات نمی یابند و ہیچ جادہ بیچارگی نمی دانند نہ بسر دست آویز ایشانست و نہ فریاد رسی پناہی گریز ایشان الغیاث الغیاث" بابر کے خط میں کئی باتیں جاذب نظر ہیں (۱) شان تخاطب ثنا و تعریف مختلف اور بلند تر۔ "امام زمان سلطان وقت جوان بخت خدا پرست جہاندار شہریار دین دار ضعیف پرور عدل گستر سلطان الاعظم المعظم حضرت ظل اللہ فی الارض ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ (۲) بر حکم آں کہ امام زمان سلطان گزیدہ سبحان شرع محمدی را استوار گرفتہ و دین حنفی را در کار بستہ در جمیع امور بعلم علما پرداختہ در میدان طلب گوی محبت با عارفان باختہ و ہمت عالی و ہمت متعالی بر نواخت ایشان بگماشتہ و قدر ارباب علم و معرفت بکمال شناختہ (۳) التماس آنکہ باید و سزد کہ در عہد ہمایون روزگار در دولت سلیمان شعار خلد اللہ خلافتہ طائفۂ علما و ائمہ و ضعفا چناں رونق و عز یابند کہ از ہر عہدے و اقلیمے برفعت شتابند و منع عشر بر وجہ معاش ایشان ناروا دارند و از قبیح القبائح پندارند سوال از چیزے عقل دور است گرفتن فقیر۔ از فقیر چگونہ جائز دارند و در حیز تصرف آرند و دریں احداث شنیع ظلمے است کہ جہان تاریک گردد و فغان در جہان افتد و بلائی و تہر لیست کہ دمار از غریبان و فقیران بر آورد و استیصال دارد" بابر اور اس کے مورخین اس احداث کے متعلق خاموش ہیں (۴)" باید و سزد کہ برائے شکر نعمت منعم سایہ عدل بر عالمیان چناں گستر ند ہیچ کس بر ہیچ کس ہیچ ظلم نکند و ہمہ خلق و ہمہ سپاہ با وامر و نواہی شرع مستقیم و مستدیم بوند نماز بجماعت بگزارند و علم علما را دوست دارند و در بازار ہر شہرے محتسبان بگر دند تا شہر و بازار

را بجمال عدل شرع محمدی بیارایند و روشن و منور گردانند و الجمع چنانکه در عهد سلف و خلفاء راشدین
با جمیع شرائط بے شبہ بود ہمچناں در عہد ہمایوں روزگار و سلطان جہاندار بے شبہ ادا شود و دین کمال
رسد و بر روئی این عهد جمال عهد خیر القرون قرنی پدید آید و عهده داران سرکار ان مسلمانان پاک در دین
چالاک۔ امینان متدینان در ولایت تعین کردند و تحصیل اموال بر وجه شرع کنند تا جمال
باحسن الدین والدنیا اذا اجتمعا بطور انجامد (۵) باید و هرگز در دیوان اسلام و در دار السلام هیچ کس
را از کفار عهده دیوانی و هیچ وجه نبود۔ و در دنا تا تکلم نزمند و امیر و عامل نباشند چنانکه در شرع خوار و
ایشان که "وهم صاغرون" نشست۔ ہمراں نوع خوار و ذلیل باشند و مالگذاری کنند و جزیہ و زکوٰۃ مال
بر وجه شرع از ایشان بگیرند و از جامه پوشش مسلمانان منع سازند و کفر خود را مستور دارند و مراسم
کفر بر طریق غلبه و اعلان نکنند۔ مواجب از بیت المال اسلام نیابند و بکسب خود مشغول باشند
و با مسلمانان هیچ برابری نکنند تا رونق اسلام بعز کمال رسد۔ والله الموفق حسبی الله و نعم الوکیل و
نعم المولی و نعم النصیر۔"

آخری ہدایت محل نظر ہے اور صوفیائے کرام کی روادارانہ وسیع القلبی و ہمہ گیر خدمت
وشفقت علی خلق اللہ کی روایات کے منافی ہے قاضی مغیث نے علاء الدین خلجی کے سامنے اپنی
جس عصبیت کا اظہار کیا تھا اس کی یاد شیخ گنگوہی نے جو خواجہ اجمیر، بابا فرید، نظام الاولیا ایسے انسان دوست
بزرگوں کے نام لیوا تھے تازہ کر دی۔ سورۂ توبہ میں جزیہ[1] کے حکم کے ساتھ یہ چھوٹا فقرہ ہے "وہم صاغرون"
مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں جو مفہوم بتایا ہے وہ قاضی مغیث و شیخ گنگوہی سے بہت

---

[1] جزیہ معاوضہ کفر یا کسی اعتقادی اختلاف کا بدل نہ تھا بلکہ فوجی خدمات کا معاوضہ تھا۔ عورتیں بچے بوڑھے اپاہج
اور تارکان دنیا سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا باوجودیکہ کفر میں اوروں کی طرح یہ بھی مشترک ہوتے۔ حاکم و محکوم بالادست
و نیازمند کا مفہوم صغار میں مضمر ہے حکم ہے کہ جزیہ دیں رعیت و محکوم کا احساس کر کے قرآنی آیت کے اس ٹکڑے وہم صاغرون کا بس
اتنا مطلب ہے جیسے افسانہ کر دیا ذلت و خواری کا جواز تو کسی طور پر واضح نہیں ہوتا اور نہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ امور حکومت میں مشرک و کافر
بالا سے ایسا امتیاز برتا جاوے جس کی تلقین قاضی مغیث یا حضرت عبد القدوس گنگوہی نے علاء الدین اور بابر کو کی۔

مختلف اور قابل ترجیح ہے۔ شیخ گنگوہ سکندر کے ایک اور ہمایوں کے ہر دو خطوط میں ایسی کوئی بات نہیں لکھتے۔ سکندر کے وقت میں مرکزی نظام اور سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں کچھ ایسی گڑبڑی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ دینی امور خطرے میں دکھائی دیتے۔ اس کے بیٹے ابراہیم کا زمانہ نہایت انتشار و خلفشار کا دور تھا۔ ہر طرف ہنگامہ آرائی تھی۔ راجپوتوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا اور ابراہیم کی شکست و موت کے بعد رانا سانگا کی ہمت بہت بلند ہوگئی تھی۔ وہ نہایت طاقتور جنگ جو اور پر حوصلہ فرما نروا تھا۔ ہندو سلطنت سارے شمالی ہندوستان میں از سر نو قائم کرنے کا منصوبہ باندھ رہا تھا۔ اور کچھ مسلمان ذاتی اغراض اور مغلوں سے عناد کی وجہ سے اس کے ہمنوا ہوگئے تھے۔ ابراہیم کا بھائی محمود لودی دس ہزار کے ساتھ جنگ کنوہ میں شریک تھا اور حسن خان میواتی جو راجپوت النسل اور نومسلم خاندان کا تھا، بھی رانا سانگا کے ساتھ تھا۔ ہندوؤں میں ہمیشہ دور بینی اور سیاسی بصیرت مسلمانوں سے زیادہ رہی یہ اور بات ہے کہ دوسرے وجوہ سے ان کی کوششیں قبل از وقت ثابت ہوئیں جس جوش سے ہندوؤں نے رانا سانگا کا ساتھ دیا تھا اور جو فضا پیدا ہوگئی تھی اس کا اندازہ بابر کی گھبراہٹ اور ترک مسکرات عجز ودعا سے کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اگر بابر کو شکست ہوگئی ہوتی تو راجپوت ہندوستان کی سلطنت پر قابض ہو جاتے ظاہر ہے جو شخص اپنے وطن عزیز اور رودولی سے ان کو ہندوؤں کے غلبہ و استیلا کی وجہ سے چھوڑنے پر مجبور ہوا ہو اور جسے پھر رودولی میں واپسی کی نوبت نہیں آئی (وہاں کے بازاروں میں سور کا گوشت علانیہ بکتا تھا) جو محکوم قوم کے افراد کو بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا دیکھتا ہو جسے وہ سب چیز جو جان سے زیادہ عزیز تھی معرض خطر میں دکھائی دیتی ہو (خواہ یہ خطرات مفروضہ ہی کیوں نہ ہوں) وہ ذاتی تکالیف کو بھول کر قومی و اجتماعی مفادات کے پیش نظر ایسا مشورہ دے سکتا تھا جو نارمل حالت میں نہ دیتا۔ شیخ گنگوہ کی پہلی تصنیفات اور خود مکتوبات کے بیشتر حصہ میں سواد اعظم کی جانب حقارت و نارواامتیاز کا ایسا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ قلندروں کی اخلاقی اور جوگیوں کی وسیع القلبی۔ گنگوہ میں ایک مرتاض ہندو جوگی پر آپ اس حد تک اثر انداز ہوئے کہ وہ مع سات سو چیلوں کے مشرف بہ اسلام ہوا۔ بڑے شوق سے ہندی دوہے قرآن و حدیث کے کلمات رومی و عطار و عراقی کے اشعار کے ساتھ لاتے ہیں۔ بہلول صوفی سروانی کو غزل "قلندر آنکہ نوق الوصل جوید"

کے ساتھ معنی صوت این سخن ہندی کہ پربت پیچ بسی ہمارو بیت" بار بار اسے دہرا کر سمجھاتے ہیں (۲۵۱)
کرشن جی۔ گورکھ ناتھ جوگیوں سدھوں کے نام ہندی دوہوں میں لیتے ہیں۔ گرو نانک کا بھی ایک دوہا
"مویوں پیاس نانک لہو پانی۔ پیو سوں رانڈ سہاگن نانوں" یعنی میں نانک تشنگی عشق سے مر رہا تھا
مجھے پانی مل گیا میں رانڈ تھا سہاگن بن گیا جب میرا محبوب مل گیا۔ مکتوب ۱۵۹ میں نقل کیا ہے۔

اس خط میں جو شیخ عزیز اللہ دانشمند بلخی اپنے برادر حقیقی کو بھیجا تھا، حضرت عبد القدوس
ایک جگہ لکھتے ہیں" بیچارہ جوگی میگوید" سبد من پایا نا چینتا ہیرانی کہو تو کو پتیانی۔ پھول تیں کلی بھیا
بولی سدھ ہرائی" یعنی ہمارے دماغ سے عارفوں کی بات اخذ کر لی، پی لی اور میری فکر دور ہوگئی لیکن
اگر میں اسے کہوں تو کون یقین کرے گا۔ کلی پھول بن گئی لیکن سدھ بدھ جاتی رہی۔ پیر و مرید کے ما بین
والنفس کا ذکر کرتے ہیں۔ پیر پرستی کو" حقیقتاً خدا پرستی" بتاتے ہیں۔ چنانکہ کسے پیش استادے بجہت تحصیل
علم کند دریں مقام مریدان صادق بدل از دل شیخ تحصیل علم کنند دل شیخ نور ربانی است بمکاشفہ و
مشاہدہ" لیکن یہ بھی فرماتے ہیں" امروز پیران و رہبران چوں کبریت احمر اند (۵۶)" نہ چنانکہ امروز پیری
و مریدی در جہان پیدا است جاہلان و نا اہلان بلکہ فاسقان و گمراہان و ہوا پرستان شیخان و مریدان
اندہ اکٹ ضلال فی ضلالٍ شیخ بر حق شیخ نور میفرمایند و دہرہ سے جا کا گرو ڈ و بنا چیلا کا ان ترائن
اندہی اندہا ٹھیلیا دوؤ کوپی پرائن۔ جو گرو دنیاوی امور میں خود مستغرق ہے اس کا چیلا کیسے پار
لگ سکتا ہے۔ اندھے کو اندھا ٹھیلے تو دونوں کی جان جائے گی (۱۳۱) مکتوب ۷۰، اسید احمد ملتانی
دانشمند کے نام مسئلہ توحید پر ہے۔ ایک جگہ قرآن کی مطابقت میں لکھتے ہیں" حق سبحانہٗ و تعالیٰ
موجد افعال و اشخاص جملہ موجودات است از محسوسات و مغیبات و ایجاد در میدان قدرت تامہ
است۔ اور فرماتے ہیں مارا در فعل و وجود جز تہمتے بیش نیست یعنی بقول میر تقی میر ؎

۱؎ گنگوہ میں ایک جوگی تھا جس کے سات سو چیلے تھے ایک گپھا (غار) میں ریاضت شاقہ کیا کرتا تھا۔ اس میں
ایک تنگ سوراخ تھا۔ آپ کی کرامت و بزرگی دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام سے مشرف ہوا اور چیلوں نے اس کی متابعت
کی۔ یہ آپ کی تربیت سے مرتبہ کمال کو پہنچا جہاں مدفون ہوا وہ جگہ دکھائی جاتی ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔ چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔ جبریہ "جبر در مقام وحدت دارند" اور قدریہ سے جو کہتے ہیں "فعل خداوند با فعل بندہ در افعال اختیاری روانیست و جز بندہ را فعل روانیست اینجا خالق افعال و موجد اعمال ہمان بندہ است اختلاف کرتے ہیں اس لئے کہ اگرچہ بندہ سخن در وحدت گفتند از وحدت برون رفتند چہ اثبات دوئی کردند و بخودی مبتلا گشتند امام حسن اشعری سے بھی کہ فعل را حادث گفت تکوین و مکون را در یک نظم سفت و دو تکثر آورد" اختلاف ہے یہ بیت لکھتے ہیں ؎

دوئی را نیست رہ در حضرت تو۔ ہمہ عالم توئی و قدرت تو ــ اسی جگہ فرماتے ہیں :۔

دوہرہ ہندی از زبان استاد خود یاد آمد و زیبا آمد ؎

سائیں سمندر اپار اتھہ ہم تہ مچھلیاں۔ جلہرا پہن جل رہن مرہن تو جلہین ما" مالک حقیقی بظاہر اس بحر ناپیدا کنار (کائنات) ہے جس میں مچھلیاں رہتی ہیں پرے ہے لیکن مچھلیاں کیا ہیں پانی میں رہتی ہیں پانی میں فنا ہو جاتی ہیں۔" عزیز من در حوت نیکو بنگر کہ چیست واز کجاست و کجاست" شر نگار یعنی عشقیہ دوہے بھی مکتوبات میں جا بجا ملتے ہیں ؎" جگ سبا یا چھوڑ کر ہوں رہ جوگن ہوں۔ باج پیاری ہے سکھی۔ ایکو جگ نہ لیئوں" میں ساری دنیا کو چھوڑ کر جوگن بن گئی۔ میں اپنے محبوب کے علاوہ دنیا کی کوئی چیز نہیں چاہتی (۳)" جے پیؤ سیج تو نیند لیں۔ جے پردیس تو یون۔ برہ بردھی کامنی نا سکھ یون نہ یون" اگر میرا محبوب میرے سیج پر ہو تو نیند کہاں۔ اگر پردیس میں ہو تو فراق کی ماری کو چین اور سکھ کہاں (۱۵۹)

اب ہم مکتوبات کے اور دوہوں سے قطع نظر کرکے مرشد نامہ کے دوہروں، شبد، چوبدہ، عقدہ اور شرلوک (اشلوک) کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ اس کتاب میں تقریباً بیاسی ہندی نمونے ہیں جو سب کے سب حضرت عبدالقدوس کے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جا بجا آپ کا ہندی نام الکھداس بھی ملتا ہے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ راگ اور راگنیوں کے طرز پر ہندی اشعار منظوم کئے گئے ہیں۔ ۱۵ ویں صدی کا باکمال ہندی شاعر قطبن مرگاوتی میں لکھتا ہے (۲)" او چھتیس بہار جا آ ہیں ایک راگ پیچ بیچ کہہ سئیں" (۱)" باجے ساج سبد سب تہاہے چھتیسوں راگ الاپے۔ دوہرہ شبد سہ دیکھوری من بوجھوری دیکھو انو بانی (دقیق بات) سبھی رنگ نیر (پانی) کی یا یا رنگ

سمایا بانی ۔ (رنگی ذات) کیوں نہیں ناچوں سکھی جو پیہہ رنگ چڑھایا۔ تن من جیہہ سب ایک رنگ دیکھا تو میں آپ گنوایا" یعنی ہمہ رنگ ہائے مختلف یک رنگ است کہ آن بے رنگیست و آن رنگ خدائیست اصل ہمہ رنگہا از آن رنگ است آب در اصل رنگ ندارد و ہمہ رنگہا از مایہ آب است ۔ چوپدہ سے

گرو جو کیجئے ایسا جان ۔ سرپ نرنتر آپ پروان (دلیل) ، دوہرہ سے یہ جگ وہ جگ دیونہار دیہ دن گا ، تن من ارتبہ بھنڈار (مال و متاع) سائیں کیری (کا) سیس (سر) کا جو دکھراوے یار" چوپدہ سے

گر بیرا گر ہیرا گندار ۔ کھودی نکسی ہیرا سار ۔ یعنی پیر زمین گوہر است و مرید کندی ۔ گوہر بدست نامد تا نہ کندی ۔ سبد سے بن کودا ہاتھ نا نہیں ، بن گرو بات نا نہیں ۔ دوہرہ میرت میرت ہے سکھی ہوں دہن (نحوست) گئی مرائے ۔ بڑ یا بوند سمندر منہ (میں) کہہ کیوں میری جائے ۔ سبد سے ہوناست ہو ناست نہ وھو منڈل چھایا ۔ پرم تنت بچار نت ناست اوست ہانہ کایا ۔ میری اور اس کی حقیقت آسمان تک پہنچی ہوئی ہے ۔ اس عظیم جوہر مطلق پر دھیان دے کر میں نے اپنے جسم کو گھلا ڈالا ہے ۔ سبد سے نہ کچھ نہ کچھ نہ کچھ جان نہ کچھ ہیں نہ کچھ مدد بیچ ...... نہ کچھ پروان (ثبوت) ، نہ کچھ دکیہ نہ جاہیا جا ہیں) بھاگ ۔ جنہ نہ کچھ تنہ رھیا لاگ ۔ یعنی جانے کہ ہستی پیدا آید و فنا رود کے شما مدہان شغل پیوستہ در کار باش کہ مقصود حقیقت ہمانجا مشاہدہ خواہد شد ۔ دوہرہ سے یہ جگ وہ جگ چھوڑ کر ہوں بیچ جوگن ہوں ۔ بن پی بھکیا اے سکھی اکیو جگ نہ لوں ۔ دوہرہ ہے ہم بیچ آئی مرگ تین ہی بیچ سرگ ہیں جانہہ ۔ رہن ہماری سائیاں اینہا کب رہاتہہ ۔ ہم خود بہشت سے آئے اور تم بھی اسے جانتے ہو ہم تو خدا کے ساتھ ہی یہاں کب رہنا ہے سے جے سونار سو لکھنی مجہہ دکھلا دے نکیو کیوں نا ہیں ناچوں مور جوں تسارن سب دکھ ۔ جس سونار نے مجھے سونے کے ایسا بنایا وہ مجھے اپنا درشن دے ۔ ہمارے سب دکھوں کو وہ مٹا دیتا ہے اس لئے میں اسے دیکھ کر مور کی طرح رقص کرتی ہوں سے جن نکھو درشنا ات ہی دا اتہی اتنہ بہی ہوسی اوت ۔ جنہا ات نہ دکھیا تنہا ات نہ اوت ۔ ات جگ کنت نہ ملیا نین گنوائیں روئے ۔ جگ ملے کر نہ ملے دکیو تو کہیا ہوئے ۔ جس کا مجھے درشن کرنا ہے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہے ۔ دنیا میرے سامنے ہے لیکن محبوب کے فراق میں روتے روتے میری آنکھیں برباد ہو گئیں ۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے ملتا ہے یا نہیں ۔ سبد سے

روتی ساتی گیان لگائے رات کہے دن بیر جائے۔ دوہرہ ــ ہیری بھتیری بیاتتہ منہ کنت لبائے۔
تہاں بسیرا جو کرے سو نیہہ بلائے ــ سونی روپی مار ستواری روپ بہونا سائیں۔ تن دہن جی لی سیون
کہیلا لیلی مجنوں کی نائیں۔ ــ

ست سر برن جی لبی دیا اپنی رود۔ کنت سہاؤ چھوڈ ئی جب سانس جب سدہ
نہچل را کہو آپ سیون دہر کی نہچل نوئ۔ بیٹھی سب پسائی کی کانچی کیونکر جوئی ــ
بہت بوڑی ہیجہ تون ٹنک جیوں تیرا۔ سائیں تین تو کیون یہہ دیکھ کنت گہیرا
ایکو کام نہ آوے جب پر کی پہیرا۔ چھوڑ پیارا سائیاں تب جا نہ کہیرا
اری منسری مال اس جلہر کا رب کہال۔ اس تالری کوچہ باہر سمند ستہیال
اری منسری کوچہ باہر سمند سنبہال۔ اس تالری بیرن کہنے مت کو رمیلی جال۔ عقدہ
ــ اچی سوگر ہوں دہن تاکی چیلا۔ جن موہ لیا کنت اکیلا۔ دوہرہ ــ رنگ بہونا میں بیہہ
پایار ہنی کرون بدہایا۔ کیا بدہایا بہاتر تا پاچہی سائیں گہر آیا۔ الکہہ نرنجن میرا سائیں سوجو لکھا
نجائے۔ جن لکہیا تن آپ گنوایا کہوں تو کو بتیائے۔

مندرجہ بالا اشعار اور کچھ اور جو مرشد نامہ میں موجود ہیں جس طرح پڑھے جا سکتے ہیں اور
جو ان کے صحیح معانی و مطالب ہو سکتے ہیں اس کے متعلق ماہرین فن ہی کوئی قطعی رائے دے سکتے
ہیں اور اس کے حسن و قبیح پر بھی وہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ راقم الحروف کا منشا محض انھیں منظر عام پر
لانا تھا۔ آخر میں کچھ ایسے اشعار کا ذکر نا مناسب نہ ہوگا جنہیں "شلوک" کا نام دیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) "ایک بہو تم۔ پرابرھم۔ جگت سربا چر اسچرن۔ تانا بہادے منو بھیئے تیہ موجیا کہتی"
اس کا مفہوم یہ ہے ــ دوئی را نیست درحضرت تو ہمہ عالم توئی و قدرت تو۔ تفرقہ این و آن در
خاطر کسے خوش آید کہ فلاح نباشد۔

(۲) اد تماں او تمم جینتہ موہ جینتہہ مدہماں۔ ادھما کاتم جینتہہ ادھم ادھما" یعنی بزرگان عالی
ہمتاں در طلب مقصود در عالم اندناقص ہمتاں و کمینگان غیر طالبان حق تعالی ہمگی وقت خود را در
طلب رزق زن و فرزند و در غم دنیا مصروف باشند۔

(۳) "آپاناست۔ پراناست کنجت جگترا۔ بدہ باجامنوناست شترزدیوی اکل پتا"
یعنی جس طرح کنول کے پھول آفتاب کی گرم شعاعوں سے کمہلا جاتے ہیں اسی طرح دنیا بھی فنا ہو جاتی ہے۔ ذات باری ہی پدر حقیقی ہے جس کی سو دیوتاؤں کی طرح تقسیم نہیں کی جا سکتی۔

(۴) "گروا۔ وتجہ گرو پرم دیوتا۔ گرو بہونا زابری لیسو سنسار پر تمتی ::
نابڈیہ گرو سمانا یہ تبانہ: جبڈ دیوتا۔ تاگرومتیا ہوئی کوپ جبڈاکبنیت پراپدا"
یعنی تاجر اور وہ لوگ جو گرو کی تعظیم کرتے ہیں لائق ستائش ہیں۔ گرو ہی سب سے بڑا مالک ہے وہ سب سے اچھا ہے جو دنیا کو ملا دیتا ہے۔ گرو کے سوا اس کا کوئی دیوتا نہیں۔ اس کے ایسا کوئی دوست نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی تیرتھ کی جگہ نہیں۔

غالباً یہ چند مثالیں کافی ہوں گی۔

دستور ملّا فیروز مصنّف جارجنامہ

خدا بخش مرحوم کے کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں منجملہ کئی کتب خانوں کی فہرستوں کے ایک فہرست کتاب پارسیوں کے ایک مذہبی کارفرما عالم، شاعر اور مخیر بزرگ دستور ملا فیروز کے "کتاب خانہ" کی بھی ہے جسے ہنگری (جنوبی یورپ) کے ایک مستشرق رہاتسک نامی نے جو بہت عرصہ تک بمبئی میں قیام پذیر رہ کر ۱۸۹۱ء میں فوت ہو کر پیوند خاک ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں مرتب کی تھی۔ دیباچے میں مرتب نے بانی کتب خانہ کے سوانح حیات سے قطع نظر کر کے محض چند اشارات پر جو فراہمی کتب کے متعلق ہیں۔ اکتفا کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ملا فیروز نے اپنی زندگی میں ایک بڑا ذخیرہ عربی اور فارسی کتابوں کا جن کا تعلق زیادہ تر سال کبیسہ یا سال زائد جسے لیپ ایر میں اور ہندو ملیماس کہتے ہیں کی بحث، حجت و قضیہ سے تھا۔ جمع کیا تھا یہ کتابیں زیادہ تر فن نجوم علم حیات اور علوم تاریخ و تواریخ کی تھیں اس ذخیرہ کو پارسیوں کے قدیمی طبقے کے چند معمر برگزیدہ حضرات کے حوالہ کر دیا گیا اور کتابوں کے مطالعہ کی آزادی اور سہولت دی گئی۔ اور ہر طبقے اور مختلف قوم و ملت کے افراد کے لئے کتب خانہ عام کر دیا گیا۔ زرتشتی[1] فرقے کے ان بزرگوں نے جنہیں ایلڈر یعنی شیوخ کہا جاتا تھا۔ یہ ذمہ داری ملا فیروز کی وفات سے

---

[1] زرتشت یا زردشت ایران کے معنون یا آتش پرست مجوسیوں کے بانی تھے۔ زردشتی یا زرتشتی ان ہی مذہبی فرقہ کے افراد کو کہتے تھے۔

جو ۱۸۳۰ء میں واقع ہوئی۔ ۱۸۵۴ء تک سنبھالی۔ ۱۸۵۴ء میں زردشتوں نے ملا فیروز کے نام پر ایک مدرسہ قائم کیا اور کتب خانہ اسی مدرسہ سے ملحق کر دیا گیا۔ معتبر پارسیوں نے بڑی بڑی رقمیں ان اداروں کے لئے وقف کیں اور یہ دونوں ادارے جو پھلتے پھولتے رہے ایک منتخب کردہ کمیٹی کے حوالے کر دیئے گئے۔ ۱۸۵۶ء میں کتب خانہ کو مدرسہ سے الگ کر دیا گیا۔ اور ایک علاحدہ کمیٹی اس کی دیکھ بھال اور انتظامات کے لئے قائم کی گئی۔ اس کتبخانہ کی جس میں وقتاً فوقتاً اضافے ہوتے رہے جن مطبوعات و مخطوطات کو عوام کے لئے ملا فیروز نے وقف کیا تھا۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ مسٹر روہاتک نے اس کی ایک مفصل فہرست تیار کی۔ مختلف علوم و فنون اور کئی زبانوں میں یہ کتابیں تھیں۔ ۱۸۷۳ء میں ۶ عربی کی ۲۵ ۷ فارسی کی ۱۱۹ اوستا پر ۴۳ اور پہلوی زبان میں ۳۷ کتابیں تھیں۔ یہ کتب خانہ پہلے رومن کیتھولک گرجا گھر کے پاس کالکا دیوی روڈ پر بمبئی میں تھا۔ اور اب شاید پیشگاہ خاور شناسی کاما (انسٹیوٹ) میں منتقل کر دیا گیا۔ محبی قاضی عبدالودود صاحب نے کاما انسٹی ٹیوٹ میں دساتیر اور دوسری کتابوں کا جو ملا فیروز کے کتب خانہ کی تھیں مطالعہ کیا تھا۔ ملا فیروز نے دساتیر کا گجراتی اور انگریزی میں ترجمہ کیا تھا اور فرہنگ لغات دساتیر اور منظوم جارجنامہ کے مرسہ دفتر کو جو انہیں کی تصنیفات تھیں اپنے نہایت خوشخط ہاتھوں سے لکھ کر داخل کتب خانہ کیا تھا۔ مسٹر رہاتک نے ان کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ جارجنامہ کو ۱۸۳۷ء میں مکمل طور پر بمبئی کے ایک مکتب نے شائع کیا لیکن اس کے مطبوعہ نسخے بھی اب کمیاب ہیں۔

خوش قسمتی سے مجھے ۳۵۔۴۰ سال قبل ایک صاحب کا مطبوعہ جارجنامہ کا دفتر دوم جو بمبئی ہی کے کتب خانہ کا ہے نسبتاً اچھی حالت میں دستیاب ہوا تھا۔ ایک سرسری نظر اس پر ڈالی اور پھر رکھ دیا لیکن بار بار جی میں آیا کہ اگر مصنف کا کچھ تفصیلی حال

---

۳ ایوان — دہلیز اور جلوخانہ کو بھی پیش گاہ کہتے ہیں۔ بنگاہ یعنی ذخیرہ اسباب بھی اسے پڑھا جا سکتا ہے۔

معلوم ہو جائے گا تو اس کتاب پر کچھ لکھا جائے۔ میرے آنجہانی دوست پروفیسر یادگیر جہانگیر تاراپوروالا کے برادر بزرگ جو ایک بڑے عالم اور ماہر السنہ تھے۔ ان سے ملنے کے لئے پٹنہ میں آئے۔ ملا فیروز کے متعلق جانکاری کا اشتیاق قائم تھا۔ میں موصوف سے ملنے کے لئے پروفیسر تاراپوروالا (TARAPURWALA) کے جائے قیام پر پہونچا۔ ان کے فاضل اور بااخلاق برادر بزرگ نے مجھ ناچیز کو شرف ملاقات بخشا اور ملا فیروز کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ وہ کاغذ جس پر ملا فیروز کے متعلق بڑی کارآمد باتیں مندرج تھیں جارجنامہ کی اب ٹوٹی ہوئی جلد اور کچھ پاشان اوراق کے اندر محفوظ رہ گیا۔ کچھ کتابیں پارسیوں کے متعلق ۱۹۶۴ء میں خدابخش مرحوم کے لئے خریدی گئی تھیں جو صاحب انہیں بمبئی سے برائے فروخت لائے تھے انہوں نے اپنی طرف سے کتب خانہ مشرقیہ کو ایک مطبوعہ کتاب فرزانگان[۳۳] زرتشتی تحفتاً پیش کیا تھا۔ محبی قاضی عبدالودود صاحب نے اس کی طرف میری توجہ منعطف کی اس میں ملا فیروز کے سوانح حیات پر کچھ زیادہ صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

ملا فیروز نے ایک منظوم کتاب دینِ[۳۴] خرد بھی تصنیف کی تھی جو طبع نہ ہو سکی۔ مشہور انگریز مورخ مسٹر بیورج نے کسی جگہ اشارۃً اس کا حوالہ دیا تھا اور لکھا تھا کہ اس کے صفحات ۱۸۱ ـ ۲۰۰ ـ ۲۵۰ پر کچھ باتیں ملا نے اپنے متعلق لکھی تھیں، یہ اشارے کیا تھے نہیں معلوم۔ صاحب فرزانگان زرتشتی نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اور کئی اشعار ایرانی اور ہندوستانی پارسیوں کے پرسش و پاسخ سوال و جواب کے نمونتاً درج کئے ہیں لیکن یہ اشعار چند متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق ہیں۔ ملا کی زندگی پر ان سے کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ مسٹر بیورج نے ایک انگریز خاتون

---

[۳۳] یہ ضخیم کتاب ۱۳۳۰ یزدگردی میں چھاپی گئی اور بمبئی سے نشر کی گئی۔ اس کے مرتب و مولف رشید شہمردان ہیں۔

[۳۴] اس منظوم کتاب کا زیادہ تر تعلق مراسم دینی زرتشتیان سے تھا۔ اس میں ۸۰ سوالات پارسیان ہند کے ہیں۔ جن کے جوابات موبدان ایران نے دیئے۔ بنگاہ خاور شناسی کاما انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں اس کا غیر مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔

یر یا گراہم کے ایک مضمون کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو لندن کے کسی جرنل میں ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مصنف نے ملا فیروز کی نہایت وجیہہ خوبصورت جاذب نظر شبیہہ کی تصویر کشی کی تھی یہ چیزیں بھی راقم السطور کی دسترس سے باہر ہیں کسی اور نے اگر اس نامور زردشتی یا زرتشتی عالم شاعر و مذہبی مقتدا اور مخیر بزرگ کے سوانح حیات پر کچھ لکھا ہو تو مجھے اس کا علم نہیں ہے جو کچھ مواد پیش نظر ہے اسے ایک ناچیز مضمون کے شکل میں مرتب کر کے معاصر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ آخر میں جارجنامہ پر بھی کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

دستور ملا فیروز کے والد ماجد دستور کاؤس رستم جلال مغربی ساحل ہند کے شہر بروچ کے آتش پرست پارسیوں کے ایک مقتدر مذہبی امام و پیشوا تھے۔ قدیمیان[۵] ہند کے موبدوں میں دستور کاؤس پور رستم جلال کا درجہ بہت بلند تھا۔ ان کے آبا و اجداد کا اصلی وطن ایران کا قریہ سہرورد تھا۔ جہاں سے مہاجرت کر کے بقول صاحب فرزانگان زردشتی سال یزدگردی ۱۲۳ھ کے حدود میں ہندوستان آئے۔ دستور کاؤس نے اپنے بیٹے[۶] کا جو ۶ جولائی ۱۷۵۸ء (سال ۱۱۲۷ یزدگردی) کو قصبہ بروچ میں متولد ہوئے تھے۔ پیشوتن نام رکھا تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں کبیسہ کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا بحث وتمحیص جواب وسوال کی جھنجھٹ اور جھگڑے نے شدت اختیار کر لی۔ ایک طرف ہندوستان کو ازپارسی تھی دوسری جانب سورت و بمبئی کے چند ممتاز اور سربرآوردہ زردشتی رہنما جنہوں نے ایرانی تقویم کو ترجیح دی تھی اور اسی پر عمل پیرا ہونے کے لئے دوسروں کو دعوت دے رہے تھے اور خود کو قدیمی

---

[۵] موبد یا موبد معنی حکیم، فلاسفر بھی ہوتے ہیں۔ لیکن عموماً اس لفظ کا اطلاق آتش پرست پارسیوں کے مذہبی مقتدا و امام پر ہوتا ہے۔ دستور کے معنی وزیر، یہ مجلس کے مدبر بھی ہوتے ہیں۔ لیکن فارسی مجوسیوں کے مقتدر کو عموماً دستور کا بھی نام دیا جاتا ہے۔

[۶] یزدی کی نسبت ایران کے مشرقی شہر یزد پر ہے جو ایک خاص قسم کے کپڑے کی مصنوعات کے لئے بہت مشہور تھا۔

کہتے تھے فرق محض ایک مہینہ کا ہندوستانی اور ایرانی تقویموں میں پڑتا تھا۔ بہت سے ہندوستانی پارسی ان تاریخوں کو جو ایران کے پارسیوں میں رائج تھیں۔ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ سورت کے پارسیوں کے گروہ کے ایک مقتدر بزرگ دھنجی شاہ ابن منچی شاہ نے کاؤس رستم جلال یعنی ملا فیروز کے پدر بزرگوار سے استدعا کی کہ وہ خود ایران جائیں اور معتبر اور قابل وثوق شہادتیں بہم پہنچائیں اور قابل یقین اطلاعات حاصل کرکے دوسروں تک پہنچائیں۔ یہ مشورہ قبول کرلیا گیا اور کاؤس پور رستم اپنے خردسال دہ سالہ فرزند پشوتن کو لے کر ایران "رہسپار" ہوئے۔

اس کے دو سال قبل کاؤس بن رستم نے مع اپنے خانوادہ کے بھڑوچ کو ترک کرکے شہر سورت میں ورود کیا تھا۔ "بازرگانانِ انگلیسی" کی جاذبیت انہیں کھینچ کر بمبئی لائی بمبئی سے ہی عازم سفر ایران ہوئے۔ ایران پہونچ کر "کودک پشوتن" نے تین سال یزد کے موبدوں بالخصوص دستور مرزبان پور دستور ہوشنگ سے "علوم مذہبی ژند و پہلوی و اوستا و فارسی" کی تکمیل کی اور ۱۱۴۱ یزدگردی میں منزل بہدینان (دین بہتر کے جائے قیام) پر پہونچے اور اردشیر پور بہرام سے خرم شاہ میں مزید علوم مذہبی کا استفادہ کیا۔ اپنے سفرنامہ میں ملا فیروز لکھتے ہیں ؎

ٹ معلوم ہوتا ہے کہ منزل بہدین کسی خاص جگہ کا نام تھا۔ یہ لفظ ملا فیروز اکثر اپنی مطبوعات میں لائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہترین دین سے اس کا استعمال کیا ہے مثلاً دو بہ دہ بہدآید زنجہ از بہدین و دستور کہ می باشند اہلِ ثروت و زور۔ زجد دنیان پسر گیرند و دختر و کنیز ہارا بہا زریخ۔ یہاں ایک اور لفظ جد دین کی ترکیب بھی قابل توجہ ہے۔ غالباً اس سے مراد مذہب پیشینانِ آبا و اجداد ہو۔

ث ایران کے ایک شہر کا نام۔

ز استادے ز بہزند خوانی — بہ پدر دندم ز روئی شادمانی
چہل و یک و ہزار و صد گذشتہ — آخر شد کہ در ایران نشستہ
بفرمان خدا نو زود گشتم — بہ اردیبیش آمدم آنجا نشستم
بیامد پیش من دستور ایام — بعلم و دین کمل مرزبان نام
بسی اندرز و پندم داد از دین — کہ جز نیکی تو اندرز دہر گزین

پہریزہیں "دورہ محصلات استانی" کو اتمام تک پہونچا کر ملا فیروز اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ عازم اصفہان ہوئے اور تین سال وہاں کے علماء سے درس لیتے رہے۔ نجوم، منطق، فلسفہ، حکمت، الہیات، صرف و نحو وغیرہ کتابوں کا بڑے انہماک اور عمیق نظر سے مطالعہ کیا۔ کمال کے حصول کے لئے بڑی کدوکاوش کی چنانچہ سفرنامہ میں لکھتے ہیں ؎

سہ سال اندر صفاہان شاد بودیم — ز ہر اندیشہ آزاد بودیم
بسی دیدیم از ارباب دانش — ز اہل علم و فضل و دید بینش
بسی اشراف دیدیم و بزرگان — بسی ارباب حال و اہل عرفان

اس زمانے کے پارسیان اہل ایران و ہندوستان کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

بیامد آمدی از ہند گر نام — بمن می گشت تلخ آں عیش و آرام
کہ بایستی از اینہا کرد دوری — میان جاہلاں کردی صبوری
ز اہل عقل و دانش دور بودن — دراں مردہ دلاں محجور بودن
و زان بے دانشان زینہار زینہار — مرا ہستہ از اینہا صحبت عار

— اگر نو کو زود سے علاحدہ کردیں تو نو کے معنی ہوں گے جیری فرد عازی۔ — ردیبیش یا اردیبیش کے معنی پارسیوں کے مجلس کا بورڈ یا تختہ یا تخرہ تھا۔ جہاں مذہبی رسومات کے لئے برتن رکھے جاتے تھے۔ — مرزبان سرحدی گورنر یا سردار و شاہزادہ کو کہتے تھے۔ لیکن افراد کے نام بھی مرزبان تھے۔ — اندرز بمعنی نصیحت و وصیت۔ صلاح و عظ و تنبیہ۔

صاحب فرزانگان زرتشتی اس ضمن میں لکھتے ہیں آری پارسیان کہ امروز بعلم و ہنر دور ، فرہنگ باستانی شہرہ آفاق واز ثقات معتبری باشند ۔ دراں عہد از زمرہ بہدانشان محسوب ۔ و زردتشتیان ایران نسبت بآنہا نسبت استادی می داشتند ۔ جارجنامہ جلد اول میں ملا فیروز نے کچھ اپنے متعلق اور کچھ ستائش ایران میں ابیات شامل کی تھیں جسے رشید شہروان مولف فرزانگان زرتشتی نے نقل کیا ہے ۔ لکھتے ہیں " با ایران رفتیم از ہندوستان ۔ زپر خار جنگل سوئی بوستان ۔ دو شش سال بودم دراں سرزمین ۔ کہ باداں براں بوم و بر آفریں ۔ ز مینش سراسر بود کان علم ۔ پرستش خداگوئی از کان علم بسی دیدم از دیر گام خرد ۔ کہ گفتی روانشاں خرد پرورد ۔ دل ہر یکے ہم چوں دریاز دُر ۔ تہی از خس جہل وز علم پر ۔ زہر گونہ دانش ہمہ مایہ ور ۔ بسیرت فرشتہ بصورت بشر ۔ سپردہ پریشاں ..... سروش ۔ کلید در دانش و رائے و ہوش ۔ دراں مدتم بخت دم ساز بود ۔ کہ چشم بہ دیدار شاں باز بود ۔

۴۵ روز کی دشوار گذار مسافرت کے بعد ان راستوں سے گذر کر جہاں کی مقامی زبانیں ان کے ایسے فاضل کے لئے بھی غیر الفہم تھیں باپ کے ساتھ بغداد میں وارد ہوئے اور حسن پاشا " فرمانداز شہر " کے مہمان ہوئے ۔ یہاں ملا فیروز نے السنہ ترکی و عربی میں مکمل مہارت حاصل کی ۔ تین سال بغداد میں مقیم رہ کر کرکوک موصل کی سیاحت کے لئے نکل پڑے ۔ بالآخر راہ بصرہ او بحر سے ایران کے بارہ سالہ قیام کے بعد وہ اوستا اور پہلوی علوم کے متبحر زردشتی عالموں سے سند لیکر سنہ ۱۷۸۰ء میں اور بقول صاحب فرزانگان زردشتی بروز انغند: ماہ امرداد سال سنہ ۱۱۴۰ یزدگردی بندر سورت میں وارد ہوئے اور خانۂ مالوف میں جا پہنچے ملا کاؤس بن رستم جلال کو پارسیوں کے قدیمی فرقے نے " صدر دستور " کا عہدہ پیش کیا ۔ جو قبول کر لیا گیا ۔ ملا کاؤس نے سنہ ۱۷۹۳ء میں اس عہدہ سے استعفا دے کر حیدرآباد دکن میں توطن اختیار کیا اور وہیں سنہ ۱۸۰۳ء میں فوت ہوئے ۔ ملا فیروز کو ان کے پدر بزرگوار کی جگہ قدیمیوں کے دستور کا عہدہ بالاتفاق انتخاب کے بعد پیش کیا گیا ۔ اب وہ قدیمی فرقے کے دستور اعظم ہی نہیں بمبئی کے پارسی قوم کے واحد اور واجب التعظیم رہنما بھی تھے ۔ بڑے وقار و منزلت

بہار اور آپ کے ساتھ اپنے فرائض مذہبی انجام دیتے رہے لوگوں کے دلوں میں اپنی سچی محبت و الفت کا بیج بوتے رہے۔

جب دستور کاؤس اور ملا فیروز ایران سے ہندوستان آئے تو بہت سے قیمتی اور نادر مخطوطات بھی ساتھ لائے ان میں دساتیر کا فارسی مخطوطہ بھی تھا جو اصفہان میں ان کے ہاتھ آیا تھا اور ایک مذہبی اور فقہی کتاب بھی دستیاب ہوئی تھی جس میں ۷۸ پرسشوں کے پاسخ تھے۔ ان سوالات وجوابات کا تعلق جن مسائل سے تھا ان سے کبیسہ مذہبی اور فقہی رسوم کے اختلافات پر روشنی پڑتی تھی "۷۸ روایات" کے نام سے یہ کتاب موسوم تھی۔ ایران سے مراجعت کے بعد ملا فیروز بمبئی میں مسکن گزیں ہوگئے اور اپنی ساری کائنات اور کل اسباب کو بروچ سے بمبئی میں منتقل کرلیا۔ سمندر کی راہ سے یہ چیزیں لائی گئیں۔ سفر بحر کے دوران میں جس جہاز پر سوار تھے اسے صدمہ پہونچا۔ اور بہت سی بیش قیمت اشیا جس میں کتابیں بالخصوص مخطوطات تھیں نذر بحر ہوگئیں خود ملا فیروز بال بال بچے اور بچنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ بہت اچھے اور ماہر تیراک بھی تھے۔

بمبئی میں مستقل طور پر قیام پذیر ہونے کے بعد ملا فیروز بقول صاحب فرزانگان زردشت بتدریس وتعلیم۔ بہدینان مشغول و در تبلیغ بہ تقویم قدیم مساعی ابراز و چندیں رسالہ در ثبوت حقیقت آں نگاشت و ہنگامہا برپا کرد جنگ قلمی و سخنی میں قدیمیاں و شاہنشاہی پارسیہا بوقوع پیوست ہر یک در حقیقت تقویم خویش کہ ہر دو بواسطہ عدم رعایت کبیسہ در اشتباہ ہستند دلائل ایراد و رسالہ نگاشتند۔ کبیسہ کے متنازعہ فیہ مسئلہ پر بڑی دھواں دار اور لگاتار بحث ومباحثہ حجت ومناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی کبھی گفت وشنید سے بڑھ کر خصومت ومجادلہ کی بھی نوبت آئی۔ بلوے اور فساد

۱۔ خوش عقیدہ بہدین دین آتش پرستوں کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہے اور قدیم کلنڈر (پتربوتھی جنتری بھی) کے پرچار میں اپنی کوششیں صرف کرتے رہے۔

بھی رونما ہوئے۔ کچھ جانیں بھی گئیں۔ لیکن ملا فیروز کی عظمت و بزرگی میں فرق نہیں آیا۔ انہوں نے کھل کر کافی نموداری کے ساتھ دلائل و براہین اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں پیش کئے۔ عملی طور پر اس تلخ و تند لفظی تحریری تکرار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن ہمیشہ اپنے مدمقابل حضرات کی تضحیک و تذلیل سے گریز کیا۔ اور کبھی بھی پوچ ولچر عامیانہ اور مبتذل الفاظ ان کی شان میں استعمال نہ کئے۔ ملا فیروز کو بمبئی کے گورنر کو فارسی پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس تعلق نے ملا کو اس عہد کے فاضل مستشرقین یورپ سے روشناس کرایا۔ دساتیر کا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ملا نے انگریزی ترجمہ کرایا۔ اس کے بعد اسے گجراتی زبان کا لباس بھی پہنایا۔ رشید شہمردان صاحب فرزانگان زرتشتی نے اپنی کتاب کے آخر میں دساتیر کی اہمیت اور آذر کیوان[۱۵] کے متعلق چند دلچسپ باتیں حوالہ قلم کی ہیں۔ منجملہ اور باتوں کے لکھتے ہیں کہ "فرماندار بمبئی جوناتھن ڈنکن" نے مشہور" دانشمند انگلیسی" سر ولیم جونس[۱۶] کے مقالات کا مطالعہ کیا تھا اور دساتیر کی طرف ان کی توجہ منعطف ہوئی تھی۔ "دستور ملا فیروز دانشمند معروف بمبئی و سرائندہ جارجنامہ" سے جو "اولیائے دولت انگلیسی" سے ربط وضبط رکھتے تھے۔ "در تفحص کتاب دساتیر امداد جست" ملا فیروز نے "نسخۂ خطی دساتیری" کو جسے ان کے پدر بزرگوار ایران سے اپنے ساتھ لائے تھے اور جو بقول ولیم ارسکین "نسخۂ مختصر و منفرد می باشد" "بنظر فرماندار رسانید" اسے دیکھ کر جوناتھن ڈنکن بہت مسرور و محظوظ ہوئے اور "دستور دانشمند" سے تقاضا کیا کہ اس کا ذکر کسی صحبت میں نہ کریں تاکہ اسے انگریزی جامہ پہنا کر بطور "بہترین ارمغان خاور زمین" ملکۂ انگلستان کو پیش کیا جا سکے۔ لیکن جوناتھن ڈنکن کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اتمام ترجمہ کے قبل ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ مارکوئیس ہسٹنگ کو یہ موقع

---

[۱۵] دبستان مذاہب کے اصل مصنف کے متعلق کچھ اختلافات ہیں۔ آذر کیوان اور اس کے بیٹے کا پٹنہ سے بہت تعلق تھا۔

[۱۶] بانی ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور مدیر ایشیاٹک ریویو۔

۱۸۱۴ء میں حاصل ہوا اور ارمغان دساتیر ملکہ کو نذر کیا گیا۔ دساتیر کے فرہنگ لغات کی تدوین دو جلدوں میں ۱۸۱۹ء میں مکمل ہوئی۔

گورنر جوناتھن ڈنکن نے یہ بھی سوچا ودیا کہ ملا فیروز ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے اقتدار کی بنا قیام اور فتوحات کے متعلق ایک سیر حاصل منظوم کتاب فردوسی کے مشہور شاہنامہ[۱۷] کے طرز و بحر میں تیار کریں۔ ملا فیروز نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور ۱۸۱۴ء میں جب جوناتھن ڈنکن فوت ہو گئے۔ اس کے قبل ہی یہ چھ ہزار ابیات منظوم کر چکے تھے۔ اس تاریخ کی تفصیلات خود جوناتھن ڈنکن نے بہم پہونچائی تھی۔ ان کی وفات کے بعد سر جون ارسکن نے ملا کا ہاتھ بٹایا۔ دساتیر کا ترجمہ اور جارجنامہ کی برطانیہ عہد کی تاریخ ہندوستان انہیں کے اشتراک عمل کے نتائج تھے۔ ۱۸۲۴ء بمبئی گورنمنٹ کی پرزور سفارش پر کورٹ آف ڈائرکٹرس نے چار سو روپیہ ماہانہ کا تاحیات وظیفہ ملا فیروز کے لئے منظور کیا تا کہ جارجنامہ مکمل ہو جائے۔ یہ وظیفہ تاحیات ان کو ملتا رہا۔ ملا فیروز کے برادر زادہ نے جو اُن کے جانشین بھی قرار دیئے گئے تھے۔ اس لئے کہ ان کو بجز ایک دختر کے کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ دستور رستم کیقباد ملا فیروز کے نام سے مشہور ہوئے اور انہیں نے جارجنامہ کے ہر سہ دفاتر کو ۱۸۳۷ء میں زیور طبع سے آراستہ کرایا اور ملکہ وکٹوریہ کے نام سے اسے مقید یا معنون کیا۔ رشید شہمردان لکھتے ہیں "جارجنامہ در سہ جلد چہل ہزار بیت از تالیفات عمدہ او ست کہ بخواہش جوناتھن ڈنکن آستاندار[۱۸] بمبئی سرودہ و مندرجاتش شرح فتوحات انگلستان در ہندوستان می باشد تالیف این کتاب در سال ۱۱۷۶ یزدگردی ۱۲۲۱ ہجری ۱۸۰۷ مسیحی شروع .... وتا وقائع سال ۱۸۱۶ میلادی ۱۱۸۶ یا ۱۲۳۳ ہجری شرح تسخیر پونہ را دارست۔ ملا فیروز جارجنامہ را در ہفتاد سالگی تمام نمود۔ کتاب مذکور پس از مرگ بتوسط برادر زادہ اش ملا رستم کیقباد در سال

۱۷۔ جارجنامہ دراصل فردوسی کے شاہنامہ کے طرز پر اور بحر متقارب میں منظوم کیا گیا۔

۱۸۔ استاندار۔ مالک جناب و علیز سلطنت = گورنر

۱۲۳۷ میلادی طبع رسید"۔

ملا فیروز ایک مختصر علالت کے بعد ۱۸ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو راہی عالم بقا ہوئے۔ بڑے عزت و احترام سے جنازہ اُٹھا۔ بمبئی کے ہر طبقے قوم و ملت کے افراد نے خراج عقیدت پیش کیا اور صدق دل سے سوگوار ہوئے۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب، شاعر، فاضل محقق اور منجم عالم تھے گو وہ انگریزی میں نہ لکھ سکتے تھے نہ بول سکتے تھے لیکن کئی زبانوں پر انہیں عبور تھا۔ از علم نجوم بہرہ وافی داشت علم و فضل و ہنر کی وجہ سے بڑی وقیع شخصیت کے حامل تھے۔ ایرانیات کے ہر شعبہ پر حاوی تھے۔ نہایت حسین و وجیہہ صورت پائی تھی۔ جسمانی حیثیت سے بھی ان کی ہستی بڑی شاندار تھی۔ طبعاً نہایت خوش اخلاق اور منکسر المزاج ہونے کے باوجود اپنے اصول کے بڑے پکے اور مناظرہ و مباحثہ میں اپنے دلائل کو بڑی بے باکی سے پیش کرتے تھے۔ اور اٹل رہتے تھے۔ مزاج میں ایک گونہ وارستگی تھی "جمع بارو نیہ" کی فکر نے کبھی انہیں نہیں ستایا "خوابگاہش بوریا و بسترش تختۂ چوب و خوراکش بقدر چند مثال بود"۔ اللہ مغفرت کرے اور ان کی روح پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ آمین۔

آخر میں ملا فیروز کی چند تصنیفات کا بھی ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دساتیر کے گجراتی ترجمے فرہنگ لغات دساتیر اور جارج نامہ کی طرف اشارات کئے جا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مسئلہ کبیسہ پر انہوں نے کئی مختصر رسالے اور پمفلٹ لکھے اور انہیں شائع کیا۔ ایران کا ایک منظوم سفرنامہ بھی لکھا۔ پند نامہ فیروز اور تقریباً ۳۰ اور کتابیں جو مذاہب مختلفہ کے متعلق تھیں تصنیف کیں۔ بہت سی مناجاتیں بھی لکھیں۔ رباعیات اور قصائد اور دوسری منظوم کتابیں فارسی میں حوالہ قلم کیں۔ ان کے مناجات آج بھی پارسیوں کے ہر دو طبقے کے ورد زبان رہتے ہیں۔ اور عبودیت پرستش عبادت و ریاضت کے مواقع پر ان کا استعمال ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ادلۂ قویہ بر عدم جواز کبیسہ در شریعت زرتشتیہ مطبوعہ ۱۸۲۸ء "رسالہ استشہاد" متضمن مسائل پرستشہاد یا سنجہا مختصر رد جواز بزبان گجراتی در موضوع کبیسہ و تقویم۔ دین خرد وغیرہ کے نام رشید شہمردان نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں۔

جارج نامہ کا پہلا اور تیسرا دفتر تو عسیر الحصول ہے دوسرا دفتر بھی کافی ضخیم ہے۔
۷۰۲ صفحات جس کے صفحے میں کم و بیش ۲۱ سطور ہیں تقریباً چودہ ہزار سات سو ابیات پر مشتمل
ہیں اور آخر میں ۵۳ صفحات کی جلد دوم کی ایک خاصی لمبی فہرست بھی ہے۔ اتنی بڑی منظوم
کتاب کا ایک مختصر مضمون میں جائزہ لینا آسان کام نہیں ہے۔ محض چند ضروری قابل ذکر امور
کی طرف ہی قارئین معاصر کی توجہ منعطف کی جاسکتی ہے اس بھاری بھرکم کتاب کی تدوین سے
متعلق اوپر کچھ عرض کیا جاچکا ہے۔ آنریبل جوناتھن ڈنکن بمبئی کے گورنر عادتاً اس وقت کے
ہندوستانی عالموں اور افاضل سے ملنا جلنا اتفاق و اشتراک بہت پسند کرتے تھے اور
ان کے کمال علم و فضل کے معترف تھے۔ ملا فیروز کے شاعرانہ جوہر اور ذہنی اوصاف کے بڑے
مداح اور قدردان تھے۔ فردوسی طوسی کے مشہور شاہنامہ سے جو تقریباً ایک ہزار سال عیسوی
میں قدیم ایرانیوں کی داستان پاستان کی تاریخ کے طرز پر منظوم ہوئی تھی۔ بہت
متاثر تھے۔ ملا فیروز سے اپنی خواہشات کا اظہار کیا کہ وہ شاہنامہ فردوسی کی متقارب زمین وزن
میزان قافیہ اور بحر متقارب کو اپنائیں۔ اور ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت کے قیام و
فتوحات کی تاریخ منظوم کریں جو آغاز اقتدار سے ہز مجسٹی جارج سیوم کے اواخر ایام تک
کی مکمل تاریخ ہو۔ ملا فیروز نے پہلے تو انکسار و عجز سے بہت کام لیا۔ اور یہ اہم ذمہ داری
قبول کرنے سے انکار کردیا لیکن ڈنکن صاحب کے اصرار ہمت افزائی اور ضروری مواد کی
فراہمی پر آمادگی رنگ لائی اور بالآخر سر تسلیم خم کردیا۔ اور اس کام کو بہ حسن و خوبی انجام دینے
لگے جب ملا فیروز نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا تو جوناتھن ڈنکن صاحب نے اپنی دلی مسرت و
طمانیت کا اظہار کیا۔ اور نہ صرف اس وقت تک کی شائع شدہ کتب تواریخ اور اولین ماخذات
کو بہم پہونچایا بلکہ ان کے اقتباسات بھی سنائے۔ انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخوں اور
دفاتر ان کے پاس پہونچ گئے۔ فارسی میں لکھی ہوئی تاریخوں پر تو خود ملا کو دسترس حاصل تھی
لیکن انگریزی زبان سے وہ کماحقہ واقف نہ تھے۔ اس لئے دوسروں سے مدد لینی پڑی پڑھائی
جاری رہی۔ ملا سنتے اور قلم بند کر لیتے یہ سلسلہ گورنر الفنسٹن اور سر جارج مالکم کے عہد حکومت

تک جاری رہا۔ انگریزی حکام اور برسر اقتدار حضرات ملا کے کام کو بڑی پسندیدگی سے دیکھتے اور ان کی کھل کر سراہنا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ منظوم تاریخ ۱۸۱۷ء تک کے واقعات اور انگریزوں کی تسخیر پونہ اور مرہٹوں کی شکست و متابعت تک جا پہونچی جب ملا نے یہ تاریخ مکمل کی تو وہ ستر برس کے بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی سب سے بڑی تصنیف "میگنم اوپس" کو زیور طبع سے آراستہ اور شائع شدہ حالت میں نہیں دیکھا ان کے مرنے کے بعد سات سال بعد ان کے برادر زادہ اور جانشین ملا رستم بن کیقباد نے ۱۸۳۷ء میں بمبئی کے ایک لیتھو پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

پیش نظر دوسری جلد کا آغاز حمد و نعت "بعثت انبیاء" اور "دعا بر بادشاہ انگلستان "جارج شاہ" سے ہوتا ہے "آغاز دفتر دوم" ان اشعار سے ہوتا ہے ؎

بنام نگارندۂ دو جہاں | برآرندۂ آشکار از نہاں
شب و روز تاریک و روشن از دست | پر از خار و گل راغ و گلشن از دست

کبیر اور صائب کی طرح ملا فیروز کہتے ہیں کہ منزل تو ایک ہی ہے راستے مختلف ہیں۔ کبیر کے اکھراوٹ میں ہے "بدھنا کے مارگ ہے تیستے۔ سرگ نکھت رواں جیتے" اور صائب نے فرمایا ؎

گفتگوئے کفر و دیں آخر بہ یکجای کشد | خواب یک خواب است با مختلف تعبیر ہا

ملا فرماتے ہیں ؎

گر ایزد پرستی گر بت پرست | بود از مئے یاد او ہر دو مست
بتخانہ و خانقاہ ہر دو ادست | براہی کند ہر کسی یاد دوست
جدا نیست نزدیک دانندہ کس | ز بانگ موذن نفیر جرس
اگر کعبہ بیت مقدس بود | در آں یاد آں ذات اقدس بود
بہ مسجد درون شیخ و راہب بدیر | نیارد بجز یاد او یاد غیر

انبیاء کے متعلق فرماتے ہیں ؎

پیمبر بیامد بگیتی بسے — از ایشاں پذیرفتہ رہبر کسے
ہمہ بودہ اند از خداوند پاک — نمائندہ راہ بہ تیرہ خاک
ہمہ را بود رو بیک آستان — جداگانہ گفتار و یک داستان

اپنے عقیدہ پر محکم لیکن بڑے وسیع القلب اور روادار تھے کہتے ہیں ؎

مرا گرچہ زرتشت پیغمبر است — بہ نیکی ز کردار بد رہبر است
بفرمان پاکش نہادہ دو گوش — بہ بینش سپردہ دل و جان و ہوش
جز او نیز پیغمبران بودہ اند — بمردم رہ راست بنمودہ اند
نگویم بود ایں بہ و آں زبوں — بپایہ بود ایں کم و آں فزوں

بادشاہ انگلستان کے متعلق فرماتے ہیں :-

بماناد خرم دل جارج شاہ — خداوند دیہیم و اورنگ و گاہ
بجز از فرانس کسے دشمنش — نباشد کہ آتش بسوزد تنش

آغاز داستان کے وقت اپنا کیا حال تھا کیا عمر تھی اس کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں ؎

چو شد روزگار جوانی ز دست — بہ پیکر ز ہر سو در آید شکست
مرا سالہا رفت پنجاہ و پنج — توانا تنم ناتواں شد ز رنج
دو دیدار خیرہ شد و سست پائی — نیارم کہ آساں بجنبم ز جائی
ہر آنگہ کہ کافور شد مشک موئی — بپژمرد از سرو پش رنگ روئی
رود از گل خرمی بوئی و رنگ — بباغ جہاں نیست جائی درنگ

اس عمر اور حالت میں اس کام کا بیڑا اٹھایا ؎

بلفظ دری ز انگریزی زبان — بیارم بپایاں برم داستاں

امید کرتے ہیں کہ ؎

گر ایں رنج را نیست کس خواستار — بماند ز من در جہاں یادگار
ز گیتی کسے برد انجام نیک — کہ بگذاشت از خویشتن نام نیک

معلوم ہوتا ہے کہ جلد اول کے اختتام کے بعد بوجوہ ملا کافی ہمت ہار بیٹھنے لگا تھا کیونکہ ؎

نہ کس یار و یاور نہ کس مہربان   نہ کس را یکے آفریں بر زبان
بریں داستاں کس نہ نہادہ گوش   مرا گشتہ زیں غم سراسیمہ ہوش

سوچنے لگے ؎

زبان سرایندہ بستہ بکام   کنم توسن گفتگو را لگام
بیندازم از کف کمان سخن   نرانم نشاں بر نشان سخن

ایسے ہی وقت میں ان کے ایک خردمند یار غم خوار ؎

خشیوار را نام میسٹر تیلر   پر از مہر جان و پر از داد سر

تشریف لائے سمجھایا ؎

بد و نیک گیتی ہمی بگذرد   چرا غم خورد آنکہ دارد خرد
جہاں ندار دار ندۂ آب و خاک   کز و بست امید و زو بست باک
بیکساں ندارد کسے را ہمیش   برو اندہ و شادی آرد بپیش
گمانم کہ رنج تو آید بسر   شوی شاد از سخنش داد گر

اس کے بعد مسٹر ٹیلر نے اپنی خدمات پیش کیں ؎

مئی داستان زمن نوش کن   ز دل یکسرہ رنج فراموش کن
ز آب سخن طبع سادہ تری   نشان در زمانہ درخت دری
کہ تا جاودان میوہ آرد ببار   نہ گردد کہن در کہن روزگار

ملا نے کہا ؏ گذارش کن آنچہ بود رای دکام ؎

بگو تا کدام است آں داستاں   بیار و بخواں از گہ باستاں
ز شادی لب بستہ بن باز کرد   ز گفتار بنگال آغاز کرد

۔ اس کے بعد "ذکر وفات علی فریدی مہابت جنگ و جلوس سراج الدولہ"

سے داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ "اسباب انہدام دولتِ چندیں سالہ" پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ سب سے پہلے شاعر اور مورخوں کی طرح غیر جانبداری اور راست گفتاری کا دعویٰ کیا جاتا ہے ؎

نہ باشد مرا شیوہ جز راستی ‌ ‌ نیارم بگفتار در کاستی

ز بیداد و داد آنچہ یاد آورم ‌ ‌ بگویشم کہ در ہر دو داد آورم

نگویم بد و نیک را نیک و بد ‌ ‌ کہ نبود پسندیدہ نزد خرد

سزاوار ہر کس بگویم سخن ‌ ‌ خوشامد نیارم ز سر تا بہ بن

بود راستی نزد ہر کس پسند ‌ ‌ بود مردم راست گو ارجمند

نہ با ہندیان و نہ با انگریز ‌ ‌ بورزم رہ مہر و رسم ستیز

اگر درد بینم ز کس از ستم ‌ ‌ نپوشم نہ گویم بجز بیش و کم

نہ ام بندہ مردم چاپلوس ‌ ‌ پسندم بگفتن فسون و فسوس

ہر آنکس بریں نامہ بر بگزرد ‌ ‌ مبادا کہ از راستی بد برد

سخن بشنو از گردش روزگار ‌ ‌ کز و گاہ دی آید و گاہ بہار

سنانے اور لکھنے والے دونوں کے آپسی اقرار و یقین دہانی کے بعد "جنگ و بہار" کے پر آشوب زمانہ کار اور علی وردی خاں کی "نیکی و داد" اور اس کی بروز نہم اپریل "شش و پنجہ د ہفت صد یا ہزار (۱۷۵۶ء) وفات اور اس کے دختر زادہ محمد سراج الدولہ کی جانشینی کا ذکر کرتے ہیں ان چند اشعار سے ان کی سراج الدولہ کی نا اہلیت کی رائے کی غمازی ہوتی ہے ؎

بزرگی گوہر نیاید بکار ‌ ‌ خرد باید و دانش استوار

ز دانای طوس ایں دو بیت چو زر ‌ ‌ چو زر بلکہ بہتر بود از گہر

بہ تضمین در ایں نامہ ارجمند ‌ ‌ بیارم کہ باشد فراواں پسند

بزرگ ہمہ دانش آہنگی است ‌ ‌ بچو باشد سبکسر بباید گریست

تہی سر چو از بردباری بود ‌ ‌ ہمہ زندگانی ز خواری بود

اس کے بعد نوعمر نواب کے عہد حکومت کے تفصیلی حالات ہیں مثلاً مسٹر ڈرایک گورنر کلکتہ کو مراسلہ بھیجنا کہ کشن گنج پسر راج بلبھہ کو روانہ کردیں، گورنر کی خاموشی بلکہ پیغام رساں کو نکلوا دینا، مسٹر واٹسن کو تھی دار قاسم بازار کو تہدیدی خط اس کا جواب قلعہ کلکتہ کی مرمت و درستگی پر نواب کی مسٹر ڈرایک کے خلاف برہمی قاسم بازار پر قبضہ، قلعہ کلکتہ سے ڈرایک کا بعد شکست فرار، ہولویل اور نواب کے درمیان مکالمہ "محبوس شدنِ ہولویل با اسیران سپاہ و شرح لقب آں تیرہ روزان دراں شب سیاہ۔"

بہت سی جزوی باتیں اور تفصیلی واقعات جو عام تاریخوں میں نہیں ملتے اور جس کے متعلق خاص طور پر باخبر حضرات کی واقفیت بھی واجبی ہی ہے۔ جارج نامہ سے واضح ہو جاتے ہیں "سانحہ ہائلہ کلکتہ" جسے انگریزوں نے "بلیک ہول ٹریجیڈی" کا نام دے رکھا ہے بیرونی اور داخلی مورخین کے درمیان ایک مختلف فیہ اور متنازع مسئلہ بن گیا۔ ہم عصر فارسی تذکروں میں اس کا ذکر مفقود ہے لیکن یوسف علی نے جن کی تاریخ سے صاحب سیر المتاخرین نے بھی استفادہ کیا تھا اس کی طرف اشارہ کیا ہے، ملا فیروز نے جو کچھ انگریزوں سے سنا قلمبند کردیا۔ جس کوٹھری میں انگریز قیدی حبس النفس کے شکار ہوئے اس کے طول و عرض کے متعلق لکھتے ہیں ؎

دراز او بپہنای جائے زبوں   زدہ گر نبودہ شنیدم فزوں

تعداد اساری بتاتے ہیں ؎

صد و چل و شش نیز مردان جنگ   چہ از بوم ہند و چہ بوم فرنگ
کہ در دست بنگالیاں بد اسیر   ہمہ را دل از زندگی گشتہ سیر

قیدیوں کی زبوں حالی "تنگی جا" "تابِ ہوا" رہائی کی ناکام کوششوں شدت عطش سے جاں بلب ہونے اور بالآخر گرکر دم توڑ دینے کا حال حوالہ قلم کرتے ہیں ؎

اسیران فتادند زندہ بگور   ہوا گرم و تفتہ لبان تنور
بجز جنگ خورشید نمودہ جائے   چو دوزخ سراسر پر آتش ہوائے
نبارم شمرد آنچہ سختی گذشت   شب تیرہ و تیرہ بختی گذشت

در تنگ زندان و تاریک جائے   نیارست جنبانذ کس دست و پائے

در آں تنگ زندان گرفتہ بدست   ہمی ہر کسے خواستن آں شکست

بسی زور کردند تا بشکنند   مگر سر ز تیمار گشتی رہد

نہ جنبید دروازہ از جائے خود   نہ برداشت از جا نگہ پائے خود

ایک پاسبان کو ہولویل نے رشوت دینی چاہی۔ ایک ہزار روپیہ کی پیش کش کا وعدہ کیا۔ اس مرد کہن نے معذوری ظاہر کی ؎

بگفتش کہ نواب رفتہ بخواب   بآرام از رنج کردہ شتاب

بالآخر افغان پاسبان کو اس کے حال زار اور شدت تشنگی پر رحم آیا۔ ایک مشک پُر آب لائی گئی ایک پر دوسرا ٹوٹا پڑتا تھا۔ بہت سے پانی کے پیتے ہی جاں بحق ہو گئے ؎

دو ساعت چو بگذشت از نیم شب   بسی را ز تن جاں بیامد بہ لب

بزندان درون زندہ بیچارہ کس   بماند و ز گرمی ہمی زد نفس

آج کل کے قوم پرستوں کے برعکس سراج الدولہ کا تصور نہ صرف اس کے معاصرین انگریز بلکہ اکثر ہندوستانیوں کا بھی اچھا نہیں تھا۔ ملا فیروز بھی اسے پیمان شکن اور کینہ جو سمجھتے تھے۔ اس کی توجیہہ بھی کی ہے بقول شاعر نواب نے ہولویل سے بعد مکالمہ کہا تھا ؎

ز من ہیچ ناید بتو بر گزند   نہ کشتن نہ خستن نہ زنجیر و بند

گذشت آنچہ بگذشت در گاہ کین   سپس زیں بتو نہ سپرم راہ کیں

بآرام بنشیں تو برجائے خویش   نہ استادہ برجا دنت کس بہ پیش

لیکن ؎

ز نزدش چو برگشت آن مستمند   کشادہ بخود دید زندان و بند

سپاہ بداندیش از پیش و پس   شدہ مرغ جان و راہیاں قفس

کال کوٹھری سے نکلنے کے بعد ؎

ہر کس ز انگریزاں کہ نامی بدند   بپایہ بزرگ و گرامی بدند

یکی مول ویل دیگرے کرٹ نام سیوم والکٹ مرد با نام و کام
بفرمود زنجیر بستن بپائی دیگر بندیان را نموده رہائی
بہ مقصود آباد ان ہر سہ تن فرستاد سالار پیمان شکن
پراگندہ شد لشکر کینہ جوئی بتاراج در شہر بنہاد روئی

دیگر تفصیلات بہ شمول تاریخ روز و ماہ دلچسپی سے خالی نہیں، ملّا نے میر جعفر کی سرکردگی میں اس سازش کی بھی قلعی کھولی ہے۔ جس کے سرگرم افراد دلب رام دیوان نواب، جگت سیٹھ، پتر داس ارمنی، امی چند وغیرہ تھے ؎

بر آں نامجو میر جعفر بنام شدہ با خداوند بد رائے و کام
جفا جوئے گشتہ بپروردگار بدی جائے نیکی بیاوردہ بار
پسندیدہ بہر بزرگی و نام خداوند خود را فگندن بدام

اپریل کے مہینے میں دو ہفتہ تک واٹسن اور ارمنی پتر داس کے ذریعے کرنل کلایو اور میر جعفر کے درمیان رازدارانہ طور پر نامہ و پیام ہوتا رہا۔ مئی میں کونسل نے طے کیا کہ "بالمعیت سرداران منافقان بالشکر انگریز نواب را از جانب خود بلطائف الحیل متسلی دارند" ۶ مئی کو طے ہوا ؎

اگر بخت و بازوی کند آوری بما و بہ جعفر کند یاوری
بگنجینۂ کمپنی یک کرور دہد روپیہ از غش و چرک دور
ز انگریز بدیہ بہتران سپاہ ہمہ از تن بتن لشکر کینہ خواہ

طامع زر امین چند سے انکشاف راز کا خوف تھا ؎

چو آمد ششم روز از ماہ مئی بیامد فرستادہ آلودہ خوئی
بدست اندرش نامۂ انگریز زعہد و زپیمان جنگ و ستیز
بسی نیز خواہش دراں کردہ یاد بیاورد و نزدیک جعفر بنہاد
پسندیدہ چوں چہرہ بد دید آنز ہمہ خواہش از کوتہ و از دراز
مرا نامہ راز زود پاسخ بنشت بدانستہ نیکو چناں کارزشت

فراوان سخن ہم سفارش بسی | کزیں راز آگہ نگردد کسی
بوبژہ امیچند زیں زینہار | گر آگہ شود زود شود سخت کار
کند آشکارا ہمہ راز ما | چو بانگ دہل سازد آواز ما
بہ نزد کہ دمہ کند آشکار | بر آشوب ما را کند روزگار
ہمہ شاخ امید بے بر شود | درخت تنم نیز بے سر شود
رسد زیں بہ نواب گر آگہی | زجانم کند کشور تن تہی

اس کے بعد کلایو اور واٹسن نے امیچند کو جو جکما دیا اور جس کا ذکر اور مورخوں نے بھی کیا ہے۔ اس کے بارے میں ملا فیروز نے بڑے شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ امیچند نے ساری اطلاع سازش کی حاصل کر لی تھی۔ مسٹر واٹسن سے اس نے کہا ۔

زگنجینۂ مہتر نامور | بیامد بدست شما سیم و زر
زہر صد اگر بہرہ بد مید پنج | شمردہ بمن نیم و درد و رنج
ہماں نیز از زیورش چار یک | سپارید پنہاں نہ بنمودہ یک
ہمو شم من ایں راز در دل چو گنج | بدارم نہاں تا نیابید رنج
دگر آنچہ گفتم نیاید بجائے | بنزد سراج آنجہاں کدخدائے
کنم آشکارا سراسر سخن | نمانم نہاں ہیچ از بیخ و بن

جب واٹسن نے یہ سنا اس کے جوش جاتے رہے، مصلحتاً بجائے تندی کے زبان نرم اختیار کرنا پڑا ۔

رمید و دلش را بخود رام کرد | مر او را بدیں دانہ در دام کرد
بگفتش بہ نزد بزرگان خویش | نویسم سخنہات بے کم و بیش
زر و زیور آنچہ زمن خواستی | چنیں نیک خواہش بیاراستی
بہ بہر تو چیزیکہ ایشاں پسند | نمایند آں چیز بے چون و چند
تو لب بستہ دار و خموشی گزیں | کہ تا گنج یابی بسی آخریں

(صف ۸۳) ۱۷ مئی کو انگریز "مہتران انجمن" کی نشست ہوئی، میر جعفر سے لین دین کی باتیں طے کر دی گئیں اور امیچند کے بارے میں فیصلہ ہوا "محروم ساختن اورا از خواہش" اور "خدعہ نمودن با او" ؎

بدو داد او جائیداد بزرگ — کہ از گوسپندی نگردد چو گرگ

بہ جعفر چوں پیمان تاوان کنیم — دو نامہ بنوشتہ زپیمان کنیم

بود زاں یکی راست دیگر دروغ — یکی شہد صافی دگر گندہ دوغ

بیک را امی چند نا کردہ یاد — نویسم زاں انکہ زیبد نزداد

دیگر نامہ را از گزاف و دروغ — نویسم بہر تا بیابے فروغ

دراں از امی چند نام آوریم — سرش را بدستان بدام آوریم

بدو نیز لک روپیہ بیست بار — دہد میر جعفر چو شد راست کار

امیچند چوں بنگرد نام خویش — دراں نامہ بنوشتہ برکام خویش

تو اس کی خوشی کا ستارہ آسمان کو چھونے لگا، لہٰذا ؎

دو نامہ زخامہ نمودہ نگار — یکی استوار و دگر سست و خوار

بیارائت ذیل کلیف (کلایو) گزیں — بخط خود آں نامہ جائی نگیں

ببردہ بنزدیکی واٹسن — کہ او ہم نویسد خط خویشتن

واٹسن سے جب یہ سب کہا گیا۔ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا ؎

برآشفت زاں رنگ دستاں وریو — فرشتہ پسند و کجا کار دیو

چنیں گفت ہرگز فریب و دغا — رود گر سرم من ندارم روا

زمن کے پسندد جہاں آفریں — زنم گر بریں نامہ مہر و نگیں

صرف نامہ صحیح پر اپنی دستخط ثبت کی ؎

برآں نامہ راست آں راست کیش — نبشت از رہ راستی نام خویش

نہ بنوشت چیزی برآں خط زور — نشد آشنائی فریب و غرور

دل و جاں خود کردہ گرزاں کلیف　　بمکر و فریب و بدستاں حلیف

ایک شخص سے واٹسن کے خط کی جعلی تحریر کرائی اور اس بیہودہ نامہ سست و خام سے کام لیا گیا ۱۹ مئی کو دونوں تحریریں بھیجدی گئیں ؎

زمئی ماہ چوں روز شد نوزدہ　　رواں کرد آں ہر دو نامہ برہ

(صفحہ ۱۶) بعد کے تفصیلی حالات کو ہم نظر انداز کرتے ہیں، جس میں سب سے اہم واقعات یہ ہیں۔ قاسم بازار کی کوٹھی سے مسٹر واٹسن WATTSON کا ۳ جون کو خفیہ طور سے فرار، ۱۶ جون کو کلایو کا ملکی اور کٹوہ پر اختیار جمالینا، کٹوہ سے پلاسی پہنچنا، ہراس زدہ سراج کی میر جعفر سے درخواست استعانت، اس کی خدا اور رسول کو گواہ کرکے بزبان فریب تسلی یقین دہانی، نوجوان نواب کا اپنے دیوان دلب رام کو بلانا "ہمی جست او چارہ جوجان خویش" اس ناسپاس سے بھی مایوس ہو جانا، پلاسی کی جنگ میں نواب کی شکست، ۲۴ جون کو "مستورات و مخزونات" کے ساتھ نواب کا مرشد آباد سے نکل بھاگنا، پکڑا جانا اور ان کے ہاتھوں شہید ہونا ہے۔ شاعر کے تاثرات کی جھلک کسی حد تک اس کے الفاظ اور انداز بیان سے ملتی ہے۔ مثلاً دلب رام کی غداری کی طرف اشارہ کرکے لکھتے ہیں ؎

بد اندیش بدرائی بد روزگار　　براہ بدش گشت آموزگار
برآں بندہ لعنت ہزاراں ہزار　　کہ گردد بد آموز پروردگار

(صفحہ ۱۳)

برآں بندہ لعنت ز یزدان پاک　　کہ آلاید آب وفا را بخاک

(صہ ۱۱۱)

میرن، ہنٹر نیک خواہ کی تعریف کرتے ہیں صہ ۱۱۱ ایڈمیرل واٹسن کی وفات جو ۱۶ اگست ۱۷۵۷ء کو واقع ہوئی اشارہ کرتے ہیں ؎

سر راستاں واٹسن میر بحر　　ز گیتی بریدہ شدش بخش و بہر

(صہ ۱۲۲)

میر جعفر اور میرن باپ بیٹے میں سراج کے حبس وقتل کے معاملہ میں سخت اختلاف تھا۔ جب تن پرست باپ اسی خوابگہہ میں چلا گیا۔ اس کے درون تیرہ، خیرہ قومی، بدخو، بدتن، تہی حقیر، ہرزہ دار، زادہ دون نہاد درشت کی بن آئی ایک شخص کو زندان شوم میں بھیجا ؎

دلش تیرہ دہرد و دیدہ کبود — چناں زشت روکش بگیتی نبود
بداندام و بالا و چوں خوک روئی — چو خرس ہمہ تن نہاں زیر موئی
بزنداں شداں دیو خنجر بمشت — فرشتہ رخ نامور را بکشت
گلی نو رسیدہ زباغ مہی — شگفتہ زبستان فرماندہی
زگلبن فرو ریخت ناپاک رائی — بروزرخ ورا باد پیوستہ جائی
بیفگند از پای تازہ نہال — گذشتہ بروزندگی بست سال
زفرماندہی رفتہ سال وسہ ماہ — شد از زخم بیداد ذکر تباہ

(صہ ۱۳۳)

یہ چند باتیں بطور نمونہ از خروارے پیش کی گئیں۔ جارجنامہ جو شاہنامہ انگریزاں بقلم یکے از پارسیان ہے، کسی ہمعصر ہمعہد یا معاصر مورخ کی کتاب نہیں ہے۔ فردوسی کے شاہنامے کا وزن و بحر اور اکثر ردیف و قافیہ طرز تحریر سبک و اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے لیکن اس کے جیسے بے سرو پا قصے کہانیاں دیو مالائیں محض داستان و افسانے نہیں ہیں بلکہ فیروز کبھی کبھی دانائے طوس کا نام ہی نہیں لاتے بلکہ ان کے حسب حال ابیات کو بھی اپنے اشعار میں چسپاں کر دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

چہ خوش گفت دانندۂ ہوشیار — سخن سخت بہتر در آغاز کار
نخست آنکہ راند ہنر بی سخن — بانجام تا بگذرد لب خویشتن

(صہ ۱۹۴)

فردوسی کا شاہنامہ تاریخ نہیں لیکن ملا فیروز کا جارجنامہ تاریخ ہے۔ یہ اور بات

یہ اور بات ہے کہ اس میں کوئی نئی بات' تاریخی انکشاف کا اضافہ نہیں پایا جاتا۔ وہی سب کچھ ہے جو پچھلے لوگ ملکی یا غیر ملکی حضرات لکھ چکے تھے' لیکن یہ کیا کم ہے کہ جو باتیں مختلف کتابوں کی دفاتر میں بکھری چھتری پڑی تھیں۔ وہ سب ایک جگہ نہایت منظم اور مربوط صورت میں بقیہ تاریخ تین ضخیم جلدوں میں نہایت سادہ سہل الفہم لیکن ادبی زبان و بیان کے ذریعہ ہمارے لئے مہیا کر دی گئی ہیں۔

اب رہا شاعر کا دعویٰ جس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے ؎

بیارم دریں نامہ بیکم و کاست ــ نہ گویم گزافہ بجز گفت راست (ص۱۰)

تو گو یہ بہت کچھ ان غیر ملکیوں کے فراہم کردہ مواد کے لئے رہین منت تھے' لیکن انہوں نے اپنی انفرادیت اور ذاتی معلومات فکر و مطالعہ کو کہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے اور بہت سے وسیع القلب آزاد طبع عالی دماغ بلند حوصلہ پیش رو انگریز مورخین کے تاثرات' حالات' استدلات اور تنسیخ' تخلیق اور تبصرے ملتے جلتے ہیں۔ انہوں نے کسی کی نقالی نہیں کی ہے۔ بلکہ اپنے طور پر انہیں نتائج پر پہونچے ہیں جن پر پیچھے جانے والوں نے نقش قدم چھوڑا تھا۔ ملا فیروز انگریزوں کے دوست تھے۔ ان کے ہاتھوں بکے نہیں تھے۔ آج کل کے بہت سے لوگوں کے برعکس حکمراں جماعت کے اشخاص یا حکمرانوں کی ناحق باتوں کی ہمنوائی اور بیجا پذیرائی' خوشامد' چاپلوسی' للو پتو کا شائبہ کبھی اس بھاری بھر کم کتاب میں کہیں نہیں ملتا۔ تاریخی حیثیت سے اس کتاب کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے اس لئے کہ اس کے مواد منقول اور استخراجی ہیں۔ بنیادی اولین اور اصلی اور مشاہدہ یا ذاتی واقفیت معلومات پر مبنی نہیں ہے۔ لیکن ساری کتاب بہت دلچسپ' پُر از معلومات اور دوسری خصوصیات کی وجہ سے جاذب نظر ہے۔ اس کی ادبی خصوصیات پر تو صاحب صلاحیت اہل علم و ہنر حضرات ہی ایک سیر حاصل مقالہ تیار کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی ایسے فاضل ادیب اور شاعر آمادہ ہو جائیں تو راقم السطور انہیں اپنا مملوکہ نسخہ دفتر دوم مستعار دے سکتا ہے۔

شمالی ہند کے صوفیائے کرام کی ہندی دوستی

خردہ بین اور تنگ نظر حضرات اسلامی تصورات و افکار کا اندازہ مسلمانوں کی حکومت کے عروج و زوال اور بادشاہوں کے اعمال و افعال اچھائیوں اور برائیوں سے لگاتے ہیں وہ اس بات کو عمداً نظر انداز کر دیتے ہیں کہ سلاطین کے سیاسی خیالات اور طرزِ عمل ذاتی اور دنیاوی اغراض سے ملوث ہوتے ہیں زور اور زبردستی سے تسخیر قلوب نہیں کی جا سکتی۔ اسلام کی ترقی اور اشاعت زیادہ تر ان بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کی رہین منت ہے جو اپنے اخلاق پسندیدہ خلوص عقیدہ و عمل اور میل جول کے میلان سے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ تلوار کا زور اور سیاست کا دباؤ تو سب سے پہلے ان خطوں پر پڑنا چاہیے تھا جو مسلمانوں کے دار الحکومتوں اور آس پاس کے علاقوں پر مشتمل تھے لیکن ایسا کہیں نہیں ہوا تاریخ کے اوراق کی چھان بین اور مختلف مقامات کے تناسب آبادی پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ دورِ اولیں کے روحانی پیشوا آج کل کے بہت سے خانقاہ نشینوں کی طرح عوام سے بے نیاز و بے تعلق نہ تھے ہر قسم کی صعوبتوں کا سامنا کرتے، بیشتر مقامات میں دورہ کرتے۔ پست اقوام سے محبت و ہمدردی سے پیش آتے ان کے جسمانی اور روحانی علاج کا بندوبست کرتے اسلامی احکام و مسائل کو آسان اور قابلِ قبول صورت میں جمہور کی زبان سیکھ کر اس کے ذریعے ان تک پہنچاتے۔ ہمارے اگلے بزرگ بڑے وسیع القلب اور روادار ہوتے تھے۔ دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرتے اور محاسن اسلام کو بطریقِ احسن پیش کرتے ہندوستان کو اجنبی ملک نہیں اپنا وطن سمجھتے۔ لوگوں سے بہت حد تک گھل مل جاتے۔ ایسی

خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے ہندوستان کی اچھی باتوں کو اپناتے اور امیر خسروؒ کی طرح فخر سے کہتے ؎
"مدعی گر زند طعنہ مرا - کز پئے ہند این ہمہ ترجیح چرا - دو دلیلم باعث این کار شدہ - کین دو سبب حجت گفتار شدہ -
آن یکے این کہ زمین از دور زمن - ہست مرا مولد و ماوا و وطن - دین ز رسول آمدہ در زمرۂ دین - حب وطن
ہست ز ایمان یقین" - سرزمین ہند میں حکمت و معنی کے جو خزانے عرصہ قدیم سے موجود تھے انہیں جتاتے اور
ان سے استفادہ کرتے - امیر خسروؒ آگے چل کر اسی کتاب "نہ سپہر" میں فرماتے ہیں ؎ "واں کہ درین خطہ
پوشیدہ درون - دانش و معنی ست نہ اندازہ برون - گرچہ حکمت سخن از روم شدہ - فلسفہ زانجا ہمہ معلوم
شدہ - لیک نہ ہند است ازین ہم تہی - ہست درو بیک از و بہی - منطق و تنجیم و کلام است درو -
ہر چہ کہ جز فقہ تمام ست درو - علم دگر ہر چہ ز معقول سخن - بیشترے ہست برآئین کہن - برہمن ہست کہ در
علم و خرد - دفتر قانون ارسطو بدرد - وآنچہ طبعی و ریاضی ست ہمہ - اینہا مستقبل و ماضی ست ہمہ - رومی ازاں
گو کہ افگند برون - برہمناں راست ازاں مایہ فزون - لیک از ایشاں چو نہ جستہ است کسے - آن ہمہ در
پردہ بماند ست بسے - من قدرے بر سر این کار شدم - در دل شان محرم اسرار شدم -" گو مذہب ہندو دین
اسلام سے مختلف تھا لیکن ہمارے صوفیائے کرام کو اس کا احساس تھا کہ ان میں بھی موحد تھے اور بہت سے
خیالات و معتقدات میں انہیں مسلمانوں سے ہم آہنگی تھی ؎ "نیست ہنود ارچہ کہ دین دار چو ما - ہست بسے
جا اقرار چو ما معترف ہستی و قدم - قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم - خالق افعال بہ نیکی و بدی - حکمت و حکمتش ازلی
وابدی - فاعل و مختار و مجازی بعمل - عالم ہر کلی و جزوی ز ازل - این ہمہ گشتہ بہ تحقیق مقر - نے چو
بسے طائفہ بر کذب مصر - برہمن از ہستی او راندہ نفس - نے چو ثنوی کش بدوئی رفتہ و بس - اختریان بخت
خدا برد و گماں - گفتہ ہندو نہ ثابت نہ چناں - قوم مشبہ سوئے تشبیہ شدہ - ہندو ازینہا ہمہ تنزیہ شدہ - خلق
دگر نور و ظلام خواند ازل - ہندو ازینہا ہمہ بیزار اصل -

حضرت امیر خسرو ہند کی فضیلت میں کئی اور باتیں فرماتے ہیں ہندوؤں کی سادگی اور ان کے
تجرِ علمی کی بڑی قدر کرتے ہیں ؎ "ہندو دہقاں بکہن چادرگی - شب بہ چراگاہ بود نیا خرگی - لب جو
ز آب خنک برہمناں غسل کنند آخر شب غوطہ زناں - گرگ را نہ بود شان غم خز - سایۂ شاخ بس و با کلبہ
دوگز -" لیکن جو چیز انہیں بہت بھاتی ہے وہ اہل ہند کی زبان پر قدرت ہے - آج بھی ہندوستانی جو کئی

زبانوں کو اس قدر جلد اور اس بہتر طریقہ سے اپنا لیتے ہیں جو دوسرے نہیں کر سکتے حضرت امیر خسرو ارشاد فرماتے ہیں سے "ہست ختا و مغل و ترک و عرب ۔ در سخن ہندوی ما دوختہ لب ۔ ما بہ درستی سخن ہر ہمہ را ۔ زاں نمط آریم کہ راعیٔ املہ را ۔" آگے چل کر کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے لوگ سرزمین ہند کی کئی باتوں سے استفادہ کر سکتے ہیں سے "جملہ جہاں زیں دو سہ تربیت گزیں ۔ فائدہ گیرے بود از ہند زمیں ۔" ان کی تعلی بے جا نہیں سے "حجت دہ آنکہ چو خسرو بسخن ۔ سحر گرے نیست تہ چرخ کہن ۔" کیونکہ انہیں اس بات پر ناز تھا کہ سے ترک ہندوستانیم ہندوی گویم جواب ۔ شکر مصری ندارم کز عرب رانم سخن ۔" غرۃ الکمال میں اپنے کو "چوں من طوطی ہندم ۔" بتا کر کہتے ہیں " از من ہندوی پرس تا نغز گویم ۔"

طوطی ہند اور حضرت شیخ المشائخ نظام الدین اولیا قدس اللہ سرہ العزیز کے " ترک المہند " جو اپنے پیر و مرشد کے وصال کے بعد صرف چھ سات ماہ زندہ رہ کر ۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو اس دنیا سے سدھارے نہ صرف اپنے عقیدت و تقدس بلکہ اپنی زباندانی اور موسیقی میں مہارت و اختراعات کے لئے بہت مشہور ہیں ہندی موسیقی سے ان کے شغف اور ہندی ایرانی موسیقی کے امتزاج سے جو نئی طرزیں انہوں نے ایجاد کیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی زبانوں میں انہیں کافی درک تھا تغلق اوحدی اور دوسروں کے مبالغہ آمیز باتوں سے قطع نظر داخلی شہادت کافی ہے کہ حضرت امیر خسرو کو فارسی ترکی کے علاوہ دیسی بھاشا بہت مرغوب تھی ۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں " جزوے چند نظم ہندی نیز نذر دوستاں کردم ۔" یہ دیوان ۶۹۳ھ میں مرتب ہوا اور ۳۴ سے ۴۳ برس کے کلام کا مجموعہ ہے افسوس ہے کہ وہ چند جزو جو ہندی زبان میں انہوں نے اس زمانہ میں لکھے تھے مفقود ہو گئے جو چیزیں ان سے منسوب کی جاتی ہیں وہ واقعی ان کی ہیں یا نہیں یا مسخ شدہ حالت میں ہم تک پہنچی ہیں اس پر بحث ابھی جاری ہے ۔ " خسرو کی ہندی کویتا " " خالق باری " دو سخنے ڈھکوسلے پہیلیاں گیتیں سب مشتبہ قرار دی گئی ہیں لیکن وحید مرزا جیسے ناقد نے بھی نہ صرف ایسے مخلوط اشعار کی طرف ہماری توجہ مبذول کی ہے مثلاً (۱) " آری آری ہمہ بیاری آئی ۔ ماری ماری برہ کی ماری آئی (۲) گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود ۔ فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے ۔" بلکہ حسب ذیل اشعار کی اصلیت و قدامت کو تسلیم کر لیا ہے (۱) خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ ۔ تن میرو من پیو کو دُو دُو بھئے اک رنگ ۔

(۲) گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس۔ چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چہوندیس (۳) فارسی بولی آئی نہ ترکی ڈھونڈھی پائی نہ۔ ہندی بولی آرسی آئے۔ خسرو کہے نہ کوئی بتائے (۴) ایک نار ترور سے اُتری ماں سون جنم نہ پایا۔ باپ کا نام جو اس سے پوچھو آدھو نام بتایا۔ آدھو نام باپ کا خسرو کون دیس کی بولی۔ وا کا نام جو پوچھا میں نے اپنے نام نبولی" حضرت حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ اپنی تصنیف انیس العاشقین میں حضرت امیر خسرو کا ایک دوہرہ نقل فرماتے ہیں۔

؎ جس تن لگی برہ تپش کتجل نہ سودی۔ مانس چیر کے کہیتر پہنچے ہہمپر روی۔ یعنی جو تن فراق کی آگ سے سوزاں ہوتا ہے اس میں پانی آنسو کی شکل میں چھلکنے لگتا ہے۔ نیند حرام ہو جاتی ہے گوشت کو چیر کر ہڈی تک فراق کا درد پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتا ہے۔

ہندی چیزوں بالخصوص ہندی موسیقی کی تواریخ ہندوستانیوں کی زباندانی کے اعتراف اور ملکی بھاشاؤں کے استعمال کے بارے میں حضرت امیر خسرو کی ذات بہت وقیع سہی لیکن منفرد نہ تھی۔ حضرت سید محمدؒ ابن جعفر المکی الحسنی مرید حضرت نصیر الدین محمود اودھی قدس سرہما العزیز اپنی کتاب بحر المعانی کے ایک مکتوب مورخہ ۲۶ ذی الحجہ یکشنبہ ۸۳۴ھ میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا اپنے پیر خواجہ اجمیر حضرت معین الحق والدین حسن سجزیؒ کی اجازت سے دہلی آنے سید مبارک غزنوی سے ملنے اور "ابیات عربی یا فارسی یا ہندی" کے استعمال کی اجازت دینے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور ہند کے "راوگھا" اور "پردہا" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "عالمے در دام ایں آوازہا شیفتہ و مبتلا ست"۔ حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد منیری قدس سرہٗ العزیز کے ملفوظ و مکاتیب میں سلطان شمس الدین التمش اور اس کے گویّے "حاجی ربابی" اور خود مخدوم الملک کے مطرب "تھجو گوائی" اور ہندی گیتوں مثلاً "جگری" وغیرہ کے متعلق جو کچھ ہے ہم صرف ان کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ ۱۵ویں صدی عیسوی کی تصنیف مناقب محمدی یعنی سوانح حضرت سید محمد اجھری (اجھر ضلع گیا) مرتبہ علی شیر شیرازی قادری مرید خاص حضرت اجھری کا باب ششم "دربیان کلام و الفاظ آنحضرت" بھی قابل ملاحظہ ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "درسیاحت وسفر ہر کجا رفتے فی الحال در کلام مثل مردمان آں دیار درآمدی چوں بر سر ہند رسید با مشائخان ہند زبان ایشاں داشت و تلفظ آں را کما ینبغی می کرد" پھر ہندی زبان کی خصوصیت

کے متعلق پیر و مرید سے گفتگو ہوتی ہے" عرضداشتیم یا سیدنا تا در لغات ہند از ہر زبانہا حروف بیشتر است چنانچہ کسے عزیز از مرداں ایں اقلیم نتواند ہمہ حروف ایں دیار ادا نمود۔ مثل اینان کہ بہ سخت ترین زبان گویانند و مایاں ہر چند کہ بکوشم بغایت فصاحت ایں گفتار نمی رسم باعث چیست۔ فرمود مہتر آدمؑ را خدا از بہشت در سراندیپ افگند و او بہ ہر زبانہا واقف بود قال اللہ تعالیٰ عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا دال براں ست۔ بہر گفتارے کہ خواستے سخن گفتے۔ در لغت ہنداناں حروف بسیار شد کہ مشتمل بر زبانہاست و بعضے از محققاں نوشتہ اند صحف آدمؑ نیز بزبان ہندوی بود۔۔۔۔ فرزندان ابوالبشر بعضے یک لغت اخذ کرد و بعضے دو چہار لغت تا نوحؑ۔ او نیز از ہمہ زبانہا تکلم کردی واز قبیلہا برخاست و ہر یکے زبانے آموختہ بہ ملکے استقامت سیکرد آں زبان منسوب بہ آں ملک شد۔ ہر گاہیکہ از ہند ہمہ لغت بیروں گشتہ رومی و فارسی زبانہا وغیرہ ہما نا نامزد شد ندزیں موجب ہندیاں می توانند ہر زبان بیاموزند ما نند صاحب آں زبان۔ و دیگراں را گو بہ ہندی رغبت افتد چنانکہ گویند کہ زادہ ہند گوید۔"

بانی خانقاہ مجہر شریف کے اس نظریہ کے متعلق خواہ کچھ بھی کہا جائے خط کشیدہ جملوں کی اہمیت و قدر و قیمت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اس کتاب میں آگے چل کر سوانح نگار اپنے پیر و مرشد کے ہاسوں گوالوں کے ایک سردار کے اسلام لانے "کول سرداروں میں تبلیغ اسلام کرنے صعوبات و مصائب کا سامنا کرنے۔ بہار کے حاکم دریا خاں کا پہلے ایک مظلوم مسلمان کی فریاد سننے سے انکار کرنے اس لئے کہ مذہبی معاملات میں دخل اندازی منافی مصلحت تھی پھر قادری بزرگ کی کرامت و بزرگی کا شہرہ سن کر ان کے لئے کوشک و خانقاہ کی تعمیر کا حکم دینے اور اس بے لوث بزرگ کے جو خالص نیت سے دین اسلام کے کاموں میں مشغول تھے اس جگہ کو چھوڑنے اور جنگلوں' بیابانوں میں جانے کا تہیہ کرنے کا ذکر کرتے ہیں پھر لکھتے ہیں کہ "صادق (گوالوں کے سردار کا نیا اسلامی نام) در رسید وگفت سیدا چنیں کوشکہا آراستہ و پیراستہ گذاشتہ چرا می روی کہ ہندی بود و نیز فہم و فراست نداشت ازاں او را آنحضرت ہم بزبان ہندوی ہمیں قدر فرمودند۔ "نہ مانہ جیو اینہا نرھنا" ازاں روز نام آں جنگل و چشمہ نرہنا افتاد از کہ شنیدہ می شود نرھنا او را می خوانند"۔ "جیو اور" اینہا" کی خالص بہاری دیہاتی ترکیب خاص طور پر جاذب نظر ہے۔

میں اس مختصر مقالہ میں ان باتوں کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتا جو منظر عام پر آ چکی ہیں ملفوظات مثلاً سیرۃ الاولیا، مطلوب الطالبین، خیر المجالس وغیرہ میں جو ہندی حضرات آئے ہیں ان کی طرف اور لوگوں نے توجہ دلائی ہے۔ دکھن اور گجرات کے بزرگوں کے کلام اور مختصر نثر و نظم کے رسالے شائع ہو چکے ہیں مولانا عبدالحق نے ایک رسالہ بھی اس موضوع پر شائع کر دیا تھا لیکن تاریخ کے طالب علم پر کچھ قیود و شرائط عائد ہوتے ہیں اس لئے میں صرف ان امور پر ناظرین معاصر کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو شمالی ہند کے بزرگوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی اصلیت و قدامت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور جن کا ذکر ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ بہار کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاری (تولد ۶۶۱ھ وصال ۷۸۲ھ) کے ملفوظ معدن المعانی کے ہندی فقرے " باٹ بھلی پر سانکری (بزبان مولانا جلال الدین ملتانی) اور " دلیس بھلا پر دور " لوگوں کو معلوم ہو چکے ہیں آپ سے منسوب مفرد فی النساء اور ہندی "لنحوں" چٹکلوں کا ذکر فضول ہے آپ کے مرید و خلیفہ اجل حضرت مظفر شمس بلخی کا فقرہ " آئیں رات سہانیاں۔ جن کا ران دھیان کہانیاں " مونس القلوب مصنفہ حضرت احمد (لنگر دریا بلخی) بھی نیا نہیں لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مخدوم الملک بہار کے خالہ زاد بھائی حضرت احمد چرم پوش (متوفی ۷۷۶ھ) بانی خانقاہ امیر شریف نے زاہد و پارسا کا فرق بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا " مینا من منزہ شیر و منی کہا ہوئے انہیں بید بامید مان میاں سرنگینی ہوئے " اور یہ کہ حضرت مظفر شمس بلخی قدس سرہ العزیز کے مکاتیب سے ہمارے روحانی پیشواؤں کی دیسی زبان اور دیسی موسیقی سے شغف کا بین ثبوت ملتا ہے۔ جس قدیم نسخے سے میں ذیل کے اقتباسات پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ مولانا حکیم تقی بلخی سجادہ نشیں فتوحہ کی ملک ہے اور اس پر بدست خود منظفر قاضی یحییٰ بہاری کا حاشیہ جا بجا ملتا ہے (۱) مکتوب ۱۲۱ میں مولانا مظفر مولانا کرم الدین کو لکھتے ہیں " دعا میکنم کہ بحرمت النبی والہ الامجاد لنگر با و علائق خلائق رہا ح عواصف جنوں بر بندد اے دوست ہر کہ زیستن داند مردن ہم داند ہر کہ زیستن نداند مردن کے داند۔ وقتے کمانچی پیش بندگی مخدوم جہاں کمانچہ میزد ایں دوہرہ میگفت بندگی مخدوم را سخت گرفتہ بود آب دیدہ میکردند آں دوہرہ ایں ست دوہرہ " ایکت کندی بید۔ با ہوتر ہر کہ کارین۔ جتا ہیں من رنجہیا مرن یہ نہی نہاین (۲) مکتوب ۱۰۲ میں " برادر اعز قاضی خواجہ " کو لکھتے ہیں " اگر با خلائق شادی میکن کہ کارتست۔ و بار بار

تو اگر با خودی ۔ مصیبت و ماتم خود می دارد ۔ وادیلامی گوئی ایں بیت می خواں ہے کہ بادہ سرخ دارم گہ رند درد خوارم ۔ کہ ایں وگاہ آنکم عنوان دقت خو لیشم دد ہرہ لے باٹ جلی پر سانگری نگری جلی پر دور ۔ نا نہہ جھلا پر پا تلاکر ہر چو رستے سانکر کوئی پتال پانی لا کہنہ بوند بکائی ۔ بجھ پر دہمہ منتر انگری کا نہہ پیا سا جائی سلے کہایوں آپن کہر تہر کہایوں نست تہار ۔ بیچ بلندیا کہر چوئی بوند پڑی رتنہہار سنگے چاروں نو جہکیس جاتوں بکت کتار ۔ جہی کرونت سونس جائی آہی بہو بہنسار" ان اشعار میں مقفوا انگری اور کانہہ یا کنہیا یا کرشن جی کے الفاظ حضرت مظفر جیسے متشرع عالم کی زبان پر خاص کر قابل توجہ ہیں (۳) مکتوب ۱۳۲ جن کا موضوع ہے "صوفی کرا گویند : انتقام کشیدن بالنفس کافر" اس دوہرہ سے شروع ہوتا ہے دوہرہ ۔ آپی کون تن بنکھروا جنگل کر نہہ اداس ۔ کنکر چینہ جل بینہ و بہی نہ چھوڈو نہ پاس "پھر لکھتے ہیں حرام علی من یتھم بالعارین ان یحضر مجالسنا یعنی صوفی از کلمات شیخ عبداللہ انصاری قدس سرہ العزیز ۔ خاکی بیختہ و آبگی بر و ریختہ ۔ نہ کف پارا ازو آزارے ۔ نہ بر پشت پائے ازو غبارے ۔ و ایں معنی صوفی دہم علم بود نہ در احوال ۔ التصوف کلہ تحمل اذی الخلق دوہرہ جینہ اساد نہ آتہ پا تان بہر بہر ہانہہ ۔ ڈی بہری بسار دحس تنگی جل تہلنا نہہ ۔

مندرجہ بالا ہندی دوہے ایسی زبان میں ہیں جو ہمارے لئے عسیر الفہم ہے لسانی اعتبار سے ہندی داں طبقہ ہی ان پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے ۔ علاوہ ازیں کتابت کی خرابی اور کاتب کی ناواقفیت کی وجہ سے بہت ممکن ہے کہ الفاظ کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے جو حضرت حسام الدین مانک پوری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب انیس العشاق اور ملفوظ رفیق العارفین سے لئے گئے ہیں ۔ (۱) تن من ادجہر بجھہ بن کیسو کہیہ ملانہ ۔ تے گھر آہیں اجر نہ جہیں گھر سائیں نانہ (۲) کہن پنڈت کہن باولا کہن بیری کہن میت ۔ کنہہ ہنسے کنہہ روئی یہ ہی ہماری جیت " ان کا تو کچھ مطلب و مفہوم سمجھ میں آتا ہے ۔ میرا جسم اور من تجھی میں الجھا ہوا ہے لیکن جب تک تو میرے گھر کے صحن میں نہ آئے میری مایوسی کا پتہ کیسے چلے گا ۔ دوسرا شعر تو زیادہ صاف ہے یعنی جذبۂ عشق حقیقی سے میں اتنا سرشار ہوں کہ نہ پنڈت سے غرض ہے نہ باؤلے سے نہ تو کسی سے دشمنی ہے نہ کسی سے دوستی میں زندگی کی بازی جیت گیا جو پانا تھا پا گیا اب نہ کہیں ہنسی ہے نہ کہیں رونا (۳) " نت نین لو ہوندی بہی تس سائیں کیر نی جائی ۔ سچ ہوئی کوئی

دیوہ ہرا جب ملی آئی" کے پہلے مصرعہ کا شاید مفہوم یہ ہے کہ اس مالک کی چاہ میں خون کی ندی آنکھوں سے روز بہتی ہے اور دوسرے مصرعہ کا مطلب نہیں نکلتا۔

صوفیائے کرام کے طریقہ کار میں نقش و تعویذات جھاڑ پھونک اور منتر وغیرہ کا استعمال بھی داخل تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہندوستان کی خاص چیزیں تھیں انہیں حضرت حسام الدین کے ایک اوراد و ادعیہ کی قلمی بیاض میں جو پھلواری شریف میں موجود ہے بواسیر کا یہ منتر مندرج ہے جس کے الفاظ میں کسی مطلب و معنی کی تلاش بے سود ہے۔ "پن کارت کن کات تو یو کتنا ابرک رکہتا۔ سی رکہتا۔ ای اے جی اے پیرے جی دے من سنگھٹ جی ہہ سی۔ سکھہ دنت رسی نا۔ اے وانا موناں نا جیوانا مو۔ دوہائی شاہ نور قطب عالم پنڈوہ کے پیر کی۔" آخری جملہ بڑا قیمتی ہے اسی طرح حضرت اشرف جہانگیر سمنانی (متوفی ۸۰۸ھ) کے سانپ اور بچھو کے ڈنک کے منتر ہیں جو لطائف اشرفی کے آخر میں مندرج ہیں۔ ان ہندی افسونوں کے ٹکڑے یہ ہیں (۱) اوم چند ملیتہ مانہیں من بھیر ائی ستہ بجواں ہو محمد زبان کرے خدائی۔ راجا باسک تس سنچارا الخ (۲) دہر بند موں دہر گند موں سوالاکو سپاری بند موں۔ اپنی جگت گرو کی سکت مرے بکھو جو آگے چڑھے۔" ان افسونوں اور منتروں کو کسی داس نے ساور منتر کہا ہے جس کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔" المیل الکمچر اربھو نہ جاپو۔ پرگٹ پربھاس مہیش پرتاپو۔"

حضرت اشرف جہانگیر سے ایک رسالہ اردو منسوب ہے لیکن جب تک اس پر نظر غائر نہ ڈالی جائے اس کی قدامت و اصلیت کے متعلق صرف دو تین اشعار سے کچھ فیصلہ کرنا مناسب نہ ہوگا لیکن ہندی کی واقفیت اور استعمال کی شہادت تو خود لطائف اشرفی میں موجود ہے۔ ایک عورت کی جس کے لڑکے نے بے ادبی کی سزا پائی تھی حضرت سے ان الفاظ میں التجا پیش کرنی "یا میران پوت بھیکہ دیہو" ایک موقع پر اس "ہندوی مثل" کا استعمال "چیری کے موہنہ کہنڈا" "جوگیوں" اور "جیتون" سے محبت "کمال جوگی" کا ایک موقعہ پر "ترپھلا" کی طبی خاصیت کا بیان کرنا۔ اور سہ دھی۔ بلاذر۔ پنوار وغیرہ جڑی بوٹیوں پر اظہار رائے "دربن ناتھہ عرف عبداللہ" کا کہنا کہ منڈی میونڈی ارچنڈی جسے ارچہ کہتے تھے بڑے کام کی چیزیں ہیں اور ہندی مثل کا دوہرہ "منڈی میونڈی۔ بھنگرہ اسگندہ تو کھاپاؤ۔ بکتی چکتی کہا ہے ہرے جو چو سکھ پاؤ۔" یہ تمام باتیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک اور واقعہ لطائف اشرفی میں مندرج

ہے حضرت سلطان اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ العزیز ایک مجذوب ابراہیم نامی سے ملنے جاتے ہیں اتفاق سے مجذوب کو کسی نے کھانا بھیج دیا تھا۔ کچھوچھہ شریف کے بزرگ کو دعوت شرکت دی جاتی ہے قبول فرماتے ہیں ان کے ایک نہایت متشرع ساتھی موجود تھے مجذوب نے انہیں بھی بلانے اور شریک کرنے کی خواہش کی لیکن اُن حضرت کا اصول تھا کہ تارک الصلوٰۃ کے ساتھ کسی قسم کی شرکت جائز نہیں سمجھتے تھے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ برملا کہتے ہیں کہ یہ پابند نماز نہیں ان کے ساتھ میں کھانا نہیں کھا سکتا مجذوب کو طیش آجاتا ہے بعد کو حضرت اشرف جہانگیر پوچھتے ہیں کہ ایسی بداخلاقی کیوں کی گئی جواب میں ایک خاص طنز ہے ہندی کا فقرہ قابل غور ہے۔ "لیو پر کہیو آپن۔ ولیسون کہنہ الیسون کہنہ"۔ کیا ان شواہد کے پیش نظر کوئی کہہ سکتا ہے کہ جامع ملفوظ اور ان کے پیر و مرشد ہندی زبان سے کماحقہٗ واقف نہیں تھے۔

ہمارے بزرگان دین اور صوفیائے کرام اکثر و بیشتر ایسے ہندی دوہے اپنی زبان مبارک سے ادا کرتے تھے جو اُردو داں طبقہ کے لئے قابل فہم نہیں ہوتے معلوم نہیں یہ اشعار خود ان کے تھے یا دوسروں کے جنہیں حسب حال ارشاد فرماتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں خود ان حضرات کا نام اشعار کے آخر میں اور ہندی شکل میں پایا جاتا ہے جیسا حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ (متوفی ۹۴۵ھ) کے متعدد ہندی دوہوں سے واضح ہوتا ہے۔ میں آئندہ معاصر کی دوسری اشاعت میں ان پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا یہاں صرف ایک ٹکڑہ پر اکتفا کی جاتی ہے۔ رشد نامہ مرتبہ حضرت "زین الدین شیخ عبدالقدوس الحنفی الچشتی" کے دوسرے ہی صفحہ پر "سرود در پردہ پوربی" کے تحت ہم پاتے ہیں سے "ہن کارن ہیہ آپ سنوارا۔ بن دھن سکھی کنت کینہارا۔ (ساتھ) کھیلی دھن ماتہیں ایوان۔ باس پھول منہ اجہی جیواں۔ کیوں تہیں کھیلوں تجہہ سنگ میتا۔ مجہہ کارن تیں ایتا کیتا۔ الکہہ داس آکہے سن لوئی (خلق) سوی (خلق) باک ارتھ یہن سوی"۔ یعنی بغیر عورت (دھن) کے زوج (کنت) بے معنی ہے معشوق ہی کی خاطر سے تو عاشق نے (تخلیق اور) زیبائش گوارا کی۔ عورت اپنے مرد کے ساتھ جوڑ کر کھیل کرتی ہے۔ جی پھول کی خوشبو سے بسا ہوا ہے۔ کیوں اے دوست میں تیرے ساتھ کھیلوں۔ کیا میری وجہ سے تیرا جی ڈانواڈول ہے۔ عبدالقدوس کہتے ہیں کہ لوگو سنو اور اس بات کے معنی و مطلب کو سمجھو۔ یہ اشعار تفسیر ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے مناجات "الٰہی لما ذا خلقت الخلق" اے مالک تو نے خلق کو کیوں پیدا کیا۔ فرمان حضرت صمدیت صادر

ہوا "کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ" یعنی میں گنج پنہاں تھا چاہا میں جانا جاؤں پس خلق کو پیدا کیا تا مخلوق مجھے پہچانے اور "مَا خَلَقَ اللّٰہُ مُشْتَقیٰ" کی "حق تعالی خواست تا اسرار را فاش گرداند" اس کے بعد اشعار کو ملاحظہ کیجئے اور مطلب واضح ہو جائے گا۔

اسی قسم کے تقریب اسی ٹکڑے صرف حضرت عبد القدوس گنگوہی کے ہم تک پہنچے ہیں۔ کئی ایسے بزرگ شمالی ہند میں گذرے ہیں جن کی ہندی شاعری اور تصنیفات کا ہم ذکر تاریخ و تذکرے کے اوراق میں پاتے ہیں لیکن جن کی چیزیں اب مفقود ہیں حضرت مولانا عبد الحق محدث دہلوی کے عم محترم شیخ رزق اللہ "مشتاقی" و "راجن" کے متعلق صاحب اخبار الاصفیا اور خود صاحب اخبار الاخیار فرماتے ہیں "شعر بزبان ہندی و فارسی دارد و رسالہا بزبان ہندی گفتہ چنانچہ پیماکن و جوت نرنجن بسیار مقبول و مشہور اند و نام ایشاں راجن است و در فارسی مشتاقی (متوفی ۹۸۹ھ)"

مولانا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ایک ہندی مثنوی چنداین کا جس میں لورک اور چنداں کی کہانی فیروز شاہ تغلق کے مشہور وزیر خان جہاں مقبول کے بیٹے اور جانشین کے لئے مولانا داؤد نے منظوم فرمائی تھی اور جسے مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی توحید و معرفت کا حامل سمجھ کر منبر پر استعمال کرتے تھے ذکر کیا ہے اب اس کا مکمل نسخہ کمیاب ہی نہیں نایاب ہے۔ اسی طرح شیخ جلال تھانیسری (متوفی سنہ ۱۵۸۰ عیسوی)، شیخ غوث گوالیاری (متوفی سنہ ۱۶۰۵ عیسوی) شیخ محمد صلولی مرید شیخ عبد الکریم (متوفی سنہ ۱۶۶۳ عیسوی)، شیخ جنید موہانی (متوفی سنہ ۱۶۶۵ عیسوی) خوش محمد قادری نوشاہی۔ شیخ برہان کالپوی صاحب فراقنامہ اور کئی ازپیراں ملک محمد جائسی وغیرہ ہندی کے صاحب تصنیفات بتائے گئے لیکن باقیات الصالحات کا اب پتہ نہیں۔ متعدد دیگر صوفیائے کرام کے اقوال و اشعار ہنوز گوشۂ گمنامی اور پردۂ خفا میں مستور۔ میں نے تھوڑی بہت کد و کاوش تجسس و تلاش سے جو چیزیں حاصل کی ہیں ان کے متعلق انشاء اللہ کسی آئندہ موقع پر کچھ عرض کروں گا اور کچھ انگریزی میں شائع بھی کر چکا ہوں۔

مقالہ طویل ہوتا جاتا ہے اس لئے آخر میں ایک امر کی طرف قارئین معارف کی توجہ منعطف کرنی ضروری سمجھتا ہوں اشعار کی تعداد تو یقیناً کافی ہے اور یہ اشعار قدیم ہندی بھاشا کا نمونہ ہیں جن میں پوربی یعنی اودھی کا عنصر غالب ہے۔ کچھ مشہور تصنیفات جیسے ملک محمد جائسی کی پدماوت۔ اکھراوٹ۔

آخری کلام ۔ مہری نامہ وغیرہ ۔ قطبن کی مرگاوتی ۔ منجھن کی مدھومالتی ۔ نور محمد کی اندراوتی ۔ عثمان کی چترا وتی ۔ سادھن کی مینا مالن کی کہانی ۔ بخش خاں کی بھوگ ساگر وغیرہ خالص اودھی زبان میں ہیں ۔ مجھے قدیم برج بھاشا راجستھانی بہاری وغیرہ زبانوں میں کسی مسلمان مصنف کی کوئی تصنیف نہیں ملی لیکن نظم اور قدیم بعید الفہم ہندی کے ساتھ ساتھ نثر اور کھڑی بولی کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں اوپر مناقب محمدی ۔ معدن المعانی اور لطائف اشرفی سے چند فقرات نقل کئے جا چکے ہیں ۔ خیر المجالس کا نسخہ اس وقت موجود نہیں ورنہ اس میں دو ایک جملے جو پائے جاتے ہیں نذر قارئین کئے جاتے ۔ میرے مورث اعلیٰ حضرت جلال الحق والدین سید جلال الملقب بہ مخدوم جہانیاں (متوفی ۷۸۵ھ ہجری) جنہوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت میں نمایاں حصہ لیا ۔ اُچھ کے رہنے والے تھے وہیں آسودہ ہیں اس لئے ملتانی اور سندھی سے تو واقف ہی تھے جیسا کہ موصوف کے ملفوظ مؤلفہ علی ابن سعد بن اشرف بن علی القرشی کے ان فقروں سے واضح ہے " مردے از سندھ بر دعا گوئے بزبان سندھی گفت " " شیخ بزبان ملتان گفت " لیکن بہار کے ایک جلیل القدر شطاری بزرگ حضرت " قاضن بن علا بن عالم ترہتی ثم المنیری الہاشمی " نے جنہوں نے حضرت عبداللہ شطاری سے مانڈو میں ۴ ذی الحجہ ۸۸۱ھ کو خرقہ خلافت پایا اپنے ملفوظ معدن الاسرار میں حضرت جلال بخاری علیہ الرحمۃ کے ایک جوابی فقرہ کو یہ لکھ کر کہ الحق راست گفتہ یوں نقل کیا ہے " کھندا ہے چھندا کہاں " ناقل کبھی اُچھ گیا دہلی تک بھی نہیں گئے اور منقول عنہ نے کبھی مشرق ہند میں قدم رنجہ نہیں فرمایا لیکن ان دور افتادہ بزرگوں کی زبان پر جن کے مقاصد عقائد و اعمال میں وحدت و یکسانی تھی کیسا صاف اور نکھرا ہندوستانی یا اردو کا جملہ زیب دیتا ہے ۔

" ہے " پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے اگر حافظ کا یہ شعر " ساقی اگرت ہوائے ما ہے ۔ جز بادہ بیار پیش ما شئے ۔ " الحاقی نہیں ہے تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے ۔

ولی ویلوری

کی

دہ مجلس کا ایک قدیم اور معتبر مخطوطہ

فضائل و مصائب اہل بیت اطہار، شہادت امام حسین علیہ السّلام اور واقعات کربلا پر متعدد منظوم کتابیں اور مثنویاں دکنی زبان میں لکھی گئیں۔ ان میں بیشتر ملا حسین بن علی واعظ کاشفی کی مشہور فارسی مثنوی روضۃ الشہدا سے ماخوذ ہیں یا اس کا ترجمہ ہیں۔ کچھ دکنی مثنویوں کا نام بھی روضۃ الشہدا ہے۔ یہ زیادہ تر دس فصلوں یا مجلسوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس لیے انہیں دہ مجلس بھی کہتے ہیں۔ بارہویں صدی ہجری میں متعدد کتابیں اس موضوع اور طرز پر لکھی گئیں۔ شمالی ہندوستان میں بھی مراثی اور مجالس عزا کا چرچا تھا۔ چنانچہ دہلی کے فضلی کی دہ مجلس جو نثر میں تھی اور کمیاب بلکہ نایاب ہے اسی صدی کے اواسط میں لکھی گئی۔ مصنفین و مولفین کا اہل تشیع ہونا لازمی نہ تھا۔ احناف، اہل تسنن اور صوفیائے کرام کو بھی اہل بیت اطہار اور بالخصوص امام حسین علیہ السّلام سے بے حد والہانہ اور سچی عقیدت تھی۔ حتیٰ کہ شاہ عبد العزیز دہلوی مصنف تحفۂ اثنا عشریہ جیسے نقش بندی سلسلہ کے جلیل المرتبت بزرگ کے قلم کو بھی اس موضوع پر جنبش ہوئی اور سرالشہادتین لکھ کر آپ نے آنسو بہائے اور دوسروں کو بھی غم ناک کیا۔ کچھ لوگوں نے ولی اورنگ آبادی سے بھی جو بہت دنوں تک اور غلط طور پر نظم اردو کی نسل کا "آدم" سمجھے جاتے رہے۔ ایک دہ مجلس منسوب کی ہے اور کلیات میں چند اشعار بھی چھپ گئے ہیں لیکن جیسا کہ ہاشمی صاحب اور زور صاحب نے لکھا ہے یہ اشعار ولی اورنگ آبادی کے نہیں ہیں بلکہ ان کے ہم عصر ولی ویلوری کی دہ مجلس کے ہیں۔ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی فہرست اردو مخطوطات مرتبہ پروفیسر عبد القادر سروری کے صفحہ ۱۹۲ کے حاشیہ میں پروفیسر بلوم ہارٹ کے اس خیال کا حوالہ دیا گیا ہے کہ روضۃ الشہدا، کو ولی اورنگ آبادی

نے بھی ترجمہ کیا تھا صفحہ ۱۴۱ میں دو شعروں سے جن میں ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۴۳ھ کی تاریخیں دی گئی ہیں یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ولی اورنگ آبادی کا وصال ان ہی دو تاریخوں کے درمیان ہوا صفحہ ۱۴۰ میں دہ مجلس منظوم کو ولی اورنگ آبادی کی تصنیفات میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن صفحہ ۷۰ میں ولی ویلوری اور شیدائی حیدر آبادی کے دکنی زبان میں دو منظوم نسخوں کا نام روضتہ الشہدا اور روضتہ الاطہار بتایا گیا ہے۔ صفحہ ۱۱۱ میں ولی ایلوری کے ترجمہ روضتہ الشہدا کی مجلس دہم کے خاتمے کے اشعار نقل کئے گئے ہیں:۔

کیا ہوں ختم یو جب درد کا حال ۔۔۔ ایکبار اسو پو تھا سیں تیسواں سال

نشان اس درد میں ہے زندگی کا ۔۔۔ زمانہ مہدی آخر زماں کا

نشان ہے دولت و پابندگی کا ۔۔۔ اتھا امن باعث امن اماں کا

ولی اب رکھ قلم اور ختم کر بات ۔۔۔ نبی ہور آل او پر بھیج صلوات

پہلا شعر صفحہ ۹۳-۹۲ میں اس طرح مندرج ہے۔

کیا ہوں ختم یو درد کا حال ۔۔۔ اگیارہ سو او پر تھا تیسواں سال

ان اشعار کی اصلی صورت کیا تھی یہ تو اشارہ سطور سے واضح ہو گا۔ لیکن جناب سرور جنہیں بیٹے نقادسے توقع تھی کہ ولی اورنگ آبادی اور ویلوری کے مخلوط ہو جانے اور دیجیاس کے معاملہ کو مبہم چھوڑ دینے کے الزام کا موقع نہ دیں گے۔

مدراس کے سرکاری کتب خانہ کے "اورینٹل" مخطوطات کی فہرست نگار نے بھی کسی قدر الجھن میں ڈال دیا ہے انہوں نے روضتہ الشہدا کے دو اردو منظوم نسخوں کا ذکر کیا ہے جس میں ایک کے صفحات کی تعداد ۲۵۶ دوسرے کی ۳۳۲ ہے اور بتایا ہے کہ دکنی زبان میں یہ کتاب جو صاحبان تشیع میں بڑی مقبول تھی، شخصے عبدالرسول کی تصنیف ہے۔ یہ عبدالرسول کب تھے، کون تھے اور کہاں کے رہنے والے تھے ان باتوں کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا گیا لیکن شروع اور خاتمے کے چند اشعار قدرے اختلاف کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں۔ ان کی صورت یہ ہے:۔ آغاز

کردں نامہ کوں بسم اللہ سوں آغاز ۔۔۔ اچھوں تا میں فصاحت میں سرفراز

سراون کیا اسے جن یک سخن میں ۔۔۔ بندیا جیو دم کدر د؟ اتنی سو بدن میں

حکیم ایسا کہ لا کر دست تدبیر | کمال تجھار دانی کا حکم غیر
فلک کے ہاتھ دے خورشید کا جام | پھرا کر دور تا صبح سوں شام

خاتمہ

یہ رومی گوں پکڑ کر دن رات گوشہ | کیا ہوں آخرت کا اپنی توشہ
یو نامہ درد کا جو کوئی کرے سیر | پڑھی حق میں میری یک فاتحہ خیر

فہرست نگار نے صحیح طور پر اس کتاب کو بجائے مرثیہ کے اسلامی تاریخ قرار دیا ہے۔ اور مصنف اردو شہ پارہ نے بھی یہ لکھ کر اس کی تصدیق کی ہے کہ یہ کتاب مرثیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ خاندان رسول کی جنگوں اور شہادتوں کی ایک تاریخ ہے اس کے داخلی شواہد کے متعلق آئندہ کچھ عرض کیا جائے گا۔

مولف اردوئے قدیم اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے البتہ صاف صاف طور پر دلی ویلوری کو دہ مجلس کا مصنف قرار دیا ہے۔ اور زور صاحب بھی یہی کہتے ہیں۔ اول الذکر اور آخر الذکر حضرات نے مصنف کا نام سید محمد فیاض بتایا ہے۔ ہاشمی صاحب میر ولی فیاض پر زور دیتے ہیں۔ سروری صاحب نے اشارہ میں "ولی محمد" (میر فیاض) لکھا ہے اور صفحہ ۹۲ میں فرماتے ہیں کہ "محمد فیاض ولی" دکنی نے ۱۱۰۵ھ میں روضتہ الشہدا کا نظم میں ترجمہ کیا۔ اس بیان کے ثبوت میں کوئی چیز نہیں دی۔ ہاشمی صاحب مولف دکنی مخطوطات نے ولی ویلوری کے ایک رشتہ دار کے نسب نامے "میر ولی فیاض" کے نام پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ شیعہ تھے۔ شاعری ان کا پیشہ نہ تھا۔ ابتدا میں فوجی ملازمت کرتے تھے۔ ان کی پیدائش ویلور علاقہ مدراس میں ہوئی۔ حرامت خاں نواب ضلع ساٹ گڈھ کے متوسلین میں تھے۔ بعد ازاں قلعہ دار ان سدھوت کے ملازم ہو کر کڑپہ چلے گئے۔ جہاں نواب عبد المجید یا عبد الحمید خان قلعہ دار تھا اور وہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ان کی پیدائش و وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔ ریاسٹ کے محلہ صدر پور میں ان کا مزار واقع ہے۔ مولف اردو شہ پارے نے بھی یہی باتیں لکھی ہیں۔ مزار کا ذکر نہیں کیا۔ دلی ویلوری کو پرگو شاعر بتایا گیا ہے۔ ان کی تصانیف میں دو ضخیم کتابیں روضتہ الشہدا اور رتن و پدم کے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی تھیں ایک دعا ز فاطمہ ایک بچاس اشعار کی مناجات بھی ان سے منسوب ہے رتن و پدم میں چتوڑ کے راجہ رتن سین اور لنکا کی راجکماری پدمنی کی عشقیہ داستان جائسی کی

مشہور ہندی نظم پدماوت کی مدد سے منظوم کی گئی ۔ اس میں چار ہزار اشعار تھے اور ڈاکٹر اشپرنگر نے اودھ کے شاہی کتب خانہ میں جو نسخہ اس کا پایا تھا اس کے صفحات کی تعداد چار سو تھی ۔ رتن پدم کا مخطوطہ تو ناپید ہے لیکن روضۃ الشہدا یا دہ مجلس کے کئی نسخوں کا پتہ چلتا ہے اور اس سے مطبوع بھی قرار دیا گیا ہے ۔ اس میں ولی ویلوری کے ذاتی حالات کی طرف کچھ بھی اشارہ نہیں پایا جاتا لیکن رتن پدم میں ملازمت کا حال شاید درج تھا ۔

ہاشمی صاحب نے دہ مجلس کے متعدد اشعار کو جو مختلف مقامات سے لئے گئے ، نقل کرنے کے بعد مختصر طور پر کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے ۔ لکھتے ہیں کہ ولی ویلوری ایک کہنہ مشق شاعر تھے جن پر مذہب اور تصوف کا رنگ غالب تھا ۔ ان کی یہ تصنیف شاعرانہ خصوصیات اور نکات سے خالی نہیں ہے جس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعر کا پایہ اس فن میں کس قدر بلند تھا ۔ واقعات نگاری ، جنگ کے حالات ، حملہ کا سماں وغیرہ جس خوبی سے بیان کئے گئے ہیں ، وہ شاعر کی اعلیٰ قابلیت کے شاہد ہیں ۔ گو محی الدین زور صاحب کو یہ کتاب دلچسپ نظر نہیں آئی اور انکے لئے .. ۵ اشعار کا مطالعہ بڑا صبر آزما ثابت ہوا ۔ لیکن جہاں ۴۳ اشعار کا اقتباس پیش کیا ہے وہاں لکھتے ہیں " خالص مذہبی موضوع ہے اور مصنف بھی ٹھیٹ مذہبی آدمی ہے لیکن نظم دلچسپی اور ادبیت سے خالی نہیں ، گو ولی اورنگ آبادی کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا " ہمیں افسوس ہے کہ رتن و پدم کا نسخہ موجود نہیں اور ولی اورنگ آبادی نے اس خاص موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی اس لئے تقابل کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ انیس و دبیر نے اپنے مراثی میں جو ادبی معجز نمائی کی اور جس تدر ایک محدود دائرہ میں خود کو رکھ کر زبان اردو کی خدمت کی اس کی توقع ان کے پیش روؤں سے کرنا مناسب نہیں پھر بھی ویلوری ولی قادر الکلام شاعر تھے اور کس حد تک اپنے کلام کی وجہ سے سراہنے کے قابل ہیں اس کا کچھ اندازہ ان کی کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے ۔ ہاشمی صاحب نے اس مثنوی کے کئی نسخوں کا ذکر کیا ہے ۔ تین ہندوستان میں اور تین ہندوستان کے باہر ۔ ان میں ایک تو خود ان کے پاس تھا ، دوسرا کتب خانہ آصفیہ میں اور تیسرا انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں ۔ یورپ کے جن تین نسخوں کا حوالہ دیا ہے ان میں دو انڈیا آفس میں ہیں اور ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں ۔ قدیم ترین نسخوں کی تاریخ کتابت سنہ ۱۱۹۶ھ اور سنہ ۱۱۸۰ھ بتائی گئی ہے ۔ تعجب ہے کہ جس کی نظر سے اتنے متعدد

اور کچھ بہت قدیم نسخے بھی گذرے اور وہ دکنی زبان کی خصوصیات اور غریب تراکیب سے بھی واقف ہو۔ پھر بھی نقل کردہ طویل اقتباسات میں کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں جو غالباً کاتب یا پریس کی زیادتیوں پر محمول کی جائیں۔ مزید برآں کچھ کام کی باتیں جو کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے برآمد ہوتی ہیں ان پر بھی ہاشمی صاحب اور زور صاحب کی نظر شاید نہ پڑ سکی۔

پٹنہ یونیورسٹی کے کتب خانہ کے شعبہ مخطوطات میں دکنی زبان کی کئی کتابیں داخل کی گئی ہیں ان میں ایک ضخیم مثنوی بھی ہے جس پر کتاب کا نام مُسرخ روشنائی میں روضۃ الشہدا مندرج ہے ۳۶۶ صفحات کی یہ ضخیم مثنوی جس کے سطور کی تعداد ۱۵ تقطیع ۱۰ × ۵۳/۴ خط نسخ نما نستعلیق ہے جس کا کاغذ دیسی، دبیز، میلاپن لئے ہوئے سفید اور پائدار ہے۔ مکمل اور بہت قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے۔ اوراق پاشاں ہیں اور قدرے کرم خوردہ لیکن بجز چند مقامات کے جہاں عبارت مٹ گئی ہے، کہیں مطالعہ کرنے والے کو کوئی خاص دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ یائے معروف اور یائے مجہول کا امتیاز البتہ کاتب نے ملحوظ نہیں رکھا اور اس زمانہ کے دستور کے مطابق ک اور گ کا فرق ناظر کے استعداد علمی کے حوالہ کر دیا گیا ہے ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے: "چوں موجب فرمائش شیر محمد صاحب کمترین حالات از کمترین مخلوقات سید افضل مسافر بیت اللہ شرفا و تعظیما بنظم قلم استطاعت نمود بتاریخ دویم شہر ربیع الثانی سنہ ۲۲ اختتام و تمام نمود امید از توجہات دردپروری و دینی قاریان ہذا الکتاب آں دارد کہ حرف سہو القلم عنایت محو فرمایند۔" سنہ ۲۲ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے سنہ جلوس کی شاید خبر دیتا ہے یعنی سنہ ۱۱۵۳ھ مطابق سنہ ۱۷۴۰ء۔ آخر کے چند اشعار یہ ہیں:-

رقم کرتا ہے حسن درد و الم کوں — لکھایا رب ہمن تا سر قلم کوں
محمد مصطفےٰ سنے آل کے باب — تھا امت سیں اپنے رنج و تاب
تو لکھا کوئی بیتاں مصائبات میں درد پایا — نکسی کے آل پر تہا یوں ستایا
خصوصاً آل ہیں جو اوصیا تھے — شرف میں ہم قرین انبیا تھے
ولی ہے سب سوں اگلا انکوں آزار — یو امت کے سیفہان جفا کار
نبی کے آل کا یو درد ماتم — سعادت ہے جو رکھنا دلمیں غم

نشاں اس درد میں ہے زندگی کا	سبب ہے دولتِ پائندہ گیکا
یوں رہنے کو پکڑ دن رات گوشہ	کیا ہوں آخرت کا اپنا توشہ
یو نامہ درد کا جو کوئی کرے سیر	پڑھے حق میں مرے یک فاتحہ خیر
محمدؐ ہور علیؓ ہور فاطمہؓ سب	کریں عاصی کوں اس اپنا مقرب
کیا ہوں ختم جب یو درد کا قال	اگھارہ سو پو تھا سن تیسواں سال
زمانہ مہدی آخر زماں کا	اٹھا اُس باعث امن و اماں کا
ولی اب رکھ قلم ہور ختم کر بات	نبی ہور آل اوپر بول صلوات

ان میں گیارہواں شعر جو اہم ہے اور سنہ تصنیف ۱۱۳۰ کا پتہ دیتا ہے، ہاشمی صاحب کو وزن کے لحاظ سے موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے گردہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں: ؎

کیا ہوں ختم جب یو درد کا حال	اگیارہ سو اوپر تہا تیسواں سال

مؤلف اردوئے قدیم نے تو اور بھی زیادتی کی ہے کہ سنہ ہی کو بدل ڈالا۔ سروری صاحب نے نقل کردہ اشعار اور پیشِ نظر نسخہ کے اشعار میں جو اختلاف ہے اور کس کی قرأت کتنی صحیح اور معتبر سمجھی جا سکتی ہے اس کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

ہاشمی صاحب نے شروع کے صرف دو اشعار اور کتب خانہ مدراس کے فہرست نگار نے صرف چار اشعار نقل کئے ہیں۔ قبل اس کے کہ تمہیدی اشعار کو جو حمد و نعت اور ایک واقعہ پر مشتمل ہیں، پٹنہ یونیورسٹی کے مخطوطہ سے نذر قارئین کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شمالی ہندوستان والوں کو دکنی شعرا کے کلام کا مفہوم پوری طرح سمجھنے اور دکن کی قدیم و مروج زبان کے غریب الفاظ و کلمات مترادفات اور عروض و قواعد کی مخصوص ترکیبوں سے جو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں، ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ ان دقتوں کا سامنا کرتے وقت چند موٹی موٹی باتوں پر دھیان دینا ضروری ہے۔ راقم السطور خود دکنی زبان سے ناواقف ہے لیکن کتابوں کے مطالعہ سے چند باتوں کی طرف توجہ منعطف ہو جاتی ہے۔ خاص ٹھیٹ دکنی زبان میں لفظوں کی بہت سی ایسی صورتیں ملتی ہیں جنہیں بلا سوچے سمجھے غلط یا غیر فصیح کہہ دینا مناسب نہیں ہے۔ ضرب الامثال محاورات حروف کے حرکات، تذکیر و تانیث، املا،

بندشِ الفاظ غرض بہت سی باتوں میں دکنی اور شمالی ہندوستان کی قدیم اردو بہت کچھ ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دے گی۔ خود شمالی ہندوستان کے متقدمین شعرا کے کلام میں بہت سی ترکیبیں، محاورات کلمات ملتے ہیں جو زبان کے منجھ جانے سے اب متروک ہو گئے ہیں۔ اپنے اپنے زمانے اور ماحول کے لحاظ سے قدیم چیزیں جو فصیح و سلیس و صحیح سمجھی جاتی تھیں آج ان میں سے بیشتر نامطبوع قرار دیدی گئی ہیں۔ ادب میں بھی بقائے اصلح اور ارتقا کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ خود دکن کا کوئی اردو ادیب اور کی جگہ ہور — جتنا کو جتا — یوں کو یو — سے کو سوں — ستی کو سیتی — ہوں کو اچھوں — حرف ربط تھا کو تہا — بندھا کو بندیا — رکھا کو رکھیا — بعد ازاں کو بزاں — نیا کو نوا — بڑھے کو برے — نہیں کو نئیں — طرح کو نمن — اس قدر کو تا — کتنا کو کتا — کہتے ہیں کو کہتے ہیا — سی طرح اوپر اور پر کو پو — مجھ کو موج یا منجے — جو کو جیوں — جب تک کو جب تک — جو کچھ کو جکچ — سے کو ستے — کو کو توں — پہچاننا کو پچھاننا — ہی کو بی — کبھی کو کبی — یہ کو یو — آگے کو آگو — اس قدر کو اتا — کتنا کو کتا — کہا کو کیا — پرکھنا کو پرکنا — سمجھا کو سمجا — دیکھا کو دیکھے — کہاں کو کاں — بوجھا کو بوجھے — کہا کو کہے — اگر کو اگو — پہنچے کو پنچے — کہا کو کہی — باد کو بیلو — رکھا کو تہارا — ابنا کو کنا — نزدیک کو کنے — دیکھ کو دیک — دکھائی دینا نظر آنا کو دسنا — لائق و قابل کو جوگ — شخص یا مرد کو جنا — جیسے کو جنے — اتنے کو اتے — تم اور تمہارا کو تمن تمنا — انھوں کو انوں کوں — اُس نے اس نے کو اُنے انے — منہ کو موں — میں کو منے — بہت کو بوت یا بہوت یا آتا — بات ہاتھ کو باتاں یا ہتا یا ہابت — اس طرح کو یونچ — ختم کروں پورا — کروں کو سراؤں یا پراؤں — تو ایسا کو تو ایسا — سو کہا کو سو کا — رہا کو رہیا — زمیں کو نجیں — پاس کو کنے — کو کو کوں — اپنا کو آپس — اندھیرا کو اندھارا — لکیر کو نکیر — ہزار کو سہس — خون کو رکت — غیرت کو روس — پاؤں کو پگ یا پگن — تلوار کو تروار — جس کی وجہ سے کو لتس — تب تک کو تداں تک — اب تک کو ادھوں — باہر کو بہار — زیادہ کو ادھک — رہو کو اچھو — مانند کو نمن — پانی کو نیر — نام کو ناوں — ہمیشہ کو سداں — سر کو سیس — دشمن کو کال یا دندی — بعضے کو کتک — کبھی کو لدٹی — جدا کو نیارا

نہیں کو ننجبہ — ہوا کو پون — آسمان کو گگن یا اکہم — اٹھانا کو اچانا — جھڑپ کو ادجھڑ — گہر کو بہوں وغیرہ نہیں لکھا جائے گا۔

سروری صاحب نے فہرست اردو مخطوطات کے صفحات ۲۴ — ۲۵ میں قدیم دکنی اردو کی چند خصوصیات و امتیازات کو نمایاں کیا ہے اور پروفیسر عبدالستار صدیقی نے دیوان ولی کے ایک مطبوعہ نسخہ میں دکنی اردو کے لسانی خصوصیات پر ماہرانہ نظر ڈالی ہے۔ محی الدین زور صاحب نے بھی اردو شہ پارے جلد اول کے آخر میں ایک مختصر سا فرہنگ کا اضافہ کیا ہے۔ قطب مشتری کے ایڈیٹر نے بھی غریب الفاظ کے معنی شامل کئے ہیں۔ انہیں پیش نظر رکھنے سے بڑی آسانی ہوتی ہے۔ گو شمالی ہند کے قارئین کی ساری مشکلیں حل نہیں ہوتیں۔ ضرورت ہے کہ دکن کے خصوصی مصطلحات کا ایک جامع فرہنگ تیار کیا جائے اور یہ کام صاحبان حیدرآباد دکن ہی کر سکتے ہیں۔ بہرکیف ولی ویلوری کے کلام کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے اور خوبیوں اور نقائص کا بھی اندازہ کرنا بہت دشوار نہیں۔ جو اشعار ہمیں وزن سے گرتے ہوئے اور ناموزوں معلوم ہوتے ہیں وہ حقیقتاً ایسے نہیں ہیں۔ ایک بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے اکثر افعال میں آخری حرف الف کے بجائے یا لاتے ہیں جیسے رہا کی جگہ رہیا۔ بندا (یعنی بندھا) کی جگہ بندیا۔ رکھا کی جگہ رکھیا۔ ستارا کی جگہ ستاریا وغیرہ اس مخلوط "ی" کا تلفظ نہیں ہوتا ——— تمہیدی اشعار میں بھی اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں:۔

کروں نامیکوں بسم اللہ سوں آغاز	اچھوں آ میں فصاحت میں سرافراز
سراون کیا ایسے جن ایک سخن میں	بندیا جیو دکے رشتے سوں بدن میں
حکیم ایسا کر لا کر دست تدبیر	نکالے مورد انیکا شکم چیر
فلک کے ہاتھ دے خورشید کا جام	پھرا کر دور کرتا صبح سوں شام
بنا تنکے محل پر طاق ابرو	رکھیا لا آ میں نکھیاں کے دیئے (؟) دو
دکھائی اپنی باریکی ہنر کی	لگایا چمکیں چنگاری نظر کی
لگایا شاخ تنسوں گل دھن کا	ثمر بخشا اسے شیریں سخن کا
بنی آدم سوں دھرتی کوں سنواریا	گگن کوں سب ستاریاں سوں تیاریا

سبت (؟) کا سیتا (؟) ہر تخم گل میغ　　آدمی کی بلک دل میں !

ولی جس نے محبت کا کیا لاف　　کیا میں اسکوں پر کوں ہو کو صراف

جسے جتنا محبت ہور ولا ہے　　سو او اتنا بلا میں مبتلا ہے

اَلَستُ بِرَبِّکُم کا جب صلا تھا　　جواب اس کا نعم سُنکر بلا تھا

جکوئی تھے اس صلا میں مست مدہوش　　بلا اوپر بلا کوں کر گئے نوش

دسے او جوں زر خالص محک پر　　تنا ان کا رہیا سا تو فلک پر

کہوں صلوٰۃ بیحد مصطفےٰ پر　　ہور اس کے آل پاک با صفا پر

اس کے بعد اور مجلس اول کے پہلے بیس اشعار ہیں جن میں کتاب نسخۂ کنز الغرائب سے ایک واقعہ لے کر نظم کیا گیا ہے ۔ جناب فاطمہؓ امام حسین علیہ السلام کو ایک نیا جامہ سی کر پہناتی ہیں اور حضرت ختمی مرتبت کے پاس انہیں بھیجتی ہیں ۔ گریبان کی تنگی اور تکمہ کھولنے کی ضرورت سے حلقوم مبارک پر نظر پڑتی ہے ۔ جبرئیل امین حکم باری پہونچاتے ہیں کہ ظالموں کا خنجر اسی جگہ رواں ہوگا ۔ چند ٹکڑے پیش کئے جاتے ہیں :۔

اتھا جو اصل میں ابن الذبیحین　　سبب جس کے ہوا ایجاد کونین

ہوا جس سوں شرف سبا خاکیاں کوں　　تجلی منجلس افلاکیاں نوں

محمدؐ سید اولاد آدم　　نبوت کے اتھا فرماں پو خاتم

سو ویسے نے مصیبت پاکو بیحد　　کیا یا لیت لم یخلق محمدؐ

غرض جو آکویاں پردام دیکھیا　　کدہی محنت کدہی آرام دیکھیا

ولی خاصاں کوں لے محنت میں پایا　　بلا میں نت رکھیا جب لگ جلایا

دیکھو در نسخۂ کنز الغرائب　　حکایت یو لکھیا ہے بس عجائب

کہ یکدن فاطمہ خاتون جنت　　خدا سوں نت اچھو ان پر تحیت

نوا جامہ حسین سرور کے تن میں　　بنائی سیکو جوں گل پیرہن میں

کہی حضرت کی تم خدمت میں جا دو　　نوا جامہ یو پہنے سو دکھا دو

سو جا شہزاد حضرت کے انگمنیں | کھڑے ہے تھے صنوبر جوں چمن میں
نبی نے دیک جلدی سوں بلائے | ہوتہ کر پیار سینے سوں لگائے
دیئے بعد از ایسے گود بیں تہمارا | دسے جوں چاند کے بھگو بیں تارا
او جامہ دیک کر حضرت نے بولے | گریبان تنگ ہے تکمیں کوں کھولے
دیکھی گردن پو کروا ہو کو دنگیر | اُبل حضرت کی نیناں سوں جلیا نیر
ترت جبریل لایا حکم باری | کئے کر دہیں (؟) اتنا جیو کوں بہاری
صبا (؟) جب ظالمانیں یو کرے گا | جہاں کروا ہے واں خنجر پھریگا
یو سن غم گیں ہو حضرت آہ مارے | ترق دل نعرۂ اللہ مارے
عزیزاں پچ یو غم ایسا ہے مشکل | گلا یائی کیا ہے کوہ کا دل

ان اشعار میں اتبا = تبا ۔ پاکو = پاکر ۔ کیا = کہا ۔ کدہی = کبھی ۔ نت = ہمیشہ ۔ جب لگ = جب تک ۔ اچھو = ہو ۔ نوا = نیا ۔ تہارا = رکھا ۔ دسی دکھائی دے وغیرہ سے دشواری پیدا نہیں ہوتی لیکن کروا جو تین جگہ آیا ہے اور صبا کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا ۔ اول الذکر سے شاید حلقہ دار شکنیں یا لکیریں مراد ہوں جسے ہندی میں تربلی کہتے ہیں اور گردن میں ہوتی ہیں ۔ دکنی میں صبح کو صبا گو بولتے ہیں ۔ مگر یہاں اس کے کوئی معنی نہیں ۔ ممکن ہے صباں ہو جس کے معنی ہیں کلمہ یا اشارہ ۔

لیکن جو چیز زیادہ جاذب نظر ہے وہ کنز الغرائب کا ذکر ہے ماخذ کی حیثیت سے ۔ مجلس دہم میں بھی ایک جگہ اسی کا حوالہ دیا گیا ہے ؎

سو ان میں سے حکایت ایک ہے پھر | دکھو کنز الغرائب بیچ نادر

کسی جگہ مولانا واعظ کاشفی کے روضتہ الشہدا کا ذکر نہیں ملتا ۔ حالانکہ کہیں کہیں اور نامعلوم ماخذات کی طرف اشارات ملتے ہیں مثلاً ایک جگہ ولی فرماتے ہیں ؎

بڑا ہے جو سیر کا ایک رسالہ | دکھو اس میں حکایت یو نیرالا[2]

ایک مقام پر یہ شعر ملتا ہے ؎

جو اسمٰعیل نے لایا حکایت | ابی المخنوق سوں او کر روایت

[1] بہلو [2] نرالا

مجالس پنجم میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

کسی نسخے میں شیخ معتبر نے　　حکایت یو لکھا ہے نامور نے

مجالس دہم کے بھی ایک دو شعر اس ضمن میں قابل ذکر ہیں ؎

لکھے[1] ہے صاحب حسن الفضا نے　　دکھو سلطان علی موسیٰ رضا نے

حسین اُپر جکوئی عاشور کے دن　　رو یگا ہو کو غمگیں مرد مومن

اس کے بعد کے چند اشعار بھی لائق توجہ ہیں ؎

کریگا ترک دنیا کی مہمات　　خدا بر لائیگا سب اس کے حاجات

اگر چیتے ہی تم جنت میں جانے　　شہیدان کے سریکا اجر پانے

کریں گے یاد و اتنع شاد کا جو　　نہ تھے اس وقت ہم افسوس کرکو

اگر اچتے ہمیں اس روز رن پر　　تو جیو کرتے فدا شہ کے چرن پر

ان اشعار میں " ابکی و تباکی " کی شیعی حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یا لَیتَنِی کُنتُ مَعَهُم فَاَفُوزَ فَوزًا عَظِیمًا " کی جس کا اعادہ ذاکرین سید الشہداء اور محرم میں کربلا کے سوگ منانے والے اہل تشیع بار بار کرتے ہیں ، تشریح کی گئی ہے ۔ داخلی شواہد سے ولی ویلوری کا تشیع ثابت ہے ۔

شیعوں کی روایت ہے کہ جناب فاطمہ نے ماحول سے بہت ملول و مکدر و منغض رہتی تھیں " صُبَّت عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَو اَنَّہَا ۔ صُبَّت عَلَی الاَیَّامِ صِرنَ لَیَالِیَا " انہیں معظمہ کا شعر بتایا جاتا ہے ۔ وصیت کی تھی کہ جنازہ پر دعوت عام یا خاص نہ دی جائے ۔ ولی ویلوری نے یہ سب تو نظم نہیں کیا لیکن یہ ضرور لکھا ؎

جنازہ مج نکو کر فاش کا ڑو　　رین (رات) میں جوں نبات النعش کاڑو

مگر مناسب توجیہہ سے معاملہ کو کافی ہلکا کر دیا ہے ؎

اتھی ہیں زندگی میں جیونکہ مستور　　موی بعد از یہی اچھا ادِچ دستور

جناب سیدہ نے دعا مغفرت بھی کی ؎

[1] لہ کہے　ہے جی

مرے والد کی امت پر رحم کر — گنہ گاراں سوں سارے در گذر کر
بخشنا سکوں توں اپنے رحم سوں — کرم سوں مغفرت کرنا کرم سوں

ولی حضرت علی کی منقبت میں بھی بہت رطب اللسان ہیں ؎

علی سلطان سارے اولیا کا — علی سردار سارے اوصیا کا
خطاب سکوں امیر المومنیں ہے — خدا سوں والی دنیا و دیں ہے
امام اول از اثنا عشر ہے — فضیلت میں سبھوں سوں بیشتر ہے

کہا جائے گا کہ اکثر صوفیا بالخصوص جو اولاد علی ہونے کا فخر و شرف رکھتے تھے تفضیلی عقائد کا اظہار کرتے ہیں ۔ حضرت شاہ آیت اللہ جوہری، پھلواروی بھی "فصل بہاراں" حضرت علی کو قرار دیتے ہیں ۔ لیکن ولی دکنی کے کچھ شعر تو ایسے ضرور ہیں جو ان کے صحیح عقیدہ کی غمازی کرتے ہیں ۔ مجلس اول کا واقعہ غدیر خم سے کرتے ہیں ؎

نبی نے حج جو آخر گذارے — وداع ہو وانگے عالم سوں سدا رے
وہاں سوں چل کو او خورشید منزل — آتاریا آ غدیر خم میں محمل
ہوا اس وقت واں ایسا گرم تھا — جو خارا موم سا گلنے نرم تھا
کئے سوگند میں یانسوں نجاؤں — پچھے جو وحی ہے تمنا سناؤں
دیا فرمان دعوی تا کوئی پس و پیش — ہویں سب جمع یاں بیگانہ و خویش
ہوئے در حال حضرت پاس حاضر — عرب کے ہور عجم کے سب اکابر
جہاز اشتر انسوں بند کو ممبر — فصاحت سوں پڑھے خطبہ تمیبر
کہے مج تنسوں جیو دھنتا ہے دوری — ہوا نزدیک ایام حضوری
مشام جاں میں بوے وصل آتا — خوشحالی سوں تن تن میں جیو سماتا
مجھے رحلت کا ہوتا ہے اشارت — ضرور ہے اب ادا کرنا رسالت
سو مج یوں حکم رب العالمیں ہے — علی تیرا ازل سوں جانشیں ہے
مقرر کر اسے توں سروری پر — بنی آدم ملک جن و پری پر

ے سبھوں سے

پچھے دھرھات حیدر کا اچائے ۔ بلند آواز سوں سبکوں سنائے

کہ مج بعد از تمانے سیمیں اولا ۔ علی مولا ہیں جن کا ہیں ہوں مولا

میرا جیو تم پو تھا تعظیم رکنا ۔ علی کا اتیچ سب تکریم رکنا

سبب ہے حق تعالیٰ کی رضا کا ۔ محبت دل میں رکنا[1] مرتضیٰ کا

یونا سمجھو تمیں نفس و ہوا سوں ۔ جکچ بولیا ہوں ہیں وحیٔ خدا سوں

بزان حضرت دعا کرنے اچاہات ۔ علی خاطر کئے حق سوں مناجات

---

[1] رکھنا

اردو ہندی زبانیں

پٹنہ کے ایک انگریزی روزنامہ مورخہ ۴ ارمارچ ۱۹۷۵ء میں ایک صاحب نے اردو کے علاقائی زبان کی تحریک کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اپنی دانست میں پُرزور دلائل پیش کئے ہیں کہ اردو اس ملک کی کوئی اہم اور ہندی سے الگ آزاد زبان محض اس وجہ سے کہ ایک دوسرے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تسلیم نہیں کی جاسکتی ۔ ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی کا بھی خیال ظاہر کیا گیا ہے ۔ رسم الخط کے اختلاف یا اشتراک سے زبانوں کی جانچ اور تفریق نہیں کی جاتی ورنہ یورپی زبانوں کا مشترک رومن رسم الخط بجائے کثرت کے زبان کی وحدت کا پتہ دیتا ۔ ایک انگریز حاکم سر کیمپبیل کے الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے کہ ہندی اور فارسی کے ناجائز تعلقات کا نتیجہ اردو کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ۔ سرسید احمد خاں اور حبیب الرحمن خاں کی تحریروں کا حوالہ دے کر اردو کی تاریخی قدامت پر شبہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد بلکہ مغلیہ دور تک اردو کا وجود ہی نہ تھا جو کچھ تھی ہندی تھی ۔ جدید اردو کے جنم داتاؤں میں گلکرائسٹ گری یرسن اور ریزلے کے نام لئے گئے ہیں اور جتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان و ہنود کے درمیان کشیدگی اور نفاق کو بڑھانے اور مذہبی ثقافتی افتراق کی خلیج کو وسیع تر کر کے اپنے سیاسی اغراض کو پورا کرنے کے لئے انگریزوں نے زبان کو بنیاد کار بنایا ۔ ایک مصنوعی بناوٹی زبان کو جنم دیا اسے اردو اور ہندوستانی کا نام دیا ۔ ہندی کے ایک دھارے کو جو مسلم ثقافت کے قریب تھا لے لیا اور اسے مفرس اور معرب بنوایا ۔ بڑھایا اچھالا اور ہندی کے مقابلہ میں اسے کھڑا کیا لیکن اب بھی ایک ہمہ گیر ادبی زبان کی ضرورتیں اس سے پوری نہیں ہوتیں اور بہار کی اکثریت میں اسے مقبولیت حاصل نہیں ہے اردو ہندی سے نکلی ہندی کی خوشہ چیں اور اسی کا ایک روپ ہے جسے لوگ اردو سمجھتے ہیں در اصل

ہندی تھی اور ہے ۔ اقبال کے ترانۂ ہندی کا مشہور شعر ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

محض جہاں اور گلستاں کے استعمال سے اردو نہیں ہو سکتا ۔ یہ ہے خلاصہ یا نچوڑ ایک ایسے شخص کے خیالات کا جو تنہا نہیں جس کی حمایت میں ایک با اثر طبقہ موجود اور سرگرم عمل ہے ۔

قارئین معاصر سے راقم السطور معذرت خواہ ہے اس لئے کہ ایک روزنامہ کے مراسلہ نگار کے افکار کو اس کے صفحات میں جگہ دینا ضروری نہیں ایک ادبی پرچہ کو سیاسی مسائل یا متنازعہ فیہ امور میں الجھنا زیب نہیں دیتا لیکن اگر کوئی چیز ادبی انداز میں پیش کی جائے اور اس سے غلط فہمی کے پیدا ہونے کا احتمال ہو تو اس پر نظر ڈالی جا سکتی ہے ۔ دعویٰ و بیان کتنا ہی مفروضہ اور دلائل کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں ۔ اکثر ان کے بار بار اعادہ اور دوسروں کی ہمنوائی سے سخت مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ کم فرصت اور ناواقف حضرات جب ایک ہی بات کو کئی مرتبہ اور مختلف لوگوں سے سنتے ہیں تو انہیں اس پر یقین سا ہونے لگتا ہے کچھ بڑے بڑے لوگ جس میں ہمارے ہمسایہ پرانت کے کرتا دھرتا اور ذی علم و ذی اقتدار حضرات بھی شامل ہیں اردو کو سرے سے کوئی زبان ہی ماننے کے لئے تیار نہیں ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اردو کچھ شہری علاقوں میں بولی جاتی ہے دیہات سے اس کو واسطہ نہیں ۔ دیہاتی علاقوں میں اردو ہندی کا کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا ۔ ایک خاص مکتبہ خیال کے لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اردو بذات خاص کوئی زبان نہیں یہ ہندی کی شکل یا اسٹائل طرز نگارش یا طرز ادا ہے اگر ان میں سے ایک فارسی، عربی یعنی بیرونی الفاظ سے گرانبار ہے تو دوسری کسی حد تک قدیم سنسکرتی الفاظ سے فطری طور پر بوجھل ۔ سنسکرت کی آمیزش اتنی غیر فطری اور نامناسب نہیں سمجھی جا سکتی جتنا غیر ملکی اجنبی الفاظ کا شمول اور غلبہ ۔ اس لئے ایک طرف تو نئے سرے جاری ساری عام فہم الفاظ جو برسوں کے استعمال سے زبان کی خراد پر چڑھ کر صاف، سہل، سادہ اور پاکیزہ ہو چکے ہیں نکالے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ زمانۂ قدیم کے "شدھ" سنسکرتی شبد یا الفاظ کھوج کھوج کر مفرد یا مرکب صورت میں داخل کئے جا رہے ہیں ۔ دوسری طرف سادگی، پھیلاؤ، وسعت، مقبولیت وحدت اتحاد اور قومی یکانگت کی ضروریات جتا کر اور واسطہ دے کر مشورہ دیا جا رہا ہے کہ غیر فطری

بیرونی الفاظ یا اسلوب کو خیرباد کہہ دینے، اپنی زبان کو سہل و سادہ بنا کر عوام سے اس کا براہ راست رشتہ جوڑنے اور مشکل غیر علمی بدیسی رسم الخط کی جگہ دیس کی ہمہ گیر آسان دیوناگری لپی کو اپنانے میں ہی ہمارا مفاد، بہتری اور خیریت ہے۔ جو حضرات زیادہ شائستہ اور مہذب ہیں وہ چند کلمے ہماری تالیف قلب کے لئے بھی استعمال کر دیتے ہیں اپنے پسندیدہ اشعار کو پڑھ کر ہمیں وقتی طور پر خوش کر دیتے ہیں۔ بعضے مرعوب اور احساس کمتری سے پژمردہ ہو رہے ہیں انہیں اصل بات تو دکھائی دیتی ہے لیکن اپنی بے بسی کا دل ہی دل میں رونا رو کر تن بہ تقدیر کی تکرار کر کے بالکل سپر انداختہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنی مادری زبان کا مستقبل تو تاریک نظر آتا ہے اندیشہ ہوتا ہے کہ بدھ مذہب کی طرح شاید اردو کو بھی اپنے جنم بھومی سے دیر سویر بے وطن کیا جانے والا ہے۔ لیکن جسے زیادتی، زبردستی، نا انصافی، ناروا و نامناسب مشورہ سمجھتے ہیں اس کے خلاف بھی کچھ کہنے یا لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ حریف سمجھتا ہے کہ تیر نشانہ پر لگا۔ دلائل و براہین کی معقولیت تسلیم کر لی گئی۔ اندریں صورت ضرورت ہے کہ ایک ادبی پرچہ میں بھی تحقیقی انداز اور تاریخی پس منظر میں اردو ہندی کی نشو و نما، مابہ الامتیاز، خصوصیات، قدر مشترک اور بنیادی فرق کو زیر بحث لایا جائے اور ضروری باتوں کا جائزہ لینے کے بعد اپنی زبان کی حفاظت و بقا، ترقی و ارتقا کی تدابیر پر غور کیا جائے۔

اخبارات نے ہی ہمیں بتایا ہے کہ روسیوں کی سوویت حکومت نے تین سال پہلے ۱۹۵۱ء میں ہی روسی اردو ڈکشنری یا لغت شائع کر دی تھی اس میں بیس ہزار الفاظ ہیں اور اس سال روسی ہندی ڈکشنری نکالی گئی ہے لیکن اس کے پینتیس ہزار الفاظ میں بکثرت ایسے الفاظ ہیں جن کا زاد و بوم ہندوستان نہیں تھا۔ یقیناً یہ وہ لفظ ہیں جن کے اخراج کی تحریک کی جا رہی ہے یا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ روسی ادیب ہندی اور اردو کا براہ راست تعلق سنسکرت کے بجائے کھڑی بولی سے دکھاتے ہیں لیکن چونکہ ہم نے ان کی یہ کتابیں اب تک نہیں دیکھیں اس لئے ان کے نظریوں سے قطع نظر کر کے ہمیں غور کرنا چاہئے۔

اردو کا ہندی الاصل اور ہندی نژاد ہونا تو مسلم امر ہے مگر ہندی کا وہ مفہوم نہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان ایک بڑا وسیع ملک ہے اس کی زبانوں کی کثرت اور مختلف علاقہ جات

کی بھانت بھانت بولیوں کی طرف البیرونی اور امیر خسرو نے اشارات کیے ہیں اردو کی بنیاد قدیم
ہندوستانی بھاشاؤں پر ہے اس کا وجود اور اس کی نشو ونما روز مرہ اور بول چال کی زبانوں اور
صوفیائے کرام کی تبلیغی کوششوں کی رہین منت ہے۔ کسی غیر زبان کی لغت یا صرف و نحو پر
اس کی بنیاد قائم نہیں ہوئی۔ مختلف قوموں کی تہذیب اور زبان کے اختلاط سے ہی تو اس
کا جنم ہوا اس میں جو تغیرات واقع ہوئے وہ ناگزیر فطرتی اسباب کا نتیجہ تھے۔ اکثر چیزیں غیر محسوس
طور پر زبان میں بتدریج داخل ہو جاتی ہیں۔ سیاسی، سماجی، مذہبی، ثقافتی اثرات و رجحانات
قدرتی طور پر زبان کو چاہے وہ بول چال کی ہو یا ادبی کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں۔ زبان بنائی نہیں جاتی
(جیسا ہمارے دیس میں ہو رہا ہے) بلکہ بن جاتی ہے اور بنتی رہتی ہے مختلف سرچشموں سے فیضیاب
ہوتی ہے اردو یا ریختہ تو نام ہی ایک مخلوط مجموعہ کا ہے جو مختلف قوموں مسلمان، ہنود، عیسائی، پارسی
وغیرہ اور ان کی زبانوں کے میل جول کا ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے۔ یہ ایسی کھچڑی نہیں جس کے دانے
ان میل، ادھ کچے اور عسیر الفہم ہوں۔ اس میں تو ایک ایسی تیزی، لوچ، لچک اور گھلاوٹ ہے
جس کے سبب اغیار کا دل بھی موہ لیتی ہے۔ انشا نے ان حروف پر بحث کرتے ہوئے "جو دریں
زبان بہ تلفظ درمی آیند" دریائے لطافت میں لکھا ہے "زبان اردو عطر زبانہائے دیگر است"
جو چیز بلا سعی و ارادہ زبان پر چڑھ جائے، زبان میں داخل ہو جائے اور کھپ جانے کی صلاحیت
رکھتی ہو اسے بدعت سمجھ کر نکال دینے کی کوشش کرنا اس زبان کو نقصان پہونچانا ہے۔ زبان کی
ایسی عمداً "تطہیر" جو غیر فطری ہو اور جو اسے عام بول چال کی زبان نہ رہنے دے کبھی سراہی
نہیں جا سکتی لیکن ایسے عناصر کو جو امتداد زمانہ سے سماجی اور ثقافتی اسباب کی بنا پر اس کا
جزو لاینفک بن گئے ہوں بیرونی اور بدیسی چھاپ سمجھ کر خارج کر دینا بھی پسندیدہ فعل قرار نہیں
دیا جا سکتا۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ انگریزوں نے سیاسی اغراض کو مدنظر رکھ کر فورٹ ولیم میں اپنی
کارروائیاں کی ہوں۔ للو لال، میر امن، میر شیر علی افسوس سے الگ الگ طرز پر کتابوں کے لکھوانے
میں کوئی دور رس حکمت عملی کا راز پوشیدہ ہو مگر گریرسن اور ریزلے کو اردو کے حامیوں میں

شمار کرنا، ان کو اسے بنانے والا، پروان چڑھانے والا سمجھنا مضحکہ خیز امر ہے۔ کیٹلر تو ایک ڈچ تھا جس نے غالباً ۱۷۱۵ء میں ہندوستانی قواعد و لغت کی کتاب ترتیب دی جسے ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں چھاپ کر شائع کیا اس میں ڈچ زبان کے املا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ شیلز کی ہندستانی گرامر جو ۱۷۴۴ء میں لکھی گئی ہیڈلے کی گرامر جو ۱۷۷۲ء میں مرتب ہوئی۔ کیا انگریزوں کی کسی منظم سازش کا نتیجہ تھیں؟ بہت سے اینگلو انڈین انگریز پرتگالی جنہوں نے شائق، صاحب، مفتون، واگر، افلاطون، شور، طاموس وغیرہ کے تخلص سے بعض اچھے اچھے شعر اردو میں کہے۔ انگریزی حکمرانوں کے اشاروں پر چلتے تھے۔ حقیقت چھپانے سے چھپتی نہیں۔ یہ اردو کی دلآویزی اور دلکشی تھی جس نے ان لوگوں کے قلوب کو مسخر کیا۔ فارسی دفتری زبان کا اثر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جورج اسٹیفن منشی خوب چند ذکا کا شاگرد تھا کیا اچھا شعر نکالا:

خط کا یہ جواب آیا لکھا جو کبھی پھر خط
کر ڈالوں گا اک دم میں تجھے آن کے پرزے

میجر آرچیسٹن کی بی بی کا جمیعت تخلص تھا۔ کہتی ہے:

روٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے
اس واسطے رہتی ہوں میں مضطر کئی دن سے

جونس، متخلص بہ صاحب، میر وزیر علی صبا کا شاگرد تھا کہتا ہے:

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا
مجھ کو پہناتے ہو زنجیر پہ زنجیر عبث

کیا ایسے اشعار کسی تحریک، فرمائش یا ہدایت کا نتیجہ ہو سکتے تھے؟ جون کرشچین عرف جانی صاحب کے بھجنوں کے علاوہ جدید ہندی کا کوئی شعر ایسے لوگوں سے منسوب نہیں کیا گیا ہے۔ اگر سیاسی مصلحت کی کارفرمائی دیکھنی ہو تو بنارس میں ہندی تحریک کی ابتدا، لاہور میں اس کی ترقی اور زور پھر یوپی کی عدالتوں سے اس کے اخراج کی کارروائیوں کی روداد پڑھنی پڑے گی۔ جیمس اور گراوز کی ہندی اردو پر بحثیں بھی جاذب نظر ہیں۔ کیا عیسائیوں کے مندرجہ بالا اشعار کو بجائے اردو کے ہندی کہا جاسکتا ہے اقبال کے مندرجہ شعر میں تو بہر حال فارسی کا بہت اثر ہے کچھ اور اشعار بھی قابلِ ذکر ہیں ان میں عربی، فارسی الفاظ یا تو سرے سے غائب ہیں یا برائے نام ہیں۔ مثلاً:

چلنے والے نکل گئے ہیں	جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں
ہوائے زور سے ابھرا اٹھا اڑا بادل	اٹھی وہ اور گھٹا جو برس پڑا بادل
حیران ہے بو علی کہیں آ یا کہاں سے ہوں	رد میں یہ سوچتا ہے کدھر جاؤں کدھر کو میں
ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے	سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا
دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی	ہے دل کو تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

وغیرہ۔ ان اشعار کو بجائے اردو کے ہندی قرار دینا حقائق سے منہ موڑنا اور دونوں زبانوں کے امتیازی خصوصیات سے چشم پوشی کرنا ہے۔

بابو برج بخی لال نے ۱۹۳۸ء میں اردو کی تاریخ شائع کی اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "ہر زبان میں کچھ خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ وہ اس سے مخصوص ہوتی ہیں دوسری زبان میں وہ نہیں ملتیں" قبل اس کے کہ ہم اس نظریہ کی روشنی میں اردو اور ہندی کے فرق کو ظاہر کریں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ دونوں میں حروف افعال، اسماء صفات ضمائر روابط کا جو زبان کا بڑا جز ہوتے ہیں بہت حد تک اشتراک ہے اردو کے بہت سے ضروری عناصر ہندوستان کی بھاشاؤں درست حد تک تو اعد و صرف و نحو پر ہی مبنی ہیں۔ اگر کسی مخلوط زبان کی تشخیص و تمیز کا معیار افعال ضمائر متعلقات فعل کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے کہ حروف اسماء الفاظ بعد کی چیزیں ہیں تو اردو کو ہم ہندی نژاد کہنے میں حق بجانب ہیں لیکن ہندی کا وہ مفہوم نہیں جو لیا جاتا ہے۔ اردو میں اکثر حروف ہندی کے ہیں جیسے ٹ، ڈ، ڑ، وغیرہ افعال کا بڑا جز و ہندی کا ہے تخفیف چند مصادر عربی، فارسی سے بنائے گئے ہیں۔ اب رہے الفاظ تو لسانیات کے ماہرین نے تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ قریب پچھتر فی صدی الفاظ دیسی آریائی یا غیر آریائی ہندوستانی زبانوں کے اس میں موجود ہیں اور صرف پچیس فی صدی الفاظ کو ہی بدیسی یا بیرونی کہا جا سکتا ہے۔ دیسی اور بدیسی کے علاوہ الفاظ کی اور قسمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ تتسم اور تدبھو۔ تتسم خالص غیر مسخ شدہ سنسکرت الفاظ کا نام ہے اور تدبھو ان الفاظ کو کہتے ہیں جو نکھر کر سادہ، نرم، اصلاح شدہ تبدیل شدہ شکل میں ہم تک پہنچتے ہیں۔ اصل میں تو یہ الفاظ سنسکرت ہی کے ہوتے ہیں مگر عرصہ دراز کے استعمال سے ان کا تلفظ اور لہجہ بہت حد تک بدل جاتا ہے نرمی اور پختگی اور بعد از این دور ہو جاتا ہے اور دل کشی۔

سادگی پیدا ہوجاتی ہے۔ راتری، پرلیٹھ، شنیوار، پرتھم، دوتیہ، سندھیا وغیرہ اردو اور ہندوستانی میں رات، پیٹھ، سنیچر، پہلا، دوسرا، سانجھ یا شام ہوگے ہندی اداروں میں رجعت قہقری اصل الفاظ کو بجنسہ واپسی لارہی ہے لیکن اردو میں ان کی گنجائش نہیں البتہ کئی خالص سنسکرت الفاظ اردو میں مروج ہیں جیسے درشن، پنڈت، راجا، مہاراج، مندر، روپ ماتش وغیرہ۔

ہندی اور اردو دونوں زبانوں سے واقفیت رکھنے والا اور دونوں کی خصوصیات امتیازی پر غور کرنے والا بآسانی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان دونوں زبانوں میں بہت کچھ قدر مشترک ہونے پر بھی اردو اپنی خاص امتیازی شان رکھتی ہے اس کے صرف ونحو میں، عبارات کی ترتیب وترکیب میں، الفاظ کے اتصال والحاق میں، طرز ادا اور طرز نگارش اور اصناف شاعری میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو ہندی میں نہیں ہیں۔ اسی طرح ہندی کے بھی خاص انداز بیان ہیں، انداز نگارش ہے، تلفظ الفاظ کی خاص شان ہے۔ اشعار کی نحوی ترتیب، استعارے، تشبیہات، اندرونی جذبات اور کیفیات واردات قلبی کی تشریح بہت حد تک جداگانہ ہے۔ داخلی اور خارجی شاعری دونوں زبانوں کی یکساں نہیں۔ ایک زلف وکاکل، خط وگیسو کے پھندوں میں الجھی ہوئی ہے مگر بادہ نوشی، رندانہ سرمستی، نغمہ وسرود، رکیک ومتبذل مضامین، ایہام گوئی، رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ اردو عالموں، خداپرستوں کے زیر اثر فلسفہ وتصوف کے اعلیٰ مضامین عشق حقیقی ومجازی کے پاکیزہ جذبات، اخلاقی نصائح کا بھی گنجینہ ہے۔ اس میں پست وپوچ مضامین بھی ہیں اور اعلیٰ عاشقانہ اور غیر عاشقانہ شاعری بھی۔ بھاشائی شاعری کے کیف و درد، سوز وگداز، شیرینی اور اعلیٰ تخیل کا کیا کہنا۔ مگر جدید ہندی میں لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ بات کہاں میر مدن کی سی بہر کیف دونوں زبانوں میں کئی قسم کے فرق اور اختلاف پائے جاتے ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو ہندی سے نکلی ہے وہ اس حقیقت سے عمداً چشم پوشی کرتے ہیں کہ شمالی ہند کی بول چال کی ٹکسالی ہندوستانی زبان جو دیوناگری کی لپی میں ہندی کا روپ دھارن کرتی ہے اور عربی وفارسی خط میں اردو کہلاتی ہے دونوں کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں ——

کاروباری بول چال کی زبانوں کا اصلی ماخذ سنسکرت نہیں پراکرتیں تھیں ان پراکرتیوں سے اپ بھرنشوں یا دیشی بھاشاؤں کی صورت اختیار کی اور انہیں سے شمالی ہند کے مختلف خطوں کی بول چال کی زبانیں نکلی ہیں۔ شوراشینی مگدھی اور اردھا مگدھی اپ بھرنشو میں اول الذکر کا ہندوستانی سے گہرا اور براہ راست تعلق ہے۔ مغربی شوراشینی اور مگدھی کے بیچ میں اردھا مگدھی تھی اوّل الذکر کی شاخ برج بھاشا اور آخرالذکر کی اودھی بڑی اہم زبانیں تھیں دور دور تک شائع و عام ہوگئی تھیں انہیں میں سب سے زیادہ ادبی ذخیرہ ہے بھکتی تحریک رامائی اور کرشنائی متوں کے عالموں اور شاعروں نے انہیں مالا مال کر دیا۔ مسلمانوں نے بھی انہیں اپنایا انہیں زبانوں کے دوہے بزرگوں کے ملفوظ و مکاتیب میں ملتے ہیں بہت سے مسلمانوں نے ان میں طبع آزمائی کی اور ادبی یادگاریں چھوڑیں جو ہندی ادیبوں سے خراج تحسین آج بھی وصول کر رہی ہیں اب یہ زبانیں بول چال کی زبان نہیں رہیں دیہاتوں میں شاید کسی شکل میں بولی جاتی ہوں شہروں میں تو ہندوستانی ہی کا رواج ہے۔ چاہے اسے ہندی کہئے یا اردو۔ لیکن ہندستانی پر برج بھاشا اودھی کے علاوہ راجستھانی وغیرہ نے بھی اپنا کافی اثر ڈالا۔ عوامی زبان کھڑی تھی یعنی کاروباری۔ سادھو کڑی اور صوفیائے کرام کی وہ زبان جس میں ہندی اور اردو اپنی ابتدائی شکل میں مخلوط تھی، رفتہ رفتہ یہ نکھرتی گئی۔ اس نکھری زبان کو دو نوعیت حاصل ہوئی۔ ایک میں فارسی کی جھلک دکھائی دینے لگی دوسری میں بھکتی کے زور سے سنسکرتی تدبھو الفاظ بکثرت نظر آنے لگے۔ وہ زبان جس میں غیر سنسکرتی عنصر نمایاں ہوا ریختہ یا اردو ہوگئی اور جس زبان میں سنسکرتی الفاظ کی بہتات تھی اور اسلوب بیان میں بھی قدرے اختلاف ہوا اسے ہندی سمجھنے لگے میں نے اسلوب بیان عمداً استعمال کیا کس لئے کہ بہت سے اشعار ہندی کے ہیں جن میں الفاظ فارسی اور عربی کے ہیں لیکن انہیں ہندی ہی کہا جائے گا۔ اس کے بالمقابل بہت سے اردو شعر و کلمات ایسے ہیں جن میں عربی و فارسی کے الفاظ نہیں آئے یا بہت کم ہیں مگر اسے اردو ہی کہیں گے۔ دونوں کی مابہ الامتیاز وجہ الفاظ نہیں بلکہ اسلوب بیان، طرز نگارش یا طرز ادا ہے۔ گریرسن کا بھی یہ ہی خیال ہے

(۱) کبیر داس کے ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے۔

تورک روجہ نماج گوجرائی بسمل مانگ پکاری — ان کی بہشت کہاں ہوئی ہے سانجھے مرگی مرائی

ہندو کی دیا مہر تورکن کی نہ او گھاٹ سوتیاگی

آدم آدمی سو دہی نہیں پائی — ماما توا کہاں تے آئی

تب نہیں ہوتے تورک وہندو — مائی کے رودھر پتا کے بند ہو

تب نہیں ہوتے گائے کسائی — تب بسم اللہ کن پھر مائی

تب نہیں ہوتے کل آو جاتی — دو جگ بہشت کون اونپاتی

من مسلے کی کہبری نہ جانا — متی بہولاں دوئی دن بجھانا

کا او جو جپ منجن کیہے کا مہجد سر نائی — ہردے کپت نماج گوجرائی کا حج مکا جائی

ہندوا ایکا دسی کری چوبیس روجہ مسلمانا — گیارہ ماس کہو کن ترے ایکہی ماہ نیانا

جو کھودا یا مہجد بستو ہے ور لوک کیہی کیرا — پورب دیسا ہری کو باسا پچھم اللہ مکاما

ڈرکی بات کہہ او درویشا — بادساہے گونے بھیسا

کہاں کو نج کہاں گے مکاما — میں تو ہی پوچھو او مسلمانا

لال جرد کی تانا بانا — کون سورتی کو کرہو سلایا

کاجی کاج کرہو تم کیسا — گھر گھر جبہہ کراو ہو بھیسا

بکری موری کن پھرمایا — کس کے تو کم تم چھوری چلایا

درد نہ جانا ہو پیر کہاد ہو — بیٹھا پڑتی پڑھی جگ بھرماد ہو

دن بھر روجا رہت اور رات ہنست ہو بایا — یہہ تو کھوں وہ بندگی کیونکر کھوسی کھدایا

مولانا ماتے پڑھے مصاپہہ (مصحف) — کاجی ماتے دے نصاپہہ (انصاف)

ہندو تورک کہاں تے آیا کن یہ راہ چلائے — دل مہا کھوجی دیکھو کھوجاوے بہشتی کہاں کینہی پاوے

نہ بی مہادیو نہ بی محمد ہری ہجرت کیچہو ناہی — آدم برہما نہ بی تب ہتے ہی دھوپ نہ بی چھاہی

(۲) دھرم داس کہتے ہیں:

کبیر دین دونی درویشا — دوار سلامت لیکھا
تم روند موند میں پیرا — تم بھاکا بھسکر پھکیرا
کھالک کہلک مجھ ماہی — یو گورو گئے کبیرا
پیر محمد سو کہن جو کھولا — اللہ ہم سے پڑے بولا
ہم عبدی اللہ فرمانا — وطن لاہوت مورا استھانا
ان کیجے رج بارا ہزارا — امت کے ہم ہیں سردارا

اس کے جواب میں کبیر کا بچن دیا ہے:

کہو بھائی کہا فرمائے — کہاں تے آئے کہاں کو جائے
بے حیران نظر نہ آئے — کیسا نصیحت اللہ فرمائے

وغیرہ۔ (۳) پنجاب کے گورو نانک کا ارشاد ہے۔

راہ دو دلنے کھمو (خصم) ایکو جانو — گرو کے شبدی حو گھم پہچانو
کُدرت وید پوران کی بتب — کدرت سرب بچا
بیج وکھت نیواج گوجاری پڑھی کیتب گو رنا قرآن — نانکو کہے گورس دیی رہیو بینا کھانا
کاجی سیکھ بھیکھ پکیرا — بڑے کہادی ہوں میں تینی پیرا
کھوراسان کھسما نا کیا ہند ستان ڈرایا — آپے دو سو نہ دے ای کرتا جو کہے موگلو چڑھایا
مرنا ملا مرنا بھی کرتا رہو ور نا — نا تو ملا نا نو کا جی جانہ ہی نا مو کھودائی

(۴) ہند ہرپور کے دیوتا دیتھوبا کے مہاراشٹری بھگت نامدیو فرماتے ہیں۔

میں گریب ہیں مسکین تیرا نام ہے ادھارا — کریما رحیما اللہ تو گنی
دریا و تو دہند تو بسیار تو دھنی — دیبی لیبی ایک تو دگر کوئی ناہیں
تم دانا تو بینا میں بیچارا کیا کرے

ہندو اندھا ترکو کانا | دوہانت جنانی سیانا
ہندو پوجے ڈیہرا مسلمان مسیت | نامے (نامدیو) سوئی سیویا جہاں ڈیہرا نہ مسیت
دیہی مہجدی مت مولانا | سہج نیاج گوجرائی

(۵) رائے داس موچی کی زبان ملاحظہ ہو:

جس کے عشق آسرا ناہیں کیا نواج[1] یا پوجا | نالی دد رج ہنوج بے بجھتہ کامی کھدمتگار تمہارا
درماندہ درجواب نہ پاوے کہے رائیداس بیچارا

(۶) گردھر گوپال کی پوجاری راجستھان کی راجکماری میرا بائی کے بھجن بہت مشہور ہیں تین شعر یہ ہیں:-

سب میں میہماں تیری دیکھی کدرت کے کربان | مجھ پر تو پربھو کرپا کیجیے بندی اپنی جان
درد کی ماری بن بن ڈولوں دوئی ملانہ کو یا | میرا کے پربھو پیر مٹے گی جب بیدی سولیا ہویا
ہری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانو کوئی | سولی اوپر سیج ہماری کس بیدمی سونا ہوئی

کبیر داس کے یہ اشعار:-

کبیر شرپر سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین | کوچ نگارہ سانس کا باجت ہے دن رین
کانکر پتھر جوڑ کے مہجد[2] لئے بنائے | تا چڑھ دو ملا بانگ دے کیا بہرا ہوا کہدا[3] ئے

بابا نانک کا ارشاد:-

سانس ماس سب جیو تمہارا۔ تو ہے کھرا پیارا | نانک شاعر یو کہت ہے۔ سچے پرور دگارا

بہت مشہور ہیں۔ لیکن دادو دیال کے مندرجہ ذیل اشعار جو عام طور پر معلوم نہیں، قابل ملاحظہ ہیں:-

اللہ تیرا ذکر فکر کرتے ہیں | عاشق مشتاق ترے ترس ترس مرتے ہیں
فلک سیتیں دیگر نیس بیٹھے دن بھرتے ہیں | دیہم دربار تیرے غیر محل ڈرتے ہیں
اتن شہید من شہید رات دیوس لاتے ہیں | گیان تیرا دھیان تیرا عشق آگ جلتے ہیں
جان تیرا جند تیرا پاؤں سر دھرتے ہیں | دادو دیوان تیرا زر خرید[4] گھر کے ہیں

---
[1] نماز [2] مسجد [3] خدا [4] خرید

دادو من ہی میرا عرش تن من ہی میرا تبان   من ہو میرو تہو رمیں آپ کہے رحیمان
سوئے کاجی سوئے ملا سوئے مومن مسلمان   سوئے سیانے ست بھلے جے راتے رحیمان
دادو الکھو الاہ کا کہو کیسا ہے نور   بے حد واکو حد نہیں شکل رہا بھرپور
دادو یہ تن پنجڑا ماہے من سوا   ایک ناؤں اللہ کا پڑھے حافظ ہوا
ہندو تورو ک نہ جانو دو ئی سائیں سبنی کا ہوئے

اور نہ دوجا دیکھو کوئی کوئی رام کوئی الاہ سوئی

صاحب میرا کا پڑا صاحب میرا خوان   سو صاحب سرتاج ہے صاحب بندیران
دن دوئی صادکائی گیرا و دیکھن نیلے دیوار   تن من بھی چھین گرا و ہشت دو جگ ہی دار

رام چرتر مانس یعنی ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن ہندی کے مصنف تلسی داس جی کے دوہوں میں کافی تعداد عربی و فارسی کی موجود ہے۔

جو مینا میں نا کہے جنتی شکر کھائے   جو بجری میں ہیں کرے سہج ہی ماری جائے
تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر   فرزیں شاہ نہ ہو سکے گت ٹیڑھی تاثیر

سورداس کا کلام بھی ایسے الفاظ سے خالی نہیں مثلاً :۔

کھیت ہیت کا ہے تم تانے سین سی آواج   دیونہ جانت پار اترا مے چاہت چڑھیں جہاج

غریب اور غریب نواز کی ترکیبیں بھی ملتی ہیں ۔ اسی طرح ہندی زبان کے ایک بہت مشہور شاعر بہاری لال گذرے ہیں ۱۶۶۳ء میں یہ فوت ہوئے ان کی ایک کتاب " ست سئی " میں قریب ،، عربی فارسی کے الفاظ آئے ہیں مثلاً :۔ خیال ، بیحال ، خجل ، احسان ، عطر ، سفر ، فتح ، کرم داغ ، رخ ، سلام ، جدا ، نواز ، شکار ، چشمہ ، گمان ، احوال ، کافور ، رقم ، ملک وغیرہ کیا ان الفاظ کی موجودگی کی بنا پر ان مسلم الثبوت ہندی اشعار کو ہم اردو کا نام دے سکتے ہیں ۔
الفاظ کو ہی اگر اہمیت دی جائے تو غالب جس کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا اور جس کے

ے حافظ ۔ ے صدقہ ۔ ے دوزخ

شاندار فارسی انداز کے اشعار کے علاوہ جیسے :

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل	زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو	میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ایسے اشعار بھی موجود ہیں جنہیں ہمارے دوست شاید منبری کا نام دیدیں۔ مثلاً :

نہ سنو گر برا کہے کوئی	نہ کہو گر برا کرے کوئی
ان دنوں پھیرڑے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے	اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ	مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے	یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے
جلانے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل	ہائے اب اس سے بھی سمجھا چاہئے
کب وہ سنتا ہے کہانی میری	اور پھر وہ بھی زبانی میری
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں	ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے	کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا	کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے	نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
بے خبر گرمِ ان کے آنے کی	آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے	ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے
غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا	مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب	مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے	تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے میرا ترے آگے
رات دن گردش میں ہے سب سماں	ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید — پر یہ کیا کم ہے کہ کچھ بھی وہ میری سن کر کھلا

اسی طرح سودا کے سادہ اردو کے اشعار بھی کم نہیں :-

باندھا کنگن تیرے سکھ کرنے کو ہاتھ — کیا میں جانے بنتی کریوں بچھڑے کا ساتھ

ریت اور رسم پردی جان میں نے تس پر — دیکھنا اس کو نہ کانہ ملا بھر کے نظر

کھیلے ہے سارا اکٹھا ہو ہو سے رنگ — سمار ھنیں روتی بیٹھ ہاریں مار مار

یہ وہ موسم ہے جس میں ہر کوئی پھیر چھو آتا ہے — پنکھیرو تنکے چن چن گھونسلا اپنا بناتا ہے

اندھیری رات ہے چاروں طرف جھنگو جھنکائے ہیں — پڑا ہے اس طرح مذبوح واں زہرا کھا جایا ہے

آگے سے تو بڑا لے دکھلائے تھا سنگیں — پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

میری محنت پہ ٹک نظر کیجئے — آگے جو دل میں آئے سو کیجئے

پنکھے ہاتھوں میں اور ہونکیں ہیں — رات دن کوئلے سے دھونکیں ہیں

نے لڑنے کے حواس تجھے نے بھاگنے کا ہوش — نے سوچ مرنے کا ہے نہ جینے کا کچھ بچاؤ

ارجن کنے کمان کو تیری دکھے بھیم سے — اینٹھنے کو کھینچنا اس کا ہے سخت کار

رکھوے جمدہر کو تجھے بانکا بنایا ہم نے — اکڑ چلنے کو تجھے سب سے بتایا ہم نے

نکل کے چوکھٹ سے گھر کی پیارے جو پٹ کے اوجھل ٹھٹھک رہا ہے
سمٹ کے گھونگھٹ سے ترے درس کو نین میں جیرا اٹک رہا ہے

برج میں ہے دھوم ہوری کی ولیکن تجھ بغیر
یہ گلال اڑتا نہیں بھڑکے ہے اب یہ تن میں آگ

نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اس کو نہ دیکھا ہو — کنہیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا وہ ہرجائی

جو وہ پھیرے ہے ادھر تو یہ بھی کہتا نہیں — میں کبھی تجھی تیری بندگی انہوں کو سلام

واں لاکے مجھ کو ماریئے گردن کہ جس جگہ — پانی کے قطرہ کا بھی نہ ہووے اثر کہیں

رات جب غصہ ہو میرے پاس سے اٹھ کر چلا — میں نہ چھوڑا گو کہ دامن وہ جھٹکتا ہی رہا

جو کہا میں ہوں عاشقوں میں ترے | بولا وہ مسکرا کے یہ نہ کہو
خبر لے جلد سودا کی دگر نہ میں یہ دیکھوں ہوں | سرہانے اس کے بیٹھا ہاتھ سے تو ہاتھ ملتا ہے
جب نظر اس کی آن پڑتی ہے | زندگی تب دھیان پڑتی ہے
جو کوئی ملنے کو ان کے انہوں کے گھر آیا | ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا

حقیقت یہ ہے کہ ہم متقدمین و متاخرین شعرا کے ایسے متعدد اشعار پیش کر سکتے ہیں جنہیں بجائے اردو کے ہندی کہنا دیوانہ پن ہوگا۔ صوفیائے کرام کی نظم و نثر کے ایسے فقرے اور اشعار ہم پیش کر سکتے ہیں جنہیں بجائے ہندی کے اردو کی ابتدائی شکل کا نمونہ ہی قرار دیا جائے گا۔ ہندی کے مختلف علاقائی بھاشاؤں کو دیکھا جائے تو قدیم نمونے نظم کے تو ملیں گے، شاید ہی نثر کا کوئی ٹکڑہ نظر آئے۔ کھڑی بولی کے جو فقرے ہم تک پہنچے ہیں، مسلمان بزرگوں کی دین ہیں اور فارسی رسم الخط میں ہیں۔ ہم یہاں ایک بات صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ تبلیغی ضرورتوں سے ہمارے بزرگوں نے دیس کی زبانیں سیکھیں جنہیں قطع نظر علاقائی اختلاف کے ہندی کا نام دیا۔ بہت سے دوہرے جنہیں ہندی کہنا زیادہ مناسب ہے ان کی زبانوں پر چڑھ گئے تھے لیکن بول چال میں الفاظ کا تلفظ اور لب و لہجہ بدلا ہوا پایا جاتا ہے۔ متعلقات افعال میں بھی تغیر دکھائی دیتا ہے۔ ہوں ہئی وغیرہ کی جگہ 'ہے' نے لے لی اور اس پر فارسیت کا اثر تھا۔ حافظ شیرازی سے ایک شعر منسوب کیا جاتا ہے۔ اور ہندوستان کے قریب کل مطبوعہ دیوانوں میں پایا جاتا ہے:

ساقی اگرت ہوائے ما ہے | جز بادہ میار پیش ما شے

مقامی اثرات اور فطرتی رجحان کی وجہ سے کچھ اور بھی تبدیلیاں ہوئیں بھاشائی زبانوں میں بدیسی لفظوں کی بڑھتی ہوئی ملاوٹ اور ترکیب سے کھڑی بولی کی داغ بیل پڑنی شروع ہوئی۔ سادھو یا فقیر تو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کم از کم ان کے پیرو ان کی باتوں، مقولوں کو دور دور تک پہنچاتے رہتے تھے۔ راقم السطور نے اس سے قبل پندرھویں صدی کے ایک بہاری بزرگ حضرت ابو الفیض قاضی علا

شطاری کے نادر الوجود ملفوظ معدن الاسرار سے اپنے مورث اعلیٰ حضرت سید جلال بخاری المشہور بہ مخدوم جہانیاں جہانگشت اوچھی متوفی ۷۸۵ھ کا فقرہ نقل کیا ہے "کھندا بے پھندا کہاں" ظاہر ہے کہ حضرت قاضن مانڈو سے آگے نہیں بڑھے اور حضرت سید جلال دہلی سے اوچہ شریف واپس گئے لیکن ایک کا فقرہ دوسرے نے نقل کیا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے بہاری بزرگ حضرت منظفر شمس بلخی نے اپنے مکتوبات میں کئی ہندی فقرے یا دوہرے استعمال کئے ہیں جس کے معنی و مطلب کے سمجھنے میں ہندی ادیب کو بھی بغل جھانکنا پڑے گا اور انہیں کے مرشد کی مجلس میں جلال الدین ملتانی کے نقل کردہ فقرہ "بات بھلی پر سانکری" کے جواب میں حضرت مخدوم الملک بہاری نے فرمایا "دلیس بھلا پر دور" (معدن المعانی)۔ حضرت منظفر بلخی کے پرپوتے نے مونس القلوب میں ان کی زبان سے سنے ہوئے ایک شعر کو نقل کیا ہے:۔

آئیں رات سہائیاں　　　جن کارن دبیاں کھائیاں

اس کا مقابلہ حضرت منظفر کے مکتوبات میں جو ہندی دوہرے پائے جاتے ہیں اور معاصر میں شائع ہو چکے ہیں ان سے اور انہیں کے ہم عصر حضرت سید احمد چرم پوش بہاری کے فقرے "میتا من نمونیا شر یہی کہا ہوئے۔ اینہیں بید با بید مان میاں سر نہ کینی ہوئے" (ضیاء القلوب) سے کیا جا سکتا ہے۔ ان بزرگوں سے بھی بہت پہلے غزنوی دور کے مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کو ہندی کا صاحب دیوان بتایا گیا ہے اور امیر خسرو کی تو بہت سی مکرینوں، پہیلیوں، دوسخنوں، گیتوں، دوہوں کے علاوہ خالق باری کا بھی نام لیا جاتا ہے لیکن ان کی زبان بہت صاف ہے تقی اوحدی اور دوسروں کی مبالغہ آمیز باتوں سے قطع نظر بھی کیا جائے تو امیر خسرو کی جدت پسندی، ان کی ہندی موسیقی میں مہارت، فارسی اشعار میں ہندی الفاظ کے استعمال اور خاص کر خود ان کے بیانات کہ "من ہم قدمے در پئے ایں کار شدم" اور "جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں ایں جا رسم بذکرے پیش کردم" (غرۃ الکمال) کافی ثبوت اس بات کا دیتے ہیں کہ پرانی ہندی یا کھڑی بولی میں انہوں نے اپنے خیالات کا

ضرور اظہار کیا۔ امیر خسرو کے پیرو مرشد حضرت نظام الدین اولیا کا ایک واقعہ صاحب مطلوب الطالبین نے کتاب جوامع الکلم سے نقل کیا ہے کہ اثنار راہ میں ایک مرد کنوئیں سے پانی کھینچ رہا تھا اس کے منہ سے ایک ہندی فقرہ سنا "باہر ری بھیّا باہر" یعنی باز آئی اے برادر باز آئی۔ آنحضرت را ایں سخن آں مرد در گرفت گریہ آغاز نہاد خواجہ اقبال و خواجہ مشیر خادم کہ بالحن داؤدی برابری می نمودند ہمراہ آنحضرت بودند ایں لفظ را باآہنگ دلربا وصورت دلکشا بستہ در ہمہ راہ گویان برابر حضرت شیخ بدولت خانہ رسیدند شیخ را ازاں کلمہ ہندی تمام آنروز شوق و ذوق غالب بود دمے ازگریہ وزاری نمی سود۔ خیر المجالس کے ایک کرم خوردہ نسخہ میں مذکور ہے کہ جب مولانا جلال الدین کے حکم سے حضرت شیخ المشائخ کی دستار بندی ہوئی تو علی مولانا نے ہندی میں کہا "ارے مولانا یہ بڑا ہوئیے" جو کہا "جو منڈاسا باندھے سو پائیں نہ گرے"۔ حضرت نظام المشائخ کے پیر و مرشد بابا فرید شکر گنج متوفی ۶۶۹ھ سے بھی بھاشائی زبان میں بہت سے پند آمیز اشعار اور قافیے منسوب ہیں ان کے متعلق تحقیقی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن ان کے فقرے "پیچ سر کے" اور خوجا برہان الدین بالا ہے" (سیر الاولیا) اور ان کے "ہندی ذکر" کو جسے سولھویں صدی کے حضرت غوث گوالیاری نے جواہر خمسہ میں درج کیا ہے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت بابا فرید کے متعلق یہ بھی مرقوم ہے کہ حضرت صابر کلیری درویش کو وقت رخصت" درباب او بزبان ہندی فرمود کہ اے صابر برد ہو کہا خواہی کرد یعنی ترا عیش خوش خواہد گذشت" (اقتباس الانوار) اس کے مقابلہ میں سیر والاولیا میں جو ہندی دوہرہ "کنت نہ جو تیں کار رے نا کان سنت منائے۔ بس کند ہے مدہن کر مدن کر ہوریں بہائے" آپ سے منسوب ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرت نظام المشائخ کے ہم عصر حضرت شرف الدین ابو علی قلندر متوفی ۷۲۴ھ کے پاس علاء الدین خلجی کے اشارہ سے امیر خسرو پہنچے شیخ بزبان ہندوی گفتند" خسرو پھیری کو ترا۔ گویند خدمت امیر کلہ بر زمین بنہاد وگفت بندہ را بایں لقب می خوانند۔ خدمت شیخ شرف الدین فرمود" ازاں پھیری ہائے خود چیزے بگو" خدمت شیخ از گفتار خود ایں ابیات خواند ...... خدمت امیر خسرو

بسیار گریست دریں محل شیخ شرف الدّین ہم بزبان ہندی ایں کلمات فرمودہ اند' رونداُ عنہ کچھ بوجھنداُعنہ' یعنی ایں ہمہ کہ میگوئی چیزے فہم مکنی۔" یہاں پنجابی اثر نمایاں ہے۔ فرشتہ نے حضرت خواجہ نصیر الدّین اودھی چراغ دہلوی متوفی ۷۵۷ھ کا ایک فقرہ نقل کیا ہے "تم ادپروے نلے"۔ حضرت خواجہ بندہ گیسو دراز آپ کے مسترشد و خلیفہ تھے تاریخ حبیبی یا تذکرہ مرشدی میں مرقوم ہے "حضرت قطبی فرمودند بندگی خواجہ (نصیر الدّین) ایک کرت بر سرود ہندی ہم سماع شنیدند و آں آخری سماع بود ایں است دوہرہ۔

پچھلی رت بہاکی تھکئی ناری چار ڈھول برا مارا نو گرہ آہ کر چلّی نار

دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ حضرت سیّد جہانگیر اشرف سمنانی قدس سرہ العزیز کے ہندی مثلوں، منتروں، نفقروں کو لطائف اشرفی سے ہم معاصر میں شائع کر چکے ہیں اور حضرت حسام الدّین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ اور ان کے مرید و خلیفہ سید راجے کا بھی ذکر آچکا ہے اودھی کے اشعار اور دوہے ان بزرگوں کی زبان پر تھے۔ دوران مکالمت میں جو فقرات استعمال میں آئے کچھ ہم تک پہنچے بھی ہیں جیسے "جس تد نگر تس تد نہاگر" "تو بار بیار ادنہکا نکسار" "جو اس بادر ہووے تو کاہے پانچونہ کرے" "مسئلہ جانت فرض ہے مول۔ کو نہینولی بولی ترے قبول" ہندی دوہوں اور کلام کا نمونہ بھی حوالۂ قلم کیا جا چکا ہے حضرت حسام الدین کا ایک منتر بواسیر کے مرض کے لئے آج تک استعمال ہوتا ہے جس کا آخری نقرہ یہ ہے" دو ہائی شاہ نور قطب عالم کے پنڈوہ کے پیر کے"۔ اس میں "کے" خاص کر جاذب نظر ہے۔ حضرت نور قطب عالم پنڈوی متوفی ۸۱۸ھ کا شعر جس کا آخری مصرعہ یہ ہے "پیو نہ پوچھے پاتری مجھ سہاگن ناؤں" ان چند مشکل' دوہروں' سے بہت مختلف ہے جو آپ کے مکتوبات میں آئے ہیں۔ غرضکہ ایسی متعدد مثالیں نقرات اور دوہوں کی پیش کی جا سکتی ہیں جن کا سرمایہ تو دیسی اور آریائی ہے لیکن ایک میں ہندی کا عنصر بہت زیادہ ہے دوسرے میں بدیسی عنصر کی جھلک ہے ایک سنگلاخ ہے دوسرا سادہ بے ساختہ برجستہ اور اردو کی تبدائی ساخت کا نمونہ ہے۔

جن بزرگوں کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے وہ سب کے سب شمالی ہند کے تھے۔ افسوس ہے کہ کوئی مستقل تصنیف یا رسالہ ہندی نثر میں ان کا اب تک نظر سے نہیں گذرا حالانکہ میل جول، کاروبار اور تعلیم و تلقین کا سلسلہ سارے ہندوستان میں جاری تھا مگر دکن اور گجرات میں متقدمین کی چھوٹی چھوٹی کتابیں دستیاب ہوئیں ہیں جن سے خانقاہوں کی زبان کی ابتدائی شکل کا اندازہ ہوتا ہے گجرات کے مشائخ میں راقم السطور کے مورث اعلیٰ حضرت قطب عالم متوفی ۸۵۷ھ کا فقرہ "لوہے لکڑ یا پتھر ہے کیا ہے" اور ان کے صاحبزادے شاہ عالم کا جملہ "چشتیوں نے پکائی بخاریوں نے کھائی" کتابوں میں مرقوم ہے حضرت شیخ وجیہہ الدین تو بڑے عالم تھے اور ہندی میں تعلیم و ارشاد بھی دیتے تھے۔ بحر الحقائق میں ان کا مقولہ درج ہے" اس بین ہور کیا خوب ہے اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہوئے" "عارف اسے کھویں جو خدا سوں بہریا ہووے"۔ معاصر کی گذشتہ اشاعت میں راقم السطور نے ایک قلمی مجموعہ کا مجملاً ذکر کیا ہے اور حضرت سید محمد حسینی الملقب بہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ کی معراج العاشقین۔ رسالہ وجودیہ از حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ ولد شاہ برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ اور رسالہ لیلی مجنوں کی طرف توجہ دلائی ہے یہاں معراج العاشقین کی ایک چھوٹی سی عبارت درج کرنا کافی ہے "نبی کہے تحقیق خدا کے درمیان سے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھیالے کے اگر اس میں تے ایک پردہ اٹھ جائے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ ہور ایک وقت ایسا ہوتا ہے سمجھو اور دیکھو۔ بے پردہ۔ اندھارے کے اوجالے کے عارفاں پر ہے۔ واصلاں پر پردے نورانی۔ وے واصلاں کا پردا ہوتا ہے محمد کا نور۔ اے عزیزاں اول ربوبیت کا پردہ سوائے تن جمالی جسم کے پردے کو آنیں سکے۔ باج اس جمالی الوہیت کے پردے ممکن الوجود کوں آنیں سکے"۔ حضرت امین الدین اعلیٰ متوفی ۱۰۸۶ھ کے ایک رسالہ تصوف کا خاتمہ یوں ہوتا ہے۔" قولہ تعالیٰ وفی انفسکم افلا تبصرون۔ خدا کہیا میں تمہارے تنا میں ہوں وے دے تمہیں دیکھتے نہیں۔ منجے مقصود اس میں مرید منتہی خدا کا وصل۔ ہور قریب ہور یگانگی تمام ہے۔ ہور جیکوئی مبتلائے درد مند ہے اسے سب صحت ہے۔ اگر کوئی

عارف اچھے تو اس میں قرآن کے تیس سپارے ہو ر ایک سو چودہ صورتاں ان میں تمام ہیں"۔ الفاظ و مذہبی رنگ کے علوے کے علاوہ زبان کی ساخت طرز ادا اور اسلوب بیان سے واضح ہے کہ یہ عبارتیں ہندی کی نہیں، ابتدائی دکنی اردو کا نمونہ ہیں۔ ان میں ہندی زبان کی خصوصیات لفظی و معنوی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ کیا یہ بات کبھی قابل غور نہیں کہ ہندی کے پرستار اپنے دعوے کے ثبوت میں قدیم دکھنی نثر و نظم کا کوئی مختصر رسالہ بھی ہندی رسم الخط میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ محض یہ کہدینا کافی نہیں کہ یہ سب چیزیں تو ہندی کی ہیں جو اردو خط میں لکھی ہوئی ہیں۔

راقم السطور نے کہیں پڑھا ہے کہ بہ نسبت شمالی ہند کی اردو شاعری کے دکن کی ابتدائی اردو شاعری پر فارسی کا نہیں ہندی کا غلبہ تھا جو رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ فارسی عروض کی پابندی نہ تھی۔ اکثر بحریں ہندی کی رائج تھیں۔ اصول و قواعد سے بے پروائی برتی جاتی تھی ترکیب و ترتیب پر بھی ہندی کا اثر تھا خوبیاں بھی تھیں بیان میں سادگی تھی اور بے ساختگی بجائے مرد کے عورت کے ذریعہ اظہار محبت کیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کے خاک کی بنیاد فارسی کے نمونہ پر قائم ہوئی بہت سی چیزوں اشارات خیالات جذبات صنعتوں اور تشبیہات پر ایرانیت اثر انداز ہے۔ ہندی بھاشائی شاعری کی خوبیوں سے انکار نہیں فطرتی جذبات اور قدرتی مناظر کی عکاسی جس فراوانی سے اس میں ملتی ہے اور اس میں جو معنویت اور مٹھاس ہے اس حد تک شاید ہی اردو میں ملے۔ مگر ہمیں تو فرق ان دونوں زبانوں کی شاعری میں دکھانا ہے دونوں کے عروض و قواعد اور صرفی و نحوی خصوصیتوں میں اختلاف ہے۔ اصناف شاعری بھی مختلف ہیں۔ ایک کی غزل نعت، منقبت، قصیدہ، رباعی، مسدس، مخمس، مثنوی واسوخت اور دوسرے کے بھجن، کبت، چھند اور ان کی قسمیں دوہے، چوپائیاں، چوبدہ، سورٹھے، اریل، کونڈلیا وغیرہ ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہیں۔ اردو معیاری اشعار کی نحوی ترتیب ایسی باقاعدہ اور خوب صورت ہوتی ہے کہ نثر و نظم کا فرق نہیں معلوم ہوتا کیا انیس کے اشعار کی کچھ دوسری ترتیب نثر میں ہو سکتی ہے۔ غالب، سودا، اقبال کے جو اشعار اوپر دیئے گئے ان میں بھی یہ خصوصیت واضح ہے اگر کوئی لفظ ضرورتاً آگے پیچھے آجاتا ہے تو گراں

نہیں گذرتا۔ شیخ چاند مرحوم نے دیوان سودا سے جو ۱۱۷۴ھ سے پہلے مدوّن ہو چکا تھا کچھ پہیلیاں اپنی کتاب میں دی ہیں ٹھیٹ ہندی میں ہیں۔ آتشبازی کی پہیلی یہ ہے:۔

رات سمیں اک میوہ آیا — پھولوں پاتوں سب کو بھایا
آگ دے وہ ہووے لاکھ — پانی دیوے وہ جائے سوکھ

نرگس کی پہیلی یوں بجھاتے ہیں۔

تریا اک سبھا کے بیچ — روپا سونا واکے سیس
مینا جیسے واکے پانوں — پیری جیسے واکا ناؤں

اس میں اردو ہندی کی خصوصیت نمایاں ہے۔ سودا نے بھاشائی زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانہ میں دیوان سودا کا ایک قدیم نسخہ ہے جس سے چند اشعار معاصر میں شائع ہو چکے ہیں اور بقیہ بعد میں شائع کئے جائیں گے ان میں یہ بات نہیں ایک شعر یہ ہے:۔

کر پچکاری کر موہن لے پھینکت گدی اوبیچ اوبیچ
دیکھ پران پیاری دھورائیں اپنی نین نہ میچ

موجودہ دور کے ترقی پسند ہندی شاعر اردو سے بھی کافی متاثر ہوتے ہیں لیکن ان کی ہندی کویتائیں اردو اشعار سے مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ بھوپال کے نئے پندرہ روزہ اخبار آرٹ و کلچر مورخہ ۱۵؍ مارچ ۱۹۵۴ء میں ہندی زبان کے مقبول شاعر نیرج ایم۔ اے کے مجموعہ "پران گیت" کے کچھ ٹکڑے شائع ہوئے ہیں۔ نیرج کی ہندی کویتائیں ہندی کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

(۱) رہ چکی بہت برسات قید میں میگھوں کی — اس کو اب زمین پر اتارنا ہی ہوگا
شرمیلے بنکے سورج چاند ستاروں کو — پانی کا یہ گھونگھٹ اگھارنا ہی ہوگا

(۲) نرجیو پڑے کھلیان کھیت دم توڑ رہے — ہیں سسک رہے بن باغ کراتے سائے
ہو گئے پیلیا سے پیلے سب پیڑ پات — جبر گئی لوؤں کی لپٹیں چراگاہ پیاسے

(۳) ہل کی ہلکی (دبچکی) بندر ہی ہے ہانپتا ہے منیا ۔ ڈوبا ہوا گھر پی اسائے اناتھ کڑالی ہے

ہے سانس ٹوٹتی مرد جواں ہتھوڑے کی ۔ بجھوے آتائے نئے دھان کی بالی ہے

(۴) سوکھے سے ہیں بہار کنوئیں واپی تڑاگ ۔ پیاسے سیمٹے پنگھٹ پریت گگریوں کے

غش کھا کر بیٹھی ہیں خاموش نہر ندیاں ۔ ہیں ڈھیر سے تٹ پر کنکال ٹھٹھڑیوں کے

(۵) پھولوں کی لاشوں پر کھلتے بھونرے بچھار ۔ مردہ تتلیاں کفن اوڑھے ہیں کلیوں کا

چڑھتا آتا ہے سمیرن کو کالا بخار ۔ سب خون تپ دق چوس گئی ٹنڈ کلیوں کا

زبان چنداں مشکل نہیں عربی فارسی کی بھی آمیزش ہے ۔ تپ دق ، مرد جواں کی ترکیب عموماً ہندی میں نہیں ملتی ۔ عطف و اضافت گل و بلبل سر دریا وغیرہ تو فارسی دار وکی چیزیں ہیں ۔ جدید ٹکسالی ہندی میں تو شدھ شبد اور اردو والوں کے لئے نرالی ترکیبیں ہی دیکھنے میں آتی ہیں ۔ مگر شاید ہی کوئی سر پھرا ان اشعار کو اردو قرار دے ۔ پیڑ پات کی ترکیب خالص ہندی ہے جس میں کا ۔ کی ۔ کے ۔ کو مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان محذوف کر کے اختصار کی داد دیتے ہیں اردو میں اسے پیڑ کے پتے کہیں گے نحوی ترکیب و ترتیب میں ہندیت ہے اردو کو دخل نہیں ۔ ہندی اردو دانوں کا ادبی ذوق کتنا مختلف ہے ۔ دم توڑ رہے کا اختصار ایک کو اچھا لگے گا دوسرے کے لئے گراں گذرے گا ۔ ایک شعر ہے :۔

وہ گانے لگے آم کی ڈال ڈال جھولا ۔ وہ لال بجا ہوگئی کماری کوئلیا

کل الفاظ ہندی اردو کے لئے مشترک ہیں مگر طرز ادا ، عروض ۔ اسلوب اور نحوی ترکیب ہمارے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتی ' وہ ' اور ' یہ ' کا تلفظ اردو ہندی میں مختلف ہوتا ہے ہندی میں حرف اول پر فتح دے کر بولتے اور ندرے کھینچ کر

---

(۱) بیوہ ۔ (۲) بے سہارا ۔ (۳) یتیم ۔ (۴) باولی ۔ (۵) جھاڑ

(۶) ہڈیاں ۔ (۷) راستہ ۔

پڑھتے ہیں۔

ہندی قدیم زبانوں کی طرح SYNTHETIC یا ترکیبی ہے تو اردو ANALYTICAL یا تجزیاتی چناؤ میں کونگرس دوار اکئی جگہیں جیتی گئیں اور کونگرس نے چناؤ میں کئی جگہیں جیت لیں۔ اکثر ہندی الفاظ جو عام بول چال میں موقوف ہو گئے تھے اب اردو میں متروک ہیں مگر ہندی میں ان کی گنجائش باقی ہے۔ اکثر الفاظ اردو میں گنوارو کہلائیں گے مگر ہندی میں ان کی کھپت ہے۔ میگھ، نبھ (سورج) الو انا نرجیو پات، ودھوا، اسائے، واپی، تڑاگ، سمیرن، نٹ، پتھر وغیرہ کے لئے اچھے خاصے آسان سادہ "تدبھو" الفاظ اردو میں موجود ہیں۔ شِگر، سمئے، ست، سونبرت (خون) سس (سر) پگ (قدم) اکولایت (بے چین) کر (ہاتھ) نیر (آسمان) ابھیمان (گھمنڈ) سویم (خود) چھکنا۔ دکل (بیکل) بیدی، ادہرا، بواڑ (باولا) رنبھانا (جنجنا) پرنٹر (ہٹ) وناش (تباہی) وغیرہ الفاظ جو آرٹ و کلچر میں شائع شدہ ٹکڑوں میں آئے ہیں۔ شاید ہی اردو میں جگہ پا سکیں۔ مترادف آسان الفاظ جو زبان پر چڑھ چکے ہیں موجود ہیں۔ مائی، مامی، کاکا، چاچا، لگنا، ساسو، سب سر، لگائی، گورو، کرپا، بیلا، باٹ، پرنتو، بیدی ساکھی (گواہ) لیکھنی (قلم) مدھ وغیرہ اب شاید ہی جدید اردو میں نظر آئیں۔ اب تو اردو میں تعریب و تفریس ہے تو ہندی میں سنسکرت اور گنوارو بولیوں کی طرف جھکاؤ ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا گو اس کے حسن و قبح پر بحث کی جا سکتی ہے۔ جن مصادر میں عربی و فارسی کی کارفرمائی ہے ان کی اب شاید جدید ہندی متحمل نہ ہو سکے۔ مثلاً نوازنا، بوکرنا، بخشنا، لرزنا، چشمک مارنا، شوریدہ، نگراں، رکابدار، مددگار، تلاش کرنا، شمار کرنا، معاش گذارنا، باور کرنا، التماس کرنا وغیرہ برعکس اس کے ہمایت ہونا، سپت کھانا، بھوجن کرنا، آشنکا کرنا، چرن برسنا، ڈھاہ کھانا، کشٹ دینا، بڈکی مارنا، سکھ کاری کرنا، باٹ جوہنا، نشچے رہنا، کوشل ہونا، مکھو رکھنا، وغیرہ اردو ادب میں شاید ہی مقبول ہو سکیں۔ اردو کے محاورات اور ضرب الامثال

در اصل بھاشا کی پیداوار ہیں ان کی ہیئت کذائی میں تصرف یا ردوبدل آسان
نہیں مثلاً چار چاند لگنا کو ہم پانچ یا آٹھ چاند لگنا کبھی نہیں کہیں گے۔ بہت کچھ
اردو اور ہندی میں اشتراک ہے لیکن کہیں کہیں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ بال بیکا
ہونا ہندی میں بال بانکا ہونا ہوگیا ہے۔ گھام کھانا، جائے جائے کر۔ لمبی سانس لینا
اردو میں مستعمل نہیں۔ یہ۔ وہ۔ ہونٹھ (اونٹھ) وکیل وغیرہ سے لب ولہجہ اور الفاظ
کے تلفظ میں اختلاف کا اندازہ ہوتا ہے۔ عربی الفاظ جن میں ن کے بعد ب ہو تو
اسے م پڑھتے ہیں جیسے منبر، منبع۔ ہندی کا انبرت اردو میں امرت ہوگیا۔ ہندی اسماء
جن کے آخر میں الف یا ہائے مختفی ہو ان کے بعد اگر کا۔ کو۔ سے۔ میں وغیرہ آتے ہیں
تو اس الف وغیرہ کو ی سے بدل دیتے ہیں لیکن عربی و فارسی الفاظ میں ایسی تبدیلی
واقع نہیں ہوتی۔ مثلاً دوا میں پانی نہ ملاؤ۔ اسے ہندی قاعدے سے کہیں گے دوے
میں پانی نہ ملاؤ۔ دانا کو ناداں سے نہ ملاؤ۔ کپڑہ میں آگ لگ گئی۔ ہندی میں کہیں گے
کپڑے میں آگ لگ گئی۔ بیٹا کا لفظ ہندی ہے اس کے بیٹے سے پوچھو۔ اردو میں
کہیں گے اس کے بیٹا سے پوچھو۔ عربی قاعدے سے الف لام تحریر میں استعمال تو ہوتا
ہے لیکن تلفظ میں نہیں آتا جیسے فصیح الدین۔ شمس الدین حروف شمسی اور حروف
قمری سے ہندی کو کوئی سروکار نہیں۔ ہندی کی الف مقصورہ کو ی سے لکھتے ہیں لیکن
الف کا تلفظ ہوتا ہے جیسے عیسی موسی یہ ہندی میں نہیں۔ اصطلاحات کے اختلافات
وحید سلیم اور ڈاکٹر رگھو بیر کی کتابوں سے واضح ہو جاسکتے ہیں تذکیر و تانیث کا
اختلاف چنداں اہم نہیں مگر صرف و نحو کا فرق ضرور درخور اعتنا ہے گری یرسن نے
ایک جملہ لکھا تھا "سر جھکا کر ناک رگڑتا ہوں اس اپنے بنانے والے کے سامنے"
اور بتایا تھا کہ اس میں عربی فارسی کا کوئی لفظ تو نہیں مگر یہ ہندی نہیں اردو ہے
یہاں فعل کا استعمال قابل غور ہے۔ راقم السطور کے سامنے اس وقت ایک ہندی
پرچہ ہے جس کے ایک جملہ کا آخری فقرہ "مریض اپنی عمر کے حساب سے کافی کمزور

دکھ رہا تھا۔ بتا رہا ہے کہ یہ ہندی ہے اردو نہیں۔ دوسرا فقرہ ہے" اس کا مونہہ بہت پیلا اور دور بل سا دکھ رہا تھا" الغرض باوجود بہت سی باتوں میں اشتراک کے اردو کی انفرادیت مسلم ہے اب رہا اس مخصوص زبان، اسلوب بیان اور طرز نگارش کی مقبولیت کا سوال اور خاص کر یوپی اور بہار میں اس کے علاقائی زبان تسلیم کئے جانے کا مسئلہ تو اس کا حل تو سیاسی حضرات ہی ڈھونڈھ نکالیں گے ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کتنی ہے ایک بین الاقوامی ادارہ سے دنیا کی سب سے کثیر الاشاعت زبانوں میں انگریزی، چینی، روسی وغیرہ کے بعد شاید اردو یا ہندوستانی کا ہی نام لیا گیا تھا مگر کہا جائے گا کہ اس سے مراد ہندی ہے ہم لاکھ کہیں کہ اردو کی ادبی روایات ہندی کے مقابلہ میں بہت قدیم ہیں بول چال کی حیثیت سے شمالی ہندوستان کیا سارے ہندوستان بلکہ ایشیا کے اکثر ممالک میں اس کا خاص مقام ہے۔ اخبارات و رسائل کے اعتبار سے بھی یہ کثیر الاشاعت ہے۔ اسے ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں پارسیوں سب نے مل کر پروان چڑھایا اور یہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے جو لوگ اقتدار اور تعداد کے زعم میں اس کے استیصال پر کمربستہ ہیں کب ہماری سنیں گے۔ مگر اردو میں خود ایسی صلاحیت موجود ہے جو اس کی بقا و ترقی کی ضامن ہے۔ ہم جب تک باقی ہیں اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ قومی زبان کی حیثیت سے ہمیں ہندی سیکھنا ہے بلکہ اس کی ترقی میں ہاتھ بٹانا ہے لیکن جس زبان سے ہماری روایات وابستہ ہیں جو ہماری مادری زبان ہے جس میں لچک ہے پھیلاؤ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے اس کی اشاعت و ترقی کی ہر امکانی کوشش ہمارا فرض اولین ہے ہم نہ اس کا نام بدلیں گے نہ اس کا رسم الخط ترک کریں گے نہ اس کے حروف تہجی الفاظ کے املا و انشا میں کوئی تبدیلی گوارا کریں گے نزاع کو نزا اطلاع کو اطلا ہم نہیں لکھیں گے نہ ث ص ذ ظ وغیرہ کو ایک کریں گے زبان اور ادب میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اردو کا رسم الخط تو اردو

بولنے والوں کی کثیر تعداد کے لئے مذہبی رنگ بھی رکھتا ہے جو لوگ اردو کو ناقابل تقسیم
تر کر مشترکہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں وہ بھی سے ہندوستان کی ۱۴ بڑی بڑی زبانوں
میں ایک زبان ماننے پر مجبور ہیں اگر انہیں ہندی کے پرچار کا ادھیکار ہے تو ہمیں
بھی حق پہنچتا ہے کہ ہم اردو کے لئے آئینی جدوجہد کریں اور اپنے اور اپنے بچوں
کے لئے اس کی حفاظت و ترقی کا بندوبست کریں ۔ اردو کا ماضی بڑا شاندار رہا ہے
ہمیں اس کے مستقبل کو اور بھی شاندار کرنا ہے ہم اپنے بزرگوں کی سیکڑوں سال
کی کوششوں پر پانی پھیرنا نہیں چاہتے اردو کا سوال ہماری معاشرت اور ادب کی
زندگی اور موت کا سوال ہے ۔

اوراقِ پارینہ

جناب مولانا حکیم سید محمد شعیب صاحب قبلہ پُھلواروی کے یہاں جو بیاضیں ہیں ان میں سے ایک ابوالقاسم صاحب (ولادت ۲۰ صفر ۱۱۹۹ھ)، برادر حضرت ابوالحسن، فرد کی ہے۔

ایک ورق کے صفحہ اوّل پر ساڑھے چھ ہندی اشعار ہیں جن کا پہلا شعر ہے۔

پی سے اور نہ کوئی پیارا بوجھ بچار دیکھ سنسارا

اور آخری شعر حاشیہ پر یہ ہے

کر سا کر وٹک درس دکھاؤ ان نینن کی تپش بجھاؤ

اس کے دوسرے صفحہ پر چار سے کچھ زیادہ اشعار ہندی ملک محمد جائسی کی پدماوت سے ماخوذ باقی رہ گئے ہیں۔ باقی حصہ پر صرف سادہ کاغذ جوڑ دیا گیا ہے۔ اس بیاض میں میر کی مطبوعہ مثنویوں کے اشعار بھی ہیں جن کے آخر میں ابوالقاسم صاحب کا یہ شعر ہے:-

تمام اب ہوئی مثنوی میر کی نفی میر کو کیا زباں حق نے دی"

آج سے نو دس سال پہلے راقم الحروف کو جناب حکیم صاحب قبلہ کے مرتب کردہ نسب نامہ بزرگان محلہ کریم چک چھپرہ ضلع سارن کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس میں علاوہ نسبی سلاسل کے کچھ مختصر حالات بھی مندرج ہیں۔ حکیم مولانا شاہ نعمت اللہ پھوال پوری کے ایک قلمی رسالہ مورخہ ۱۱۹۶ھ سے ضروری اقتباسات اخذ کر کے اور اصل عبارت بھی دیکر مولانا حکیم شعیب صاحب نے یہ نسب نامہ مرتب کیا۔ کریم چک کا محلہ حضرت حاجی الحرمین مخدوم شاہ عبدالکریم حسامی چشتی مانک پوری کے نام پر آج سے قریب یہ تین سو سال پہلے سے آباد ہے۔ حاجی الحرمین صاحب کا سلسلہ نسب گیارہ واسطوں سے پندرہویں صدی عیسوی کے مشہور چشتی صلائی بزرگ حضرت شاہ حسام الدین فاروقی

مانک پوری سے ملتا ہے۔ جن کے متعلق ناچیز کا ایک انگریزی مقالہ ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔ حضرت عبد الکریم بھی اپنے اجداد کے اوصاف سے متصف تھے اور آپ کا خاندان ہمیشہ علم و فضل و ورع و تقویٰ کے لئے مشہور رہا ہے۔ "سہ بار دولت حج و طواف بیت اللہ حاصل فرمودند و سہ مرتبہ خود را برائے رفع مافرق معصومان و بیوہ فروختند"۔ ایک مرتبہ ایک غریب بیوہ اور اس کے تین چار بچوں کی مسلسل فاقہ کشی سے متاثر ہو کر آپ نے اس معصومہ کو بوقت تمام راضی کیا۔ "چوک شہر" میں لے جا کر انہیں بردہ فروشوں کے ذریعہ بیچ ڈالے۔ "فریب نرنگی" نے خرید کر "خدمت اسپ" "چیز خدمت خاص" پر مامور کیا جب تبدیل مذہب پر زور دینے لگا "آپ نے فرمایا" شما کور ز خدمت است نہ کار از دین" "ظلم و ستم پہ اتر آیا۔ بارے" پیران فرنگیہا کہ پادری می گویانند" کا اس طرف گذر ہوا۔ دوران مکالمہ میں حضرت کے علم و فضل کا اسے علم ہوا اور اس نے رہائی دلوائی۔ آپ نے پھر بیت الحرام کا رخ کیا۔ واپسی آنے کے بعد حضرت شاہ ۱۰۳۶ھ اور میر ہاشم (مدفون بکولہوالی جونپور) کے ساتھ کئی جگہ گھومے۔ "عبور گنگ کردہ در پرگنہ مانجھی سرکار سارن برابر دھیانوں کہ سابقاً تمامی دشت و بیابان بود بر لب دریا استقامت فرمودند" "مشکل تمام" صد بیگہ زمین عوض قبول افتادہ عبادت خانہ تیار گردیدہ کریم چک بنام جلیل القدر آنجناب گردیدہ"۔ آپ کا انتقال کامروپ میں ہوا۔ لاش آپ کے خلیفہ حضرت پیر محمد سلونی متوفی ۱۰ محرم [illegible] کے ایما پر اور آپ کی وصیت کے مطابق محلہ لنگری محلہ میر معصوم تیار لائی گئی۔ پھر مانک پور میں پہنچائی گئی جہاں آپ مدفون ہیں۔

آپ نے موضع مہولی میں بنت سید عبد الرسول سے نکاح کیا تھا جس سے حضرت عبد الحکیم متولد ہوئے۔ ان کے اکلوتے بیٹے شیخ عبد اللہ فاروقی کریم چکی کو حالت نماز میں تاجپور ضلع سارن سے کچھ ایک جنگل میں تالاب کے کنارے کافروں نے شہید کر ڈالا۔ آپ کے چھ بیٹوں میں زوجہ اولیٰ سے شاہ محمد افضل اور محل ثانی سے جو آپ کی سالی بھی تھیں، پانچ بیٹے ہوئے۔ جن میں سب سے مشہور "قدوۃ السالکین محمد انور قادری نقش بندی" تھے۔ انہیں [illegible] میں دربار اورنگ زیب عالمگیر سے فرمان مدد معاش عطا ہوا۔ جسے انہوں نے اپنے برادرزادوں کے نام کرا دیا۔

اور خود با اقتدار افغانان سارن محمد ولی خاں و محمد اشرف خاں کی زمین داری مصطفےٰ پور عرف بھوال پور پرگنہ گوہ سرکار سارن میں اراضی خرید کر ۱۲۶۰ھ میں مکان تعمیر کرایا جو تکیہ شاہ انور کے نام سے بہت مشہور رہوا۔ صاحب تذکرہ حکیم شاہ نعمت اللہ انہی شاہ انور کے پوتے تھے۔ شاہ محمد افضل متوفی ۱۳۳۱ھ ابن شاہ عبداللہ شہید کے تین جلیل القدر صاحبزادے حکیم فصیح اللہ، حکیم مسیح اللہ اور شاہ عزت اللہ تھے۔ اول الذکر کو جو مہاراجہ سندر سنگھ بانی بکاری راج کے طبیب خاص تھے، اولاد ذکور نہ تھی صرف تین بیٹیاں تھیں ان میں سے ایک کی شادی کجھوہ ضلع سارن میں میر سید امام علی عرف بڑے میر صاحب سے ہوئی جن کے صاحبزادے مشہور دیوان سید ناصر علی راقم السطور کے بزرگوں میں تھے، دوسری بیٹی شاہ عزت اللہ کے چار بیٹوں میں سب سے بڑے اور بزرگ حضرت واصل با لحق حکیم شاہ فرحت اللہ عرف حسن دوست سے ہوئی۔ حضرت شاہ فرحت اللہ ۸۵ سال کی عمر میں بمقام کجھوہ ضلع سارن یعنی راقم السطور کے وطن میں بروز ۹ شعبان ۱۲۲۶ھ فوت ہوئے۔ وہاں سلطان احمد اپنی خواہر کے داماد کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ ان کے "پسر ہم زلف دیوان ناصر علی" نے تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا۔ لیکن ان کے صاحبزادے حکیم شاہ مظہر حسن کے اصرار سے نعش کریم چک پہونچائی گئی جہاں مزار اب بھی موجود ہے۔

حکیم شاہ فرحت اللہ نے تکیہ میتن گھاٹ شہر پٹنہ کے مشہور ابوالعلائی بزرگ حضرت مخدوم شاہ محمد منعم متوفی ۱۱۸۵ھ کا زمانہ پایا تھا۔ "منعم پاک" بہاری تھے لیکن پچاس برس آپ نے دہلی میں گذارے اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ آپ شاہ اسداللہ کے مرید تھے جن کا سلسلہ ارادت حضرت فرہاد خدا نما اور حضرت دوست محمد کے واسطوں سے حضرت ابوالعلا اکبر آبادی تک پہونچتا تھا۔ حضرت دوست محمد کی "بیہم کہانی" ہندی میں بہت مشہور ہے۔ مخدوم منعم پاک بھی شاید کبھی کبھی اردو میں اشعار کہتے تھے۔ شاہ وحید الحق پھلواروی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مکتوب مخدوم کا جناب شعیب صاحب قبلہ نے راقم السطور کو دکھایا۔ یہ خط جو ایک مرید کو لکھا گیا تھا۔ اس میں بس اس قدر عبارت نظر سے گذری "چنداں کہ خود را غرق دیدی فرق دیدی دربارۂ منعم بے چارہ کہ نگاشتہ اند۔ منعم بے چارہ نہ ایں جا است نہ آنجا است۔"

یار جس دم کو منہ دکھائے گا　　　　اس گھڑی کچھ نظر نہ آوے گا

الغرض حکیم شاہ فرحت اللہ "بعد الفراغ علوم ظاہری" چھپرہ سے پٹنہ پہنچے اور منعم پاک کی خدمت میں تربیت و ارشاد کے لئے حاضر ہوئے۔ مخدوم محمد منعم نے انہیں اپنے اکمل الخلفاء مخدوم شاہ حسن علی پھلواری (ولادت ۱۱۴۴ھ وفات ۱۲۲۲ھ) کے حوالے کیا۔ مرید و پیر میں بڑی محبت تھی۔ پیر نے مرید کو حسن دوست کا لقب دیا۔ ایک مرتبہ حکیم فرحت اللہ نے چھپرہ سے شاہ حسن علی کو لکھا کہ دعا کیجئے کہ جو مریض مجھ سے رجوع کرے اچھا ہو جائے۔ آپ نے جواب دیا "جو علاج پذیر ہو ایسے مریض کو اپنے ہاتھ میں لو، باز نوشتند بر ہمن نیم کہ کار گوفت کنم و بر علم غیب آگہی یابم"۔ ایک نسخہ میں یہ فقرہ درج ہے "برہمن کون بنے بار بار تپرا"" دریا بخش ایما شد ہر کرا زندگی باشد پیش تو آید ہر کہ میرد نزد تو نہ رسد"۔ کہا جاتا ہے کہ جو بھی مریض حضرت فرحت اللہ کے پاس آیا اچھا ہی ہو کر واپس ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت شاہ حسن علی بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ بارہ سال کی عمر میں "برائے تحصیل علوم در شہر عظیم آباد آمدند"۔ انیس سال کی عمر تھی جب حضرت منعم پاک دلی سے آئے اور آپ ان سے منسلک ہوئے۔ گھاٹ خواجہ کلاں میں مکان خرید کر رہنے لگے۔ مہاراجہ کلیان سنگھ ان کی اور ان کے پیر و مرشد حضرت عشق منعم پاک کی بڑی عزت کرتے تھے اور خلق خدا کی حاجت روائی کے لیے سفارشیں قبول کرتے تھے۔ آپ نے ساری عمر تجرید و تفرید میں بسر کی۔ آپ کبھی کبھی ہندی دو ہے بھی نظم کرتے تھے۔ آپ کا ایک دوہا آپ کے مرید و خلیفہ حضرت حیات اللہ ابوالعلائی نے حجۃ العارفین میں نقل کیا ہے جو بہت خوب اور آسان ہے ؎

دکھ موں سبھ کوئے ہر بھجے　　اور سکھ موں نا ہی کوئے
سکھ موں سب کوئے ہر بھجے تو دکھ کاہے کو ہوئے

آپ کے مکتوبات کے کئی قلمی نسخے مقالہ نگار کی نظر سے گذرے ان میں ایک خط اس وقت کی اردو میں ہے معلوم ہوا ہے کہ حضرت شاہ حسن علی اور حضرت شاہ فرحت اللہ کی خط و کتابت کبھی کبھی اردو میں بھی ہوتی تھی چنانچہ بہار شریف میں رخشاں ابدالی صاحب کے پاس

حضرت شاہ فرحت اللہ کے دو تین خطوط اردو کی موجودگی بتلائی جاتی ہے ۔ خدا کرے یہ مل جائیں تو بہار میں اردو کے خطوط کے موضوع پر ایک کارآمد مواد کو پیش کرنے کی نوبت آئے ۔ اردو میں خطوط نویسی کی تاریخ جو ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے شاید اب تک مرتب نہیں کی جا سکی ۔ حالانکہ مشاہیر اردو کے خطوط و رقعات کے اکثر مجموعے شائع ہو چکے ہیں ، ان میں سب سے مشہور و مقبول رقعاتِ غالب ہے ۔ غالباً یہ قدیم ترین خطوط اردو کا مجموعہ ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اور اصناف زبان کی طرح اردو نثر کی نشو و نما عروج و ترقی بھی صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی ہی کوششوں کی رہین منت ہے اردو کی مقبولیت میں خاندان ولی اللہی کے قرآن و حدیث کے تراجم کو بڑا دخل ہے ۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادوں شاہ عبدالقادر و شاہ رفیع الدین نے لفظی و با محاورہ ترجمہ قرآن مجید کر کے سب کی توجہ اردو کی طرف مبذول کر دی ۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی اردو نثر کے نمونے بہت پہلے کے بھی ملتے ہیں اور دکن میں تو کئی نسخے پائے جاتے ہیں لیکن ان میں ہندیت زیادہ اور اردویت کم تھی ۔ شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن کے دیباچہ میں ارشاد فرمایا ہر بندے عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بڑے حضرت شیخ ولی اللہ عبدالرحیم صاحب کے بیٹے سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے ہیں ۔ اسی طرح اس عاجز نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے معنی لکھے ۔" نام تو ہندی دیا ہے لیکن ہے در اصل اردو ۔

کبھی کبھی مریض کو جلد صحت نصیب نہ ہوتی تھی تو حکیم شاہ فرحت اللہ مضطرب اپنے پیر و مرشد سے رجوع کرتے تھے ۔ اغلب ہے کہ ان کا خط اردو میں ہو جس کے جواب میں حضرت شاہ حسن علی نے یہ مکتوب اس وقت کی اردو نثر میں لکھ کر بھیجا "حسن دوست کو آسیس (دعا) آگے آگاہ (معلوم کرو) کہ اللہ کو علم حضوری ہے (بیماری اللہ کے چاہنے سے عائد ہوتی ہے) یا اللہ جس کو دے عقل (دعائیہ جملہ) ۔ دوا کرنا راست آوے تو خوب ۔ معلوم کرنا مرض کا خوب دشوار ہے ۔ دیر ہو تو کیا ہوئے ۔ اللہ علم حضوری وے تو شتاب آرام ہوئے ۔ جو کہہ دیں تو سبھ سبھ کا احوال د مرض کہنا پڑے (یعنی ہم سے جو پوچھتے ہو تو ہم کس کس کو کیا کیا کہنا شروع کریں) ۔ اور تم یہ سبھ کا احوال اور مرض پوچھو ۔ تم حکیم اور ہم کیا کہیں ۔ ہم بندہ یا خدا ۔ بندہ کو کہنا ۔ قبول کرے یا نہ کرے ۔ اللہ کرے اس کو آرام ہو ۔ یا اس کا کام ہو

دور (پورا) - نبی ولی آخر کو دیکھ کے دعا کرتے تھے ۔ اور ان کو حکم تھا ۔ کہو تم سجھو ۔ قبول کرے یا نہ کرے تم آخر دیکھتے ۔ حکم ہے تم کو دعا کرو یاد و کرو ۔ دیکھو باطن (مقدر) کو کیا ہے ۔ اس کے دیکھنے عمل کرو زیادہ والدعا"۔ یہاں خواجہ حافظ کا شعر یاد آجاتا ہے: ؎

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس   در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

حکیم شاہ فرحت اللہ کے چھوٹے بیٹے حکیم سعادت حسن نے بھی جن کی شادی بی بی بہورہ بنت میر امام علی مجیبی ہمشیرہ دیوان ناصر علی سے ہوئی تھی ۔ حضرت شاہ حسن علی سے فیض پایا لیکن سب سے بڑے بیٹے شاہ مظہر حسن (سال ولادت ۱۱۹۰ھ) نے اپنے والد سے ہی ارادت و تربیت حاصل کی ان کے لئے حضرت حکیم فرحت اللہ نے ایک رسالہ مسائل سلوک پر مظہر اسرار لکھا ۔ انہیں ادبی ذوق بھی تھا" بیشتر برغزلہائے اردو ، ہندی نیز کیفیت می افزودند و بوجد می آمدند" ۔ ان کے ارشادات کو ان کے مرید شاہ قمر الدین ابو العلائی دانا پوری نے ۱۲۵۵ھ میں جمع کر کے رسالہ مرشد مرتب کیا ۔ اس ملفوظ میں اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے ۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ بدی کو ناکردہ تصور کرنا ، بدلہ نہ لینا ، صبر کرنا ، درگذر کرنا انتقام لینے سے بہتر ہے ۔ انسان کی محبت و عداوت صرف اللہ کے لئے ہونی چاہئے ۔ دوستی نبھانا گو مشکل ہے مگر کوشش کرنی چاہئے کہ حق دوستی ادا ہو اور شکایت کے مواقع پیدا نہ ہوں ۔ اقربا ، قریب بعید کے ساتھ مواسات یتیموں ، بیواؤں کی پرورش ، مسافروں کی مہمان نوازی ، بزرگوں کا ادب و احترام ، بی بی بچوں کے حقوق کی پاسداری ، محاسبۂ نفس ہر روز صبح سے شام تک کے اعمال و کردار کا جائزہ حسنات و خیرات کا پہنچانا تاکہ عجب و غرور پیدا نہ ہو ۔ اور دو وظائف میں مداومت ۔ یہ نچوڑ ہے آپ کی تعلیمات و ارشادات کا ۔

کریم حکیمی خاندان میں بہت سے افراد کمالات دینی و دنیوی کے لئے مشہور و ممتاز تھے ۔ علم و ادب کا خاصہ ذوق تھا ۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اور اہلبیت اطہار سے بے پایاں عقیدت و ولا رکھتے تھے ۔ اس لئے مرثیہ منقبت کا خاصہ ذخیرہ اب بھی بعض حضرات کے پاس موجود ہے ۔ یو پی کے ایک بزرگ جو ہندوستان میں مرثیہ نگاری پر ایک سیر حاصل کتاب لکھ رہے ہیں ، پٹنہ تشریف لائے تھے ۔ ان کا کہنا ہے کہ بہار کے سب سے پہلے مرثیہ نگار چھپرہ کے رہنے والے تھے ۔ ممکن ہے کسی

آئندہ موقع پر کچھ مراثی کے نمونے نذر قارئین معاصر کئے جائیں۔ چونکہ صاحبانِ کریم چک زیادہ تر قادری صوفی تھے۔ اس لئے حضرت غوث اعظم کی شان میں جو کلام منظوم ہوئے ان کی بھی تلاش و تفتیش ضروری ہے۔ آئندہ سطور میں ایسی ایک نظم پیش کی جائے گی جسے مولانا ابوالخیر آہ پھلواروی برادر حضرت فرد نے اپنی بیاض مملوکہ کتب خانہ مجیبی میں تبرکاً درج کیا ہے۔ اس کے مصنف ان کے نانا حضرت حکیم محبوب عالم عاصی مشہور بہ حکیم باسو صاحب ہاشمی قریشی قادری کریم چکی تھے۔ یہ شاہ محمد ساکن گھگھٹہ چھپرہ ضلع سارن کے پوتے سابق الذکر حضرت شاہ محمد افضل کے نواسے حکیم مسیح اللہ کے بھانجے شاگرد ذی النورین داماد و جانشیں تھے۔ سال ولادت ۱۱۳۰ھ کے دو برس بعد یہاں نے رحلت کی تینوں ماموؤں نے اپنے سایہ عاطفت میں با درسیات اور فن طب کی تکمیل کرائی اور اپنا سارا کاروبار ان کے سپرد کر دیا۔

نبیرہ حکیم نعمت اللہ بن شاہ ابراہیم بن شاہ محمد انور بن شاہ عبد اللہ شہید اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "شیخ محمد افضل برادر کلاں جدم در کریم چک استقامت کردند بعد خویش کس خلف حکیم نسیم اللہ، حکیم مسیح اللہ و شیخ عزت اللہ و یک دختر بن دو سالہ مسمی بہ حکیم باسو گذاشتند۔۔۔ پرورش ہمشیرہ زادہ ہر سہ برادران فرمودند۔ یوم التحریر (۱۱۹۱ و ۱۱۹۸ھ) در خانہ ہر سہ خال ہستند"۔ ایک تحریر میں شاہ عزت اللہ فرماتے ہیں "حکیم باسو ہمشیرہ زادہ حقیقی را کہ در سن دو سالگی مادرش فوت کردہ بود بطور ہمہ فرزندان پرورش و تعلیم و تربیت ماہر برادران تا ایام شباب نمودہ بودیم۔۔۔۔۔۔ از عبیہ برادرم حقیقی حکیم مسیح اللہ کہ خود کردہ و عیال و اطفال مذکور را مثل فرزندان ہمراہ ما ہم بودند لہٰذا بعد وفات برادرم حکیم مسیح اللہ برائے انتظام و اجرائے دوکان طبابت شہر و امورات دربار وغیرہ از طرف خود با نائب و مختار کار را مقرر کردیم۔ چنانچہ تا حال بر ہمان کار و حال است" حکیم مسیح اللہ فن طباعت میں کاملین کا درجہ رکھتے تھے۔ دہلی کے مشہور حکیم اور صاحب تصانیف کثیرہ حکیم محمد ارزانی (محمد اکبر) کے شاگرد تھے۔ طبابت پٹنہ محلہ مغل پورہ حویلی اشرف خاں کے نزدیک کرتے تھے۔ نواب میر قاسم ان سے بہت متاثر تھے۔ جنگ بکسر کے بعد حکیم مسیح اللہ اپنے بیٹوں حکیم واعظ اللہ و حکیم غلام جیلانی کو پٹنہ کا کاروبار سپرد کر کے

مرشد آباد چلے گئے۔ یہاں عرصہ تک طبابت کرتے رہے۔ پھر ٹپنہ واپس آئے اور حکیم باسو کو اپنا جانشین کیا۔ حکیم محبوب عالم عاصی عرف حکیم باسو نے بڑی شہرت اپنے فن میں حاصل کی وافر دولت کمائی موضع گھگھٹہ کے علاوہ بہت سے مواضع خریدے کئے بہت سے اسناد و فرامین پائے۔ مولانا حکیم سید محمد شعیب صاحب قبلہ نے فرمان ۵۸ھ سطابق ۱۷۵۸ء اور انگریزی عہد میں جن کی سنہ ۲۴ جلوس شاہ عالم اور ۱۱۹۳ء اور ۱۱۹۶ء میں تجدیدات ہوئیں ان کی عبارت اپنی ایک تحریر میں نقل کی ہے۔ حکیم باسو اپنے زہد و ورع و تقوی کے لئے بھی مشہور تھے۔ مرشد آباد میں بہت دن گذارے ۱۲۰۱ھ میں وفات پائی پھلواری شریف میں مدفون ہوئے۔

حکیم صاحب کے نواسے مولانا ابوالحیات نے اپنی بیاض میں ان کی نظم جو غوث پاک کی شان میں ہے اپنے قلم سے درج کی ہے وہ یہ ہے:

(۱)

مرضوں نے مجھ کو کیا ہے زیر غوث اعظم — اب تو سنبھال لیجئے اس پیر غوث اعظم
مرشے جلائے دیا کمی پیر غوث اعظم — میری طرف سے کیوں ہے اب دیر غوث اعظم

(۲)

تم دین کو جلایا حضرت محی الدین ہو — محبوب حق کہایا حضرت محی الدین ہو
سب پر تمہارا سایہ حضرت محی الدین ہو — جاں بخش ہو جائے ہر پیر غوث اعظم

(۳)

اے دستگیر عالم لیجئے خبر ہماری — ہوں گا نمائے در پہ کرتا بہت سازاری
یہ تشنگی ہماری یہ دل کی بے قراری — اب شفا سوں کیجئے اب پیر غوث اعظم

(۴)

مرت کی ناؤ ڈوبی جل موں اسے نکالا — صد بابر س کے مردے پل موں جلائی ڈالا
کہیں نوح کوں بچایا یوسف کو کہیں سنبھالا — اب پیر میں ہماری کیا دیر غوث اعظم

(۵)

اے دستگیر عالم دونوں جہاں کے والی | بے نام ورد تیرا کیا یوم کیا لیالی
عاصی کی التجا ہے تیرے جناب عالی | مرتا ہوں تم بلاذنی کبہ بھیر غوث اعظم

اس نظم میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو جاذب نظر ہو سکے ۔ کیا ۔ بیر (مرتبہ اور بارے میں) بلائے دیّا ۔ سوں (سے) ۔ بہت سازاری ۔ موں (میں) ۔ کوں (کو) ۔ کبہ بھیر (پھر) سے قدامت و بہاریت واضح ہوتی ہے "تم دین کو جلایا" جس میں 'نے' غائب ہے، اشارہ کرتا ہے کہ ایک روایت کی طرف کہ حضرت عبدالقادر ایک راستہ سے گذرے دیکھا کہ ایک ضعیف کمزور انسان بے بس ولاچار زمین پر پڑا ہوا ہے ۔ آپ نے اسے دونوں شانے پکڑ کر اٹھایا ۔ جب سہارا ملا تو اس نے کہا کہ ہم آپ کے دادا کے دین ہیں اور اسی حالت کو پہنچ گئے ہیں ۔ اس نظم کو بارہویں صدی کی بہار کی زبان کا اصلی نمونہ قرار دینا صحیح نہ ہوگا ۔ مولانا ابوالحیات نے یہ نظم لکھ کر جو اعتذار پیش کیا ہے وہ لائق توجہ ہے "تمام شد منقبت جناب مستطاب .... سید محی الدین عبدالقادر جیلانی حسنی الحسینی علیہ وعلی جدہ الصلوٰۃ والسلام من تصنیف حکیم محبوب عالم صاحب قدس سرہ چشم از خوانندہ و بینندہ آنست کہ نظر بر شاعری و فصاحت و بلاغت نفرمایند بلکہ ...... اصلح (کچھ الفاظ ناپڑھا نہیں) مثل مصنف از عاشقان آنجناب گردانادو اگر درعین لطف ...... ملاحظہ کنند سراپا اثر محبت مصنف کہ از آنجناب میداشت می آید ۔ پس کار از کار رست تا کجا نوشتہ آید" اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوالحیات اور ان کے بڑے بھائی حضرت ابوالحسن فرد کے زمانے میں صوبہ بہار کی زبان نہایت صاف شستہ، فصیح و بلیغ ہوگئی تھی لیکن جناب حکیم باسو تو ہم عصر تھے حضرت شاہ آیت اللہ جوہری کے ۔ مثنوی گوہر جوہری ۱۱۶۱ھ کی تصنیف ہے ۔ اور آپ کی دوسری نظمیں، مثنویاں، مراثی ہیں سے کچھ معاصر میں شائع بھی ہو چکی ہیں ۔ یہ کلام بطور نمونہ زبان بہار پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ حضرت منعم پاک سے جو شعر منسوب ہے اور اوپر درج ہوا، بتاتا ہے کہ ہماری زبان ہمارے صوبہ میں ۱۱۸۵ھ کے قبل کس قدر ترقی کر چکی تھی ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

سطور بالا کو کاتب کے حوالہ کرنے کے ایک روز بعد یعنی ۱۲ ستمبر ۱۹۵۴ء کو جس واجب الاحترام بزرگ کے خرمن کی خوشہ چینی کا شرف راقم السطور کو حاصل تھا۔ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوکر جوار رحمت ایزدی میں پہنچ گئے۔ اللہ حضرت مولانا حکیم سید محمد شعیب صاحب مرحوم مغفور پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ اوراق پارینہ کی تجسس وتلاش اور ان کی حفاظت ونگہداشت میں جتنی کد وکاوش حضرت مرحوم کیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہے آپ کی ذات جامع صفات بقیۃ السلف تھی۔ جید عالم، وسیع القلب و متورع صوفی طبیب حاذق، نساب ادیب، شاعر تھے۔ درس وتدریس کا مشغلہ بھی تھا۔ آپ کی ایک کتاب "اعیان وطن" حال میں شائع ہو چکی ہے لیکن کئی کتابیں اور رسائل ہنوز تشنۂ اشاعت ہیں۔ یوں تو آپ کے الطاف عمیمانہ سے جو چاہتا متمتع ہو سکتا تھا لیکن راقم السطور پر تو شاید آپ کے بعد پھلواری شریف کے ذخائر علمی کا باب ہی بند ہو گیا

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔

علم التاریخ

دبستان علوم کی متعدد شاخوں یا شعبوں میں ایک اہم، ہمہ گیر، مختلف النوع، کثیر الفوائد شعبہ کا بھی شمار ہے جسے علم التاریخ کہتے ہیں۔ یہ جدید اور قدیم تعلیم و تربیت کا ایک ناگزیر حصہ بھی ہے اور ایک ایسا سرچشمہ جس کی آبیاری اور افادیت میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک گرانقدر مثالی علمی ورثہ اور تہذیب و ثقافت کا ایک نادر تحفہ ہے۔ اس سے نہ صرف اقوام و امم سابقہ بلکہ دور حاضر کے بھی انسانی اور قومی زندگی کی خصوصیات، اعمال و افکار، ذہنی افتاد، حوادث و حالات، سرگرمیوں، کارگزاریوں، کشاکش و کشمکش اور اپنے محرکات و نتائج کا نہایت دیانت داری اور حق شناسی سے محاسبہ کیا جا سکتا ہے۔ بڑی سعی و کاوش اور کد و کاوش کے بعد، مواد کے ذریعے معلومات سے واقعات و حقائق کو سراغ اور پتہ پایا جاتا ہے اس کے بعد حالات حاضرہ اور گرد و پیش کے وقوع پذیر واقعات کی روشنی اور سماجی تناظر (PERSPECTIVE) میں ضروری باتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، شرح و توضیح یا تاویل کی جاتی ہے اور اس طرح دھیرے دھیرے، رفتہ رفتہ تاریخ کے گم شدہ ابواب کا ایک مرقع تیار ہو جاتا ہے جس کی چلتی پھرتی تصویروں کے تصوری خاکہ یا آئینہ میں انسان خود اپنے اعمال و اقوال کا تجزیہ اور محاسبہ کر سکتا ہے۔ زشت و خوب کی جانچ اور پرکھ ہوتی ہے تاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس کی نوعیت مختلف اقوام و طبقات کے ہاتھوں بلا قید زمان و مکان بدلتی رہتی ہے اسلوب میں فرسودگی بھی نمایاں ہوتی ہے لیکن اس کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں ہوتی

روپ و رنگ بدلتا ہے۔ یکجنگی بھی آتی ہے۔ اس کی بوقلمونیت، رنگ برنگ۔ تبدیلیوں کے باوجود اپنی جوہرداری برقرار رکھتی ہے۔ اس کی چاہ اور چاہت میں کبھی کوئی بڑا فرق دکھائی نہیں دیتا۔

گوناگوں داستانوں، قصہ کہانیوں، دیومالائی قسم کی کتھاؤں، ہندوستان کے اٹھارہ پرانوں کے راجاؤں کی لمبی نسب نامہ، نساوریوں، مبالغہ آمیز کارناموں کی بھرمار تفاصیل کو بھی کسی زمانے میں تاریخ کی حیثیت اور درجہ دیا جاتا تھا۔ بعید الفہم دیومالائی پورانک روایات، دیوی دیوتاؤں کی محیر العقول کہانیوں کی ایک زمانے میں بڑی ہمہ گیری تھی۔ دھارمک کتھاؤں کے علاوہ جن و پری، خیالی راجاؤں اور رانیوں کی من گھڑت کہانیوں کی ریل پیل تھی۔ ایک سیل یا بہاؤ تھا جو عرصۂ دراز تک جاری و ساری رہا۔ لیکن اساطیری دور کے ابتدائی مراحل کا زور رفتہ رفتہ تصورات و نظریات بدلنے، قدیم نقوش مدھم ہونے لگے اور نئے نئے ابھرنے لگے۔ زمانہ پیشین کے لوگوں کو کبھی خیال و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ علم و فضل کے اس شعبہ کے ارتقائی عمل کا نقطہ عروج اتنی بلندی پر پہنچ جائے گا کہ یونان و روما کے فلسفہ تاریخ کو جغرافیہ (ہیئت الارض) اور سوشیولوجی (عمرانیات) وغیرہ کے ہم پلہ ہی نہیں ٹھہرایا جائے گا بلکہ اس کے ڈانڈے مختلف قسم کے سائنسی اور غیر سائنسی علوم سے بھی ملائے جائیں گے۔ اس کے سوشل سائنس قرار دیے جانے پر دانایان و محققین یورپ و امریکہ کے درمیان بحث و تمحیص کا ایک نیا باب بھی کھل جائے گا۔ پچھلے زمانے یعنی ۱۹ ویں صدی کے نصف اوّل تک زبانی روایتوں، سنی سنائی باتوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی بالخصوص دھارمک امور کو مصدقہ اور درست سمجھا جاتا تھا۔ گذرے ہوئے واقعات کا چرچہ تو ہوتا تھا لیکن کسی قسم کی پوچھ تاچھ، سوچ بچار اور چھان پھٹک کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی لیکن دھیرے دھیرے لایعنی اور لاحاصل امور کے کھوٹی جھوٹی ہونے کا احساس بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ ہر چیز کی چھان بین ہونے لگی۔ تقلیدی و اعتقادی باتیں معرض بحث و تنقید اور بالآخر بے لاگ بے جا خورد گیری اور دقت شناسی کے دائرے میں آ گئیں۔ ماضی کے مناظر، واقعات و کیفیات، افراد و شخصیات کے اعمال و افکار پر ناقدانہ نظر پڑنے لگی۔ ٹھوس حقائق کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے، سمجھنے، جوڑنے اور ملانے کا جذبہ قوی تر ہوتا گیا۔ کیا، کیوں اور کیسے کے سوالات اٹھ کھڑے

ہوئے۔ انسانی اور آسمانی حادثات و واردات کے سلسلے میں صحیح معلومات کے حصول کی فکر بڑھنے لگی۔ حالات حاضرہ کی روشنی میں پیشینیاں (متقدمین) کے افراد و شخصیات کی خصوصیات، کردار و انکا اور ہر قسم کے ساخات کی جانچ پڑتال ہونے لگی۔ بظاہر معمولی، چھوٹی اور ذیلی باتیں اصلی، یقینی اور تفصیلی معلوم ہونے لگیں حقائق کی کہانی دکھائی دینے لگیں۔ گذشتہ زمانے کے حقائق کے متلاشی کا رخ الفہم ذہن جزیاتی سے کلیاتی امور تک جا پہنچا۔ بکھری چھتری باتوں کا استخراج انتخاب کر کے منظم اور منضبط کر کے اپنی معلومات کو صحیح، معتبر اور واقعاتی بنا کر رسالوار سلسلہ میں ترتیب دیکر منظر عام پر لایا گیا اس طرح تاریخ کی داغ بیل ڈالدی گئی اس کا ہیج دبن تیار ہو گیا۔

مختلف لوگوں نے کسی طرح سے تاریخ کی تعریف کی ہے۔ جب یہ سوالات اٹھائے گئے کہ درحقیقت تاریخ کیا ہے، کسے کہتے ہیں، اس کی خصوصیت، ماہیت، مقصدیت، افادیت، طریقہ کار اور اسلوب تحریر (METHODELOGY. MI) کیا ہے تو لوگوں نے اس کا اپنے اپنے طور پر جواب دیا ہے اور تشریح و توضیح کی ہے۔ کچھ لوگوں نے تاریخ کی حقیقت، خصوصیت، تنوع (VARIETY.) اور جامعیت کا جیرچہ کیا ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ ازمنہ سابقہ کے نوع انسانی انفرادی یا اجتماعی طبقاتی خصوصیات زندگی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی، مذہبی، سماجی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی کی مجموعی طور پر جانکاری حاصل کی شواہد کی صحت اور اسناد و استناد کی بڑی سنجیدگی اور غور و فکر سے جرح و تعدیل کے بعد جس ذریعہ علم سے حقائق و معلومات کا مرتبع یا تحریری عکاسی پیش کی اسی کا نام تاریخ ہے۔ رہن سہن کھان پان، ملبوسات، طریقہ پوشش، طرز رہائش، تعمیر مکانات، طریقہ و نصاب تعلیم، معتقدات مذہبی، تصویرکشی، نقش نگاری طرز و آلات موسیقی، کاریگری، صنعت، حرفت اور ان سب کے علاوہ قوموں ملکوں، سلطنتوں حکمراں خاندانوں کے گوناگوں مسائل خسروی حکومتیں ہوں یا پنچایتی راج، جمہوریت ہو یا مطلق العنانیت ان کے حالات میں اتار چڑھاؤ اور عروج و زوال کی نوبتیں آتی ہیں، تنازعات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جو ان کے محرکات و عواقب ہو سکتے ہیں یا تاثر نگار سب کچھ ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ سوویت روس کے مارکس فضلا نے ہسٹوریکل میٹریلزم (HISTORICAL MATERIALISM. SM)

ڈیٹرمنسٹک میٹریلزم DETERMINISTIC MATERIALISM.

اکونومک ڈیٹرمنزم ECONOMIC DETERMINISM. کے نظریئے

پیش کیے ہیں انکے مکتب خیال SCHOOL OF THOUGHT. ایں تاریخ کی ترجمانی

اور ماضی کی بازیافت مادیت کے جو واحد حقیقت ہے، تابع ہوتی ہے۔ سماج اور سماجی اداروں کی

خاصیت مادی لوازم اور عوامل اور مرکزی محرکات اور قوتوں کے مانند معاشی اقتصادی

ECONOMIC.) ہوتے ہیں۔ کسی کا چاہے وہ کیسا ہی پچھڑا ہوا مزدور یا کسان کیوں نہ ہو

حق ملکیت ساقط نہیں ہوتا۔ مارکسی میلان یا جھکاؤ بہ نسبت ذہنی یا روحانی رجحانات کے مادیت

کے اقتدار کی جانب ہوتا ہے۔ DETERMINISM. کے معنی ہیں جبریت جس کے

روس کے مارکسی قائل ہیں۔

یہاں ایک اور امر لائق توجہ ہے۔ تاریخ و مورخ کا باہمی تعلق اٹوٹ ہے رشتہ اور ماضی

کے معلومات کی دریافت کی مشکلات اور خامیاں۔ مجموعی طور پر عہد گذشتہ کے قوموں کے عروج

و زوال، انسانی تہذیبی، معاشرتی، معاشی زندگی کا علم، جن واقعات و حالات میں مضمر ہوتا ہے۔ اس

کے تحریری تنقیدی جائزہ کو ہی تاریخ کہتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ واقعہ نگار کس طرح

اور کس حد تک صحیح شواہد اسناد و ماخذات کی دریافت اور واقعات کے اسباب و عواقب کا تعین

کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اپنی معلومات و تحقیقات کو کس طرح کس ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔

جو چیزیں اور باتیں صدیوں سے پردہ خفا میں مستور ہوں باوجود ہر امکانی کوشش جد و جہد تلاش

و جستجو کے ان کی دریافت غیر الحصول بلکہ ناممکن الوصول ہو سکتی ہے۔ حقائق کے متلاشی کی معلومات

تیقنات کے درجہ تک نہیں پہنچ پاتی، کلی طور پر صحیح و درست نہیں ہو سکتی۔ واقعات کی اصلیت،

ماہیت، قطعیت، تعین کرنے اور نتائج نکالنے میں نقص، خامیاں، فروگذاشتیں رہ جا سکتی ہیں۔

مجبوراً ایسے استخراج، استنباط، استدلال اور تاویلات سے سہارا لینا پڑتا ہے جب تک

کوئی نیا آنے والا مزید معلومات پیش نہیں کرتا، سابق مورخ کے تاریخی ریکارڈ کی اہمیت

قائم رہے گی۔

ایک اور اہم امر تاریخ کے بنیادی عناصر ہیں جن اسناد، مواد و ماخذ، شواہد و شہادات کی نیو پر تاریخ کی عمارت قائم کی جاتی ہے، تانا بانا ملایا جاتا ہے۔ وہ مندرج بھی ہوتے ہیں اور غیر مندرج بھی مکتوبہ بھی ہوتے ہیں اور مروجہ بھی، دستاویزی بھی ہوتے ہیں اور غیر دستاویزی بھی۔ زیر زمین کے کھنڈرات کے دفینے بھی ہوتے ہیں اور بالائے زمین کے بچے کھچے آثار، علامات اور نشانیاں اندرونی یا داخلی بھی ہوتی ہیں اور بیرونی یا خارجی بھی۔ مندرج یا دستاویزی شہادات کے ضمن میں دفتری کاغذات، شاہی فرامین، اسناد، حکمنامے، پروانہ جات اور دیگر قسم کے وثائق و رسل و رسائل کے سلسلے کے مکتوبات اور اشار کی کتابیں قدیم خاندانوں کے نجی کاغذات، ڈائریاں یادداشتیں روزنامچے، بیانات، کشکول، اوارجہ، آپ بیتیاں، ذاتی سوانح عمریاں، زمین کے بھیتر اور اوپر کے باقیات الصالحات جن کے کھوج، دریافت اور سراغ لگانے ہی کے لئے ارکان محکمہ آثار قدیمہ لائق تحسین و مبارکباد ہیں۔ کئی طرح کے اور مختلف قدر و قیمت کے ہوتے ہیں اور مورخ یا واقعہ نگار کے لئے بہت مفید اور ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ چندر گپت موریہ کے فلسفی وزیر و مشیر چانکیہ یا کوٹلیہ جو اطالیہ کے (ITALIAN.) راج گیانی میکیاولی کی طرح عاقل یا فطرتی تھا اور اس کے ہزاروں سال کا پیش رو تھا۔ ایک کتاب "ارتھ شاستر" تصنیف کی تھی جو تقریباً مفقود ہو چکی تھی، دکھنی صوبجات میں کسی طرح حیرت ناک طور پر اس کا سراغ ملا، لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں لیکن اشوک کے ستوپ اسنوپ اور استنبہ STUPES AND STONE PILLARS) کہلاتے ہیں اور اب تک موجود ہیں ان کی بھی اس سے کم اہمیت نہیں ہے۔ ہمارے صوبہ بہار میں پٹنہ کے کمہرار اور بلندی باغ کے کھنڈراتی آثار میں ایک کندہ مہر بھی ملی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے وہاں ایک (HOSPITAL.) بیمارخانہ آروگیہ (AROGYA.) یا دارالشفا کی عمارت قائم تھی۔ دریائے سندھ کے علاقائی موہن جوداڑو اور ہڑپا کے کھنڈراتی آثار ڈراویڈی قوم کی تہذیبی زندگی کی نشانیاں جو ایک طرف گجرات اور دوسری طرف بہار دکلبر کے بچے کھچے

باقیات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اوجین و مالوہ کے ہزاروں سال پیشتر کے بنے ہوئے مندروں پر جو کتبے پتھروں پر کھدے ہوئے ملتے ہیں اور مسلمانوں کے زمانے میں تعمیر کردہ مساجد و عمارات پر جو کتبے موجود ہیں ان سے تاریخ نویس اپنے کام میں بڑا کارآمد پاتا ہے۔ اس سے نئی نئی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جسے وہ ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ زمین کے اندر نایاب فلزی سکہ جات کے ذخیرے بھی پائے جاتے ہیں جن کے اقسام زمانی مکانی ندرت اور تاریخی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے پراچین زمانوں کے بہت چھوٹے سکوں پر جنہیں مارک کا نام دیا گیا ہے گھوڑے ہاتھی کے نقش ملتے ہیں۔ عہد باستانی کے تانبہ چاندی کی آمیزش سے بنے ہوئے علاقائی دلین (BULLION) بھی ملتے ہیں اور یہ ذریعۂ تبادلہ ہوتے ہیں۔ سونے چاندی تانبے کے چھوٹے چھوٹے گول چوکور، ہلکے، بھاری سکے جن پر حکمرانوں کے نام سنین اور دارالضرب کی نشانیاں پائی جاتی ہیں تاریخ دانوں کے لئے بڑے کام کے ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے وزن مقدار اور تعداد سے زمان و مکان کے اقتصادی حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ سرکار کے آثار قدیمہ کے محکموں اور عجائب خانوں (MUSEUME) میں جو چیزیں رکھی ہوئی ہیں ان سے بھی تاریخ نویس بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔ عہد عتیق یعنی پراچینی عہد عہد سلف کی پرانی چیزوں کے شوقین جمع کرنے والوں انٹی کوریز ANTI QUARIANS کے پاس ہزاروں سال کے آثار کا بھی علم مورخ کو ہوجاتا ہے اور وہ بہت کچھ اس سے کام کی باتیں پالیتے ہیں۔ پہاڑوں کو توڑ پھوڑ کر غار نما بنائے گئے کمرے، ظروف و پارچہ جات پر بنائے ہوئے نقوش اور بیل بوٹے، عمارتوں پر خطاطی طغرا میں بنانے والوں کے نام تاریخ اور دعائیہ فقرے بہت کچھ مفید مطلب ثابت ہوتے ہیں۔ ایلورا، اجنتا میں جو صدیوں پہلے تصاویر بنائی گئی تھیں ان سے نہ صرف عصر قدیم کی کلا اور صنعت و حرفت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان تصاویر سے بہت سی نئی تاریخی باتوں کا بھی انکشاف ہوتا ہے جیسے دیسی بدیسی لوگوں کی شکل و صورت، سفارتی تعلقات وغیرہ۔ پہاڑ کی تراشی ہوئی دیواروں پر یہ نقوش اس زمانے کی جیتی جاگتی زندگی کے حالات پیش کرتے ہیں، عکس ریزی کرتے ہیں، لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور محو حیرت ہوجاتے ہیں

گیا کے مخدوم پور علاقے میں اشوک نے بودھ دھرم کے منکرین اجی ویکا (AJIVIKA)
فرقے کے لئے جو سرکاری بدھ مت کے پیرو نہیں تھے۔ پہاڑ کو چیر کر غار نما کمرے بنوائے تھے
جو ان کی رہائش گاہ تھے۔ علاوہ اس کے کہ موریہ خاندان کے اس عظیم اور جلیل الشان فرمانروا
کی عالی ظرفی اور رواداری کا یہ غاری قیام گاہ ایک حتمی ثبوت ہوتے ہیں۔ دیوار پر کسی ایسے
مسالہ کا استعمال کیا گیا تھا جو آج تک کسی کے علم میں نہیں آیا۔ راقم السطور نے کئی بار اس
طرف کا چکر لگایا اور اپنی شکل یا بدشکلی کا صاف صاف عکس مثل آئینہ کے پایا۔ موریوں کے
بکھرے بہتیرے آثار چھوٹے چھوٹے پتھر (N.V.P) کبھی تعداد میں منیر شریف اور دوسری جگہ
بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا رنگ روپ بھی انوکھا اور کسی خاص مسالہ کا مرہون منت تھا۔
ان میں جو مسالہ لگایا گیا تھا اس کا علم ہنوز مفقود ہے۔ الغرض نیومس میٹک NUMISMATIC
اپی گرافک EPIGRAPHIC اور آرکیولوجیکل
(ARCHAEOLOGICAL) مواد و ماخذ کی حیثیت سے اتنے ہی اہم ہیں جتنے
لٹریری اور ڈوکومنٹری یعنی ادبی دستاویزی۔

مستند شواہد و ماخذ کی فراہمی اور انتخاب تاریخ نویس کے لئے ایک لازمی اور
اولین امر ہے۔ اس کے بعد افراد و اشخاص کی سرگذشت سوانحی حالات کی بازیافت' تہذیبی'
معاشرتی' اقتصادی' علمی' مذہبی ماحول علوم و فنون' وضع قطع راگ رنگ' ماضی و حال کا
ہم آویز دگر مذکور باہمی DEALOGVE کے بارے میں توضیحات' تبصرہ اور تنقید کی منزل
آتی ہے۔

تاریخ کا موضوع انسان ہوتا ہے اور انسان کی فطرت میں بڑا الجھاؤ اور
پیچیدگی (COMPLEXITY) ہوتی ہے۔ انسانی طبائع مزاج' سرشت'
جبلت' ذہنی افتاد اور کردار و واردات میں تبدیلیاں پائی جاتی ہیں۔ تضاد بھی دکھائی دیتا
ہے۔ مماثلت و مشابہت بھی۔ ایک حال پر سب کچھ برقرار نہیں رہتا۔ مورخ کے شعور'
نظریات' تصورات مسائل اور اسالیب میں انسانی نفسیات کے علم کی جھلک دکھائی

دیتی ہے۔ انسانی افکار و خیالات میں جو تغیرات ہوتے ہیں، حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں ان کے پیچھے جو محرکات، علل و عواقب ہوتے ہیں اس پر بھی اس کی نظر رہتی ہے جب صحیح اور تفصیلی تحقیقی ماخذوں پر اس کی دسترس ہو جاتی ہے تو وہ عقل کی میزان پر تول کر حال کی روشنی میں مستقبل کی جھلک دکھاتا ہے۔ ماضی کے گذرے ہوئے واقعات کی مواد و شواہد کے سرچشموں اور سوتاؤں کی مدد سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ماضی کی بازیافت اور دریافت کردہ معلومات سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ دور حاضر کے حالات کس طرح اور کس حد تک بطور نتیجہ پیدا ہوتے ہیں اور مستقبل میں آنے والے حالات کا کیسا عکس یا پرتو دکھائی دیتا، ماضی، عصری اور مستقبل کس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس کا اندازہ تاریخ کے صفحات کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔

انگریزی میں تاریخ کی تعریف یوں کی گئی:

"IT IS A STUDY OF THE PAST AS AN EXPLANATION OF THE PRESENT AND GUIDE FOR THE FUTURE."

"ماضی و حال کا جائزہ لیکر اسباب و نتائج کا تعین کر کے مستقبل میں آنے والی نسلوں کی رہنمائی کا فرض مورخ انجام دیتا ہے اور تاریخ ماضی کا آئینہ، حال کی توضیح اور مستقبل کے لیے درس عبرت ہوتی ہے۔"

مورخ یا واقعہ نگار کی زیادہ تر اور خاص توجہ ماضی پر ہی مرکوز ہوتی ہے۔ گذشتہ حوادث و کوائف کا سنین اور واقعاتی تسلسل سے تاریخوار اندراج تصریحات و توضیحات تاریخ نویس کا خصوصی کارنامہ ہوتا ہے۔ جزا و سزا اور مکافات عمل کی مثالیں اس کے پیش نظر رہتی ہیں۔ تاریخ کسی بد شعار کو نہیں بخشتی۔ تاریخ اور ماضی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ماضی کو کوئی محو اور منسوخ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا احتمال اور امکان ہے کہ انسانی خیالات و خواہشات گذشتہ ایام کی لغزشوں، فروگذاشتوں اور کمزوریوں کی ساری یادیں بھلا دینے

ماضی کی بہ نسبت حال میں ہی مگن رہنے اور مستقبل سے لاپروائی برتنے پر مُصر ہوں اور قابل ترجیح سمجھیں۔ کراہیت اور خجالت کے احساسات اور کبھی کبھی ضمیر کی جھنجھوڑ اور سرزنش عہد رفتہ کو آواز دینے سے روکتی اور باز رکھتی ہے۔ بعض اوقات ہم جس بات کو پسند نہیں کرتے یا غیر اہم سمجھتے ہیں وہ بہت اہم ہوتی ہے۔ اپنے علاوہ اسلاف کے کرتوت سے بھی چشم پوشی اور اغماض کی خواہش کو غیر فطری نہیں کہا جا سکتا لیکن ہم چاہیں یا نہ چاہیں تاریخ کے اوراق بتائینگے کہ لوگ کن وجوہات سے بدنام اور اپنے مقاصد میں ناکام ہو جاتے ہیں، کن اخلاقی تہذیبی، سیاسی، معاشرتی کمزوریوں اور خامیوں کی وجہ سے نامراد رہ جاتے ہیں۔ حقائق گذشتہ کو کھوج اور ڈھونڈھ کر بکھری کڑیوں کو ایک دوسرے سے پیوست کرکے مختلف جزئیات کو ایک خاص اصول کے تحت ترتیب دیکر اور قلم بند کرکے مورخ عواقب و عوامل کو روشنی میں لاتا ہے۔

صاحب صلاحیت مورخ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہے۔ اسے اپنے تبصرہ اور توضیحات و بیانات میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ نہ تو وہ وسواسی ہوتا ہے نہ وہمی بدگمانی تنگ نظری، جانبداری، رنگ آمیزی، کسی کی مدح سرائی، کسی تضحیک وہ روا نہیں رکھتا۔ مختلف واقعات کو منظم کرکے جو نتائج نکل سکتے ہیں اس کا تذکرہ قلمبند کرتا ہے، عصبیت اور بیجا طرفداریوں کی خرابیوں کو شعوری طور پر وہ سمجھتا ہے اور خود کو ان سب باتوں سے دور رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی راہ میں بہت سے چھپے ڈھکے چور گڑھے (PIT FALL,) ہو سکتے ہیں جن سے بچ نکلنے میں ہی عافیت ہے۔ انگریزی کا ایک لفظ ہے (BIAS.) جس کے معنی ہیں میلان یا جھکاؤ۔ ذاتی رجحانات کے سبب ایک کی حمایت دوسرے کی ملامت۔ یہ ایک ناروا مذموم حرکت ہوتی ہے۔ (BIAS.) یا جانبداری کے علامات کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کسی کو وطنیت، کسی کو قومیت، کسی کو مذہب و ملت کا جذبہ بے راہ کر دیتا ہے۔ وطن دوستی، حب الوطنی، قومی برتری، مذہبی عقیدت کے جذبات قابل احترام ہوتے ہیں لیکن غلط اور بیجا طرفداری اس طرح کہ دوسروں کے ایسے ہی جذبات

کی منفعت کا پہلو نکلتا ہے خطرناک نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ مورخ شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک جج یا منصف کی ہوتی ہے وکیل کی نہیں۔ وکیل استغاثہ اپنے موکل کی حمایت میں کوئی دقیقہ بحث و دلیل کا نہیں چھوڑتا لیکن بعض وقت اس کی زوردار تقریر میں صحیح و سقیم کی تمیز جاتی رہتی ہے۔ جج فریقین کی سب باتیں ٹھنڈے دل سے سنتا ہے گواہوں کی شہادات اور پیش کردہ دلائل کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال کے بعد اپنا بے لاگ فیصلہ سنا دیتا ہے۔ تاریخ نویس کو بھی کئی متنازعہ فیہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تصویر کے صرف ایک رخ کو پیش کرنا اپنی بات منوانے پر زور دینا بیجا حرکت سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی نکتہ چینی اور خوردہ گیری بجائے بدظنی اور کسی قسم کی عصبیت کے حقیقت پر مبنی ہونا چاہیئے اس کی ایمانداری اور غیر جانبداری پر آنچ نہ آئے۔

تاریخ کی کوئی جامع تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس کی نوعیت متعدد اور مختلف ہوتی ہے کچھ تو عام یا معمولی کلیاتی قسم کی جامع العلوم کہی جا سکتی ہیں۔ آغاز آفرینش سے زمانہ قدیم کے بہت سے مفروضہ قصص و حکایات سے مملو اس کا وہ حصہ جو تاریخ نگار کے قریب العہد اور اس کے مشاہدات یا معلومات سے متعلق ہو در خور اعتنا ہوتا ہے۔ اس قسم کی سنار ک نگارشات سے متعلق متقدمین کی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، مذہبی زندگی کی جھلکیوں کے دکھائی دینے کا امکان ہوتا ہے۔ ہر قوم و ملک کی جداگانہ تاریخیں ہوتی ہیں جن کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ عالمی تاریخ (UNIVERSAL HISTORY.) کی ایک مثال عبد الرحمٰن ابن خلدون کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے کتاب العبر و الدوان المبتدا الخبر۔ اس کے مقدمے (PROLEGOMENON.) نے اس تیونسی عالم فلسفی مورخ کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے ایک قسم تاریخ کی کسی خاص دیار یا خطے کی علاقائی اقلیمی تاریخ ہوتی ہے جس کی قوموں اور ملکوں کی تاریخوں کی طرح بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ قدیم یونان کے ایتھنز (ATHENSE.) اور اسپارٹا (SPARTA.) کی تاریخ

چین کے منانگ خاندان کی تاریخ اور ہمارے ہندوستان میں کلہانہ کی راج ترنگنی جس کا آخری بارہویں صدی کے تاریخ کشمیر کا حصہ زمانہ حاضرہ کی تاریخوں کی طرح صحیح معنوں میں تاریخ کا درجہ رکھتا ہے جسے اسٹائن اور آر سی پنڈت نے انگریزی میں ترجمہ کیا اور سیرحاصل مقدمہ لکھا اس کی مثالیں ہیں۔ ہندوستان میں کلہانہ کے بعد سترہویں، اٹھارہویں صدی کے پہلے کسی ہندو اہل قلم نے تاریخ کی طرف توجہ نہیں کی تھی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

علاقائی (REGIONAL.) تاریخوں میں دکن کے سلاطین بہمینہ اور گولکنڈہ، احمد نگر، بیجاپور، مانڈو، خاندیش کی فارسی تاریخیں، عربی میں گجرات کی تاریخ اور ہندوستان کے باہر کی ضخیم تاریخوں میں تاریخ بغداد، تاریخ دمشق وغیرہ آتی ہیں۔ ابن عساکر کی علاقائی تاریخ کی آدھی درجن جلدیں بھی طبع نہیں ہوسکیں۔ کچھ تاریخیں کسی خاص مضمون اور موضوع کے نقطۂ نظر سے فارسی وعربی اور دوسری زبانوں میں لکھی گئیں۔ انگریزی جنگ ایتھنز اور اسپارٹا، تاریخ بنی اسرائیل، صلیبی لڑائیوں پر کتابیں لکھی گئیں۔ ایڈورڈ گبن (GIBBON.) نے عروج وزوال سلطنت روما پر اپنی مشہور عالم تاریخ لکھ ڈالی۔ عربی میں وفیات، سفرنامے، تاریخ مذاہب جیسی کتابیں کئی ایک موضوع پر لکھی گئیں۔ مختلف مباحث پر جو متعدد کتابیں عربی یا فارسی میں لکھی گئیں اسی زمرہ میں آتی ہیں مثلاً حدود العالم، معجم البلدان، معجم الادبار، تاریخ الادب العربی، وفیات الاعیان، الفہرست، رحلہ ابن بطوطہ، مسالک الابصار وغیرہ تاریخ مذاہب کے سلسلہ میں چند نام فوری طور پر ذہن میں آجاتے ہیں مثلاً عبدالکریم شہرستانی کی ملل و النحل اور فارسی کی دبستان مذاہب جسے ایک پارسی نے پٹنہ کے گوشے میں بیٹھ کر عہد اکبر و جہانگیر میں لکھ ڈالا۔ اس ضمن میں اطالوی زبان میں ضخیم انالی ڈل اسلام ANNALEDULL ISLAM.) کبھی یاد آتی ہیں جنہیں اطالوی ڈیوک لیون کیٹینی DUKE E LEONE CAETANI. نے لکھنا شروع کیا لیکن اموی عہد تک کئی جلد لکھ پایا تھا کہ بدقسمتی سے اس کی وفات واقع ہوگئی۔ اطالوی امیر اور محقق نے ایک اور ضخیم کتاب لکھی تھی جس کا نام اس نے کرو نوگرافیا (CHRONOGRAPHIA.) رکھا تھا۔ یہ اور

آتاں کے معنیٰ ہم نام ہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

سطور بالا میں جو کچھ تاریخ نویسی کے متعلق لکھا گیا اہل علم کے لئے مسکن عطش نہیں ہو سکتا۔ فی الحقیقت بہت سی ضروری باتیں ہنوز تشنۂ تحقیق رہ جاتی ہیں اور محتاج نگارش ہیں مثلاً فلسفۂ تاریخ کا وجود و شعور تاریخ نویسی کی تاریخ، نظریاتی، تصوراتی تبدیلیاں، ارتقائی عمل تاریخ کے نام اور وجہ تسمیہ وغیرہ تاریخ کے آغاز ادوار اور نام کے متعلق چند اشارات ہی کافی ہوں گے، علم تاریخ کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی اس کے بارے میں تحقیقی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ ظنی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے ابتدائی زمانے میں اس کے حالات و خیالات پر فطرت (پراکرت) کے نادر الظہور مظاہر و مناظر PHENOMENON (MENC OF NATURE, 'E) نے کافی اثر ڈالا ہوگا، خوف و رجا نفع و نقصان دہندی و فیض بخشی کے احساسات نے اس کے ہوش و گوش مودھ اور اوسان، و فہم و ادراک کو مغلوب و متاثر کر دیا ہوگا، و سواسی اور وہمی ہو کر دھارمک ہو گیا ہوگا، آسمانی شمس و قمر زمین پر بہتی ہوئی بڑی بڑی ندیاں نہایت بلند آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ، اونچے بڑے بڑے درخت کی عظمت و ہیبت نے اسے توہمات اور اندھی تقلید کا تابع اور دھارمک بنا ڈالا۔ قدیم روم و یونان کا دیوتا ہرمیس (HERMES.) جو مصری دیوتا تھوا تھ (THOTH.) کا ہم پلہ اور جواب قرار دیا گیا۔ ہندوستان کے بڑے دیو، دیوتاؤں کی طرح اسے پوجا جانے لگا اور اسے کچھ امتیازی خصوصیات کی حیثیت بھی دی جانے لگی بہت سے قصے کہانیاں چل پڑیں یہ اساطیری دور ختم ہوا اور یونان و روم کے فلسفیانہ تاریخ کا دور شروع ہوا۔ ہیرو ڈوٹسی (HERODOTIS.) جو ۴۸۴ قبل مسیح گذرا ہے، تاریخ کا بابا آدم کہلاتا ہے۔ ٹے سی ٹس (TACITUS.)، لیوی (LIVY.) تھوسی ڈائی ڈس (THUCYDIT THUCYDIDOUS.) پولی بیس (POLYBOIUS.) جس کی آئین روم کی چھٹی جلد ۱۵۰ یا ۱۶۰ قبل مسیح مکمل ہوئی، یہ سب زمانۂ قدیم کے بڑے بڑے مورخ سمجھے جاتے ہیں۔ کسی نے ایتھنز اور

اسپارٹا کی جنگوں کا حال قلمبند کیا، کسی نے کئی جلدوں میں سلطنت روم کی تفصیلی تاریخ لکھی۔ پولی بیس کی تاریخ روما سے فرانسیسی انقلاب کے مورخ مونٹیسکو

(MONTESQUO. UO) نے بہت کچھ استفادہ کیا۔ ایک اور ترقیاتی دور شروع ہوا اور جو باتیں پہلی قدیمی تاریخوں میں مفقود تھیں منظر عام پر لائی گئیں۔ ماضی کے دریچوں میں جھانک کر مستند مواد و ماخذ و شواہد کی مدد سے قدیم انسانوں کی داتفاقی زندگی، عادات واطوار، طور طریقوں، اخلاق طرز معاشرت تہذیب، ثقافتی، اقتصادی امور کا معروضی عقلی خطوط پر جائزہ لیا گیا۔ شخصی مطلق العنانی یا جمہوری حکومتوں، فرمانروایان وقت کے غلبہ واقتدار سیاسی تعلقات، تنازعات سب پر تحقیقی نظر ڈالی گئی۔ تاریخی ارتقا کا عملی ظہور پذیر ہوا۔ بہت سے چھپے اور بکھرے ہوئے عناصر ظاہر ہونے لگے اور سنین و ماہ کی ترتیب سے ان کی تدوین اور تنظیم کی گئی۔

یونان و روم کی تاریخ ہو یا عربی کی تاریخیں انہیں کئی نام سے یاد کیا گیا ہے کسی نے وقائع نگاری کو اناالس (ANNALS.) کا نام دیا جس میں واقعات سال وار ترتیب سے اسناد کے ساتھ تحریر کئے گئے ہوں، کرونولوجی (CHRONOLOGY.) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا۔ انالی یا انالس یونانی الفاظ ہیں جن کے معنی ہیں سال سے متعلق یا داشت انولس سے یہ لفظ نکلے ہیں جن کا مفہوم ایک سال ہے۔ انگریزی لفظ ہسٹری جس کا مخفف اسٹوری ہے۔ گذشتہ واقعات و معاملات و روداد کے حقائق پر مشتمل جن کا علم مطالعہ اور تحقیق و تلاش سے حاصل ہوتا ہے۔ زمانہ و سال کا مفہوم کرونولوجی سے بھی نکلتا ہے عام فہم مروجہ نام اردو میں تاریخ ہے۔ مشہور انگریزی مستشرق مارگولیتھ نے اپنی ایک کتاب میں جو عربی تاریخوں کے موضوع پر ہے۔ لکھا ہے لبنان (LABANON.) کے ساحلی علاقہ میں ایک جو نیقی (GHOENECCAE.) نسل کے شخص کی جو عربی زبان میں بیرونی الفاظ کے داخلے کے متعلق تحقیقات کر رہا تھا، نگاہ لفظ اریخ پر پڑی جس کے معنی سال و ماہ تھے۔ تاریخ اسی لفظ اریخ کی بدلی ہوئی شکل بتائی گئی ہے۔ انگریزی مورخ ہنری

ہنری تھامس بکل (THOMAS BUCKLE.) اپنی تصنیف تاریخ تمدن وتہذیب میں،
جسے ۱۸۶۱ء میں اس نے مرنے کے چار سال پہلے مکمل کیا تھا، لکھا ہے کہ مسلمانوں کے قبل
سال وماہ وروز کا سلسلہ یا رشتہ واقعاتی تاریخوں سے جوڑا نہیں جاتا تھا' اس وقت یہ
کتاب پیش نظر نہیں ہے اس لئے اس نظریہ کی تحقیقی واقعیت کے متعلق کچھ کہا نہیں جاسکتا
یہ تو متحقق ہے کہ ہسٹری لیعنی وقائع ایک یونانی لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنٰی ہیں علم ماضی
وزخ انسانی کا۔ ٹے سی ٹس متوفی ۱۲۰ء کی تاریخ سلطنت روم کا نام ANNALS,
تھا جو ایک یونانی لفظ ہے اور جس میں واقعات کے سالوار ترتیب و تنظیم کا مفہوم مضمر ہے۔

عہد عتیق کے یونان وروم کے مورخین نے اپنی فلسفیانہ اور واقعاتی تاریخوں
سے جو اثر قائم کیا تھا اس کی جھلک یورپ کے نشاۃ ثانیہ (RENAISANEE) یا زمانہ
بیداری میں جو اٹالیہ میں ۱۴ ویں صدی میں شروع ہوا اور ۱۶ ویں صدی تک جاری رہا دکھائی
پڑتی ہے اور بعد کے آنے والے سیکڑوں مورخین نے جو یورپ اور امریکہ کے مختلف خطوں
کے رہنے والے تھے اپنی تصنیفات اور نئے نئے نظریات سے تاریخ کا تصور ہی بدل ڈالا'
اس کی ماہیت، مقصدیت، جامعیت، طریقۂ کار پر اپنے اپنے معروضی، مشاہداتی، عقلی اور سائنسی
تجزیے اور نقطہ نظر پیش کیے جرمنی کے لیو پولڈ جون رینکے (.RANKE) امریکہ کے ترقی
پسند (/ PROGESSIVE, IVE) مورخین میں گروٹ (GROTE.) ، کولنگ اوڈ
(COLLING WOOD) جون ٹرنر (TURNER R) پیرنگٹن مفکرین کا نام لیا جا
سکتا ہے۔ انگریز مورخ ٹوائنبی TOYONBEE نے بارہ ضخیم جلد میں اپنی کتاب مطالعہ
تاریخ (S STUDY OF HISTORY, ORY) لکھ ڈالی۔ تونیسی مسلم مورخ
عبدالرحمٰن ابن خلدون کے مقدمہ (/ PROLEGOMMA, MA) کے متعلق اس نے
جو اپنی رائے دی ہے اس سے اس کی عالی ظرفی جھلکتی ہے۔ لکھتا ہے:۔

" THIS IS THE " GREATEST WORK OF ITS KIND
/THAT HAS EVER YET BEEN EVERYET BEEN

CREATED BY ANY MIND IN ANY TIME OR PLACE.

ابن خلدون اور اس کی عالمی تاریخ کے نام اور مقدمہ کے بارے میں کچھ اشارہ اوپر کسی جگہ کیا جا چکا ہے۔ امریکی مورخین میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ابن خلدون کے مقدمہ کو عظیم کارنامہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے خالق کو عظیم انسان ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس کی ۱۳۰۸ء/۸۰ء میں وفات ہوئی۔ ۷۷۶ء میں کتاب العبر AL-IBOR. مکمل ہوئی۔ ۱۳۸۲ء اور ۱۴۰۶ء کے درمیانی عرصے اور مصر (EGYPT) کے دوران قیام میں تقریباً چھ مرتبہ مالکی فقہ کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے اور ہٹائے گئے۔ ۱۳۹۰ء میں ایوبی خاندان کے سلطان حکمران یوقرق نے انہیں اس عہدہ سے برخاست کر دیا چونکہ ان کے خلاف ایک دستخطی مہم میں شریک ہو جانے کا الزام تھا۔ ان کی سرکاری (OFFICIAL) زندگی جیسی بھی رہی ہو ہمیں تو انہیں ایک محقق، مفکر اور مورخ کی حیثیت سے دیکھنا ہے۔ اور اس میں وہ پورے ہی نہیں بہت بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی عالمی تاریخ (UNIVERSAL HISTORY) بالخصوص اس کے مقدمہ کا ترجمہ فرانسیسی عالم ڈی۔ سلین (DESLANE) نے کیا ہے اور اس کے بارے میں اپنی رائے دی:

ONE OF THE WORLDS GREAT AUTHER AND

THINKER.

لبنانی عالم چارلیس (CHARLES ISSAWI) نے۔

مقدمے کے بہت سے حصوں کے اقتباسات کی جو انسان کے سماجی، عمرانی، جغرافیائی، تاریخی اور اقتصادی حالات و تغیرات اور ارتقائی عمل سے متعلق تھے، تفریحات و توضیحات کی۔

کتاب کے نام سے ہی عبرت، بصیرت، آگاہی مکافات، رہبری، رہنمائی اور محاسبہ اعمال کے مفہوم واضح ہو جاتے ہیں۔ ابن خلدون ایسے مانوں نے مختلف علوم پر کام کیا اور وہ

سب سے بڑے انگنت احادیث کے راوی ہیں۔ مذاہب عالم کے بانیوں میں پیغمبر اسلام کی ا واحد ہستی تھی۔ کہ ان کی صحیح
تاریخ وفات کا بھی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ کہا گیا کہ بارہ وفات یعنی ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ میں سے کسی تاریخ کو ان کا وصال ہوا۔ مزید براں افسوسناک امر یہ بھی ہے کہ ڈیڑھ سو سال کی تاخیر ہے جو ان کے بارے میں کسی کتاب "سیر" کے پیش کرنے میں واقع ہوئی۔ عباسی عہد اور ۷۶۸/۱۵۱ ہجری میں ابن اسحاق نے پہلے پہل ایک کتاب جو "سیر" کہلائی، لکھی اس کا مکمل نسخہ پردہ خفا میں مستور ہو گیا۔ ابو عبید عمر الواقدی نے بھی بہت کچھ لکھوا ڈالا لیکن واقدی ایک غیر معتبر راوی قرار دیا گیا ہے اس کے سکریٹری ابن ہشام نے ابن اسحاق کی سیر کی تلخیص و تدوین کا فرض انجام دیا۔ جو کتابیں اموی اور عباسی دور میں مرتب کی گئیں ان میں اس زمانہ کی سیاست کے رنگ اور جانبداری کے واضح نشانات ملتے ہیں۔ اب جو یورپ کے مستشرقین نے ان ابتدائی تحریرات کو ڈھونڈ ھ نکالا اور اپنی زبان میں بھی انہیں منتقل کیا تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور صحیح و سقیم معتبر اور غیر معتبر کا اندازہ ہوا۔ محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰/۹۲۳ نے احادیث کی چھان بین کر کے جسے معتبر سمجھا اس کی بنیاد پر اپنی کتاب کی تدوین و تکمیل کی۔ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری نے بھی بڑی تفتیش و تلاش حدیث کے سلسلے میں کی، بہت کانٹ چھانٹ کے بعد جسے معتبر سمجھا اس کا مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام صحیح بخاری پڑا۔ ظاہر ہے معتقدین اسے صحیح ترین کتاب بعد "کتاب باری" سمجھتے ہیں۔ لیکن تنقید بخاری پر بھی کچھ لکھنے کی گنجائش نکل ہی آئی۔ "طبقات ابن سعد" ۲۳۰/۸۴۴ ۔ اور سوانحی کتابوں میں ابن خلقان ۱۲۸۲ھ کا وفیاتی تذکرہ "مراۃ الخیال" اور "مناقب الصالحین" جو تذکرہ یافعی متوفی ۷۶۸/۱۳۶۷ کے لئے مشہور ہیں آج بھی موجود ہیں، مسلم، ترمذی، ابن داؤد وغیرہ کی فقہی کتابوں احادیث و سنن، اقوال و غزوات رسول، سیر و طبقات کے بعد صحیح معنوں میں تاریخ کا دور شروع ہوا اور بڑی بڑی ضخیم جلدیں عربی میں لکھی جانے لگیں۔
تاریخ بغداد کا اوپر ذکر آیا۔ ابن عساکر نے تاریخ دمشق کے سلسلے میں جو اکابرین علماء اور اہل قلم

علم التاریخ کا بڑی عمیق نظروں سے مطالعہ کیا تھا۔ مسلمان مورخین قدیم یونانی و رومی اور ان کے بعد کے عہد کے یورپ کے عیسائی مستشرقین و مورخین کے افکار و تحریرات سے متاثر تو تھے لیکن انہوں نے اپنی ایک علیحدہ راہ بھی نکالی تھی۔ عالمی ملکی علاقائی اقالیم و یاداور خطوں کے بارے میں صحیح تاریخیں مرتب کیں۔

عربی کی تاریخوں کے بھی کئی نام تھے۔ سیر (SIYAR) جس سے سیرت یعنی اخلاق اوضاع وصفات کی پابندی ظاہر ہوتی تھی اخبار، خبر کی جمع ہے۔ ابن خلدون کا عبر، جو عبرت کا صیغہ جمع ہے، تاریخ، طبقات، مغازی، روزنامہ یہ سب نام بھی آئے ہیں ــ قرآن میں قصص کا لفظ آیا ہے، سورہ یوسف کو احسن القصص کہا گیا۔ اہل سیر کو مورخ یا واقعہ نگار اور اس کی تصنیف کو کتاب السیر بتایا گیا۔ پٹنہ کے مشہور مورخ غلام حسین طبا طبائی کی سیر المتاخرین سے شاید ہی کوئی اہل علم ناواقف ہو۔ ابن خلدون عالمی کائناتی تاریخی نظریہ کا شاید سب سے بڑا شارح اور متشرح تھا جس زمانے میں کلاسیکی عیسائی

(CLASSICAL) قسم کے مورخین خاص خاص محدود امور جیسے چرچ، اس کے رسومات و معتقدات، صلیبی لڑائیوں سیاسی آویزشوں، تنازعات، حکمرانوں کی جنگ جویانہ کشاکش اور دوسرے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ ابن خلدون دنیا کے قبائلی لوگوں کی ابھرتی ہوئی بیداری کی جاگیرتی کو اپنی تحریرات سے ہوا دے رہے تھے اور خوش حالی کی طرف دھیرے دھیرے قدم زنی کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ انسانی ہمدردی اس مالکی فقہ کے دامنی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

مسلمانوں کی دین علم التاریخ، علم العمران، علم الارض (جغرافیہ) تذکرہ اور سوانحات کے دائرہ میں ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے ایک نئے علم کی جو اسناد اور علم الرجال کے نام سے مشہور ہے۔ ایجاد کی۔ پیغمبر اسلام کے احوال واحادیث کی صحت اور اعتبار کی جانچ کا یہ ایک ذریعہ ہے سوچا گیا تھا۔ حدیث کا ایک انبار تھا۔ جو جمع ہو گیا۔ صرف ایک شخص نے جن کا نام نامی ابو ہریرہ تھا جو اصحاب صفہ کی حیثیت سے صرف دو برس پیغمبر اسلام کے ارد گرد رہے

گذرے ۸۰ (اسی) جلدوں میں ان کے بارے میں لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا اور صرف چند ہی جلدیں تیار کی تھیں کہ ۷۷ا ۱ھ میں وفات پا گیا۔ اعثم کوفی بلاذری، ابن الجوزی (۱۱۹۶ - ۱۲۵۷ء) کامل ابن اثیر ابوالفدا مسعودی (مروج الذہب) رشید الدین خاوندشہ وغیرہ کی تاریخوں کا چرچا مشرق و مغرب یعنی ہر جگہ آج بھی ہوتا ہے۔ عربی و فارسی میں اتنی کثیر التعداد تاریخی کتابیں دکھائی دینے لگیں کہ علم التاریخ کو مسلمانوں سے مخصوص کیا جانے لگا۔ ابوریحان احمد البیرونی کی کتابوں بالخصوص اس کی تحقیقات ہند کی حیثیت جداگانہ اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ تاریخ یمینی YAMINI. "طبقات ناصری" "تاج المآثر" سے سلطنت اور مغلیہ عہد کی تاریخوں کا دور شروع ہوا۔ تاریخ کے معاملے میں ہندوستان کے تیموری مغلوں کا زمانہ عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ بابر و جہانگیر کے خود نوشت سوانحات، گلبدن بانو بیگم کی آپ بیتی ہمایوں نامہ اور اکبر نامہ نے تو تاریخ کا ایک نیا باب ہی کھول دیا۔

۱۷ ویں ۱۸ ویں صدی میں علاوہ مسلمانوں کے ہندو اہل قلم مثلاً سبحان رائے، بھیم سین، رنچھوڑ داس، شیو ناتھ، خوشحال چند وغیرہ نے تاریخ کی ایک نئی راہ نکالی، صدیوں کے جمود کو پگھلا دیا اور ایک ضروری خلا کو پر کیا۔ یہاں کچھ سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں اور انگریز مورخوں نے اٹھائے ہیں۔

سنسکرت میں تاریخ کا فقدان کیوں تھا۔ لے دے کے ایک کتاب ۱۲ ویں صدی میں راج ترنگینی جو کشمیر کی صحیح معنوں میں تاریخ کہی جا سکتی ہے۔ کلہان نے لکھی بقول اسٹائن (STEIN) اس کے مترجم کے، اس پر لنکا کے بدھ مت کی تاریخ اور چینیوں CHINESE کا اثر تو تھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ مسلمانوں (جن کی آمد کشمیر میں شروع ہو چکی تھی) کے تاریخی افکار و رجحانات، عقائد جاذب نظر ہوتے ہوں لیکن کلہان نے قدیم کتبوں اور سکوں پر کندہ مہروں سے ہی مدد لی۔ اس کی ضرورت ہے کہ راج ترنگینی پر جو بھی بیرونی اثرات پڑے اس کی سیر حاصل چھان بین کی جائے۔

عہد قدیم کے ہندوؤں اور برہمنوں نے علوم کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جسے چھوڑا ہو

علم یقین (ERTAIN KNOWLEDGE) علم حکمت PHILOSOPHY

علم ریاضی و ہندسہ و علم حساب۔ MATHEMATICAL SCIENCE (CE)

علم طب (MEDICAL SCIENCE) علوم نجوم ASTRONOMY)MY

ASTROLOGY Y) علم طبعی (NATURAL SCIENCE) E)) کے ساتھ ساتھ علم

سحر (MAGIC) (علم جوگ (AK/KNID OF S, SPIRITUAL WORSHIP

سب میں ایسی مہارت حاصل کی تھی اور کتابیں لکھی تھیں جسے دیکھ کر دور حاضرہ کے فضلا انگشت حیرت دانتوں میں ڈال لیتے ہیں۔ لیکن پراچین زمانے میں کوئی اتی ہاس (تاریخ) کی کتاب لکھنے والا دکھائی نہیں دیتا، کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تاریخ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے؟ بدیع الفہم، عالم الغیب قسم کے دیو مالائی افراد، دیوی، دیوتاؤں اور راجاؤں کے قصوں کی بہتات ہے کیوں؟ کیا ان خیالی مفروضہ دیوتاؤں اور راجاؤں کی بہ نسبت تاریخی شخصیات و افراد کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ کیا دنیا کی بے ثباتی، ناموبے بود دھوکہ فریب محض ہونے کے تخیلات کا غلبہ تاریخی کی طرف رخ کرنے سے انہیں روکتا تھا؟ دنیا فانی ہے اور مکافات و محاسبہ اور نقل مکان، آواگون یا تناسخ کا عمل جاری ہے اس میں تاریخ کی کہاں گنجائش تھی۔ بہر کیف یہ اور ایسے ہی خیالات کئی بار اٹھائے گئے اور اختلافات کے باعث بنے۔ موجودہ زمانے کے مفکرین اور اہل قلم ہند و یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ عہد قدیم میں علم التاریخ کا وجود نہ تھا انہوں نے پورا زور قلم اس بات کے منوانے پر صرف کر دیا کہ مہابھارت اور رامائن کے قصے در قصے واقعاتی حقائق پر مبنی تھے اور اٹھارہ پورانوں کی بنیاد اور ماں اور قصص تاریخی تھیں۔ راجاؤں کے نسب نامے اصلی تھے۔

قدیم عہد میں بڑی بڑی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، کیا مرور زمانہ کے سانحات لوگوں کے کردار اور روداد کی سرگذشت جو سنسکرت یا کسی پراکرتی زبان میں لکھی گئی ہوگی امتداد زمانہ کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ زمانہ متوسط میں بھی جب مسلمانوں کی حکومت تقریباً سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کی چھوٹی بڑی حکومتیں راجستھان اور دکھن

کے وجیا نگر میں قائم تھیں۔ ہندو راجا شمال و جنوب میں جب موقع پاتے مسلمان حکمرانوں سے برسر پیکار ہو جاتے تھے۔ وجیا نگر میں ہندوؤں نے ایک بڑی مضبوط حکومت قائم کر لی تھی اور بہمنی اور بیجاپور کی مسلم سلطنتوں سے اس کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں مثلاً عبدالرزاق اور نانی کولو کونٹی (NICHO LO CONTI) نے بہت کچھ وہاں کے لوگوں اور حکمرانوں کے بارے میں ان کی معاشی، اقتصادی، تہذیبی، تمدنی حالات پر روشنی ڈالی ہے کیا وجہ ہے کہ وہاں کے ہندوؤں نے کچھ بھی حصہ تحریر میں لانا ضروری نہیں سمجھا۔ راجستھان قرون وسطیٰ میں بھاٹوں (BARDS) کی مدحیہ نظموں کا جو ایک طرح کی ہندی کا نمونہ تھیں مخزن تھا۔ لیکن کیا ہم بھاٹ قبائل کے ان افراد کو جو راجاؤں کے خاندانی شجروں اور بہادری کے کارناموں کو منظوم کر کے سناتے اور انعام پاتے تھے تاریخی اہمیت دے سکتے ؟ مواد و ماخذ کے طور پر ذرف ان سے بہار کے نالندہ اور وکرم شیلا اور بنگال کے پہاڑ پور کے بچے کھچے تحریری اور غیر تحریری آثار سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ نیپال کا مرتاض بدھ مت کا راہب دھرم سوامی ویشالی ہوتا ہوا دریائے گنگ کو عبور کر کے نالندہ پہنچا۔ بختیار خلجی کے حملہ اور فتوحات بہار کے تقریباً ۱۲۔۱۳ برس بعد اور تقریباً تین برس نالندہ کے معمر عالم سری بھدر (ATIKA) نے، جس نے قریب ۱۳ برس تبت میں رہ کر بڑی بڑی کتابیں لکھیں اور تبتی زبان میں بدھ مت کی تحریری باقیات اتصالیات کا پتہ لگا کر تبت ہی کی زبان میں بہت کچھ لکھا اور ۱۰۵۳ء (دس سو ترپن عیسوی) میں فوت ہوا۔ تاریخ کے لئے بڑی اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے ہم مورخ تو نہیں کہہ سکتے نہ اس کی کتابوں کو تاریخ کا درجہ دے سکتے ہیں کچھ مطلب اور مضمون تو مل سکتا ہے لیکن ترتیب و پیکر وضع و اسلوب کی کچھ بھی گنجائش نہیں مانی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سید حسین احمد

سید حسن عسکری - ایک نظر میں

نام : سید حسن عسکری بن سید رضی حسن بن سید لطافت حسین۔

۱۹۰۱ء : ولادت، بمقام کجھوہ سیوان (سابق سارن)

تعلیم : ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ کجھوہ سیوان (سابق سارن)

۱۹۱۸ء : چھپرہ ضلع اسکول سے میٹرک کا امتحان دیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

۱۹۲۲ء : جی، بی بی کالج مظفر پور سے بی اے آنرز کا امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے کامیابی ملی۔

۱۹۲۴ء : پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

۱۹۲۵ء : پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ ایل کا امتحان پاس کیا۔

اعزازی ڈگری

۱۹۶۷ء : مگدھ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی سند سے نوازا۔

۱۹۸۴ء : پٹنہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔

شادی

۱۹۲۶ء : سید رضا حسین کی دختر بی بی اُم سلمہ سے عقد ثانی۔ عقد اول ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ چند برس بعد بیوی کا انتقال۔

ملازمت

۱۹۲۶ء : نیو کالج پٹنہ میں ٹیچر ہوئے۔

۱۹۲۷ء : پٹنہ کالج کے شعبہ تاریخ میں بحیثیت لکچرر تقرری ہوئی۔

۱۹۳۴ء : اسسٹنٹ پروفیسر پٹنہ کالج مقرر ہوئے۔

۱۹۵۰ء : پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں بحیثیت پروفیسر جوائن کیا۔ اور بہار ایجوکیشن سروس سے CLASS I ملا۔

۱۹۶۲ء : کے پی جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائرکٹر ہوئے۔

۱۹۶۴ء : VISITING PROFESSOR کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ جوائن کیا۔

۱۹۶۸ء : ہسٹری کانگریس کے صدر چنے گئے۔ (جوائن نہیں کیا)

۱۹۷۸ء : بہار یونیورسٹی میں VISITING PROFESSOR مقرر ہوئے (جوائن نہیں کیا)
اس کے علاوہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے مجلس انتظامیہ کے رکن، بہار ریسرچ سوسائٹی کے رکن اور BIHAR REGIONAL SERVEY-omm- COMMITTEE کے سکریٹری بھی رہے۔

اعزاز

۱۹۶۸ء : بہار ریسرچ سوسائٹی نے ان پر ایک سوؤنیر نکالا۔

۱۹۷۱ء : ایرانی سلطنت کی ۲۵۰۰ سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کے لئے شاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے انہیں مدعو کیا۔

۱۹۷۵ء : غالب ایوارڈ ملا۔

۱۹۷۸ء : فارسی زبان وادب سے علمی شغف اور جید عالم ہونے کی حیثیت سے راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ ہند نے CERTIFICATE OF HONOUR سے نوازا۔

۱۹۷۹ء : بہار اردو اکادمی نے ایوارڈ دیا۔

۱۹۸۵ء : صدر جمہوریہ ہند نے تعلیمی اور تحقیقی کارناموں کو مدنظر رکھتے ہوئے "پدم شری" سے سرفراز کیا۔

۱۹۸۷ء : "بہار رتن" کے اعزاز سے نوازے گئے۔

کتابیں

تقریباً ۲۵۰ تحقیقی مقالات لکھے جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ملک کے اہم رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

۱۹۶۵ء : REPORT OF THE REGIONAL RECORD SURVEY COMMITTEE.

۱۹۸۰ء : SIRAT-E-FIROZE SHAHI

فارسی سے انگریزی ترجمہ

۱۹۸۰ء : SHAHNAME-E-MUNAWAR-AL-KALAM

فارسی سے انگریزی ترجمہ

۱۹۸۱ء : MAKTUB & MALFUZ LITERATURE AS A SOURCE OF SOCIO POLITICAL HISTORY

۱۹۸۲ء : TABQUAT-E-BABRI

زین الدین خوافی کی کتاب طبقات بابری کا انگریزی ترجمہ

۱۹۸۳ء : THE COMPREHENSIVE HISTORY OF BIHAR

EQBAL NAMA

۱۹۸۳ء : کشل چند کی کتاب "اقبال نامہ" کا انگریزی ترجمہ۔

۱۹۸۵ء : COLLECTED WORKS OF PROF. S.H. ASKARI VOL.I.

(دوسری مرتبہ شائع ہوئی ۱۹۹۲ء میں)

۱۹۸۸ء : AMIR KHUSRAU (دوسری مرتبہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی)

۱۹۹۰ء : MEDIEVAL BIHAR

ULTANTE AND MUGHAL PERIOD

۱۹۹۰ء : عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصّہ

۱۹۹۰ء : ہندوستان کے عہد وسطیٰ پر مقالات ۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۰ : اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ۔